freepdfpost.blogspot.com

حرفِ راز

100 کالم اوریا مقبول جان

100 کالم

1

حرف راز

اوریا مقبول جان

اوریا مقبول جان کے منتخب
کالموں کا مجموعہ اب کتابی شکل
میں

pdfnovels.blogs

allurdupdfnovels.blogspot.com

12 دسمبر کا انتظار

پاکستان کی تاریخ میں اقتدار پر ساٹھ دہائیوں سے قابض طبقات نے کسی فرد کی ریٹائرمنٹ کا اس شدت سے انتظار نہیں کیا ہوگا' جس قدر پل پل گنتے ہوئے چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کی ریٹائرمنٹ کا کیا جا رہا ہے۔ ہر گزرتا پل ایک قیامت ہے، سکھ کا سانس نہیں ملتا، نہ جانے صبح عدالت کے دروازے کھلتے ہی کون سی بددیانتی، بے اصولی اور لاقانونیت پر بحث کا آغاز ہو جائے اور بڑی بڑی تنی ہوئی گردن والوں کو عدالت کے روبرو کھڑا ہونا پڑے۔ سیاست دان، بیوروکریٹ اور جرنیل، کون ہے جو نجی محفل میں صرف ایک بات کا گلہ کرتا نظر نہیں آتا کہ ہمارے کام میں مداخلت ہو رہی ہے۔ ہر ادارے کو اپنی حدود میں رہ کر کام کرنا چاہیے اور یہ حدود آئین اور قانون مرتب کرتے ہیں۔ یہی اس حد کو صرف عدلیہ پر نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ یہی وہ منطق ہے جس کی گونج ایک بددیانت اور قانون سے ماورا معاشرے میں ہمیشہ سنائی دیتی ہے۔ لیکن اس بے ہنگم شور میں عدالت کی کرسی پر بیٹھے کسی نہ کسی مردِ حُر کی گرجدار آواز ہر دور اور ہر معاشرے میں ضرور سنائی دیتی رہی ہے۔ امریکہ کی سپریم کورٹ کی عمارت پر سنگ مرمر کی دیوار میں کھدی اور سونے کے پانی سے لکھی چیف جسٹس جان مارشل کے 1803ء کے ایک فیصلے کی یہ تحریر موجود ہے:

"It is emphatically the province and duty of the judicial department to say what the law is" یعنی ''یہ بنیادی طور پر عدلیہ کا ہی دائرہ کار اور فرض ہے کہ وہ بتائے کہ دراصل قانون کیا ہے''۔ یہ الفاظ عدلیہ کی تاریخ کے سب سے مشہور مقدمے Marbury VS. Madison سے لیے گئے ہیں۔ جان مارشل امریکہ کی تاریخ کا سب سے طویل عرصہ تک رہنے والا چیف جسٹس تھا۔ وہ 1801ء سے 1835ء تک چونتیس سال امریکی سپریم کورٹ کا چیف جسٹس رہا۔ یہ وہ شخص تھا جس نے ایک ایسے امریکی معاشرے کی نوک پلک سنواری جو بظاہر یورپ کے بھگوڑوں، پیشہ ور مجرموں، انسانی غلامی کے تاجروں اور مقامی آبادی کے بے رحمانہ قتل میں ملوث افراد سے مل کر بنا تھا۔ امریکہ کو آزاد ہوئے ابھی چند ہی برس ہوئے تھے اور جمہوریت کے نشے میں چُور کانگریس کے ارکان خود کو امریکہ کے سیاہ و سفید کا مالک سمجھتے تھے۔ امریکہ نے ابھی دو صدارتی ادوار دیکھے تھے۔ امریکہ کے تیسرے صدر تھامس جیفرسن نے 17 فروری 1801ء کو امریکہ کا صدارتی الیکشن جیتا۔ اسے 4 مارچ کو حلف اٹھانا تھا۔ ان چند دنوں کے وقفے میں سبکدوش ہونے والے صدر جان ایڈمز نے کانگریس سے عدلیہ کے بارے میں ایک قانون پاس کرایا جس کے تحت سپریم کوٹ کے ججوں کی تعداد چھ سے کم کر کے پانچ کر دی گئی، سرکٹ عدالتیں تین سے چھ کر دی گئیں اور صدر کو ججوں کو نامزد کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔ چارج چھوڑنے سے ایک دن پہلے یعنی 3 مارچ کو جان ایڈیمز نے 16 فیڈرل سرکٹ جج اور 42 فیڈرل جسٹس آف پیس مقرر کر دیے۔ انہیں امریکی تاریخ میں رات کے اندھیرے کے جج Midnight judges کہا جاتا ہے۔ تھامس جیفرسن کی حکومت نے آتے ہی کانگریس سے جان ایڈیمز کا 1801ء کا عدلیہ کا قانون ختم کروایا، اپنا نیا 1802ء کا قانون پاس کروایا اور ساتھ ہی عدلیہ پر کام کرنے کے لحاظ سے ایسی پابندیاں لگائیں کہ نئے منظور کردہ قانون کے بارے میں جلد فیصلہ نہ آ سکے۔ کانگریس کو سپریم، عوام کا نمائندہ اور عقلِ کل سمجھنے والے یہ تصور کر بیٹھے تھے کہ اب وہ جب چاہیں، جیسے چاہیں قانون کو اپنی مرضی کے مطابق موڑ لیں گے۔ ایسے میں چیف جسٹس جان مارشل کے مذکورہ مقدمے میں فیصلے نے قانون کی بالادستی کو ایک نیا راستہ دکھایا۔ انہوں نے پہلی دفعہ قانون کی تاریخ میں لفظ Void استعمال کیا۔ یعنی ایسا قانون جو آئین کی روح سے متصادم اور انصاف کے تقاضوں کے مطابق نہ ہو' دراصل وجود ہی نہیں رکھتا۔ یہی وہ تصور ہے جو انصاف کی اصل روح ہے۔

انصاف کے نفاذ کا عمل ایک محترم اور مقدس عمل ہے۔ اس کی کوئی حدود و قیود متعین نہیں کی جا سکتیں اس لیے کہ بددیانتی اور لاقانونیت ایسی بلائیں ہیں جو زندگی کے ہر شعبے میں موجود ہوتی ہیں اور عدالتوں کا دائرہ کار ان تمام شعبوں پر محیط نہ ہو تو انصاف کی فراہمی رک جاتی ہے۔ عموماً یہ تصور کیا جاتا ہے کہ عدالتیں انصاف فراہم کرتی ہیں لیکن اصل بات یہ ہے کہ اگر کہیں انصاف کا قتل ہو جائے یا بددیانتی ہو جائے یا لاقانونیت سے لوگوں کے حقوق سلب ہو جائیں تو عدالتیں اس ظلم کو اپنے فیصلوں سے درست کرتی ہیں۔ تھانے میں انصاف کی فراہمی پولیس کا کام ہے۔ غلط مقدمہ درج نہ ہو، کوئی پیسے لے کر غلط تفتیش نہ کرے اور عدالت میں سچ بولنے والے پولیس افسران مقدمے کا دفاع کریں۔ اسی طرح مختلف محکموں میں پٹواری ہو، انکم ٹیکس انسپکٹر ہو یا ہسپتال میں ڈاکٹر، اگر یہ لوگوں کو قانون کے مطابق سہولیات فراہم نہیں کرتے، ان کے جائز کام بھی پیسے لے کر کرتے ہیں، ان کی حق تلفی کرتے ہیں، ان کو جائیداد، سرمائے اور صحت سے محروم کر دیتے ہیں تو وہ انصاف نہیں کر رہے ہوتے۔ اسی طرح پارلیمنٹ یا صوبائی اسمبلیاں اگر متفق ہو کر ایسے قانون منظور کرنے لگیں جس سے انسانوں کے ساتھ ظلم، ناانصافی، بددیانتی اور حقوق کی پامالی کا خطرہ ہو تو ایسے میں وہ پوری پارلیمنٹ بحیثیت مجموعی انصاف کا قتل کر رہی ہوتی ہے۔ یہ قتل ایسے ممالک میں اور زیادہ خوفناک ہو جاتا ہے جہاں لوگ دھونس' دھاندلی اور ناجائز ذرائع استعمال کر کے جمہوریت کی بساط کے اہم مہرے بن جاتے ہوں۔ جہاں کسی بھی گاؤں یا قصبے میں لوگوں کی رائے چند غنڈوں، چوہدریوں، خانوں، ملکوں اور وڈیروں کے خوفناک تسلط کے سائے میں لی جاتی ہو۔ ایسے لوگ جب ملک کے قانون ساز اداروں میں جا کر بیٹھتے ہیں تو وہ صرف اور صرف اپنے ذاتی مفادات کے تحفظ کے لیے قانون سازی کرتے ہیں۔ ایسے تمام اداروں کو جو ان کے زیر اثر ہوتے ہیں محکوم اور مجبور بنانے کا خواب دیکھتے ہیں۔ پاکستان کی بیوروکریسی، پولیس، ترقیاتی ادارے اور ریونیو وصول کرنے والے ادارے اس غیر قانونی قبضے کی مثالیں بن چکے ہیں۔ ان تمام اداروں میں اگر کوئی عام آدمی کو انصاف دینا بھی چاہے تو اسے ان تمام گروہوں کے اجتماعی غیظ و غضب کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو چھ دہائیوں سے اقتدار کی مسندوں پر قابض ہیں۔ یہاں انصاف کیسے قتل ہوتا ہے؟ مثالیں واضح ہیں۔ کسی بددیانت پولیس افسر کو اعلیٰ عہدے پر لگانا ہمارا اختیار ہے، کسی ٹیکس چور مافیا کے گروہ کو کھلی چھٹی دینا ہمارا اختیار ہے، کسی ایماندار، منصف مزاج افسر کی زندگی اجیرن کرنا ہمارا اختیار ہے..... ہاں یہ اختیار ہے..... لیکن جب یہ اختیار انصاف کا قتل کرنے لگے تو پھر عدلیہ کا دائرہ اختیار شروع ہو جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں چیف جسٹس جان مارشل نے کہا تھا کہ ''لوگوں کی منتخب کانگریس بھی کبھی کبھی ایسے قوانین کی تخلیق کرتی ہے جو انصاف اور عوام کی امنگوں کے برعکس ہوتے ہیں اور ان کو غیر قانونی قرار دینا عدالت کی بنیادی ذمہ داری ہے''۔ یہاں اس نے لفظ ''عوام کی امنگوں'' استعمال کیا ہے۔ جسٹس افتخار چوہدری کی ریٹائرمنٹ کا انتظار کرنے والوں کو یہ اندازہ نہیں کہ عدالت کا سوموٹو نوٹس اور عدالت کے کمرے میں ہر اس شخص کی حاضری جو اپنے آپ کو فرعون سمجھتا ہو، یہ سب عام آدمی کی امنگوں کا عکس ہے۔ امریکی تاریخ جان مارشل کے نظریے سے اس وقت تک نہ نکل سکی جب تک اس معاشرے میں قانون کی بالادستی قائم نہ ہو گئی۔ جسٹس افتخار محمد چوہدری کی روایت بھی عدلیہ کا اس وقت تک حصہ رہے گی جب تک اس معاشرے میں قانون کی بالادستی قائم نہیں ہوتی، ورنہ عدلیہ تو رہے گی عوام کی امنگوں، آرزوؤں اور تمناؤں کی ترجمان نہیں رہے گی۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

2014ء

عالم الغیب اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی ذات ہے۔ وہی ہے جو آنے والے زمانوں کے رازوں سے واقف ہے۔ اسی کے علم اور دستِ قدرت میں ہے کہ آنے والا پل کس کے حق میں کیا فیصلہ دے۔ دنیا میں کس کو مقامِ عبرت بنا دیا جائے اور کس کو عزت سے سرفراز کیا جائے۔ وہی جسے چاہتا ہے بادشاہت عطا کرتا ہے اور جس سے چاہتا ہے بادشاہت چھین لیتا ہے، جس کو چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلیل ورسوا کر دے۔ قرآنِ پاک میں جس آیت میں اللہ نے اپنی اس ہیبت کا ذکر کیا ہے، اسی آیت کے آخر میں فرمایا کہ "اُس کے ہاتھ میں خیر ہے"۔ یعنی جب وہ کسی کو بادشاہت عطا کر رہا ہوتا ہے یا چھین رہا ہوتا ہے، کسی کو عزت دے رہا ہوتا ہے یا ذلیل ورسوا کر رہا ہوتا ہے تو ان سب میں مخلوق کی بھلائی چھپی ہوتی ہے۔ جب وہ بستیاں غارت کرنے کا حکم صادر فرماتا ہے تو پوری بنی نوعِ انسان کو ایک ایسی بستی کے لوگوں سے نجات دلاتا ہے جو اجتماعی طور پر قابلِ اصلاح نہیں رہی ہوتی، جس کے باسی اپنے اعمال پر نادم نہیں ہوتے بلکہ اپنی برائیوں پر فخر کرتے ہیں۔ اس طرح وہ آنے والے زمانے کے لوگوں کو خبردار کرتا ہے کہ دیکھو میں نے کس طرح کے لوگوں، کیسی قوموں اور کن اعمال پر بستیوں پر عذاب نازل کیے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے اس علمِ غیب سے امتوں کو خبردار کرنے کے لیے اپنے رسولوں اور پیغمبروں علیہم السلام کو آنے والے زمانوں کی خبر دیتا رہا ہے۔ یہ ان کے کارِ نبوت کے لیے اللہ جل شانہٗ کی جانب سے خاص رہنمائی ہوتی ہے۔ سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چونکہ خاتم النبیین ہیں، آپ پر نبوت کا دروازہ بند ہو چکا اور آپ کے بعد قیامت تک کوئی نبی یا رسول نہیں آئے گا، اسی لیے آپ کو نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہا جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آخری زمانے، یعنی اپنی امت کے بارے میں فرمایا: "دوسری امتوں کے مقابلے میں تم لوگوں کا وقت ایسے ہے جیسے عصر اور مغرب کا درمیانی وقت"۔ (صحیح بخاری) جس کا مطلب یہ ہے کہ غروبِ آفتاب یعنی قیامت کی گھڑی قریب ہے اور اس امت کی عمر انتہائی مختصر ہے۔ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قیامت کے قریب کے زمانے کے بارے میں کھول کھول کر نشانیاں بتائی ہیں۔ یہ تمام نشانیاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ علم سے بیان فرمائیں کہ یہی اس ذاتِ بے ہمتا کا کلیہ اور قانون ہے۔ وہ فرماتا ہے: "وہی غیب کی بات جاننے والا ہے اور کسی پر اپنے غیب کو ظاہر نہیں کرتا، ہاں جس پیغمبر کو وہ پسند فرمائے"۔ (الجن:26)

یوں تو احادیث کی ہر کتاب میں محدثین نے "الفتن" کے نام سے باب ضرور باندھا ہے اور نعیم بن حماد نے تو صرف اسی آخری دور کے بارے میں دو ہزار احادیث جمع کیں اور کتاب کا نام بھی "سنن الوردہ الفتن" رکھا، یعنی فتنوں کا وہ زمانہ جو قربِ قیامت میں ہوگا، جس میں بڑی بڑی جنگیں ہوں گی، یاجوج اور ماجوج پوری انسانیت پر غلبہ حاصل کر لیں گے، سیّدنا امام مہدی خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم کریں گے، دجّال کا خروج ہوگا اور پھر اللہ تبارک وتعالیٰ دجّال سے جنگ کے لیے سیّدنا عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی قدرتِ خاص سے دنیا میں نازل کریں گے۔ ان تمام واقعات میں سے دو واقعات کا اشارہ قرآنِ حکیم میں ملتا ہے... ایک یہودیوں کا یروشلم میں واپس لوٹ آنا اور اس کے ساتھ ہی یاجوج اور ماجوج کا دنیا پر غلبہ حاصل کر لینا۔ باقی تمام کے بارے میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت تفصیل سے بتایا، یہاں تک کہ سیّدنا امام مہدی اور سیّدنا عیسیٰ علیہ السلام کا حلیہ اور نام ونسب تک بتا دیا۔ ان تمام احادیث میں حضرت عیسیٰؑ کا نام عیسیٰ ابن مریم کہہ کر پکارا گیا تاکہ کوئی اس دھوکے میں نہ رہے کہ کوئی اور بھی مسیح ہو سکتا ہے۔ یاجوج اور ماجوج کے کھلنے اور یہودیوں کے یروشلم میں واپس لوٹنے کو ایک ہی وقت باہم منسلک بتایا گیا ہے اور سورہ انبیاء میں اسے واضح کیا گیا تاکہ علم ہو جائے کہ جیسے ہی یہ واقعات ہوں تو سمجھ لو کہ دورِ فتن یعنی آخری زمانے کا آغاز ہو رہا ہے اور یہ آغاز اب سے تقریباً پانچ دہائیاں پہلے ہو چکا ہے جب یہودی یروشلم میں واپس لوٹنا شروع ہوئے۔ اس دور میں جو ہونے والا ہے اس کا اجمالی خاکہ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتا دیا لیکن اس امت کی لمحہ بہ لمحہ رہنمائی بھی تو ضروری تھی، خاتم النبیین ﷺ کے بعد اب یہ رہنمائی کیسے ملتی، لیکن اللہ اپنے بندوں کے لیے اپنے علمِ خاص سے رہنمائی کا راستہ کھلا رکھتا ہے۔ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "میرے بعد نبوت میں سے مبشرات کے علاوہ کچھ بھی باقی نہیں بچا"۔ آپ سے پوچھا گیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبشرات کیا ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اچھے (سچے) خواب جو انسان دیکھتا ہے یا اسے دکھائے جاتے ہیں"۔ (صحیح بخاری)۔ ان خوابوں یعنی جو دیکھے یا دکھائے جاتے ہیں، ان کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک اور بات واضح کر دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جب قیامت کا زمانہ قریب ہوگا تو مسلمانوں کے خوابوں کو بہت کم جھٹلایا جائے گا اور تم میں سب سے زیادہ سچے خواب دیکھنے والا سچی بات کرنے والا ہوگا اور مسلمان کا خواب نبوت کا پینتالیسواں حصہ ہے"۔ (ترمذی) یہ وہ زمانہ ہوگا جس کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہ جھوٹ اور مکروفریب کا دور ہوگا۔ فرمایا "دجال کے خروج سے پہلے چند سال دھوکے اور فریب کے ہوں گے، سچے کو جھوٹا اور جھوٹے کو سچا بنایا جائے گا، خیانت کرنے والے کو امانت دار بنا دیا جائے گا اور امانت دار کو خیانت کرنے والا قرار دیا جائے گا"۔ (مسند احمد)۔ ایسے دور میں سچے لوگوں کا دم کتنا غنیمت ہوتا ہے اور ان کا ساتھ کتنی بڑی نعمت! اسی لیے تو اللہ نے فرمایا کہ "سچوں کے ساتھ ہو جاؤ"۔ یہی لوگ ہیں جو آج کے اس دورِ فتن میں مشعل کی طرح رہنمائی فرماتے ہیں۔ یہ اہلِ نظر بھی ہیں اور صاحبانِ بصیرت بھی۔ ان میں کتنے ایسے ہیں جو دعائے نیم شب میں اس امت کے لیے اللہ کے غیظ وغضب سے پناہ مانگتے ہوئے ہچکیوں سے روتے ہیں اور خوف سے تھرتھراتے ہیں۔ لوگ سوال کرتے ہیں کہ ایسے لوگ کون ہیں، کہاں ہیں، ان کی پہچان کیا ہے؟ کس قدر آسان ہے ان کی شناخت، وہ دور جس میں دھوکہ اور فریب عام ہو، اس میں رزقِ حلال کھانے والے، ہمیشہ سچ بولنے والے اور مصلحت سے پاک حق گوہی تو وہ لوگ ہیں جن پر اللہ اپنے علم کے دروازے کھولتا ہے۔

گزشتہ پچیس برسوں سے میں ایسے لوگوں کی تلاش میں سرگرداں رہا ہوں۔ جس دفتر، گلی، محلے، علاقے اور بستی میں کسی ایسے فرد کا علم ہوا جس کی سچائی کا چرچا تھا، جو حق گوئی پر لوگوں کے عتاب کا شکار تھا، جس کی زندگی رزقِ حلال اور سیّد الانبیاء ﷺ کی اتباع میں گزر رہی تھی، نرم خو، امت کا درد رکھنے والا تو اس کے قرب میں چند لمحے ملنے کو سعادت سمجھتا تھا۔ ان پچیس برسوں میں میرے ملک پاکستان کی حالت ابتر سے ابتر ہوتی رہی، یہ لوگ پچیس سال اللہ کی ناراضگی سے ڈراتے رہے، اللہ سے استغفار کا کہتے رہے، لوگوں کو اللہ کی جانب رجوع کی دعوت دیتے رہے، اپنے خوابوں کا ذکر کرتے تو خوف سے کانپ اٹھتے، پھر ایک دم چونک کر کہتے: اگر لوگوں نے ٹھیک ہونے کا فیصلہ نہ کیا تو پھر اللہ نے اس سرزمین سے جھاڑ جھنکار کو صاف تو کرنا ہے، یہ بشارتوں کی سرزمین ہے۔ دورِ فتن میں اللہ کے بندوں کی لشکرگاہ ہے۔ حالات خراب ہوتے رہے، میرے جیسے صبر سے عاری لوگ پکارتے: "کب ہوگا؟" وہ تسلیاں دیتے اور کہتے دعا کرو کہ ہم لوگ خود ہی ٹھیک ہو جائیں ورنہ اللہ نے اگر ہمیں ٹھیک کرنا شروع کر دیا تو پھر بہت نقصان ہو جائے گا۔ میرے جیسے بے صبر لوگ پھر بھی کہتے کہ "ہونے دیں" یہ لوگ فرماتے: ایسا مت سوچو، آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے تو بہتر ہے۔ لیکن کبھی کبھی ہمارے جیسے ضدّی لوگوں کی ضد سے تنگ آ کر یا پھر حالات کی زبوں حالی سے پریشان ہو کر بے خودی میں ان کے منہ سے 2014ء کے سال کا ذکر نکلتا۔ پھر کہتے، سب اللہ کو معلوم ہے لیکن اس سال میں کچھ ایسا ضرور ہو سکتا ہے کہ سب کچھ بدل جائے، سب صحیح ہو جائے، سارا علم اللہ کے پاس ہے۔ لیکن گزشتہ چھ ماہ سے جس طرح یہ سچے لوگ سچے خواب دیکھ رہے ہیں، وہ تو بتاتے ہیں کہ اب اس ملک سے کھلواڑ کے دن ختم ہونے والے ہیں، بہت ہو چکا، اب بس!!

allurdupdfnovels.blogspot.com

آئین کی مقدس کتاب

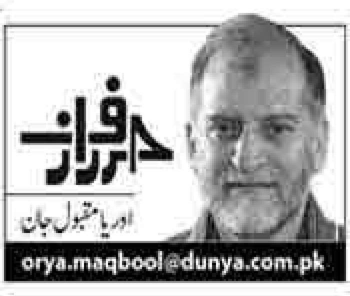

orya.maqbool@dunya.com.pk

آئین کی بالادستی ایک ایسا نعرہ ہے جسے جدید ریاست کی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ پوری دنیا کے عوام کے دلوں میں یہ تصور مضبوط کر دیا گیا ہے کہ کوئی ریاست آئین کے بغیر چل ہی نہیں سکتی۔ یہ ایک ایسی دستاویز ہے جو مقدس ترین ہے، اس سے انکار بغاوت ہے اور باغی کی سزا موت ہے۔ اپنے اس نظریے کو ثابت کرنے کے لیے سیاست کے طالب علموں کو اس وقت ایک عجیب و غریب دلیل دی جاتی ہے جب وہ یہ سوال کرتے ہیں کہ دنیا کی قدیم ترین جمہوری ریاست برطانیہ کا تو سرے سے کوئی آئین ہی نہیں ہے۔ اس کے جواب کے لیے ان آئینی ماہرین نے ایک کمال کی اصطلاح ایجاد کی ہے...غیر تحریری آئین (Unwritten Constitution) اس اصطلاح کے فریب کی داد دینی چاہیے۔ کہا جاتا ہے کہ برطانیہ کی روایات ایک آئین کا درجہ رکھتی ہیں' اس لیے وہاں تحریری آئین کی کوئی ضرورت نہیں، ان کے عوام اپنی روایات کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ ایک عالمی طاقت اور صرف سو سال پہلے تک ایک ایسی سلطنت' جس میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا، اپنے لیے پانچ چھ سو آرٹیکلز پر مبنی ایک آئین تحریر کیوں نہیں کرتی؟ اس کے جواب میں اس کی جمہوری تاریخ اور قانون کی حکمرانی کی تاریخ بیان کر دی جاتی ہے۔ وہی تاریخ جس میں جیمز اوّل بھی ہے جو نہ انسانی حقوق کو مانتا تھا اور نہ ہی اظہار رائے کی آزادی کو، چارلس اوّل بھی ہے جو 25 سال کی عمر میں بادشاہ بنا' جس کے ہاتھوں پارلیمنٹ ایک کھلونا بنی رہی اور بالآخر 30 جنوری 1649ء کو عوام کے ہجوم نے اسے ایک بڑے چھرے' جسے گیلوٹین کہتے ہیں' کے نیچے رکھ کر ذبح کر دیا۔ انہی روایات میں صنعتی انقلاب کے دوران بدترین چائلڈ لیبر کی تاریخ ہے، لیکن کیا کریں آئین کی بالادستی اور آئین کو مقدس دستاویز کا درجہ دینے والوں کی منطق ہی نرالی ہے۔ جدید سیکولر ریاست کے لوازمات میں آئین اوّلین شرط اور اس کی روح ہے۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ اس عالمی معیار کے حوالے سے اسرائیلی ریاست نے ایک فقرہ تحریر کر کے دنیا کو حیرت میں ڈال رکھا ہے۔ اسرائیل کے آئین کی کتاب صرف ایک لائن پر مشتمل ہے: ''اسرائیل کا آئین تورات ہے''۔ کاش پاکستان کا آئین تحریر کرتے ہوئے بھی اسی غیرتِ ایمانی کا اظہار کیا جاتا اور صرف ایک لائن تحریر کر دی جاتی کہ ''پاکستان کا آئین قرآن ہے اور سنت رسولؐ اس کی عملی تشریح ہے''۔ اس کے باوجود پاکستان کا آئین جو حدود و قیود متعین کرتا ہے اور حکومت اور پارلیمینٹ کو جو ذمہ داریاں تفویض کرتا ہے اس کے مطابق کوئی ایک قدم بھی قرآن و سنت کے خلاف نہیں اٹھایا جا سکتا۔

اب دنیا کا یہی دستور ہے کہ آئین کو ایک مقدس دستاویز مان لیا جائے اور اس تصور کو اقوام عالم میں راسخ کر دیا گیا ہے۔ یہاں پہلا سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا ایک ایسی تحریر جو ان تمام خصوصیات کی حامل ہو جس میں انسانی حقوق، قانون کی بالادستی، عدل و انصاف، معاشی، معاشرتی اور سیاسی مساوات جیسے سب اصول درج ہوں اسے ایک خوبصورت انداز میں شائع کر دیا جائے؟ اور کیا اس کی جلدیں ملک کے ہر دفتر میں موجود ہوں اور اسے ہر موقع پر رہنما کے طور پر پیش کیا جائے، اس پر فخر کیا جائے کہ ہم نے ایک اسلامی، جمہوری اور ترقی یافتہ آئین مرتب کر لیا ہے؟ تو کیا یہ سب کسی بھی ملک کے رہنے والوں کے لیے کافی ہے؟ کیا صرف آئین میں تحریر کرنے سے لوگوں کی زندگیاں بدل جاتی ہیں، ان کی معاشی ناہمواری ختم ہو جاتی ہے، انہیں عزت نفس میسر آ جاتی ہے، انہیں ہر طاقتور کے مقابلے میں انصاف مل جاتا ہے، ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ ہو جاتا ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو آئین مرتب کر کے اسے برکت کے لیے ہر اونچے مقام پر خوبصورت غلاف میں لپیٹ کر رکھ دیا جاتا اور کہا جاتا کہ ہم نے آئین میں یہ طے کر دیا ہے کہ اس ملک میں امن، انصاف اور خوشحالی ہو گی، اس لیے اب ان سب چیزوں کا مطالبہ کرنا فضول ہے، خاموشی سے بیٹھے رہو۔

یہ ہے وہ المیہ جس سے میرا ملک اس دن سے دوچار ہے جس دن سے 1973ء کا آئین اسمبلی نے متفقہ طور پر منظور کیا۔ جب کبھی کوئی شخص، تنظیم یا تحریک یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اس ملک میں شرعی قوانین نافذ کرو یا عرفِ عام میں کہا جاتا ہے کہ شریعت نافذ کرو تو بڑے بڑے دانشور اور ''عقلمند'' سیاست دان ایک دم پکار اٹھتے ہیں کہ شریعت تو نافذ ہے، آئین میں درج ہے۔ دوسرا ''شاندار'' مشورہ یہ دیا جاتا ہے کہ اگر شریعت کے نفاذ کا اتنا ہی شوق ہے تو اس کے لیے ایک طریق کار ہے، جاؤ الیکشن لڑو، جیت کر اسمبلی میں آؤ اور شریعت نافذ کروا لو۔ یہ کیسی ''جمہوری'' دلیل ہے؟

حضور! پاکستان کے بیس کروڑ عوام نے جو اسمبلی منتخب کی ہوتی ہے وہ اسی لیے کی ہوتی ہے کہ آئین کو مکمل طور پر ملک میں نافذ کرے۔ اس کے ممبران کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی ایک شق پر عمل کریں اور دوسری کو چھوڑ دیں۔ ان ممبران کو اس قوم نے آئین کی بالادستی اور اس کے نفاذ کے لیے ووٹ دیے ہوتے ہیں، جب وہ ایسا نہیں کر پاتے تو پھر لوگ سراپا احتجاج بنتے ہیں۔ آئین میں اعلیٰ عدالت کے ججوں کی تقرری کا ایک طریق کار درج ہے۔ اس کے مطابق پہلے مشرف اور پھر آصف علی زرداری کی حکومتوں نے چیف جسٹس اور دیگر جج مقرر کیے، لیکن عوام یہ سمجھتے تھے کہ یہ آئین کی روح کے ساتھ ایک مذاق ہے؛ چنانچہ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ پورے ملک میں صرف ایک لاکھ وکیل ہیں، کیا کسی نے ان سے کہا کہ آئین کی حکمرانی چاہتے ہو تو جاؤ الیکشن لڑو، اسمبلیوں میں آؤ اور اپنی مرضی سے آئین کو نافذ کرو؟ کیا یہ ایک لاکھ وکیل پورے ملک کی نمائندگی کرتے تھے؟ ہاں کرتے تھے، اس لیے کہ اس ملک کے عوام کی رائے سے جو آئین بنا تھا، وہ اس کے نفاذ کی بات کرتے تھے۔ اس ملک میں یہ جنگ، یہ فساد، یہ خانہ جنگی اور بار بار لوگوں کا سڑکوں پر نکلنا صرف ایک ہی وجہ سے ہے کہ ہم نے لوگوں کے ہاتھوں میں ایک خوبصورت دستاویز آئین کے نام سے تھما دی ہے اور پھر اس کو اسمبلی کی الماریوں میں سجا کر بھول گئے ہیں کہ اسے نافذ بھی کرنا ہے۔ اسی لیے خواہ 1977ء میں ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف تحریک چلے یا پھر کسی ایسے قانون کے خلاف جو شریعت سے متصادم ہو تو نعرہ ایک ہی بلند ہوتا ہے کہ شرعی قوانین نافذ کرو، شریعت نافذ کرو۔ کیا آئین میں یہ درج نہیں کہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ سود ختم کرے، لوگوں کو اسلامی طرز زندگی اپنانے کے لیے سہولیات فراہم کرے، قرآن کی تعلیم کے لیے عربی زبان سکھانے کا بندوبست کرے، فحاشی و عریانی اور فحش ادب کا خاتمہ کرے، تمام قوانین کو اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالنے کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات پر عمل درآمد کرے؟ ہماری منافقت کا عالم یہ ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل' جس میں تمام مسلکوں کے علماء شامل ہیں' نے اپنی تمام سفارشات مدتوں سے مکمل کر رکھی ہیں، لیکن آج تک یہ سفارشات اسمبلی میں پیش نہیں ہوئیں۔ حکومت جس نے سود کا خاتمہ کرنا ہے وہ سپریم کورٹ کے فیصلے کے خلاف سود کے حق میں نظر ثانی کے لیے جاتی ہے۔ فحاشی و عریانی کو میڈیا کی آزادی کے نام پر قبول کیا جاتا ہے۔ یہ ہے ہماری منافقت اور یہی ہے اس ملک میں فساد کی اصل وجہ۔ آپ لوگوں کی امنگوں کے مطابق ایک دستاویز ترتیب دیتے ہیں، اسے مقدس ترین کتاب کا درجہ بھی دیتے ہیں لیکن ہر دوسرے دن اپنے عمل سے اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔

چمن میں اپنی تعیناتی کے دوران میرے سامنے ایک کیس پیش ہوا، ایک شخص کی زمین پر کسی طاقتور نے قبضہ کر لیا تھا، وہ روز تھانیدار کے پاس جاتا کہ اس طاقتور سے اس کی زمین کا قبضہ چھڑائے۔ تھانیدار کہتا، بابا یہ ایک دیوانی مقدمہ ہے، جاؤ کسی دیوانی عدالت میں دعویٰ دائر کرو۔ کئی مہینے معاملہ ایسے ہی چلتا رہا۔ ایک دن اس شخص نے اس طاقتور کو قتل کر دیا اور تھانیدار سے جا کر کہا اب مقدمہ فوجداری ہو گیا ہے، اب کارروائی کرو۔ ہم بھی حالات کے فوجداری ہونے کا انتظار کرتے رہتے ہیں اور جب ایسا ہو جاتا ہے تو چیختے ہیں کہ طاقت سے اپنی بات منواتے ہو؟ یہ کوئی جمہوری طریقہ ہے؟ آئین میں سب کچھ درج ہے۔ کل کوئی ایسا ہی کرنے کو کہے گا!!

allurdupdfnovels.blogspot.com

آئین کو مقدس کیوں کہا جاتا ہے

حرف راز
اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

موجودہ علم سیاسیات یعنی پولیٹیکل سائنس نے گزشتہ سو سال سے انسانوں کے ذہنوں میں یہ تصور راسخ کر دیا ہے کہ جدید سیکولر جمہوری ریاست آئین کے بغیر چل ہی نہیں سکتی۔ اس طرح کی ایک مقدس کتاب اور ایک مقدس عہد نامے کی تخلیق کے دو مقاصد تھے۔ پہلا یہ کہ صدیوں سے انسان مذہب کی الہامی کتابوں کو مقدس ترین سمجھتا اور انہیں اعلیٰ اور ارفع مقام دیتا آیا ہے، اس لیے ایک کتاب کے مقابلے میں جب تک کتاب تخلیق نہ کی جائے اور اسے مقدس ترین قرار نہ دیا جائے، ان الہامی کتابوں کے مقام اور مرتبے کی نفی نہیں ہوتی۔ اس میثاق کی روح یہ ہے کہ اگر آئین یا اس کے بنانے والے مانیں گے تو قرآن یا تورات سپریم لاء قرار پائیں گے لیکن اگر پارلیمانی اکثریت اس کا انکار کر دے تو اس کی حیثیت ثانوی بھی نہیں رہتی۔ دوسرا یہ کہ اسے ایک عہد نامے کا درجہ دیا گیا ہے اور انسانوں کے انسانوں کے ساتھ عہد کو اللہ اور انسانوں کے ساتھ عہد پر مقدم تصور کیا جاتا ہے جبکہ اللہ قرآن پاک میں بندوں کے ساتھ اپنے کیے ہوئے عہد کو سب سے مقدم، اہم اور مقدس بیان فرماتا ہے اور انسان کی اس دنیا میں آمد بھی اسی عہد کی پاسداری کے لیے ہے۔ یہ وہ عہد ہے جو اللہ نے تمام ارواح سے عالمِ بالا میں لیا تھا۔ اللہ اس میثاق اور اس عہد کو ناقابلِ تنسیخ سمجھتا ہے اور آخرت میں جزا اور سزا کا انحصار اسی عہد کی پاسداری پر رکھا گیا ہے جبکہ اسمبلی کا بنایا گیا آئین اللہ کے ساتھ کیے گئے اس عہد کی توثیق یا تنسیخ کا اختیار رکھتا ہے۔ اسی لیے موجودہ علم سیاسیات نے آسمانی کتابوں کے مقابلے میں ہر ملک کے لیے "آئین" کی شکل میں ایک مقدس کتاب ترتیب دینا لازمی قرار دیا۔ اسی لیے موجودہ تعلیم کے پروردہ اس وقت ایک حیرت میں گم ہو جاتے ہیں جب ان سے کہا جاتا ہے کہ دنیا میں کچھ ممالک آئین کی ایک تحریر شدہ "مقدس کتاب" کے بغیر بھی چل سکتے ہیں، چلتے ہیں اور چل رہے ہیں۔ وہ اس اٹل حقیقت پر یقین کرنے کو تیار ہی نہیں کہ ان کا محبوب ترین ملک اسرائیل ابھی تک ایک تحریری آئین سے محروم ہے۔ صیہونیت کے عالمی ایجنڈے اور مغرب کی مشترکہ سازشوں سے بننے والے اس ملک نے آج تک دنیا کے تمام آئین پرست لوگوں کو حیرت میں ڈال رکھا ہے۔ اس موضوع پر آخری تقریر 7 مئی 2012ء کو اسرائیلی پارلیمنٹ کینسٹ (Kenesset) میں ان کے وزیر انصاف یعقوب نیمان (Yaacov Nemen) نے کی اور کہا کہ اسرائیل کو ایک تحریری آئین کی شدید ضرورت ہے۔ اس نے کہا کہ اسرائیل کی حکومت میں بل اور قانون کے درمیان فرق کرنا مشکل ہے اور اسرائیل میں سرکاری قانون سازی کا بھی کوئی طریق کار موجود نہیں۔ 25 جنوری 1949ء کو اسرائیل کی پہلی آئین ساز اسمبلی منتخب ہوئی۔ اس سے قبل جب 14 مئی 1948ء کو برطانوی افواج کا آخری دستہ حیفہ کے رستے روانہ ہوا تو اسی دن تل ابیب میں منعقدہ ایک تقریب میں بن گوریان نے اسرائیل کا اعلان آزادی پڑھ کر سنایا۔ اس کے ساتھ یہودی نیشنل کونسل' جو 1920ء میں یورپ میں ربائی ابراہیم اسحٰق کی سربراہی میں قائم ہوئی تھی' کا اجلاس ہوا اور اس میں اسرائیل کے قیام کا سات نکاتی اعلان آزادی منظور کیا گیا۔ یہ اعلان پوری دنیا میں بسنے والے یہودیوں کو ایک قوم یا ملت سمجھتا ہے اور ان کی مقدس سرزمین میں واپسی کے حق کو تسلیم کرتا ہے۔ یہودی قوم کو تمام عالمی طاقتوں سے سیاسی اور معاشی آزادی اور خودمختاری کا اعلان کرتا ہے۔ اس اعلان میں جمہوریت نام کی چڑیا کا کوئی ذکر نہیں بلکہ کہا گیا ہے کہ ہم اُس آزادی، انصاف اور امن کے خواہاں ہیں جس کا طریقہ ہمارے پیغمبروں نے ہمیں سکھایا۔ اس اعلان آزادی کے بعد اسرائیلی پارلیمنٹ میں دو فقرے بار بار گونجے... ایک توراتی جمہوریت (Torah Democracy) اور دوسرا "ہمارا آئین تورات ہے" اسی لیے جب پہلی آئین ساز اسمبلی میں آئین بنانے کے لیے بحث کا آغاز ہوا تو ایک متفقہ شور اٹھا کہ ہم کوئی ایسی کتاب، دستور یا آئین نہیں بنا سکتے جو حیثیت میں بلکہ تھوڑی سی بھی حیثیت میں ہماری مقدس کتابوں تالمود (Talmud)، تناخ (Tanakh) اور شلخان آرخ (Shulkan Arakh) سے بالاتر تصور کی جائے۔ ہماری مقدس کتابیں بالاتر ہیں اس لیے ہم کوئی ایسی کتاب' جسے آئین کہتے ہیں' تحریر نہیں کریں گے اور آج 66 سال گزرنے کے باوجود اسرائیل نے ایک آئین مرتب نہیں کیا۔ البتہ اپنے اداروں کو چلانے کے لیے قوانین ضرور بنائے جنہیں وہ Basic Laws کہتے ہیں اور میرے وہ دوست' جن کی عقل موجودہ سیکولر جمہوریت کی حدود سے باہر نہیں دیکھ پاتی' ان قوانین کو آئین کا متبادل ہی نہیں بلکہ آئین کہتے ہیں، حالانکہ یہ تابع قانون سازی (Subordinate legislation) ہے جبکہ ان تمام قوانین کی منظوری کے طریق کار کا عالم یہ ہے کہ اسرائیل کی اسمبلی میں قانون پاس کرنے کے لیے کورم کی کوئی شرط نہیں ہے۔ حد یہ ہے کہ ان کا سب سے اہم قانون Human dignity and freedom (انسانی وقار اور آزادی) 1992ء میں اسمبلی میں موجود ایک مختصر سی اقلیت نے پاس کیا۔ دنیا بھر کی جمہوریت پسند اور سیکولر جمہوری ریاستوں کو دھوکا دینے کے لیے مئی 2003ء میں اسرائیلی پارلیمنٹ کی قانون اور انصاف کمیٹی نے' جس کی صدارت مائیکل ایتان (Micheitan Eitan) کر رہا تھا' ایک پروجیکٹ کا آغاز کیا جو آئین بنائے گا اور یہ آئین اسمبلی کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ گیارہ سال گزرنے کے بعد اس کمیٹی کا مرتب کردہ کوئی مسودہ اسرائیل کی پارلیمنٹ میں پیش نہیں ہو سکا۔ وہ بنیادی قوانین' جنہیں یہ لوگ آئین تصور کر بیٹھے ہیں' اساسی نوعیت کے نہیں بلکہ کارروائی یعنی Procedure کے قوانین ہیں۔ پہلا بنیادی قانون آزادی کے دس سال بعد 1958ء میں مرتب کیے گئے اسمبلی کے رولز ہیں۔ دوسرا 1960ء میں اسرائیلی قوانین اور زمین کے بارے میں، تیسرا 1964ء میں صدر کے عہدے کے متعلق، چوتھا 1968ء میں حکومت، پانچواں 1975ء میں معیشت، چھٹا 1979ء میں فوج کے متعلق اور ساتواں 1980ء میں یہ بنیادی قانون پاس ہوا کہ یروشلم اسرائیل کا دارالحکومت ہوگا۔ ان تمام قوانین کا تعلق روزمرہ کے معمولات سے ہے۔ ایسے قوانین عموماً اسمبلیاں منظور کرتی رہتی ہیں جنہیں آئین کا نعم البدل نہیں کہا جا سکتا۔ ان کی پارلیمنٹ میں کوئی عالمی معاہدہ پیش نہیں ہوتا، کہیں ریفرنڈم یا دو تہائی اکثریت کا کوئی تصور نہیں، اس لیے کہ اسرائیل نے اپنے قیام سے لے کر آج تک یہ سوچا تک نہیں کہ ان کی مقدس کتابوں میں دیے گئے اصول کسی اسمبلی میں زیر بحث لائے جا سکتے ہیں۔

یہاں اسرائیل کی مثال اس لیے پیش کی ہے کہ یہ ریاست پوری مغربی دنیا نے مذہب، ایک یہودی ملت اور ایک قوم کے طور پر زبردستی دنیا میں پھیلے ہوئے یہودیوں کو ایک خطۂ زمین دے کر بنائی جبکہ پاکستان کا تو معاملہ اس سے بالاتر ہے۔ ہمارے آباؤاجداد نے اپنے پنجابی، سندھی، پشتون اور بلوچ ہونے سے انکار کیا اور مسلمان ہونے کی بنیاد پر اپنے نسلی بھائیوں سے علیحدگی کا اعلان کر کے مذہب کے نام پر ملک یا ریاست تخلیق کی۔ مثالیں بہت ہیں کہ برطانیہ اور آئرلینڈ کی روایات بہت مستحکم ہیں اور انہیں کسی تحریری آئین کی ضرورت نہیں ہے، کس قدر شرم کی بات ہے کہ برطانیہ اپنی روایات کا احترام اس قدر کرتا ہے کہ وہ اس سے بالاتر کسی آئین کی مقدس کتاب تحریر کرنے کا تصور نہیں کرتا، اسرائیل یہودیت کی کتب کو اساسی قانون کے طور پر لیتا ہے، لیکن یہ لوگ اسلام کو صرف ایک سو سال سے عالمی دستوری پابندی کے پیمانے میں کھینچ کر لانا چاہتے ہیں۔

آئین کو کس قدر محنت سے مقدس بنایا جاتا ہے؟ غور کریں، دنیا کے تمام آئینوں کی تشریحات پر ہزاروں کتابیں ایسے لکھی گئی ہیں جیسے قرآن کی تفاسیر ہوتی ہیں۔ آئین کی شقوں کو سمجھنے کے لیے باقاعدہ ایک سائنس بنائی گئی جسے آئینی قانون (Constitutional Law) کہتے ہیں بالکل ویسے ہی جیسے ہمارے ہاں فقہ ہوتی ہے۔ آئین کی تعلیم کو دنیا بھر میں عام کیا گیا اور عالمی سطح کے آئینی ماہرین کی ایک فوج ظفر موج تیار کی گئی۔ دنیا کا کون سا آئین ہے جس کی ایک سے زیادہ تشریحات اور تفسیریں نہ ہوں، ان پر اختلاف نہ ہو، لیکن سب کے سب نافذ ہیں۔ کوئی سوال نہیں کرتا کہ کون سی تشریح نافذ کریں، لیکن جیسے ہی قرآن و سنت کی بات آتی ہے تو کوئی ان کے آئینی ماہرین کا تذکرہ نہیں کرتا جنہیں مفسرین کہتے ہیں، نہ اس کو سمجھنے کی سائنس کی بات ہوتی ہے جسے فقہ کہتے ہیں اور نہ ہی اس کو اساسی آئین بنا لینے کی بات کی جاتی ہے۔ ہمیشہ اختلافِ امت کا بہانہ گھڑا جاتا ہے اور اس مملکتِ خداداد پاکستان میں یہ سب کہا جاتا ہے جس کے تمام فرقوں... شیعہ، سنی، بریلوی، دیوبندی، اہل حدیث و دیگر نے مل کر 22 نکات اربابِ اقتدار کے سامنے پیش کیے تھے کہ ان کو نافذ کر دو، ہمیں کوئی اختلاف نہیں۔ کیا آج تک ان 22 نکات کے مطابق عمل درآمد ہوا؟ کیسے ہو سکتا ہے... ہم غیر مہذب، فرسودہ اور دقیانوس کیسے کہلا سکتے ہیں۔ ہمیں موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق زندہ رہنا ہے اور کسی قوم کے زندہ رہنے کے لیے امن، انصاف، عزت و وقار، رزق، خوشحالی، مساوات اور بنیادی سہولیات نہیں بلکہ "مقدس ترین" کتاب آئین ضروری ہے۔ ایک ایسی دستاویز جسے کارپوریٹ سرمائے، قبائلی تعصب، علاقائی غنڈہ گردی اور حکومتی سرپرستی میں منتخب ہونے والے اراکین اسمبلی جب اور جس وقت چاہیں بدل دیں یا کوئی آمر اسے معطل کر دے۔ یہ ہے اس مقدس کتاب کی اساس۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

عندلیب باغِ حجاز

اس امت کی آخری اجتماعی علامت خلافت عثمانیہ ختم ہو رہی تھی۔ امت رنگ، نسل، زبان اور علاقے کی بنیاد پر تقسیم کی جا رہی تھی۔ ایسے میں مسلمانانِ ہند وہ خوش قسمت قوم ہے جسے اللہ نے اقبال عطا کیا۔ ملت اسلامیہ کی گزشتہ ایک ہزار سال کی تاریخ میں اس سے توانا آواز نہیں گونجی۔ یہ توانا آواز کیوں ضروری تھی؟ اس لیے کہ اہل نظر جانتے تھے کہ اللہ کے آخری کلام قرآنِ حکیم کے مطابق یہ وہ زمانہ تھا جب یاجوج اور ماجوج کے لشکروں کو کھول دینے کا اذن ہو گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ سورۃ الانبیاء میں فرماتے ہیں: ''اور طے ہو چکا ہے، اس بستی کے لیے جسے ہلاک کر دیا ہم نے کہ وہ نہیں پلٹ سکیں گے، یہاں تک کہ جب کھول دیے جائیں گے یاجوج اور ماجوج اور وہ ہر بلندی سے نکل پڑیں گے'' (الانبیاء:96,95)۔ یروشلم کی جس بستی کی ہلاکت کا اس آیت میں تذکرہ ہے، اس میں بنی اسرائیل کی واپسی جنگِ عظیم اوّل کے بعد شروع ہوئی اور دجالی نظام کے ہرکاب یاجوج اور ماجوج اس دنیا پر اپنا نظام مسلط کرنے لگے۔ سیّدالانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حدیث کے مصداق سب سے پہلی کڑی جو ٹوٹے گی وہ خلافت ہوگی، یعنی مسلمانوں کی مرکزیت کا خاتمہ ہوگا (مفہوم)۔ اسی دور میں خلافت عثمانیہ ٹوٹی۔ اسی زمانے میں دجال کے اہم ترین ہتھیار ربا یعنی سود نے ایک منظم بینکاری کے نظام کی شکل اختیار کی۔ سیکولر قومی جمہوری ریاست کا تصور مضبوط ہوا اور اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ کی جگہ ریاست کو اقتدارِ اعلیٰ کا درجہ حاصل ہو گیا۔ یہ سب اس خوبصورت طریقے سے ہو رہا تھا کہ کسی کو اندازہ تک نہ ہوا کہ اس کے بعد آنے والے دنوں میں ملتِ اسلامیہ، اسلامی نظام حکومت، سود کے بغیر معیشت اور قوانین اسلامی کے نفاذ کی بات کرنا ایسے ہو جائے گا جیسے کوئی احمقوں کی بستی میں رہتا ہو۔ جن تصورات پر امت تیرہ سو سال چلتی رہی انہی کو ناقابلِ عمل اور حقیقت سے دور قرار دے دیا جائے گا۔ یہی وہ وقت تھا جب اس امت کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اقبال جیسا تحفہ عطا کیا۔ سیّدالانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مکتب فیض سے عشقِ رسولؐ میں ڈوبا ہوا یہ مردِ قلندر امت کے لیے بشارتیں بھی دیتا رہا اور آنے والے وقت کے خطرات سے ڈراتا بھی رہا۔ یہ بلبلِ شیریں سخن، یہ فلسفی بے مثال اور شاعرِ رنگین نوا کس دروازے کا گدا اور کس باغ کی بلبل تھا! اقبال نے اپنی شاعری کے آغاز ہی میں یہ معاملہ واضح کر دیا تھا۔ ان کی نظم ''حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں'' میں ایک خواب کا ذکر ہے جس میں اقبال نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حضور اپنی ایک حاضری کا ذکر یوں کیا ہے:

گراں جو مجھ پہ یہ ہنگامۂ زمانہ ہوا
جہاں سے باندھ کے رختِ سفر روانہ ہوا
قیودِ شام و سحر میں بسر تو کی لیکن
نظامِ کہنۂ عالم سے آشنا نہ ہوا
فرشتے بزمِ رسالتؐ میں لے گئے مجھ کو
حضورِ آیۂ رحمت میں لے گئے مجھے کو
کہا حضورؐ نے اے عندلیبِ باغِ حجاز
کلی کلی ہے تری گرمیٔ نوا سے گداز

اس محفل میں اقبال کو سیّدالانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جس لقب سے پکارا وہ تھا ''عندلیبِ باغِ حجاز'' یعنی ''حجاز کے باغ کی بلبل''۔ اقبال کا پورا کلام حجاز کی خوشبوؤں سے معطر ہے۔ ''نغمہ ہندی ہے مگر لے تو حجازی ہے مری'' یہ نظم اقبال کی ابتدائی نظموں میں سے ایک ہے، یہی وجہ ہے کہ اقبال اس دور میں جب ہندوستان کے گیت بھی لکھتے ہیں تو اس زمین سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی محبت کا تذکرہ یوں کرتے ہیں: ''میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے''۔ یا پھر یہ شعر:

سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا
اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا

اقبال کی زندگی کے آغاز اور آخر، دونوں سروں پر دو نظمیں یا دو کلام ہیں... ایک جس کا تذکرہ اوپر کیا گیا جس کا عنوان ''حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں'' ہے جو بانگ درا کی ابتدائی نظموں میں سے ایک ہے۔ دوسرے کلام کا نام بھی حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ یہ فارسی کے قطعات ہیں اور یہ ارمغانِ حجاز میں ہیں جو علامہ اقبال کے انتقال کے بعد شائع ہوئی۔ یہ قطعات اس وقت لکھے گئے جب اس عندلیب باغِ حجاز نے حجاز جانے کا قصد کیا اور اپنے آقا و مولا سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حضور حاضری کے لیے تیاری شروع کی۔ اقبال کی یہ دیرینہ خواہش تھی۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں ''عندلیبِ باغِ حجاز'' کے سینے میں جو تڑپ تھی وہ شدید ہو گئی تھی۔ لندن کی دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے روانہ ہوئے تو 20 اگست 1931ء کو پورٹ سعید پہنچے۔ عدن کی بندرگاہ پر کھڑے ہو کر ساحلِ عرب کو حسرت سے تکتے ہوئے اقبال اپنی کیفیت کو ایک خط میں یوں بیان کرتے ہیں:

''اے عرب کی مقدس سرزمین، تجھ کو مبارک ہو۔ تو ایک پتھر تھی جس کو دنیا کے معماروں نے رد کر دیا تھا مگر ایک یتیم بچے نے خدا جانے تجھ پر کیا جادو کیا کہ موجودہ دنیا کی تہذیب و تمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی... تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدس نقشِ قدم دیکھے ہیں۔ کاش میرے بدکردار جسم کی خاک تیرے ریت کے ذروں میں مل کر تیرے بیابانوں میں اڑتی پھرے اور یہی آوارگی میری زندگی کے تاریک دنوں کا کفارہ ہو۔ کاش میں تیرے صحراؤں میں لٹ جاؤں اور دنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہو کر تیری تیز دھوپ میں جلتا ہوا اور پاؤں کے آبلوں کی پروا نہ کرتا ہوا اس پاک سرزمین میں جا سکوں جس کی گلیوں میں اذانِ بلالؓ کی عاشقانہ آواز گونجتی تھی''۔

گول میز کانفرنس سے واپسی پر حرم کے سفر کی تیاری شروع کی تو سوچا، جب کسی کے گھر جاتے ہیں تو کوئی تحفہ لے کر جاتے ہیں، میرے دامن میں تو کچھ بھی نہیں۔ اسی کیفیت میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سامنے نذرانے کے طور پر پیش کرنے کے لیے قطعات لکھنا شروع کیے جن کا عنوان ''حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم'' رکھا۔ یہ تمام قطعات ایسے ہیں کہ ہر قطعے پر آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ دل طیبہ کی ہواؤں میں گم ہو جانے کو بے تاب ہو جاتا ہے اور ذہن حدود و قیود سے ماوراء عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سرمستی میں کھو جاتا ہے۔ کیا خوبصورت آغاز ہے:

بایں پیری رہ یثرب گرفتم
نوا خواں از سرودِ عاشقانہ
چو آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام
کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ

(میں نے اس بڑھاپے میں یثرب کی راہ اختیار کی ہے۔ عاشقانہ نوا خوانی کی مستی و سرور میں چلا جا رہا ہوں، اس پرندے کی طرح جو صحرا میں شام کے وقت اپنے گھونسلے کو لوٹنے کے لیے پر پھیلا دیتا ہے)

اس کے بعد کیفیتوں کی سرمستیاں ہیں، عشق کے ترانے ہیں اور مسلمانوں کی حالتِ زار پر سرکار دو عالمؐ سے صرف ایک درخواست کی گئی ہے... ''تنہا ہے یارسول اللہ تنہا ہے'' اور آخری شعر میں اقبال کی بے بسی ایک عاشق کی فریاد بن کر یوں گویا ہوتی ہے:

دلے برکف نہادم دلبرے نیست
متاع داشتم غارت گرے نیست
درون سینۂ من منزلے گیر
مسلمانے زمن تنہا ترے نیست

''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں نے اپنا دل ہتھیلی پر رکھا ہے لیکن کوئی لے جانے والا نہیں، میرے پاس دولت تھی لیکن کوئی دولت لوٹنے والا نہ تھا، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم آپ میرے سینے میں قیام فرمایئے، مسلمان ہوں، مجھ سے زیادہ تنہا اور کوئی نہیں ہے''۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

حرف راز
اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

جب ایسا لمحہ آن پہنچے کہ قوم کی واضح اکثریت اپنے مستقبل سے مایوس‘ حال سے برگشتہ اور ماضی پر لعنت بھیج رہی ہو تو تاریخ بتاتی ہے کہ پھر اس کی عمارت دھڑام سے گر جاتی ہے۔ اقتدار کے ایوان‘ کاروبار کے مراکز اور استحکام کے ذمہ دار ادارے ایک زوردار دھماکے سے زمین بوس ہو جاتے ہیں۔ وہ جو سروں پر تاج سجائے اپنی آنے والی نسلوں کے لیے بھی اقتدار کی مسند مضبوط کر رہے ہوتے ہیں، ان کے تاج ہوا میں اچھال دیے جاتے ہیں۔ جن کی دولت انہیں اس غرور میں مبتلا کیے ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنی آنے والی سات پشتوں کے رزق کا بھی اہتمام کر رکھا ہے‘ ان کا یہ اہتمام بھوکے ننگوں کے ہاتھوں بکھر کر رہ جاتا ہے۔ جنہیں قوت بازو پر ناز ہوتا ہے‘ جو تیر و تلوار یا بندوق کی طاقت پر بھروسہ کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری طاقت‘ قوت اور ہیبت لوگوں کو نکیل ڈال دے گی؛ ہماری صلاحیت ہی امن قائم کرتی ہے، چین بحال کرتی ہے، لیکن جب ایسا لمحہ آتا ہے تو تاریخ شاہد ہے کہ بندوقیں کندھوں سے لٹکی رہ جاتی ہیں اور انہیں سیدھا یا استعمال کرنے کا موقع تک نہیں ملتا۔

ایسا کب اور کیوں ہوتا ہے اور کیا ہم پر بھی یہ وقت آن پہنچا ہے؟ اس کی خبر تو اللہ ہی جانتا ہے کہ وہی عالم الغیب ہے، اسی کے علم میں ہے کہ ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے لیکن مریض کی حالت کا اندازہ لگانے والے طبیب تو مدتوں سے اس قوم کو آپریشن کے ذریعے سرطان کی گلٹیوں سے نجات پا لینے کا مشورہ دیتے چلے آ رہے ہیں۔ لیکن سوال کرنے والے کہتے ہیں کہ کون سا ایسا ماہر سرجن ہے؟ کوئی بھی تو نہیں۔ جو آپریشن کی میز سجاتا ہے‘ خود اسی مرض کی لذت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ یہ مکمل مایوسی کا لمحہ ہوتا ہے جس کی کوکھ سے اللہ کے فیصلے جنم لیتے ہیں۔ ایسے فیصلے جو سخت بھی ہوتے ہیں اور انسانوں سے اس کی محبت سے بھرپور بھی۔ کیا ہم پر مایوسی کا وہ لمحہ آن پہنچا ہے؟

ہاں! ہم یقیناً مایوسی کے اس سمندر کی اتھاہ گہرائیوں تک ڈوب چکے ہیں جہاں عام آدمی بھی جسے حکومتوں کے بدلنے سے کوئی سروکار نہیں ہوتا‘ زبان حال سے پکارتا ہے کہ ہماری تقدیر نہیں بدل سکتی۔ سب چور ہیں اور چور ہی حکمرانی کی مسند پر بیٹھتے ہیں۔ اٹھارہ کروڑ عوام کی مایوسی کا عالم دیکھیے کہ وہ مدتوں جمہوریت کے ہومیو پیتھک علاج کی میٹھی گولیاں اس امید پر کھاتے چلے جاتے ہیں کہ اس طرح مرض جڑ سے ختم ہو جائے گا۔ وہ فوج کے آپریشن کی ٹیبل بار بار سجنے پر خوش ہوتے ہیں کہ چلو علاج تکلیف دہ ہے‘ تھوڑی بہت معذوری کا بھی خطرہ ہے لیکن صحت تو بحال ہو جائے گی۔ لیکن بار بار آپریشن سے کینسر کی گلٹیوں میں نیا اضافہ ہو جاتا ہے۔ ہر دفعہ فوج آتی ہے تو لوگوں کو ایک نیا خاندان تحفے میں دے جاتی ہے جو ان پر آنے والے کئی برس حکومت کرتا ہے۔ ایوب خان نے بھٹو خاندان کا تحفہ بخشا، تو ضیاء الحق نے شریف خاندان کا۔ باقی دو کمال کے تھے... ایک نے جام و مینا میں ملک کی سلامتی کو غرق کیا اور دوسرے نے عیش و نشاط کی سرپرستی میں وہ جنگ اس قوم کو تحفے میں بخشی جس کے بارود کی بو اور خون کے چھینٹے آج ہر روز ہمارے در و دیوار پر ایک نئی کہانی لکھ کر جاتے ہیں۔ یہ ہے وہ مایوسی کا لمحہ‘ یہ ہے وہ کیفیت جس کے باعث ہماری واضح اکثریت مستقبل سے مایوس‘ حال سے برگشتہ اور ماضی پر لعنت بھیج رہی ہے۔ یہی مرحلہ وقت بدلنے کا ہوتا ہے۔ اللہ کی یہ سنت ہے کہ وہ قوموں کو راہ راست کی جانب لوٹنے سے پہلے ایک زوردار جھٹکے سے خبردار کرتا ہے۔ قرآن کریم اللہ کی اس براہ راست مداخلت کا بار بار ذکر کرتا ہے۔ بڑے عذاب سے پہلے چھوٹے عذابوں کا نزول، تاکہ لوگ سنبھل جائیں اور اس کی جانب واپس لوٹ جائیں۔ لیکن دنیا کے فلسفے، سائنس اور سیاسیات کے ماہر اسے Divine Intervention کا نام دیتے ہیں۔ جب کسی قوم میں اچانک کوئی تحریک بھڑک اٹھے‘ وہ اچانک طویل خواب سے انگڑائی لے کر بیدار ہو جائے‘ وہ مدتوں ایک دوسرے کی گردنیں کاٹتی کاٹتی تھک ہار جائے اور اچانک صلح جُو بن جائے تو ایسے لمحوں کو مورخین اور فلسفی کسی غیر مرئی قوت یا طاقت کا شاخسانہ بتاتے ہیں جسے ہیگل نے عقل کل کا نام دیا ہے۔

ایسا وقت بہت خوفناک ہوتا ہے اور اس کا آغاز بہت ہیبت ناک، لیکن اس کی کوکھ سے خیر نے جنم لینا ہوتا ہے۔ کیا ہماری حالت دنیا کے ان ممالک سے مختلف ہے جہاں خلق خدا نے خود آپریشن ٹیبل سجائی تھی۔ ہم جن علتوں اور امراض کا شکار ہیں وہ ہمارے لیے عذاب کی نوید لا چکے۔ جس ملک میں جھوٹ سے دن کا آغاز ہوتا ہو اور رات کا سناٹا جھوٹ کو پروان چڑھائے، میڈیا، دکان، سکول اور یونیورسٹی سے پارلیمنٹ تک میں جھوٹ کی منڈی سجے، دین کاروبار بنے اور جہاد ذاتی انا کی تسکین، جہاں حکومت خاندانی لوٹ مار اور بدترین شہنشاہیت میں بدل چکی ہو؛ تعلیم‘ صحت‘ روزگار اور عزت نفس سب پاؤں کی ٹھوکر تلے روندے جا چکے ہوں‘ ایسے میں اگر کوئی جمہوری نظام کے ہومیو پیتھک تسلسل کی خواہش کر رہا ہے تو احمقوں کی جنت میں رہتا ہے اور اگر کسی کو عسکری صلاحیتوں پر اعتماد ہے کہ وہ حالات کو آپریشن ٹیبل پر لا کر درست کر لیں گے تو یہ اس کی بھول ہے۔ اب نہیں، شاید اب نہیں! عالم الغیب صرف اللہ کی ذات ہے لیکن قوموں کی تاریخ میں ایسے لمحے جب بھی آئے میرے اللہ کا فیصلہ ایک ہی رہا ہے کہ اگر ہم ظالموں کو ظالموں سے نہ لڑائیں تو دنیا میں امن نہ ہو۔ خوفناک تصادم... جو اہل نظر جانتے ہیں اور جو اس دنیا سے رخصت ہو گئے بتاتے تھے‘ انتباہ کرتے تھے‘ ڈراتے تھے کہ حالات اس مقام پر مت لے جاؤ کہ اللہ کو امن قائم کرنا پڑے۔ لیکن کون سنتا ہے۔ وہ تو نسلوں کی بادشاہت کو محفوظ بناتا ہے، سات پشتوں کے رزق کا بندوبست کرتا ہے، عسکری قوت کی دھاک بٹھاتا ہے۔ لیکن شاید اب مہلت باقی نہیں رہی۔ دیوانگی حد سے بڑھ جائے تو شہر کا شہر پتھر اٹھا لیتا ہے۔ ہمارے ہاں تو دیوانے گلی گلی اور کوچہ کوچہ موجود ہیں‘ صرف لوگوں کے ہاتھوں میں پتھر اٹھانے کی دیر ہے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

علامتیں صدیوں میں بنتی ہیں

حرفِ راز
اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

انسانی تاریخ بھی عجیب ہے، کتنے ہی بڑے بڑے لوگوں کو گمنامی کی موت مرنے دیتی ہے، ان کے کارناموں پر وقت کی دھول پڑ جاتی ہے، ان کی تحریریں کتابوں میں مدفون اور ان کی شہرتیں پیوندِ خاک ہو جاتی ہیں۔ کبھی کبھی کوئی جستجو کرنے والا اپنے تجسس میں اس جانب آ نکلے تو ایسے لوگوں کا ذکر چھیڑ دیتا ہے۔ کبھی کبھی تو صدیوں بعد کسی مضمون یا کتاب میں ان کا تذکرہ ہو جاتا ہے، اس کے بعد پھر ایک طویل خاموشی! یہی معاملہ تاریخی واقعات اور سانحات کا بھی ہے۔ کتنے بڑے بڑے المیے ہیں جو قوموں کی تاریخ میں گزرے، کیسی کیسی قیامتیں ان پر ٹوٹیں لیکن قوموں کے شعور کے کسی گوشے میں ان کی یاد تازہ نہیں رہتی۔ کیسی کیسی جنگیں، آفتیں، بلائیں، فتوحات اور شکست کی کہانیاں ہیں جنہیں کوئی یاد نہیں رکھتا۔ کہیں کہیں قومیتوں کے حوالے سے کورس کی کتابوں میں تھوڑا بہت تذکرہ مل جاتا ہے یا کبھی کسی تحقیقی یا ذاتی حوالے سے کسی مضمون، افسانے یا شاعری میں بھی ذکر ہو جاتا ہے، لیکن کچھ واقعات ایسے ہیں جو پوری انسانی تاریخ کے لیے علامت بن جاتے ہیں اور کچھ واقعات کسی مخصوص قوم کے لیے صدیاں گزرنے کے باوجود بھی ایک حوالہ بنے رہتے ہیں..... نہ ان واقعات کی یاد میں کمی آتی ہے اور نہ ہی افسانوں، کہانیوں، شاعری اور روزمرہ بول چال سے ان کا ذکر ختم ہوتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کی صلیب اور واقعۂ کربلا دو ایسی علامتیں ہیں جو آج تک انسانی تاریخ کے وسیع تناظر پر چھائی ہوئی ہیں۔ صلیب کی علامت دنیا بھر کی شاعری میں حضرت عیسیٰؑ کی معصومیت اور واقعۂ کربلا حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مظلومیت کے تصور سے آج بھی روشن ہے۔ دونوں وقت کے جبر و استبداد کے سامنے مظلومیت اور تن تنہا لڑنے کی روایت کے امین ہیں۔ حیرت کی بات دیکھیے کہ جب یہ دونوں واقعات رونما ہو رہے تھے تو دور دور تک کوئی ان کا ذکر کرنے والا بھی موجود نہ تھا۔ تاریخ مرتب نہیں ہوتی تھی، لوگ ان کے تذکرے سے کتراتے تھے۔ بادشاہوں کا خوف اور سپاہ کی دہشت وقتی طور پر دونوں واقعات کو خاموش کر گئی لیکن انہیں ایک علامت کا روپ دھارنے میں تھوڑا سا وقت لگا۔ حضرت عیسیٰؑ کے حواری بھی ملکوں ملکوں پھیل گئے اور سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یاد بھی عالم اسلام کے کونے کونے میں خوشبو کی طرح مہکنے لگی۔

ہر ملک کی تاریخ کے بھی یاد رکھنے والے چند واقعات ہوتے ہیں اور چند قابلِ ذکر لوگ بھی ہوتے ہیں جو داستانوں تک کا حصہ بن جاتے ہیں۔ پاکستان کی تاریخ کے بہت سے واقعات اور بہت سے قائدین گمنامی کی اتھاہ گہرائیوں میں چلے گئے۔ وہ جن کے نام کا ڈنکا بجتا تھا آج ان کی قبروں کو بھی کوئی نہیں جانتا۔ کیسے کیسے واقعات ہوئے، تحریکیں چلیں، لوگ مرے، ان تحریکوں کے رہنما بھی تھے، لوگوں کے جنازے بھی اٹھائے گئے، کتنے بڑے بڑے ہجوم نے جنازوں کا ساتھ دیا، لیکن ان تحریکوں کو یاد رکھنے والے صرف متعلقہ گروہوں کے لوگ ہی باقی رہ گئے۔ کسی نے ختم نبوت تحریک کو، کسی نے نظام مصطفیٰ کو اور کسی نے ایم آر ڈی کو یاد رکھا اور دن منایا، لیکن وہ دو واقعات جو پاکستان کی تاریخ میں علامت بنے ان میں پہلا تحریک پاکستان میں مہاجروں کی ہجرت اور شہادتیں اور دوسرا 1971ء کا سانحہ مشرقی پاکستان ہیں۔ یہ دونوں واقعات ایسے ہیں جن کی یاد تازہ ہے اور زخم بھی ہرے ہیں۔ 1947ء کے سال نے تو اتنا بڑا ادب تخلیق کیا جس کے بعد لگتا ہے اُردو ادب کا خزانہ ہی خالی ہو گیا۔ اُردو کیا، ہر زبان میں اس المیے کی داستان بیان ہوئی۔ سانحہ مشرقی پاکستان بھی دونوں ملکوں میں ایک نیا ادب تخلیق کروا گیا۔ اس سانحے پر پاکستان میں رونے والوں کی کبھی کمی نہیں رہی اور مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) میں بھی ادب کے ہر زاویے سے اس سانحے کو یاد کیا جاتا ہے۔ تاریخ مرتب کرنے والے بھی کئی سال گزرنے کے باوجود اس کے کسی نہ کسی نئے زاویے پر ہر سال کتب میدان میں لاتے ہیں' لیکن ان سب کے علاوہ واقعات کو ناپنے کا ایک اور پیمانہ بھی ہوتا ہے، یہ پیمانہ روزمرہ محاورے کا ہوتا ہے۔ مقررین کے خطابات میں اس واقعے کو کئی انداز سے یاد اور تازہ کیا جاتا ہے۔ ایک طویل عرصے سے تقریر میرا شوق رہا ہے۔ سکول میں چھٹی کلاس سے ایم اے تک میں نے سکول، کالج اور یونیورسٹی کے مباحثوں میں حصہ لیا۔ ایک مقرر کی حیثیت سے میں جانتا ہوں کہ کون سا واقعہ ایسا ہے جسے بیان کرنے سے سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کے دلوں کو گرمایا جا سکتا ہے، کون سا ایسا تیر ہے جو نشتر بن کر لگے اور جذبات سے کھیل جائے۔ گزشتہ کئی برسوں سے میں یونیورسٹیوں اور کالجوں میں تقریری مقابلوں کے منصف یا صدارت کے فرائض بھی انجام دے رہا ہوں۔ مدتوں تحریکِ پاکستان، ہجرت، شہادت اور سانحہ مشرقی پاکستان طلبہ کی تقریروں میں علامت کے طور پر نظر آتا رہا۔ جذباتی فقروں اور مقررین کی آواز کے زیر و بم سے یہ واقعات ہجوم میں تلاطم برپا کرتے اور تالیوں کی گونج بڑھ جاتی، لیکن گزشتہ چھ سات برسوں سے ایک اور واقعے نے ان دو واقعات کے ساتھ اپنی جگہ بنائی ہے.... لال مسجد کا واقعہ اور جامعہ حفصہ کا سانحہ۔ کراچی سے لے کر پشاور اور کوئٹہ سے آزاد کشمیر تک شاید ہی کسی کالج یا یونیورسٹی کے بین الکلیاتی مباحثوں میں شریک ہونے والے طلبہ نے اس کا ذکر نہ کیا ہو۔ ان میں حجاب والی خواتین بھی ہوتی ہیں اور الٹرا ماڈرن لڑکے بھی، انگلش میڈیم سکولوں سے پروان چڑھنے والے اور عام نظامِ تعلیم کے پروردہ طلبہ بھی ان میں شامل ہیں' لیکن ان سب مباحثوں میں جہاں کہیں مظلومیت کا تذکرہ آتا ہے، ریاستی تشدد کی گفتگو ہوتی ہے تو یہ مقررین جو جانتے ہیں کہ کون سا واقعہ دلوں کے تار چھیڑ سکتا ہے، وہ لال مسجد اور جامعہ حفصہ کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔ کئی دفعہ تو ایسا ہوتا ہے کہ وہ کربلا کے واقعے کے ساتھ اس واقعہ کا تذکرہ یوں کرتے ہیں جیسے یہ دونوں ایک سلسلے کی کڑی ہوں۔ پرویز مشرف کے آٹھ سالہ دور نے ایک حیران کن تبدیلی اس ملک کی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں پیدا کی' جسے شاید کوئی محسوس نہیں کر رہا۔ میں جب یونیورسٹی میں پڑھتا تھا تو پوری یونیورسٹی میں ایک خاتون حجاب لیتی تھی اور اکا دکا لڑکوں کی داڑھی ہوتی تھی، ضیاالحق کے نفاذ اسلام اور معاشرتی اقدار کا غلغلہ تھا، لیکن یونیورسٹیوں میں حجاب رواج پا سکا اور نہ داڑھی۔ ضیاالحق کے بعد بھی دو دہائیاں ایسے ہی رہا لیکن پرویز مشرف کی سیکولر اخلاقیات کے نفاذ نے ایک ایسا ماحول پیدا کیا کہ اب آپ کو ہر یونیورسٹی میں ہر تیسری لڑکی حجاب میں نظر آئے گی اور وہ داڑھیاں نظر آئیں گی جن کا کبھی یونیورسٹیوں میں مذاق اڑایا جاتا تھا۔ میں جب یہ ماحول دیکھتا ہوں تو مجھے حیرت نہیں ہوتی کہ جب کوئی مقرر کسی بھی کالج سے آئے یا کسی بھی بیک گراؤنڈ سے تعلق رکھتا ہو وہ لال مسجد اور جامعہ حفصہ کا تذکرہ کر کے داد سمیٹنے لگے۔ داد دینے والوں کے نزدیک مشرف بے حجابی کی اس تحریک کی علامت ہے جس نے ان بچیوں کو حجاب پہننے اور لڑکوں کو داڑھی رکھ کر اپنے مذہبی جذبات کا اظہار کرنے پر مجبور کیا۔ ان کے نزدیک جامعہ حفصہ اس حکمران کے سامنے کھڑے ہونے اور مظلومیت میں مارے جانے کی علامت ہے۔ علامتیں اپنے اندر جذباتیت رکھتی ہیں اور ایسے ہی ترتیب پاتی ہیں۔ ان کا سفر صدیوں پر محیط ہوتا ہے۔ یہ چند سال اور کچھ افراد تک محدود نہیں رہتیں، وقت انہیں سنوارتا رہتا ہے۔ ایک طرف محبت اور دوسری جانب نفرت۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے

مقدمہ کہیں اور درج ہو چکا ہے۔ اس بارگاہ میں جس کے سامنے پیمرا' ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ پرِ کاہ کی بھی حیثیت نہیں رکھتے۔ جو جس کے ساتھ کھڑا ہوگا اس کا انجام بھی اس کے ساتھ ہوگا۔ یہ مقدمہ اس مالک کائنات کے ایک دہائی تک تحمل اور دی جانے والی مہلت کے بعد درج ہوا ہے۔ اسے کسی گواہ' وکیل یا بحث کی حاجت نہیں۔ وہ سب جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں چھپا ہوا ہے اور جو تمہارے افعال سے ظاہر ہے۔ وہ حکم دے تو تمہارے ہاتھ' پاؤں اور جسم کے اعضا گواہی دینے لگ جائیں۔ اس کا اپنا تعزیراتی قانون ہے۔ اس تعزیراتی قانون کے تحت کچھ جرائم کی فردِ جرم روزِ حشر کھلے گی۔ لیکن چند جرائم ایسے ہیں جن کا فیصلہ وہ اسی دنیا میں کرتا ہے۔ ان جرائم میں سے ایک جرم سورہ "النور" کی آیت نمبر 19 میں درج ہے۔ اللہ فرماتا ہے "یاد رکھو جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان والوں میں بے حیائی پھیلے' ان کے لئے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے' اور اللہ جانتا ہے' اور تم نہیں جانتے"۔ یہ وہ فردِ جرم ہے جو اس قوم کے دروازوں پر چسپاں ہو چکی۔ ان سب دروازوں پر جو گیس کی بندش پر' بجلی کی لوڈشیڈنگ کے خاتمے کے لئے' تنخواہوں میں اور مراعات کی خاطر' جمہوریت کی بقا اور آمریت کے خاتمے کے لئے سڑکوں پر نکلتے رہے۔ کبھی کسی رہنما یا پارٹی کے کہنے پر اور کبھی خود بخود غصے کے عالم میں جو انتقام اور انصاف کی خاطر لاشیں سڑکوں پر رکھ کر احتجاج بھی کرتے رہے اور مخالفین کی لاشیں بھی گراتے رہے لیکن اللہ کے اس تعزیراتی قانون جزا و سزا پر ان کا نہ دل خوف سے کانپا اور نہ ان کی زبانوں میں جنبش ہوئی۔ بلکہ انہوں نے ایسے لوگوں کا تمسخر اڑایا جو اس گناہ کو ہاتھ سے روکنے کے لئے آگے بڑھے۔ لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے لوگوں نے جب فحش فلموں کو نذرِ آتش کیا تو آزادی اظہار کے نام پر ایک طوفان کھڑا ہوا۔ ہر کوئی گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ جب انہیں رسول ﷺ کی یہ حدیث سنائی گئی کہ "جب کوئی برائی دیکھو تو ہاتھ سے روک دو' اگر استطاعت نہیں رکھتے تو زبان سے روکو' اگر پھر بھی استطاعت نہیں رکھتے تو دل میں برا کہو اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے' تو ایسے میں انہیں ریاست اور اس کی عملداری یاد آگئی لیکن اللہ اور اس کے رسولؐ کے قوانین اور اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کا موقع ہاتھ آیا تو منافقت کی انتہا دیکھیں کہ ہائی کورٹ میں قتل ہونے والی فرزانہ پر وہی لکھنے والے یہی حدیث لکھ کر طعنے دیتے رہے۔ اللہ قیامت کے دن ان کی نیتوں پر فیصلے کرے گا۔ لیکن دنیا میں جن جرائم پر فیصلہ ہونا ہے وہ لوگوں کے ظاہر پر ہوگا۔ یہ فیصلہ بہ حیثیت مجموعی قوم' علاقے اور بستی پر نافذ ہوتا ہے۔ اس کا ارشاد ہے "اور ڈرو اس وبال سے جو تم میں سے صرف ظالموں ہی کو لاحق نہ ہوگا" (الانفال 25)۔ یہ وبال قوموں کی کسی جرم پر بدترین خاموشی پر بھی آیا کرتا ہے۔ اللہ سورہ النحل کی 48ویں آیت میں فرماتا ہے "اور اس شہر میں نو (9) لوگ ایسے تھے جو فساد برپا کرتے تھے اور اصلاح سے کام نہیں لیتے تھے" یہ وہ لوگ تھے جن کو پوری قوم نے اپنا رہنما تسلیم کر لیا تھا۔ وہ ان کی بداعمالیوں پر خاموش تھی اور ان کے ظلم پر آواز بلند نہیں کرتی تھی۔ یوں اللہ نے ان پر اپنا فیصلہ مسلط کر دیا اور بستی میں ہر خاص و عام کو عذاب کا مزا چکھا دیا۔ آج سے تقریباً دو سال قبل جب اس چینل پر شہزاد رائے کا یہ گانا بار بار نشر ہو رہا تھا تو خوف سے دل کانپ اٹھتا تھا۔ جو لوگ میڈیا کی باریکیوں کو جانتے ہیں' وہ سمجھتے ہیں کہ کسی فقرے یا گانے میں وقفہ (Pause) ایک خاص مقصد کے لئے دیا جاتا ہے تاکہ لوگ اس دوران اپنے دماغ میں جو خیال آئے سوچیں۔ گانے میں شہزاد رائے گاتا ہے "چند لوگوں نے ...... پوری قوم کی ......" (اس کے بعد ایک لمبا وقفہ) پھر "قسمت اپنے ہاتھ میں"۔ اس وقفے کے دوران ہر کوئی جانتا ہے کہ لوگوں کے ذہن میں کیا آئے گا۔ پنجاب حکومت کے ایک درد دل رکھنے والے افسر نے چینل کے مالک سے فون کر کے سوال کیا کہ تم سمجھتے ہو کہ اس سے لوگوں کے دماغ میں اشارہ کس فحاشی کی طرف ہوتا ہے' اس افسر کے بقول مالک نے ڈھٹائی کے ساتھ جواب دیا' ہاں جانتا ہوں اور یہی حقیقت ہے۔ افسر کے بقول ایک دن ایک اعلیٰ سطح کی تعلیمی مہم کے دوران شہزاد رائے کو پنجاب حکومت نے بلایا۔ اس نے اسے علیحدہ کر کے کہا تمہیں معلوم ہے تمہارے اس گانے سے لوگ کس قدر مشتعل ہو رہے ہیں۔ میرے پاس رپورٹس ہیں کہ تمہاری جان کو خطرہ ہے۔ اس کے اگلے دن گانا بند ہو گیا۔ میں اس افسر کا نام اس لیے نہیں لکھ سکتا کہ مجھے اس کی استطاعت کا علم ہے۔ اس نے اپنی استطاعت کے مطابق فرض ادا کر دیا اور اللہ اسے اس کا اجر عطا فرمائے گا۔ لیکن وہ جو استطاعت رکھتے تھے انہوں نے شہزاد رائے کو ہیرو بنایا۔ نہ اہل اقتدار کے پاؤں میں لغزش آئی اور نہ ہی میڈیا کے کارپردازوں کے دل کانپے بلکہ 7 فروری 2013ء کو اسی گلوکار کو ایک مقبول ٹاک شو میں ایک قومی ہیرو بنا کر پیش کیا گیا۔ یہ تو فرد جرم کی ایک چھوٹی سی گواہی ہے۔ اس ملک میں فحش کو عام کرنے کے لئے گزشتہ دس سالوں کے خبروں کے بلیٹن نکال لیے جائیں تو ثبوتوں کے انبار لگ جاتے ہیں۔ وہ لوگ جو نیت باندھ کر صرف خبریں سننے بیٹھتے تھے ان کے سامنے اچانک ایک نیم برہنہ بھارتی اداکارہ "آئٹم سانگ" کرتی نظر آنے لگتی تھی۔ دنیا کا کونسا ایسا "ماڈرن" گھرانہ ہے جس میں ایک لڑکی باتھ روم سے ٹانگوں کے بال صاف کرتی نکلے اور گھر والوں کو دکھائے کہ اس کی ٹانگیں کتنی ملائم ہو چکیں ہیں۔ ہم نے اشتہارات کے نام پر یہ سب دیکھا۔

ایک فرد جرم اور بھی ہے۔ اس فرد جرم کا تعلق اس پاکستان کے حوالے سے اللہ کی غیرت سے وابستہ ہے۔ دنیا میں دو سو کے قریب ممالک رنگ نسل اور زبان کی بنیاد پر وجود میں آئے' لیکن یہ واحد ملک ہے جو اللہ کے نام پر وجود میں آیا۔ اللہ اپنی نشانیوں سے ثابت کرتا ہے کہ اس ملک کے ساتھ کھلواڑ کرنے والوں کا وہ کیا حشر کرتا ہے۔ کیا اندرا گاندھی کو سزا سکھوں کے گولڈن ٹیمپل کی وجہ سے ملی نہیں' آج تک اس خاندان کا کوئی فرد طبعی موت نہ مر سکا۔ کیا شیخ مجیب الرحمٰن اور اس کے خاندان کی لاشیں ایک طویل عرصہ اس لیے پڑی رہیں کہ اس نے بنگالیوں کے خواب پورے نہیں کیے تھے۔ کیا ذوالفقار علی بھٹو اور اس کے پورے خاندان کو احمد رضا قصوری کو قتل کرنے کی سزا ملی کہ آج تک گڑھی خدا بخش ایک طبعی موت مرنے والے کے جنازے کو ترس رہا ہے۔ اللہ کا اپنا اصولِ سزا ہے۔ میرے شہر کے بزرگ ایک سچا واقعہ سناتے ہیں۔ ایک بھینس چور آہستہ آہستہ قاتل اور ڈاکو بن گیا۔ پولیس کی ملی بھگت سے بچ جاتا۔ ایک دن کسی بڑے شخص کے قتل کے الزام میں گرفتار ہوا۔ پھانسی کی سزا ہوئی' سپریم کورٹ تک قائم رہی۔ ماں ملاقات کرنے گئی تو اس نے کہا کہ میں نے بہت قتل کئے لیکن یہ قتل نہیں کیا۔ ماں دریائے چناب کے کنارے بیٹھے ایک درویش خدا مست کے پاس چلی گئی۔ قصہ سنایا۔ درویش نے نظریں زمین پر گاڑھے کہا کہ جاؤ اسے بولو بھینس معاف نہیں کرتی۔ اس نے بیٹے سے کہا تو اس نے سر جھکا لیا اور کہا اب مجھے ضرور پھانسی ہو جائے گی۔ یہ شروع شروع کا قصہ ہے' میں نے ایک گاؤں سے بھینس چوری کی' اس کا بچھڑا ساتھ چلنے لگا۔ اتنے میں گاؤں والوں کو پتہ چل گیا وہ میرے پیچھے دوڑ پڑے اور ان کی آوازیں مجھ تک آنے لگیں۔ بچھڑا آہستہ آہستہ چلتا تھا اور گائے رک کر اس کا انتظار کرتی۔ مجھ پر خوف سوار ہوا۔ میں نے بندوق سے فائر کر کے بچھڑے کو مار دیا۔ بھینس نے بس ایک دفعہ منہ اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا اور ہمارے ساتھ چلنے لگی۔

اس ملک کے اس آفاقی نظریے کا جس قدر مذاق' تضحیک اور تمسخر اڑایا گیا گزشتہ ستر سال کی تاریخ میں ایسا نہیں ہوا۔ یہ پاکستان کا نہیں ان دس لاکھ شہیدوں کی روحوں کا تمسخر تھا۔ جن کی جانیں اس ملک کی تخلیق پر قربان ہوئیں۔ شہید مرتے نہیں' زندہ ہوتے ہیں اور وہ دس لاکھ اس ملک کی سرحدوں پر موجود یہ تماشہ دیکھتے رہے۔ پاکستان کا مطلب کیا لاالہ الا اللہ کے نعرے کو اپنے آقاؤں کی خوشنودی کے لئے ایک نئے نعرے میں بدلنے کی کوشش کی گئی۔

مقدمہ کہیں اور درج ہو چکا ہے۔ یہ مقدمہ آئی ایس آئی اور فوج کی تضحیک کا مقدمہ نہیں۔ اس مقدمے کا کوئی ایک مجرم نہیں۔ اس مقدمے کا پہلا عذاب ہم گزشتہ کئی سالوں سے بھگت رہے ہیں۔ اللہ اس عذاب کے بارے میں فرماتا ہے "اور تمہیں مختلف ٹولیوں اور گروہوں میں بانٹ کر ایک دوسرے سے لڑاوے اور ایک دوسرے کی طاقت کا مزا چکھائے (الانعام 65)۔ لیکن شاید ہم نے اس عذاب کو اللہ کی نشانی نہیں سمجھا۔ فیصلہ تو صرف اللہ جانتا ہے۔ لیکن اہل نظر زمین کی جنبش کو خوفناک دیکھ رہے ہیں۔ زمین تھرتھراتی ہے تو سب کلمہ پڑھتے ہوئے بھاگ نکلتے ہیں۔ زلزلوں کا شور بڑھتا چلا آرہا ہے۔ کیا ہوگا۔ صرف اللہ جانتا ہے لیکن خوف سے زبانیں گنگ ہیں اور آنکھیں پتھرائی ہوئی۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

عالمی دوغلا پن اور مسلم امت

یہ وہی سرزمین ہے جہاں روس کے کمیونسٹ انقلابیوں نے 1920ء میں پچاس ہزار جنگی قیدیوں اور عام شہریوں کو لائنوں میں کھڑا کر کے گولیوں سے بھون ڈالا تھا۔ ریڈ آرمی روس میں کمیونسٹ انقلاب لانے کے لیے منظم کی گئی تھی اور اس کے مسلح دستوں نے طاقت کے بل بوتے پر پورے روس پر اپنا نظام نافذ کیا تھا۔ یہ وہی نظام اور طریقِ انقلاب ہے جس کی مدح سرائی میرے ملک کے دانشوروں، شاعروں اور ادیبوں کا بہت بڑا طبقہ مدتوں کرتا رہا، انہیں آج آزادی اور حریت کے علمبردار کہا جاتا ہے، ان کی شاعری کو انسانی حقوق کی علامت جانا جاتا ہے اور انہیں یوں پیش کیا جاتا ہے کہ وہ جمہوری جدوجہد کے پرچم بردار تھے۔ انجمنِ ترقی پسند مصنفین کے سجاد ظہیر، اختر الایمان اور فیض احمد فیض اسی طرح کی طاقت کے بل بوتے پر کمیونسٹ شریعت کے نفاذ کے قائل تھے۔

پچاس ہزار لوگوں کے قتلِ عام کی گواہ یہ سرزمین ''کریمیا'' آج ریفرنڈم سے اپنی خودمختاری کا اعلان کر چکی ہے۔ اس ریفرنڈم کے بعد بھی اگر کوئی شخص یہ تصور کرتا ہے کہ مغرب یا عالمی برادری میں انصاف نام کی کوئی چیز ہے تو اسے احمقوں کی جنت میں رہنے والا ہی کہا جا سکتا ہے۔ یہ ریفرنڈم یا حقِ خود ارادیت گزشتہ سو سال سے ہر اُس بستی، علاقے یا آبادی پر حرام ہے جو مسلمانوں کی ہے اور غیر مسلم قومی ریاستوں کے تسلط میں ہے؛ جہاں روز لاشیں گرتی ہیں، بچے ذبح ہوتے ہیں، عصمتیں تار تار ہوتی ہیں لیکن کسی عالمی طاقت کو شرمندگی محسوس نہیں ہوتی۔ گزشتہ چند برسوں میں جب کبھی کسی غیر مسلم آبادی نے اپنی علیحدگی، خودمختاری یا آزادی کے لیے ذرا سی بھی آواز اٹھائی، عالمی ضمیر فوراً جاگ اٹھا' خواہ وہ جنوبی سوڈان تھا یا مشرقی تیمور، فوجیں اتاری گئیں یا عالمی دباؤ سے مجبور کیا گیا تو یہ دونوں علاقے مسلمان اکثریت سے علیحدہ کر دیے گئے۔ یہ صرف ان خطوں کے ساتھ نہیں ہوا جو مسلمانوں کے زیرِ تسلط تھے بلکہ جہاں کہیں بھی انسانی حقوق کی پامالی، ظلم و بربریت کی اطلاع موصول ہوئی عالمی برادری ایک دم وہاں کود پڑی۔ شرط صرف یہ تھی کہ اس بستی میں مظلوم مسلمان نہ بستے ہوں۔

جنوبی افریقہ کی نسل پرست حکومت سے پوری دنیا نے بائیکاٹ کیے رکھا یہاں تک کہ ان کی کرکٹ ٹیم کو دنیا کے کسی بھی ملک میں کھیلنے کی اجازت نہ تھی۔ وہاں کالے اور گورے کے درمیان تفریق تھی' مذہب ایک تھا۔ لیکن پورے افریقہ میں کتنے ہی ایسے ممالک ہیں جہاں مسلمان اقلیت روز قتل ہوتی ہے مگر اس ظلم کے بارے عالمی میڈیا میں کوئی آواز گونجتی ہے نہ عالمی ضمیر کو ہی اس کا احساس ہوتا ہے۔ کریمیا کے در و دیوار رقص کناں تھے، آتش بازی اور خوشی کے ہنگامے لیکن ایسے میں مجھے نہ جانے کیوں لبنان میں صابرہ اور شطیلہ میں پڑے فلسطینی یاد آ گئے..... بے یار و مددگار، ایسے افسردہ جس کا بیان ممکن نہیں، ستر سال کے بوڑھے فلسطینی کو اپنی عمر کے اگلے پچاس سال تک بھی وطن واپس لوٹنے کی امید نہ تھی، لیکن اس کی زندگی پچاس سال کہاں بچی تھی۔ یہ امید تو وہاں کھیلتے بچوں کی آنکھوں میں بھی نہ تھی جن کے نزدیک زندگی بس یہی مہاجر کیمپ تھے جس میں کسی قسم کی شہری سہولت میسر نہ تھی۔ آج بھی ان کے گھروں میں کسی نہ کسی بچھڑنے والے کی کہانیاں سنائی جاتی ہیں، کہیں قید میں کئی سال گزارنے والوں کا قصہ ہے تو کہیں اسرائیل کی شدید بمباری سے سارے کیمپ کی سڑکوں پر بکھری بچوں کی لاشوں کے قصے...وہ بچے جو چند منٹ پہلے تک گلی میں ہنستے کھیلتے تھے اچانک فضا سے آنے والی گولیوں اور بموں کا شکار ہو گئے۔

فلسطین کا ذکر تو دنیا میں کہیں نہ کہیں مل ہی جاتا ہے۔ فلسطینی مہاجرین کی بڑی تعداد دنیا بھر کے ممالک میں پھیلی ہوئی ہے جو کسی نہ کسی طور اس مسئلے کو زندہ رکھتی ہے۔ جہاں کہیں صہیونیت اور یہودی بالادستی کا تذکرہ چل نکلتا ہے تو لوگ فلسطین کو یاد کرتے ہیں، لیکن شاید عالمی ضمیر اور عالمی اخلاقیات کے دائرے میں نہ کشمیر آتا ہے اور نہ ہی اس کے مظلوم مسلمان۔ جس خطے سے تعلق رکھنے والے افراد کو اس مملکت خداداد پاکستان نے اپنے سروں پر بٹھایا، وزیر بلکہ وزیر اعظم تک بنایا' انہیں بھی شاید تجارت اور باہمی محبت میں وہ ایک لاکھ قبریں یاد نہیں آتیں جو صرف تین دہائیوں میں کشمیری شہیدوں کی میتوں سے آباد ہوئیں۔

گزشتہ دنوں کلدیپ نائر لاہور آئے تو ایک تقریب میں ان کے ہمراہ مجھے بھی کچھ کہنے کا موقع ملا۔ میری صرف ایک ہی عرضداشت تھی کہ وہ لوگ جو آج بھی یہ سمجھتے ہیں کہ کشمیر ابھی تک پاکستان اور بھارت کا مسئلہ ہے اور یہ تقسیم کا نامکمل ایجنڈا ہے جسے مکمل ہونا چاہیے تو ایسے لوگ خوابوں کی دنیا میں رہتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب دنیا مسلمانوں کو نسل، رنگ اور زبان کی بنیاد پر پہچانتی تھی۔ کوئی انہیں عرب کہتا اور کوئی بربر نسل سے۔ عربوں میں مراکشی مسلمانوں کو ایک علیحدہ حیثیت سے جانا جاتا اور ان پر تحقیق کی جاتی۔ مشرقِ بعید میں ملائیشیا، انڈونیشیا اور دیگر مسلمانوں کو بھی ایک علیحدہ نسلی شناخت کے حوالے سے پہچانا جاتا۔ سرد جنگ کے زمانے کے اخبارات، رسالے، تحقیقی مقالے اٹھا لیں، آپ کو ایسے ہی نظر آئے گا' لیکن گیارہ ستمبر کے بعد تو دنیا ہی بدل گئی ہے۔ وہ لوگ جو ایک امتِ مسلمہ اور ایک جسدِ واحد کی حیثیت سے مسلمانوں کو نہیں مانتے تھے، جن کے نزدیک یہ مختلف نسلوں اور زبانیں بولنے والے افراد کا ایک مجموعہ تھے اور جنہیں مذہب کی بنیاد پر ایک قوم تصور کرنا غلط تھا، وہی لوگ گیارہ ستمبر کے بعد پوری مسلم امہ کو دہشت گردی کے حوالے سے ایک امت اور ایک جسدِ واحد پکارنے لگے۔ ان کے نزدیک مسلمان یمن میں ہو یا چیچنیا میں، پاکستان میں ہو یا ازبکستان میں، انڈونیشیا میں ہو یا شام میں، سب کے سب خونخوار ہیں، سب کے سب دہشت گرد ہیں اور سب کے سب دنیا سے وہ طرزِ زندگی یا لائف سٹائل چھیننا چاہتے ہیں جو انہوں نے دو سو سال کی محنت سے کارپوریٹ سرمائے کے بل بوتے پر تعمیر کیا ہے۔ لیکن وہ سب جو پکارتے پھرتے ہیں کہ مسلمان خونخواری اور دہشت گردی کے حوالے سے ایک ہیں، انہیں اس بات کا اندازہ تک نہیں کہ اس امت کو ایک کرنے میں پورے مغرب نے دو سو سال کتنی محنت کی ہے۔ کیسا دوغلا پن ہے جس نے اس امت کے دلوں میں نفرت کی آگ بھڑکائی۔ علاقے اور ملک اگر نسل اور رنگ کی بنیاد پر تقسیم ہوں گے تو خلافت عثمانیہ کے ہوں گے، لیکن اگر جنگِ عظیم دوم کے بعد عظیم جرمنی تقسیم بھی ہوا تو سب نے مل کر دیوارِ برلن گرادی، ویت نام دو حصوں میں بانٹا گیا لیکن وہ ایک ہو گیا۔ اگر دنیا کے کسی کونے، گوشے یا حصے میں کسی شخص نے ایک مسلم امہ اور ایک مرکزی خلافت کی بات کی تو اسے دہشت گرد کہا گیا۔ حیران کن خوف کا عالم یہ ہے کہ ایک ایسی تنظیم' جو ریاست کے قیام سے پہلے ہتھیار اٹھانے کو حرام تصور کرتی ہے اور صرف اپنے لٹریچر سے مسلمانوں کو ایک امت اور ایک خلافت پر جمع ہونے کا درس دیتی ہے، اس پر ہر مسلم ملک میں پابندی ہے، ہر جگہ ان کے ساتھیوں کے لیے تشدد اور قید ہے۔ جو لوگ لٹریچر میں بھی ایک مسلم امت کا نام سننا پسند نہیں کرتے' وہ جب دہشت گردی کی بات کرتے ہیں تو اسے ایک ملت کہنے لگتے ہیں۔ یہ ہے وہ رویہ، یہ ہے مسلمانوں کے ساتھ سلوک، یہ ہے وہ عالمی دوغلا پن جس نے کشمیر سے فلسطین اور چیچنیا سے افغانستان تک کسی مسئلے کو علاقائی رہنے ہی نہیں دیا۔ کوئی ان مسائل کو اب میز پر بیٹھ کر مفادات کی تلوار سے ذبح نہیں کر سکتا۔ کوئی امن کی آشا کے گیت نہیں گا سکتا.....اس وقت تک جب تک عالمی ضمیر مسلمان خطوں میں اس صبح کے طلوع کی ضمانت نہیں بنتا جیسی صبح مشرقی تیمور، جنوبی سوڈان اور کریمیا میں طلوع ہوئی۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

امن کی آشا کا شہیدِ اوّل

حرف راز
اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

آج سے تقریباً پچپن سال قبل امن کی آشا کا ایک سفر ڈھاکہ، چٹا گانگ، کھلنا، نوا کھلی، فرید پور اور ایسے کئی سو مقامات پر شروع ہوا تھا۔ بنگال کا دانشور طبقہ قیام پاکستان سے اپنی شکست پر تلملایا ہوا تھا کہ یہ سب کیسے ہو گیا۔ دنیا بھر کے تعلیمی ادارے، سیاسیات کے ماہر، تاریخ کے شناور اور سیکولر دانشور صدیوں سے لوگوں کو یہ سبق پڑھاتے چلے آئے تھے کہ قومیں رنگ، نسل، زبان اور علاقے سے بنتی ہیں۔ اسی بنیاد پر جنگ عظیم اوّل کے بعد دنیا کو تقسیم کیا گیا۔ لیکن مشرق میں رہنے والے بنگالیوں کو کیا ہو گیا؟ ایک بنگالی تہذیب، ایک بنگالی زبان، مشترکہ ادبی اور ثقافتی ورثہ اور ایک ہی مسحور کن علاقے کے باوجود انہوں نے تحریک آزادی کے وقت ملک علیحدہ کر لیا اور وہ بھی اس لیے کہ یہاں کے رہنے والے کلمۂ طیبہ لا الہ الا اللہ پڑھتے ہیں۔ ان کے معروضی علم اور موضوعی دماغ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی۔ بنگال کی سرزمین سے علیحدہ اسلامی مملکت کی تحریک نے جنم لیا اور پھر مغربی حصہ بھی اس کا ہمنوا ہو گیا تھا۔ 1947ء میں تخلیق پانے والے اس پہلے اسلامی نظریاتی ملک نے بہت سے سینوں پر مونگ دلے اور ہزاروں دانشوروں کی امیدوں کو خاک میں ملا دیا۔ ادھر اس تقسیم سے ایک ایسے مذہب کے متشدد اور امن پسند دونوں طبقات نے بھی انتقام کی آگ کو بھڑکایا جو صدیوں سے ہند کی سرزمین کو پوتر اور پاک سمجھتے ہوئے مذہبی طور پر یہاں سے باہر جانے کو بھی حرام قرار دیتے تھے، جو اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ باہر سے آنے والے مسلمانوں نے اس دھرتی کو جو دیوتاؤں کی سرزمین ہے، ناپاک کر دیا ہے۔ وہ تمام مسلمانوں کو ملیچھ یعنی ناپاک تصور کرتے تھے۔ ملیچھ کا مقام ہندوؤں کی ذات پات کے مذہبی نظام میں شودروں اور دلتوں کے بھی بعد آتا ہے۔ مشرقی بنگال کے عوام کا مغربی ہندوستان کے لوگوں کے ساتھ مل کر ایک ایسا علیحدہ ملک بنانا جس کی بنیاد کلمۂ طیبہ ہو، سیکولر دانشوروں اور ہندو ویدانتی مذہب کے متوالوں دونوں کے لیے ایک المیہ تھا۔ اس سارے کھیل کو کیسے بگاڑا جائے؟ کس طرح رنگ، نسل، زبان اور علاقے کی بنیاد پر نفرت کی آگ بھڑکائی جائے؟ اس کے لیے ایک مصنوعی دشمن ضروری ہوتا ہے جس کی نسل، رنگ، زبان اور علاقہ مختلف ہو۔ مغربی پاکستان دشمنی کے اس معیار پر پورا اترتا تھا؛ چنانچہ سیاسی پنڈت اور معاشی ماہرین میدان میں کود ے۔ تجزیے، تبصرے اور معاشی جائزے پیش کیے گئے۔ دوسری جانب مغربی پاکستان میں حکومتی افسروں نے بھی اپنی بدترین غلطیوں سے نفرت کی تحریروں کے لیے مواد فراہم کیا۔ مشرقی پاکستان میں یہ تصور راسخ کر دیا گیا کہ مغربی پاکستان لٹیرا ہے۔ صحافت کے میدان میں یہ نعرہ زبان زدِ عام ہو گیا کہ ”مغربی پاکستان کی سڑکوں سے پٹ سن کی خوشبو آتی ہے“۔ نفرت کے اس شدید ماحول میں ایک ثقافت، ایک تہذیب، ایک زبان اور ایک ادبی ورثہ کے تحت امن کی آشا کے پھول کھلانے شروع کر دیے گئے... میگھا ایک طرح کی چھاتی ہے، برہم پتر دریا سب کو ایک طرح سیراب کرتا ہے... رقص و موسیقی کے دھارے ایک جیسے ہیں، ٹیگور مشترکہ ورثہ ہے... اور وہی نعرہ جو آج یہاں بھی لگایا جاتا ہے کہ ہم تین ہزار سال سے بنگالی، چودہ سو سال سے مسلمان اور صرف چند سالوں سے پاکستانی ہیں۔ تین ہزار سال سے عرب ہونے کا دعویٰ تو مکّہ میں ابوجہل کا تھا اور میرے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس نسلی تفاخر کی جڑ کاٹ کر رکھ دی تھی۔ جیسے مشرکین مکّہ کو نسل، زبان اور رنگ کی برتری کی شکست کا دکھ تھا ویسے ہی پاکستان کی تخلیق پر ان طبقات کی حالات بھی دیدنی تھی جن کے بنگالی اور ہندوستانی قومیت کے نعرے 14 اگست 1947ء کو ہوا میں تحلیل ہو گئے تھے۔ اس کا توڑ صرف امن کی آشا تھی، یہ یقین دلانا تھا کہ ہم ایک ہیں، نسلاً ایک ہیں، مذہب تو ایک ثانوی چیز ہے۔ اس کے بعد کی کہانی بہت دردناک ہے۔ اس کا آغاز اس دن سے ہو گیا تھا جب مغربی پاکستان کے سب سے مقبول لیڈر ذوالفقار علی بھٹو نے 1970ء کے انتخابات میں ایک امیدوار بھی مشرقی پاکستان میں کھڑا نہ کیا اور مشرقی پاکستان کے مقبول لیڈر شیخ مجیب الرحمن نے مغربی پاکستان میں تین برائے نام امیدوار کھڑے کیے۔ علیحدگی کی تحریر کا یہ پیش لفظ تھا جو ان دونوں رہنماؤں نے تحریر کر دیا تھا۔ اس کے بعد تاریخ کا خونچکاں باب شروع ہوا۔ ہوسِ اقتدار نے کھل کر عام انسانوں کے خون سے ہولی کھیلی۔ انسانی خون اور عزت و آبرو کی پامالی کے اس بدترین موسم میں کچھ دیوانے اور فرزانے ایسے تھے جو وطن کے پرچم، ملک کے نظریے کی حفاظت اور تحفظ کی جنگ لڑ رہے تھے۔ یہ نسلاً بنگالی تھے۔ ان کی زبان، رنگ اور علاقہ وہی تھا لیکن ان کے نزدیک پاکستان کا تحفظ اس متحدہ ریاست کا تحفظ تھا جو اللہ کے نام پر وجود میں آئی تھی۔ ان لوگوں میں عبدالقادر ملا بھی تھے، فرید پور کے رہنے والے جنہیں کل بنگلہ دیش میں تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔

اس ساری لڑائی، خونریزی، قتل و غارت اور دھما چوکڑی کے بعد جب مشرقی پاکستان کی متحدہ پاکستان سے علیحدگی ہوئی تو دنیا کے سامنے دو قومی نظریے کی وہ عظیم سچائی پھر ابھر کر سامنے آ گئی... نہ کسی کو بنگالی زبان یاد آئی اور نہ ہی یکساں ثقافت، کہا گیا کہ تم مسلمان ہو اس لیے تمہارا ملک علیحدہ ہو گا۔ مسلمان بنگالیوں کا بنگلہ دیش اور غیر مسلم بنگالیوں کا مغربی بنگال۔ لیکن معاشی پنڈتوں اور مغربی پاکستان کی لوٹ مار کی کہانی کا بھی بدترین انجام ہوا۔ 1971ء سے پہلے ایک بنگالی بھی بھارت میں چھوٹی موٹی نوکری کرنے نہیں گیا تھا، آج وہاں ایک کروڑ بنگالی دربدر خاک بسر چھوٹی چھوٹی نوکریاں کر رہے ہیں۔ 1971ء سے پہلے بنگالی عورت عزت و آبرو کے ساتھ اپنے شہروں میں زندگی گزار رہی تھی لیکن اب غربت و افلاس کا یہ عالم ہے کہ دس لاکھ بنگالی عورتیں دنیا بھر کے بازاروں میں بیچی جا چکی ہیں۔ کلکتہ کے بازارِ حسن میں ستر فیصد عورتیں بنگلہ دیشی ہیں۔ 1971ء سے پہلے بہت کم لوگ مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان میں چھوٹی موٹی نوکری کرنے آتے تھے لیکن آج یعنی 2013ء میں اندازاً بیس لاکھ بنگالی اس مغربی پاکستان میں معاشی مجبوری کی وجہ سے باروچی بنے ہوئے ہیں اور دوسری چھوٹی چھوٹی نوکریاں کر رہے ہیں۔ وہ لوگوں کے طعنے سنتے ہیں، پولیس والوں کو رشوتیں دیتے ہیں، جعلی شناختی کارڈ بناتے ہیں لیکن اپنے ”سنار بنگلہ دیش“ واپس نہیں جاتے جسے میرے ملک کے دانشوروں نے 1971ء میں انہیں اس طرح پیش کر دیا تھا کہ مغربی پاکستان سے آزاد ہو کر وہ دنیا کی خوشحال ترین قوموں میں سے ایک ہوں گے۔ امن کی آشا سے جب بنگلہ دیش کی آزادی ہوئی تو وہ سب کے سب مجرم بنا دیے گئے جو اس ایک ملک پاکستان کے تحفظ کی قسم اٹھاتے تھے اور اس سے محبت کرتے تھے۔ اس کے بعد امن کی آشا کے نقیب بھارت نے اس نوزائیدہ ملک کے ساتھ جو کیا وہ بھی ایک المناک داستان ہے۔ پچیس سال تک دو ارب ڈالر کی متروک اشیاء انہیں زبردستی بیچی گئیں اور ان سے ایک ڈالر کی چیز بھی نہ خریدی۔ دریاؤں کا پانی روکا گیا اور آج اس بنگالی قوم کے درمیان ایک باڑ ہے جسے عبور کرنے والوں کو گولی مار دی جاتی ہے۔ گزشتہ دنوں ایک دس سالہ بچی کی وہ تصویر دنیا بھر کے میڈیا کے لیے حیرت کا باعث بنی جو اس دس فٹ اونچی باڑ کو بمشکل عبور کر رہی تھی اور ایک زبان بولنے والے مغربی بنگال جا رہی تھی کہ اسے گولی مار دی گئی اور اس کی لاش بنگالی قومیت کے چہرے پر تصویر بن کر رہ گئی۔

یہ داستان طویل بھی ہے اور دلگداز بھی۔ اس داستان سے میرے ملک کی اکثریت ناآشنا ہے کیونکہ انہوں نے وہی کہانیاں پڑھی ہیں جو میرے ملک کے میڈیا پر قابض ”عظیم“ دانشوروں نے سنائی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان سے محبت کے جرم میں عبدالقادر ملا کو دی جانے والی پھانسی پر کوئی آنکھ اشکبار نہیں ہوئی، لیکن اللہ اس دن سے بچائے، اس وقت سے پاکستان کو محفوظ رکھے کہ آج جو آنکھیں بنگلہ دیش میں پاکستان کی محبت میں مرنے والوں اور فوج کا ساتھ دینے والوں پر خاموش ہیں اگر کل کہیں کوئی ایسی حکومت برسرِاقتدار آ گئی جو سوات آپریشن، وزیرستان کارروائی اور بلوچستان آپریشن میں پاکستان اور پاکستان کی فوج کا ساتھ دینے والے کو تختۂ دار پر کھینچنے لگی تو شاید ان کے لیے چند سطریں لکھنے والا بھی کوئی موجود نہ ہو۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

دنیا

امن کے قیام کا راستہ

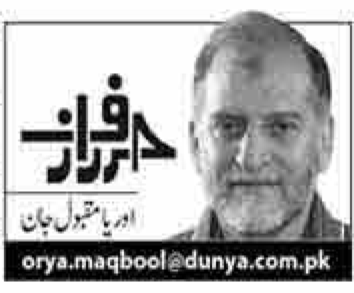

اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

دوسری جنگ عظیم کے شعلے سرد ہو چکے تھے لیکن جن ملکوں کی سرزمین پر یہ آگ اور خون کا کھیل کھیلا گیا وہاں بربادی اور تباہی کے منظر دھوئیں کے بادلوں کی طرح چھائے ہوئے تھے۔ کروڑوں انسان ابدی نیند سلا دیئے گئے اور ہزاروں بستیاں اور شہر کھنڈر بن گئے۔ نسل اور قوم کی برتری کے نعرے پر لڑی جانے والی یہ لڑائی جمہوری طور پر منتخب رہنماؤں نے خونخوار بھیڑیوں کا تاج سر پر سجا کر لڑی۔ نہ ہٹلر کوئی ڈکٹیٹر تھا اور نہ چرچل نے فوج کے ذریعے برطانیہ کے اقتدار پر قبضہ کیا تھا۔ دونوں اپنے اپنے ملکوں کے محبوب ترین جمہوری قائدین تھے۔ میدان جنگ سے کوسوں دور سمندر پار بسنے والا امریکہ بھی ایک لازوال جمہوریت کا علمبردار تھا۔ جنگ کے شعلے چڑھتے سورج کی سرزمین جاپان سے لے کر ایشیاء افریقہ اور یورپ کے ہر خطے کو اپنی لپیٹ میں لے کر خاکستر کر چکے تھے۔ اس خونریز لڑائی کے بعد جس طاقت نے اپنے پنجے اس دنیا میں آکٹوپس کی طرح گاڑے وہ امریکہ تھی۔ جنگ میں اسلحہ کی فراہمی نے اسے مالا مال کر دیا تھا اور دنیا پر ٹیکنالوجی کی برتری ثابت کرنے کے لیے اس نے ایٹم بم گرا کر ہیروشیما اور ناگاساکی کے شہروں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا تھا۔ میدان جنگ سے کوسوں دور امریکہ کے شہر جنگ کی گرد سے بھی دور تھے۔ نہ اس کے شہروں پر بمبار طیاروں نے پروازیں کیں اور نہ ہی فضائی بمباری سے بچنے کے لیے شہریوں کو بلیک آؤٹ کا سامنا کرنا پڑا۔ جنگ عظیم کی قتل و غارت اور تباہی و بربادی سے دور امریکہ نے یہ جان لیا تھا کہ اب اس کی طاقت کا لوہا مانا جا چکا ہے۔ جہاں اس کی فوجی برتری قائم ہوئی' وہیں معاشی برتری کا سکہ بھی چلنے لگا۔ ہر تباہ شدہ ملک امریکی امداد کا محتاج تھا' لیکن امریکی ذہن کسی اور جنگ کے منصوبے سوچ رہا تھا۔ ایک ایسی جنگ جو دنیا کو خوف میں مبتلا رکھے' ملکوں میں خون بہتا رہے' بارود کی بو سے بستیاں آلودہ ہوتی رہیں' اسلحے کی منڈی سجی رہے اور اس کے نتیجے میں امریکی بالادستی کے ساتھ امریکی معیشت بھی ترقی کرتی رہے۔ اس جنگ کو امریکہ کے منصوبہ ساز ذہن نے سرد جنگ کا نام دیا۔ پوری دنیا کو اب دائیں اور بائیں بازو میں تقسیم کر دیا گیا۔ نسل' رنگ اور زبان کی بنیاد پر بہت خون بہایا جا چکا تھا۔ اب اس نعرے میں کشش باقی نہ تھی۔ اسی لیے نظریات کی بنیاد پر ایک نئی جنگ کا آغاز کیا گیا۔ یہ جنگ کمیونسٹ شدت پسندوں کے خلاف تھی اور اس جنگ کا ایندھن سب سے پہلے امریکہ کے اپنے پڑوسی ممالک تھے جو براعظم جنوبی امریکہ میں واقع تھے۔ ان تمام ممالک میں مزدوروں' کسانوں اور غریب عوام کے جذبات کی نمائندگی کرنے والی سب تنظیموں کو جمہوریت' امن' انسانیت اور ترقی کا دشمن قرار دے کر کمیونزم کے کھاتے میں ڈالا گیا۔ ایسے افراد اگر حکومت حاصل کر لیتے یا حاصل کرنے کے قریب ہوتے تو فوج کے ذریعے ان کا تختہ الٹ کر انہیں جنگلوں' پہاڑوں اور پناہ گاہوں میں دھکیل دیا جاتا جہاں انہیں گوریلا جنگجو کے نام سے بدنام کر کے ان کے خلاف کارروائی کی جاتی۔ آگ اور خون کی اس تاریخ کا آغاز جنگ عظیم دوئم کے خاتمے کے ٹھیک ایک سال بعد یعنی 1946ء میں امریکہ میں Army School of Americas کے قیام سے ہوا۔ اس سکول میں جنوبی امریکہ کے ممالک سے افواج کو کمیونسٹ گوریلوں سے لڑنے کی تربیت دی جاتی۔ انہیں وہ گر سکھائے جاتے کہ کیسے لوگوں کو غائب کرنا' کس طرح انہیں بدترین تشدد سے ناکارہ بنانا اور کس طرح فوجی ایکشن کے ذریعے بستیوں کی بستیاں ویران کرنا ہیں۔ اس سکول کا نصاب اس قدر متشدد تھا کہ اس سے فارغ التحصیل لوگوں نے اپنے ملکوں میں یا تو قتل کیے یا پھر افراد کو سرے سے لاپتہ کر دیا۔ اس سکول کے بارے میں مشہور کانگریس مین اسٹیبان ٹورس (Esteban Torres) نے کہا کہ یہاں صرف اور صرف تشدد' ترغیب' بلیک میلنگ اور کرپشن کے طریقوں کی تعلیم ہوتی تھی۔ یہ سکول 50 سال تک کام کرتا رہا اور اس نے جنوبی امریکہ کے ممالک سے 60 ہزار فوجیوں کو تربیت دی۔ یہ سکول امریکہ کی خارجہ پالیسی کا اہم ستون تھا۔ وہ خارجہ پالیسی جو جنگ عظیم دوئم کے بعد جارج کینن (George Kennan) نے مرتب کی۔ اس نے کہا تھا ہم دنیا کی آبادی کا صرف 6.3 فیصد ہیں لیکن ہمارے پاس دنیا کی 50 فیصد سے زیادہ دولت آ چکی ہے۔ ہمارا سب سے بڑا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہم اس تضاد کو قائم رکھیں' بے شک اس کے لیے دنیا بھر کے ممالک کو ایک خوف میں مبتلا کر دیں اور جنگ کے میدان وضع کرتے رہیں۔ لیکن ایسا کرتے ہوئے ہمارے ملک کی سالمیت اور سکیورٹی نظرانداز نہیں ہونی چاہیے۔ اس خارجہ پالیسی سے امریکی افواج نے دنیا بھر میں ہر ترقی پذیر ملک کو جنگ اور ہر ترقی یافتہ ملک کو خوف کا شکار کر دیا۔ اس سکول میں تربیت کے لیے تشدد کے ذریعے راز اگلوانے سے لے کر نفسیاتی طور پر ناکارہ کرنے کے کئی مینوئل پڑھائے جاتے تھے۔ سالٹر سٹیفنی (Salter Stephanie) نے 1999ء میں اپنی کتاب میں ان تمام مینوئلز کا ذکر کیا ہے جو آج بھی دنیا بھر کی بدنام زمانہ جیلوں میں استعمال ہوتے ہیں جن میں گوانتاناموبے اور ابوغریب جیل شامل ہیں۔ اس سکول سے فارغ التحصیل ایسے لوگوں کی ایک طویل فہرست ہے جنہوں نے اپنے ملکوں میں جا کر یا تو منتخب حکومتوں کے تختے الٹے یا پھر فوج میں رہتے ہوئے ہزاروں لوگوں کو لاپتہ کیا اور ہزاروں کو آپریشن کے نام پر قتل۔ ارجنٹائن کا ایملو میرا' بولیویا کا ہوگو سبزر' چلی کا راڈل اتیروگا' یوی ڈور کا گوہیر موا السلواڈور کا رابرٹو اربسن' گیمبیا کا صدر یحیٰ جامہ' گوئٹے مالا کا مارکو انسٹونیو' پانامہ کا نوری ایگا اور پیرو کا ولادی میر جونٹین اور ایسے کئی افراد شامل ہیں جنہیں ان کے ملکوں میں اقتدار پر امریکی فوج کی مدد سے قابض کروایا گیا اور پھر انہوں نے تیس سال ایک امریکی جنگ اپنی اقوام پر مسلط کی۔ لیکن روس کی کمیونسٹ حکومت کے خاتمے کے بعد یہ نعرہ ان لوگوں سے چھن گیا۔ ادھر جنوبی امریکہ کے ممالک کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اس امریکی جنگ نے ان کے شہر ویران' معیشت تباہ اور لاکھوں افراد قتل کروا دیئے ہیں۔ کسی قوم کے لیے یہ احساس کافی تھا۔ ہر ملک نے علیحدہ علیحدہ امریکہ کو خیرباد کہنا شروع کیا۔ اپنے ناراض لوگوں کو ساتھ ملایا' ان سے صلح کی اور آج وہ سب چین سے ہیں۔ آج جنوبی امریکہ کے ممالک ترقی کی شاہراہ پر ہیں۔ ایسا کرنے کے لیے انہیں کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ اس کی دو بنیادی وجوہات تھیں' ایک یہ کہ انہوں نے یہ یقین پختہ کر لیا تھا کہ اب امریکہ کی جنگ ہم نے اپنے ملک میں نہیں لڑنی اور دوسری بات یہ کہ جتنا خون یہاں پر بہہ چکا ہے' جتنے قتل ہو چکے ہیں' جتنے لاپتہ افراد ہیں ان کا الزام ایک دوسرے پر رکھ کر امن کا راستہ خراب نہیں کرنا۔ پوری قوم امن چاہتی تھی۔ ہر ملک اس اذیت سے نجات چاہتا تھا۔ وہاں کسی دانشور' ادیب' صحافی' سیاسی یا مذہبی رہنما نے یہ سوال نہیں اٹھایا کہ اتنے ہزار شہداء کے خون کا سودا مت کرو' اتنے لاپتہ افراد کے قاتل فوجیوں پر مقدمہ چلاؤ' اتنے فوجیوں اور سکیورٹی فورسز کے قاتلوں سے بدلہ لو۔ بس ایک نکتے پر سب جمع ہو گئے تھے کہ ہمیں امن چاہیے اور ہم اس امن سے پرانے زخموں کو دھو لیں گے' پرانی رنجشوں کو بھول جائیں گے' امن کی اس خواہش اور سکون کی اس تلاش نے پورے جنوبی امریکہ کو امن' اطمینان اور خوشحالی واپس لوٹا دی۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

روزنامہ دنیا

امریکہ کی رخصتی اور سیکولر‘ لبرل حضرات کا المیہ

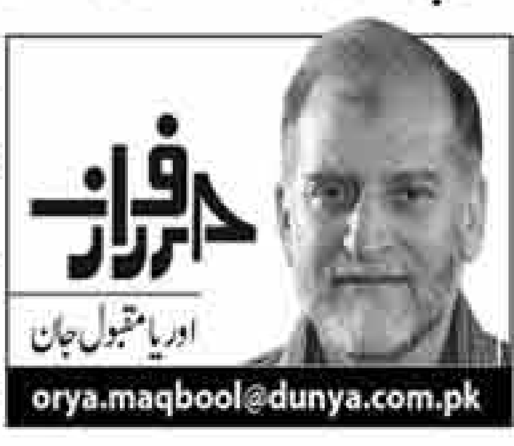

اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

لاہور کی مال روڈ پر گورنر ہاؤس اور ایچی سن کالج کے درمیان رومن ستونوں والی ایک عمارت ہے جس میں پاکستان کی بیوروکریسی کی آخری تربیت کے لیے چھ ماہ کا ایک کورس کروایا جاتا ہے۔ انہیں دنیا کے مختلف ممالک میں گھمایا جاتا ہے اور ان کے ہاں انتظامی مشینری کے بارے میں معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ اس کورس کے بعد یہ بیوروکریٹ سرکاری محکموں کے اعلیٰ ترین عہدوں پر تعینات ہونے کے اہل ہو جاتے ہیں۔ تربیت کے دوران دنیا جہان کے ماہرین ان لوگوں کو حکمرانی کے گُر سکھاتے اور دنیا بھر میں ہونے والے واقعات‘ سانحات اور ان سے جنم لینے والی انتظامی مشکلات پر قابو پانے کے طریقے بھی بتاتے ہیں۔ کیسے کیسے لوگ کیسی کیسی تھیوریاں پیش کرتے ہیں۔ پرانے گرو بھی آتے ہیں اور نئے شہسوار بھی۔ عالمی اقتصادی پس منظر کے ماہر بھی تشریف لاتے ہیں اور مقامی سیاست کے کیڑے بھی۔ سفیر بھی وہاں اپنے ملکوں کا دفاع کرتے ہیں اور دنیا کے بڑے بڑے تھنک ٹینکوں میں بیٹھے مفکرین بھی حیران کن تجزیے آپ کے سامنے رکھتے ہیں۔ دو سال قبل یعنی 2011ء میں مجھے نوکری کے لوازمات کے طور پر اس کورس میں تربیت حاصل کرنا پڑی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ڈرون حملے عروج پر تھے اور ہر کوئی اس ٹیکنالوجی کے گُن گا رہا تھا۔ حکومت عوام کے سامنے اپنی بے بسی کا اظہار کر رہی تھی لیکن اندرونِ خانہ انہیں ایک نعمت تصور کیا جاتا تھا۔ اسی معاملے پر اسی رومن ستونوں والی عمارت جسے عرفِ عام میں سٹاف کالج کہتے ہیں‘ خیبر پختونخوا میں فاٹا کے ایک اعلیٰ ترین ذمہ دار فرد نے حالات و واقعات پر ایک طویل بریفنگ دی۔ یوں تو اس میں بہت سے معاملات کو سرکاری زبان میں ”خفیہ“ یا سٹیٹ سیکرٹ کا درجہ حاصل تھا لیکن ڈرون حملوں کے بارے میں ان کی فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ منہ سے نکلنے والا جملہ ایسا تھا کہ میں سر سے پاؤں تک لرز گیا۔ انہوں نے کہا ”یہ ڈرون نہیں ”ابابیلیں“ ہیں بالکل ویسی ہی جیسی اللہ نے ابرہہ کے لشکر پر بھیجی تھیں اور انہیں کنکریاں مار کر کھائے ہوئے بھُس کی مانند کر دیا تھا“۔ یہ ایک ایسی دلیل تھی جس پر انتظامی امور کے ماہرین تو بہت ہی خوش تھے لیکن ان لوگوں کی بھی حسرت دیکھنے کے قابل تھی جو یہ چاہتے ہیں کہ امریکہ کی طاقت اس ملک میں ہر اس شخص کا خاتمہ کر دے جس کے منہ پر اللہ کا نام ہو اور دل میں اسلام سے محبت۔ یہ خواہش صرف پاکستان میں موجود لبرل یا سیکولر افراد اور دانشوروں کی نہیں بلکہ یہ بیماری عالمی ہے۔ سیکولرازم اور لبرل ازم کے سب سے بڑے پرچارک ایچ جی ویلز نے بار بار اس کا اظہار کیا ہے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں اس کی تقریر تو دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اس نے کہا تھا کہ ہمیں حکومتوں پر قبضہ کر کے سیکولر اخلاقیات اور لبرل خیالات کو زبردستی نافذ کرنا چاہیے اور طاقت کے ساتھ مذہبی تصورات کی بیخ کنی کرنی چاہیے ورنہ مذہبی خیالات والے چھا جائیں گے۔ ایچ جی ویلز کی اس ”شاندار“ منطق پر بہت سے مسلمان ملکوں میں زبردستی عمل کروایا گیا اور ہر دور کے دانشوروں نے اس تھیوری کا ساتھ دیا۔ مصر میں جمال عبدالناصر برسرِ اقتدار آیا تو اس ظالم فوجی ڈکٹیٹر کو روشن خیال کہا گیا اور اخوان المسلمون کو فتنہ پرداز۔ یہی رویہ شام میں حافظ الاسد‘ عراق میں صدام‘ لیبیا میں قذافی اور دیگر سیکولر ڈکٹیٹروں اور آمروں کے ساتھ روا رکھا گیا۔ پاکستان میں اس کی مثال پرویز مشرف تھی۔ ان سب کی حمایت میں ایک دلیل دی جاتی ہے کہ ”دیکھو ان کے زمانے میں عالمی برادری میں ہماری کتنی عزت ہے“ یہ لوگ ماورائے عدالت قتل کریں‘ ہزاروں افراد کو لاپتہ کر دیں‘ بستیوں کی بستیاں اجاڑ دیں‘ اپنے ملک میں قتل و غارت کا بازار گرم کر دیں‘ ان کے تمام قصور صرف اس بنیاد پر معاف کر دیے جاتے ہیں کہ ان کی وجہ سے عالمی برادری میں ہمارا امیج بلند ہو رہا ہے۔ یہ تمام کے تمام سیکولر ڈکٹیٹر اس عالمی برادری سے تعریف کی سند صرف اس وجہ حاصل کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے ملک میں مذہبی قوتوں کی بیخ کنی کی ہوتی ہے۔ ان کا جینا دوبھر کیا ہوتا ہے۔ ان کے لیے زندگی اذیت ناک بنائی ہوتی ہے۔ انہیں صفحۂ ہستی سے غائب کیا ہوتا ہے۔ انہی سیکولر ڈکٹیٹروں کے حواری ڈرونز کو ابابیلوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ سٹاف کالج میں جب وہ ذمہ دار شخصیت یہ منطق پیش کر رہی تھی اور اس کے لیے میرے دین کا سہارا بھی لے رہی تھی تو میں نے سوال کیا ”کیا ابرہہ کے لشکر میں بچے اور عورتیں بھی شامل تھیں؟ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اللہ کی طرف سے مامور ابابیلیں اور ان کے ہاتھوں میں موجود کنکر اسی طرح غلطی کرتے تھے کہ جیسے امریکہ کے ڈرون کرتے ہیں؟ ابرہہ کے لشکر کا مقام مکہ سے چند میل کے فاصلے پر تھا۔ کیا کوئی ایک ابابیل بھی اڑ کر یا راستہ بھٹک کر مکہ گئی اور اس نے قریش کے کسی شخص یا گروہ پر کنکریاں پھینکیں؟“ اس سوال کا جواب نہ اس اعلیٰ افسر کے پاس تھا اور نہ ہی ڈرونز کی وکالت کرنے والے کسی بھی شخص کے پاس ہے۔ وہ سینکڑوں بے گناہ جو ان ڈرون حملوں میں مارے گئے ان کے بارے میں میرے ملک کا میڈیا اس قدر بے حس ہے کہ ان کے خاندانوں کے المیے پر ایک رپورٹ تک شائع نہ ہوئی۔ بغداد‘ بیروت اور کابل جا کر جنگوں کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرنے والے اینکر پرسنوں اور کالم نگاروں نے کبھی بھی ان گھروں کی روئیداد بیان نہ کی جن میں معصوم بچوں اور عورتوں کے جسم چیتھڑے بن گئے تھے۔ ان لوگوں سے تو مغرب میں بسنے والے صحافی ہی بہتر نکلے کہ گارڈین نے 25 اکتوبر 2013ء کی اشاعت میں ایک ایسے خاندان کی کہانی شائع کر دی جن کے گھر پر 24 اکتوبر 2012ء کو ڈرون حملہ ہوا تھا۔ یہ خاندان میرے ملک میں اپنی کہانی لیے لیے گھومتا رہا لیکن کسی صحافی‘ اینکر پرسن اور انسانی حقوق کے علمبردار کو ان کا خیال نہ آیا۔ ان لوگوں نے اس ملک سے باہر موجود انسانوں کو پکارا اور کہانی چھپ گئی جو یوں تھی۔ جس دن ان کے گھر پر ڈرون حملہ ہوا اس وقت ان کی 65 سالہ ماں مومنہ بی بی عید سے پہلے سویاں تیار کر رہی تھی۔ رفیق الرحمٰن کے تین بچے 13 سالہ زبیر‘ 9 سالہ نبیلہ اور 5 سالہ اسماء باہر کھیل رہے تھے جو شدید زخمی ہوئے۔ اگلے دن اخبار میں خبر شائع ہوئی کہ ڈرون حملے میں 5 شدت پسند مارے گئے اور ڈرون حملہ ایک گاڑی پر کیا گیا حالانکہ اس پورے علاقے میں کوئی سڑک ہی نہیں ہے۔ مومنہ ایک بزرگ خاتون تھی جو پورے گاؤں میں واحد دائی تھی جبکہ اس گاؤں سے میلوں دور بھی کوئی ہسپتال نہیں ہے۔ یہ صرف ایک کہانی ہے۔ ہر ڈرون حملے کی ایسی ہی کئی کہانیاں ہیں۔ ایسے ہی جھوٹ ہیں جو پہلے امریکہ بولتا ہے پھر پاکستانی میڈیا ان کو اٹھاتا ہے کہ اتنے دہشت گرد مارے جا رہے ہیں۔ کیا شاندار منطق ہے کہ ڈرون حملے طالبان کی کمر توڑ سکتے ہیں۔ اگر یہی دلیل پورے ملک کے لیے مان لی جائے تو پھر ہر تھانے کے ایس ایچ او کو چند میزائل‘ بم یا توپیں دے دی جائیں کہ جاؤ فلاں مجرم کے گھر پر حملہ کرو اور وہاں جو بھی موجود ہے اس کو مار دو۔ عین ممکن ہے کہ بچوں کے ساتھ مجرم بھی مارا جائے۔ نہ مارا جائے تو پھر بھی تمہارے حامی صحافی اور دانشور اس کے مرنے کا اعلان کر ہی دیں گے اور تمہارے اس قاتلانہ فعل کی حمایت بھی کریں گے۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ اس ملک کے سیکولر اور لبرل طبقے کے سر سے پہلے پرویز مشرف کا سایہ اُٹھا اور اب امریکہ بھی اپنا بوریا بستر لپیٹ کر جا رہا ہے۔ ان کی حالت سعادت حسن منٹو کے افسانے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں پاگل خانے کے دو کرداروں جیسی ہو گئی ہے۔ یہ کردار یوروپین وارڈ میں دو اینگلو انڈین پاگل تھے۔ ان کو جب معلوم ہوا کہ ہندوستان کو آزاد کر کے انگریز چلے گئے ہیں تو ان کو بہت صدمہ ہوا۔ وہ چھپ چھپ کر گھنٹوں آپس میں اس اہم مسئلے پر گفتگو کرتے رہتے کہ پاگل خانے میں ان کی حیثیت کس قسم کی ہو گی۔ یوروپین وارڈ رہے گا یا اڑا دیا جائے گا۔ بریک فاسٹ ملا کرے گا یا نہیں۔ کیا انہیں ڈبل روٹی کے بجائے بلڈی انڈین چپاتی تو زہر مار نہیں کرنا پڑے گی۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

انگریز اور انگریزی کے مدح خواں

حرف راز
اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

انگریز اور انگریزی ذریعہ تعلیم کے مداح شاید اب بھی اسی خواب میں گم ہیں کہ اس ملک میں ہزاروں پرائیویٹ سکولوں کی ایک نرسری قائم ہونے کے بعد یہ ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہو چکا ہے اور کچھ عرصے کے بعد اس خطے میں بے مثل انتظامی آفیسر، بہترین سائنسدان اور عظیم دانشور پیدا ہونے شروع ہو جائیں گے۔ انہیں اس بار کے سول سروس کے بدترین نتائج کو غور سے دیکھ لینا چاہیے اور پھر ان گیارہ ہزار چار سو چھ امیدواروں کے سکولوں کے بارے میں معلومات اکٹھی کر کے غور کرنا چاہیے کہ ہم نے اس قوم کو کس دلدل میں پھنسا دیا ہے۔ یہ نتائج سول سروس کی تاریخ کے بدترین نتائج ہیں۔ صرف دو فیصد امیدوار یہ امتحان پاس کر سکے۔ اس امتحان میں بیٹھنے والے سب امیدواروں کے والدین نے روکھی سوکھی کھا کر انہیں برساتی کھمبیوں کی طرح پھیلے انگلش میڈیم سکولوں میں داخل کرایا۔ یہیں سے وہ اے اور او لیول میں نمایاں نمبر لے کر ان کالجوں اور یونیورسٹیوں میں گئے جو مروجہ نظام تعلیم سے مختلف اور خود کو آکسفورڈ کیمبرج اور ہارورڈ کی روایت کی وارث اور امین سمجھتی ہیں۔ ان کے والدین نے ان پر لاکھوں روپے فیسوں اور دیگر اخراجات کے طور پر خرچ کیے۔ آج سے پندرہ بیس سال قبل اس ملک میں شاید ہی کوئی ایک ایسا ادارہ موجود ہوتا ہو گا جو سول سروس کے امتحان کے لیے خصوصی تعلیم کا بندوبست کرتا ہو۔ لیکن آج ہر بڑے چھوٹے شہر میں ایسے اداروں اور اکیڈمیوں کا جال بچھا ہوا ہے جو اس ملک کی انتظامیہ کے سرخیل بننے کے خواہش مندوں کو تربیت دیتی ہیں۔ ان اکیڈمیوں میں ہر مضمون کا ایک ماہر طالب علموں کو سول سروس کے امتحان کی تیاری کراتا ہے۔ بہت سے ریٹائرڈ سول سرونٹ امتحان میں کامیابی کے گُر بتاتے ہیں۔ یہ سلسلہ گزشتہ پندرہ سالوں سے جاری ہے۔

لیکن ان اداروں میں اب جو نسل داخلہ لے رہی ہے یا ان امتحانات میں جو لوگ ہر سال جوق در جوق شریک ہوتے ہیں ان کی بنیادی تعلیم اب ایک ایسی زبان میں ہونے لگی ہے جو ان کی تعلیمی استعداد کو شدید متاثر کر رہی ہے۔ تمام درسگاہیں اور ماہرینِ تعلیم متفق ہیں کہ کسی غیر ملکی زبان میں علم کی ترسیل اور اس کو سمجھنے کی صلاحیت تیس فیصد سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اس کے بعد اس زبان میں اظہار کرنے، لکھنے یا بولنے کی صلاحیت اور کم ہو جاتی ہے۔ اس لیے جب بھی کوئی فرد انگریزی زبان میں مضمون پڑھتا ہے تو دوسرے کو سمجھانے کے لیے اور اس کا مافی الضمیر بیان کرنے کے لیے اردو، پنجابی، پشتو، سندھی، بلوچی کا استعمال کرتا ہے تاکہ بات اگلے کے ذہن میں اچھی طرح بیٹھ جائے۔ ہمارے گزشتہ ایک سو سال کے نظام تعلیم کی یہی ایک خوبی تھی کہ لولا لنگڑا سہی، تکیہ، اپنی زبان پر ہی کیا جاتا تھا اور ایک عام سا استاد بھی بچپن میں یہ بات اپنے شاگردوں کے ذہن میں بٹھا دیتا تھا۔ پھر کسی حد تک اہم معاشرتی مضامین اردو میں ہوتے تھے جن کی وجہ سے طالب علم کو تاریخ اور حالات حاضرہ سے ایک خاص دلچسپی پیدا ہوتی تھی اور وہ عام سے انگریزی مضمون کو بھی ایک دوسرے سے

بحث

مباحثے کے بعد اچھی طرح ذہن میں اتار سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے بچپن سے لے کر جوانی تک قصوں، کہانیوں اور دیگر معلومات کا ماخذ اس کی اپنی زبان ہوتی تھی۔ اس دماغ کی سکرین پر جو دنیا آباد ہوتی وہ اسے اپنے حوالے سے پوری دنیا کو سمجھنے میں مدد دیتی۔ یوں اس ذہن کی صلاحیتیں بھی کھل کر سامنے آتیں اور وہ ایک ایسا شخص بن کر نکلتا' جسے بیک وقت دو یا تین زبانوں کو سمجھنے کا ملکہ حاصل ہوتا۔ اپنی مادری زبان، قومی زبان اردو جس میں اس کے اجتماعی لاشعور نے وہ سارے تلازمے اور لفظ اکٹھے کیے ہوتے اور پھر انگریزی۔ لیکن اب موجودہ نظام تعلیم نے اسے جب سے انگریزی تک محدود کیا ہے وہ غبی بن کر رہ گیا ہے اور (انگریزی کے طفیل) اس کی ساری تخلیقی صلاحیتیں تباہ ہو کر رہ گئی ہیں۔

دلیل دی جاتی ہے کہ اس سے تعلیم بہتر ہو گی۔ ان لوگوں کو شاید علم نہیں کہ ایک انگریز بچہ سکول کے علاوہ باقی پندرہ بیس گھنٹے گھر اور محلے میں ہزاروں ایسے محاورے، قصے، کہانیاں اور تبصرے انگریزی زبان میں سنتا ہے جو اس کی یادداشت اور ذہانت کا حصہ بن جاتی ہیں اور اس کا ذہن دن بدن وسعت اختیار کرتا جاتا ہے۔ پاکستان میں' جب بچہ سکول سے باہر آتا ہے تو پھر وہ انگریزی کو خیرباد کہہ دیتا ہے۔ محلے میں، گھر، دکان اور ہوٹل پر وہ روزمرہ' محاورے' کہانیاں' ضرب الامثال' غصے کے اظہار میں گالیاں' دکان یا ہوٹل پر لین دین اور ریڈیو ٹیلی ویژن پر تبصرے سب اردو یا مقامی زبان میں کہہ سن رہا ہوتا ہے۔ یوں یہ ایک بیگانے ماحول میں پروان چڑھتا ہے جس کا اس کی تعلیمی صلاحیت بڑھانے میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ نہ اس کا محاورہ بہتر ہوتا ہے اور نہ ہی زبان۔ نہ اس کی قوتِ استدلال یا بیان کرنے کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے اور نہ ہی اس کے علمی تناظر میں وسعت آتی ہے۔ سکول معاشرے سے اجنبی اور معاشرہ سکول سے اجنبی۔ یہ ہے ہمارا المیہ جس کی وجہ سے آج سول سروس کے امتحانات میں ہم دو فیصد نتائج حاصل کرنے کا ''تمغہ امتیاز'' سینے پر سجائے ہوئے ہیں۔ میں اس فقرے کو ایک بار پھر دہرانا چاہوں گا جسے میں نے بارہا دہرایا ہے کہ دنیا کی پانچ ہزار سالہ تاریخ میں کوئی ایک قوم بھی ایسی نہیں جس نے کسی دوسرے کی زبان میں علم حاصل کیا ہو اور پھر ترقی بھی کی ہو۔ اس لیے آپ کسی دوسرے کی زبان میں علم سکھا تو سکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس زبان میں تخلیقی صلاحیتیں مردہ ہو جاتی ہیں۔

ان پانچ ہزار سالوں میں دو ملکوں' بھارت اور سنگاپور نے انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانے کی حماقت کی۔ سنگاپور گزشتہ پانچ سال سے سرتوڑ کوشش میں ہے کہ واپس کیسے آیا جائے اور بھارت میں اب تمام پالیسی ساز اداروں نے گھنٹی بجا دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بھارت سائنس کے میدان میں نقلچی بن کر ابھر رہا ہے۔ ہر سال 22 کروڑ بچے سکول میں داخل ہوتے ہیں اور 40 لاکھ سے بھی کم گریجوایٹ بن پاتے ہیں۔ دنیا میں جن ممالک میں سو فیصد شرح خواندگی ہے وہ سب کے سب اپنی قومی زبان میں تعلیم دیتے ہیں۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے پہلے پرنسپل لائیٹنر نے پنجاب کی تعلیمی حالت پر تقریباً تین ہزار صفحات پر مشتمل رپورٹ لکھی۔ اس کا لب لباب یہ ہے کہ انگریزوں کے آنے سے پہلے یہاں سو فیصد شرح خواندگی تھی اور یہی حال سندھ اور خیبر پختونخوا کا تھا۔ لیکن انگریز کے جانے تک ہماری شرح خواندگی گر کر گیارہ فیصد تک آ گئی تھی۔ انگریز اور انگریزی کے مدح خواں اس قوم سے اور کتنا انتقام لینا چاہتے ہیں؟۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے

دنیا پوری میں دو تصورات رکھنے والے لوگ پائے جاتے ہیں۔ایک وہ جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کائنات دراصل ایک حیرت انگیز سائنسی کھیل ہے جس کی سب سے کامیاب اور عظیم ایجاد انسان ہے جو سوچنے، سمجھنے، گفتگو کرنے اور کائنات کے رازوں کو ڈھونڈ کر کائنات کو تسخیر کرنے کا ملکہ رکھتا ہے۔اسی کی کوششوں سے دنیا خوبصورت بنتی ہے اور اسی کے ظلم و ناانصافی سے دنیا جہنم کی صورت ڈھل جاتی ہے۔دنیا میں کوئی واقعہ، کام، ایجاد، یا ترقی ایسی نہیں جس کی کوئی وجہ نہ ہو۔علت و معلول یعنی Cause اور Effect کا تصور۔ان تصورات کے حامل سائنسدانوں، دانشوروں، فلسفیوں اور عالموں کی ایک سوچ یہ بھی ہے کہ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ کائنات خود بخود ایک سائنسی عمل سے وجود میں نہیں آئی تھی بلکہ اس منظم اور مربوط دنیا کو کسی عظیم ہستی یعنی خالق کائنات نے تخلیق کیا ہے تو پھر بھی وہ اس دنیا کو معرضِ وجود میں لا کر اب بس تماشہ دیکھ رہا ہے اور یہاں پر بسنے والے انسانوں اور حیوانوں کے اس کھیل سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔اس نے دنیا کو ایک سائنسی نظام کے تحت ترتیب دے دیا ہے اور اب یہ دنیا اس سائنسی نظام کی پابند اور محتاج ہے۔دنیا میں بلاوجہ سیلاب نہیں آسکتا، زلزلہ نہیں آتا، بیماریاں، قدرتی آفتیں، تباہیاں کسی وجہ سے ہوتی ہیں۔اسی طرح انسان جو کچھ اس دنیا میں کرتا ہے اس پر سزا و جزا کا بھی اسے یہیں پر مکمل اختیار ہے۔وہ چاہے تو شہر کے شہر برباد کر دے اور پھر بھی عظیم فاتح کہلائے۔لوگوں کو بھوک اور قحط کا شکار کر لے، ان سے بیگار لے، غلام بنائے لیکن اپنے اثر و رسوخ اور اقتدار کی وجہ سے اسے کوئی مجرم نہ گردانے، اس پر کوئی ہاتھ ڈالنے والا نہ ہو۔یہی سوچ ہے جو دنیا میں ہونے والی ہر ترقی اور ہر تباہی کا بھرپور سیاسی، سماجی، معاشرتی اور سائنسی تجزیہ کرتی ہے۔خانہ جنگی کیوں ہوئی، کیسے قتل و غارت شروع ہوا، فصلیں کیسی برباد ہوئی، ملک کیسے تباہ ہوئے، قومیں کیسے غلام نہیں، ان سب کا شاندار تجزیہ دنیا بھر میں میسر ہے۔لیکن دوسرا تصور رکھنے والے وہ لوگ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ اس کائنات کو اللہ نے ایک خاص مقصد، حسن ترتیب، عظیم منصوبہ سازی اور شاندار ہیئت ترکیبی سے پیدا کیا ہے۔اس نے اس دنیا میں انسان کو سوچنے، سمجھنے، دیکھنے، سننے اور گفتگو کرنے کے ساتھ علم کی دولت اس لیے عطا کی ہے کہ وہ اس خالق کائنات کے فرامین کے مطابق اس دنیا کو حسین، خوبصورت اور رہنے کے قابل بنائے۔اس کے لیے اس اللہ نے روز آخر جزا اور سزا کا ایک نظام مقرر کر رکھا ہے۔روز حشر ہر فرد تنہا اور اکیلا اپنی فردِ عمل کے ساتھ پیش ہوگا۔اللہ فرماتا ہے "اور ان میں سے ہر شخص قیامت کے دن اللہ کے حضور میں پیش ہو گا فرداً فرداً" (سورۃ مریم: 95) لیکن قوموں اور ملتوں کے بارے میں اس کائنات کا روّیہ اور تصور مختلف ہے اور وہ قرآنِ پاک میں بار بار اس کا اظہار کرتا ہے۔اس کے نزدیک قوموں پر انعامات کی بارش اور آزمائشوں کے نزول کی وجوہات ہیں۔وہ قوموں کو سرفراز بھی کرتا ہے اور صفحۂ ہستی سے مٹا بھی دیتا ہے۔یہ سب وہ اس لیے کرتا ہے کہ یہ دنیا اس کا باغ ہے۔وہ اس باغ کی ذمہ داری انہیں کو سونپتا ہے جو اسے خوبصورت بنانے کے اہل ہوتے ہیں۔وہ ایک عرصہ لوگوں کو مہلت دیتا ہے لیکن اگر اس ملت کے دوران وہ لوگ زمین کو فساد سے بھر دیں، اس میں رہنے والوں کے لیے عرصۂ حیات تنگ کر دیں۔دنیا کے اس باغ کو اپنی بداعمالیوں کی جھاڑیوں اور بدکرداریوں کے کانٹوں سے آباد کر دیں تو پھر اللہ خود صفائی کا حکم صادر فرماتا ہے۔زلزلے، طوفان، سیلاب، وبائیں یہ سب اس کے حکم کی عمل داری سے آتے ہیں۔لیکن وہ ظالموں کو ظالموں سے لڑا کر بھی دنیا میں امن قائم کرتا ہے اور گروہوں میں تقسیم کر کے، ایک دوسرے کی گردنیں کٹوا کر بھی عذاب کا مزا چکھاتا ہے۔

ہم اس کے صفائی کے حکم کی زد میں آچکے ہیں۔جس قوم کو اہل نظر گزشتہ دس سال سے صرف ایک بات کی تلقین کر رہے تھے کہ اپنی بربادی اور عذاب سے بچنے کے لیے اللہ سے رجوع کرو۔اس سے معافی کے طلبگار ہو جاؤ۔وہ اللہ جو قرآن پاک میں کس قدر امید کے ساتھ انسانوں کی جانب دیکھتا ہے کہ کوئی قوم ایسی کیوں نہ ہو گئی جیسی قوم حضرت یونس ؑ کی تھی کہ معافی کی طلبگار ہوتی اور ہم اس سے عذاب ٹال دیتے، اور اسے ایک عرصہ دنیا سے لطف اٹھانے دیتے۔قوم یونس ؑ جس پر عذاب کا اٹل فیصلہ ہو چکا تھا اور اللہ نے اپنے پیغمبر کو مطلع بھی کر دیا تھا۔لیکن اللہ کہ جو اپنے ہی فیصلوں پر قادر ہے، تو جب اس نے دیکھا کہ پوری قوم اس کے حضور سجدہ ریز ہو گئی، گڑ گڑا کر معافی کی طلبگار ہو چکی تو اس نے معاف فرما دیا۔اللہ کے ان فیصلوں کے تین مدارج ہیں۔ہم بحیثیت پاکستانی ان تینوں میں سے آخری درجے پر آچکے ہیں۔اللہ سورہ الرعد کی آیت نمبر 10 میں قوموں کی حالتوں کے بارے میں فرماتا ہے۔پہلی حالت: "ہر شخص کے آگے اور پیچھے وہ نگران مقرر ہیں جو اللہ کے حکم سے باری باری اس کی حفاظت کرتے ہیں"۔پاکستان بننے کے بعد طویل عرصہ ہم اللہ کی اسی نگہبانی کے سائے میں زندگی گزارتے رہے۔ہم خوشحال بھی تھے اور پرامن بھی۔دوسری حالت: یقین جانو اللہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے حالات میں تبدیلی نہ چاہے" یہ مہلت بھی ہمیں ملی۔ہم سے فرشتوں کی نگہبانی تو اٹھا لی گئی لیکن ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیا گیا اور ہمیں چار دہائیاں موقع دیا گیا کہ ہم اپنے حالات بدلنے کی خواہش کا اظہار ہی کر دیں۔ہم نے چوروں، بددیانتوں، لٹیروں اور اللہ اور اس کے رسول کے احکامات کا تمسخر اڑانے والوں کو اپنا رہنما چنا۔ہم نے ہر اس چوکھٹ پر اپنا سر جھکایا اور ہر اس طاقت کی غلامی کی جو اس مالک کائنات کے مقابل کھڑی ہوئی۔ہم نے جمہوری رہنما بھی ایسے منتخب کیئے جنہیں تمام امیدیں دنیا اور دنیا کے تاجداروں سے تھیں اور ہمارے فوجی ڈکٹیٹر بھی ایسے تھے جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کا بھری محفلوں میں مذاق اڑاتے تھے۔اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" دنیا مومن کے لیے قید خانہ اور کافر کے لیے جنت ہے"۔ان کا تمسخر عجیب تھا، کہتے تھے، کہ اس سوچ کے ساتھ کوئی قوم ترقی کر سکتی ہے۔تیسری حالت: "اور جب اللہ کسی قوم پر آفت لانے کا ارادہ کر لیتا ہے تو اس کا ٹالنا ممکن نہیں، پھر ایسے لوگوں کا اپنے سوا کوئی رکھوالا نہیں ہوتا"

ہم اسی تیسری حالت میں داخل ہو چکے ہیں۔پوری دنیا میں ہمارا اپنے سوا کوئی رکھوالا اور مددگار نہیں ہے۔جس مغرب کے لیے ہم نے اپنا سب کچھ قربان کیا۔اپنی زمین کو آگ اور خون میں نہلایا وہ ہماری سرزمین پر اپنا کھیل شروع کر چکا۔ان کے نزدیک اس خطے میں پاکستان کی وہی حیثیت ہے جو جنوبی امریکہ میں کولمبیا کی تھی۔اپنی اس علاقائی اہمیت کی جو سزا کولمبیا نے بھگتی اسی کی تیاریاں یہاں پر ہیں۔ہر بستی، قریہ اور علاقہ میں فساد، قتل و غارت علاقائی اور فرقہ وارانہ جنگیں۔مغرب میں پناہ حاصل کیے ہوئے سیاسی رہنما اور ان کے ساتھ کھیلنے اور ان کے ذریعے ہمارے امن و امان سے کھیلنے کا عالمی طاقتوں کا خفیہ منصوبہ۔پڑوسیوں کے خونخوار پنجے جو ہمارے جانب بڑھ رہے ہیں۔ایسے پڑوسی جن سے نہ خیر کی توقع اور نہ دوستی کی۔لیکن اس سب سے زیادہ خوفناک یہ کہ ہم پر اللہ نے ایک ایسی کیفیت طاری کی دی گئی ہے کہ ہم عقل و ہوش سے عاری کر دیا گیا ہے۔ہماری حالت سورۃ الاعراف کی 179 ویں آیت کی طرح ہے: "ان کے دل ہیں لیکن ان سے سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں مگر ان سے سنتے نہیں۔یہ لوگ بالکل چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر۔یہی وہ ہیں جو غفلت میں پڑے ہیں"۔یہ ہے ہماری حالت ہمارے انجام پر دونوں متفق ہیں۔اہل خرد، اہل دنیا اور عالمی تجزیہ کار بھی اور اہل نظر بھی۔لیکن دونوں میں ایک فرق ہے۔اہل دنیا ہماری تباہی اور بربادی کا نقشہ کھینچ رہے ہیں جبکہ اہل نظر ہماری شامت اور آزمائش کے بعد اصلاح اور خیر کے موسموں کی نوید دے رہے ہیں۔لیکن اس آزمائش کے چند مہینوں میں ہمارا کوئی رکھوالا نہیں۔ہم نے جن قاتلوں، غنڈوں، لیٹروں، چوروں اور ظالموں کو اپنے ہاتھ سے پالا تھا، اب وہ بلائیں ہمارے ساتھ گتھم گتھا ہونے والی ہیں، ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہونے والی اور اللہ کے اس اصول کے مطابق کہ اگر ہم ظالوں کو ظالموں سے نہ لڑائیں تو دنیا میں امن کیسے ہو۔

چند ماہ۔۔۔۔اور پھر دائمی امن۔خوشحالی

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے

شکوہِ ترکمانی، ذہن ہندی، نطقِ اعرابی

allurdupdfnovels.blogspot.com

ازخودنوٹس، وکلاء اور عوام

اسلام آباد کی عدالتوں سے لے کر اس ملک کے چھوٹے سے چھوٹے شہر کی عدالتوں تک چاروں طرف وکلاء کے رنگ برنگے بورڈ اور چھوٹے بڑے چیمبر نظر آئیں گے۔ عدلیہ کی انتظامیہ سے علیحدگی سے قبل ان کی کثیر تعداد ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور اس کے زیرِ سایہ مجسٹریٹوں کی عدالتوں کے اردگرد بھی ڈیرے ڈالے ہوتی تھی۔ ایک آزاد اور متحرک پیشہ ہونے کی وجہ سے یہ لوگ سیاسی اکھاڑوں کے نمایاں شہسوار ہوتے ہیں۔ عام سیاسی کارکن سے لے کر بڑے بڑے سیاسی رہنماؤں کے ہجوم میں بھی ان کی قابلِ ذکر تعداد نظر آتی ہے۔ بہت کم ایسے وکیل ہیں جو اپنے شعبے میں اس قدر منہمک ہوں کہ انہیں ملکی سیاست کے اتار چڑھاؤ سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ انہی وکلاء کے ہجوم میں سے ہی بڑی عدالتوں کی کرسیوں پر متمکن ہونے والوں کی تعداد بھی سب سے زیادہ ہے بلکہ ایک عام ملازم جو سول جج کی حیثیت سے اپنی نوکری کا آغاز کرتا ہے، اپنی زندگی کے پچیس تیس سال مقدمے سننے اور فیصلے لکھنے میں صرف کرتا ہے، بہت کم عدالتِ عالیہ یا عدالتِ عظمیٰ کی نشستوں پر سرفراز ہونے کے خواب دیکھتا ہے۔ یہ وکیل عدل و انصاف، قوانین کی پاسداری، عدلیہ کی بالادستی اور آئین و قانون کی حکمرانی کے سب سے بڑے علمبردار ہوتے ہیں، ان کے نعروں میں فوری اور سستا انصاف مدت ہائے دراز سے چلا آ رہا ہے۔

لیکن ان وکیلوں کے گرد جوتیاں چٹخاتے سائلین کی بھی ایک دنیا ہے۔ یہ دنیا بہت المناک ہے۔ یہ دنیا ایسے بے یار و مددگار لوگوں سے آباد ہے جن کو تھانے، پٹوار خانے، ٹیکس کے دفتر یا کسی اور عوامی محکمے سے انصاف نہیں ملا ہوتا۔ کسی پر جھوٹا مقدمہ بنایا گیا ہوتا ہے تو کسی کی زمین پر ناجائز قبضہ کروایا گیا ہوتا ہے۔ کوئی اپنے مقتول بیٹے کے بااثر قاتلوں کی وجہ سے پریشان ہوتا ہے تو کسی کو اصولوں پر قائم رہنے کی وجہ سے کسی وزیراعظم یا وزیراعلیٰ نے نوکری سے برطرف کیا ہوتا ہے۔ کسی کی بیٹی گاؤں کے بدمعاشوں کے قبضے میں ہوتی ہے تو کسی کی ساری عمر کی جمع پونجی کوئی نوسرباز بینکار یا کوآپریٹو ادارہ برباد کر چکا ہوتا ہے۔ ان کے لیے قانون کی زبان بھی اجنبی ہوتی ہے اور عدالتوں میں وکیلوں کے داؤ پیچ بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتے۔ ان سائلین میں اکثریت کے چہرے حسرت و یاس کی تصویر ہوتے ہیں اور وہ ڈھور ڈنگر یا گھر، زمین وغیرہ بیچ کر اپنی کل کائنات مٹھی میں تھامے وکیل کے دروازے پر آ کر دستک دیتے ہیں۔ اس کے بعد "فوری اور سستے انصاف" کے یہ علمبردار ان سائلین کے ساتھ جو سلوک کرتے ہیں وہ اس ملک کے نظامِ عدل کی خوفناک تصویر ہے جس نے اس ملک میں "سوؤ موٹو" کو عوام کی امنگوں کا ترجمان بنا دیا ہے۔ اس ملک کے کسی وزیراعظم، گورنر یا وزیراعلیٰ کو آج تک اتنی درخواستیں وصول نہیں ہوئیں جتنی اکیلے چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کے قائم کردہ انسانی حقوق کے سیل کو ملی ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ جب عام محفلوں اور ٹیلی ویژن کے مذاکروں میں بیٹھ کر یہ وکیل "سوؤ موٹو" یا ازخودنوٹس کو انصاف کا قتل قرار دیتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اگر ماتحت عدلیہ کا نظام درست ہو جائے تو انصاف فوری اور سستا مل جائے گا اور بنیادی طور پر افتخار محمد چوہدری کے کرنے کا کام یہی ہے۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ کبھی کسی نے ماتحت عدلیہ کے بوسیدہ کمروں اور پُرہجوم ماحول میں فوری اور سستے انصاف کے علمبردار ان وکلا کو نہیں دیکھا۔

جسٹس فلک شیر جب لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے، گوجرانوالہ میں متعین ایک سیشن جج نے فوری اور سستے انصاف کو یقینی بنانے کے لیے صرف ایک قدم اٹھایا تھا کہ اس نے وکلاء کو خواہ مخواہ تاریخیں دینے سے انکار کر دیا تھا۔ خواہ مخواہ تاریخیں جسے یہ لوگ (Adjournments) کہتے ہیں۔ تاریخیں لینے کے مقاصد ان وکیلوں پر تو خوب واضح ہوتے ہیں لیکن ان کی وجوہ بیان کرتے ہوئے یہ جس طرح سادہ لوح سائل سے کھیلتے ہیں اس پر ان کی روح کی مُردنی اور دل کی تختی پر آنسو نکل آتے ہیں۔ گوجرانوالہ کے وکلاء نے سیشن جج کے اس "وکیل دشمن" رویے کے خلاف ہڑتال کی اور عدالتوں کا بائیکاٹ کر دیا۔ مذاکرات کا سب سے اہم نکتہ یہی تھا کہ یہ سیشن جج ہمیں ریلیف (Relief) نہیں دیتا۔ سائلوں کو بے وقوف بنا کر مقدمے کو طول دینا اور اس طرح اپنی مستقل روزی کے بندوبست کرنے کو کس خوبصورتی سے "ریلیف" کا نام دیا جاتا ہے۔ ایسے بہت سے احتجاج اس ملک کے طول و عرض میں پھیلی عدالتوں میں موجود وکیلوں کے رویے کی صورت تاریخ کا حصہ ہیں۔ ڈسٹرکٹ اور سب ڈویژنل مجسٹریٹ کی حیثیت سے میں نے نو سال عدالت کی کرسی پر گزارے۔ صرف اپنے تجربات کی بنیاد پر اگر میں ان وجوہ کو لکھنا شروع کروں جو یہ وکیل تاریخ مانگنے یا کیس کو طول دینے کے لیے بیان کرتے تھے تو الف لیلیٰ کی طرح ایک ہزار ایک رات تک کہانی سنائی جا سکتی ہے۔ ہر کیس کے ساتھ ایک علیحدہ کہانی ہوتی ہے اور ہر پیشی پر ایک مختلف عذر۔ گواہ نہیں آیا، مقدمہ پیش ہے لیکن وکیل دوسری عدالت میں، ملزم حاضر ہے تو تفتیشی غائب، تفتیشی حاضر ہے تو ملزم ندارد۔ اس سارے معاملے میں حیران کن بات یہ ہے کہ اپنے مؤکل کو بچانے کے لیے پولیس کو عدالت میں گمراہ کرنے کے گر بھی یہی وکیل ہی بتاتے ہیں۔ میڈیکل سرٹیفکیٹ اور پوسٹ مارٹم میں مناسب تبدیلی کے مشورے بھی انہیں وکلاء کی فراست کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ جو آج "سوؤ موٹو" کو عدالتی نظام کی سست روی کا باعث قرار دیتے ہیں، کیا گزشتہ پچاس سالوں میں عدالتی نظام میں ایک کیس کی اوسط عمر بتا سکتے ہیں؟ پورا ملک اس بات پر گواہ ہے کہ لوگوں کی عمریں وکیلوں کے چیمبروں اور عدالتوں کے دروازوں پر گزر جاتیں اور پھر بھی ان کے کیسوں کے فیصلے نہیں ہو پاتے۔ مقدمے نسل در نسل چلتے اور آج بھی چل رہے ہیں۔ ایسے میں "ازخودنوٹس" ایک مظلوم کی آواز کے براہِ راست اعلیٰ عدلیہ تک پہنچنے کا ذریعہ بنا تو لوگوں کی امیدیں اس کے ساتھ بندھ گئیں۔

یہ تو عام آدمی کے دکھ درد کی کہانی ہے۔ ایک دوسرا پہلو ہے جو اس سے بھی زیادہ تحیّر کا باعث ہے، وہ ہے اس ملک پر قابض سیاستدانوں، بیوروکریٹس اور دیگر بڑوں کی کرپشن، جسے عرفِ عام میں "وائٹ کالر کرائم" کہا جاتا ہے۔ رشوت اور کرپشن کے گرم گرم نوٹوں سے تجوریاں بھری ہوں تو ملک کے بہترین وکیل کی خدمات آپ کو میسر آ سکتی ہیں۔ وہ بڑا وکیل کیس کو عام عدالت سے شروع کرواتا ہے۔ اس کے تجربے اور رعب کے سامنے ایک عام اینٹی کرپشن جج کی کیا بساط؟ تاریخوں پر تاریخیں، بہانوں پر بہانے، میڈیکل سرٹیفکیٹ، قانونی موشگافیاں، گواہوں کی عدمِ دستیابی۔ کئی سال بیت جاتے ہیں۔ کرپشن کی دولت سے کاروبار میں وسعت آ جاتی ہے۔ ملزم کم بااثر سے زیادہ بااثر ہو جاتا ہے۔ کبھی الیکشن جیتتا ہے اور کبھی اپوزیشن کا سرخیل ہوتا ہے۔ سپریم کورٹ تک پہنچتے پہنچتے اس مقدمے کی حالت ایک نچوڑے ہوئے لیموں کی سی ہو جاتی ہے جس میں سے کچھ برآمد نہیں ہوتا۔ ایسے میں "ازخودنوٹس" سے اگر کرپشن کی گاڑی کو چلتے ہی روک دیا جائے تو دلیل یہ دی جاتی ہے کہ کیا کرپشن روکنا عدالت کا کام ہے؟ یہ تو انتظامیہ کا کام ہے۔ عدالت اپنے دائرہ اختیار سے تجاوز کر رہی ہے۔ وہ وکیل جس نے دس پندرہ سال ایک مقدمے کو لے کر چھوٹی عدالت سے بڑی عدالت تک جانا ہوتا ہے، اسے جب دو تین ماہ میں مقدمے کا فیصلہ ہوتے نظر آتا ہے تو اس کا دل ڈوب جاتا ہے اور ساتھ ہی اس کے مؤکل کی بھی آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگتا ہے۔ لیکن ان ایک لاکھ سے زائد وکلاء کو اندازہ نہیں کہ اس قوم نے جو محبتوں کے پھول ان وکیلوں کے قافلوں پر نچھاور کیے تھے، اس کی وجہ صرف اور صرف افتخار محمد چوہدری کے ان سوؤ موٹو مقدمات کی بازگشت تھی جس کا آغاز وہ اپنے بلوچستان ہائی کورٹ کے زمانے سے ہی کر چکے تھے۔ لوگوں کی امیدوں کا ایک ہجوم تھا جو ان کے اردگرد تھا۔ اگر افتخار محمد چوہدری وکلاء کے درمیان موجود نہ ہوتے تو اعتزاز احسن ہوں یا علی احمد کرد، حامد خان ہوں یا منیر اے ملک لوگ ان کے قافلوں سے وہی برتاؤ کرتے جو یہ سلوک سائلوں سے مدتوں کرتے چلے آئے ہیں۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

بددیانتی اور تعصب کی انتہا' حل کیا ہے؟

اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

یورپ نے جس طرح تاریخ اور سائنس کی کتب لکھ کر دنیا بھر میں یہ ثابت کر رکھا ہے کہ جب سے کائنات معرضِ وجود میں آئی ہے علم، تہذیب، ثقافت، سائنس، فلسفہ اور دیگر علوم صرف مغرب میں ہی پروان چڑھے اور پورا مشرق جس میں مصر، عراق، ایران، چین اور ہندوستان کی تہذیبیں شامل تھیں' سارے کا سارا ابتدائے آفرینش ہی سے جہالت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس تعصب اور بددیانتی کو بیان کرنے کے لیے پندرہ سو الفاظ پر مشتمل ایک کالم ناکافی تھا۔ تشنگی کا ایک احساس مجھے بھی تھا اور پڑھنے والوں کا احساسِ تشنگی تو بہت زیادہ تھا۔ پوری دنیا کے مروجہ علم کو جس طرح جھوٹ پر مبنی تاریخ سے زہر آلود کر دیا گیا ہے' اس کو تعصب سے پاک اور از سرِ نو تاریخ مرتب کرنے کے لیے بے پناہ محنت درکار ہے۔ اس پر ظلم یہ ہے کہ گزشتہ دو تین سو سالوں سے ہمارے نصاب اس طرح ترتیب دیے گئے ہیں کہ ہر بچہ ذہن میں یہ تصور راسخ کر کے جوان ہوتا ہے کہ فلسفہ، طب، حکمت، اصولِ حکمرانی، حساب اور سائنس، سب کا آغاز یونان سے ہوا اور ہم جس سرزمین پر رہتے ہیں' وہاں کے لوگ جہالت کی زندگی گزارتے تھے، مافوق الفطرت قسم کے خیالات رکھتے تھے اور ایک دوسرے کی گردنیں کاٹتے تھے۔ اس تعصب کی نفی اور مغرب کی بالادستی کی قلعی کھولنے کے لیے طویل عرصے سے ایک ایسی یونیورسٹی کی ضرورت تھی جس میں اس فریب زدہ دنیا کے سامنے سچ لایا جائے اور بتایا جائے کہ کس طرح مشرق کے علمی مآخذ کو اپنے ناموں سے تحریر کر کے اسے ذاتی کاوش قرار دے کر یورپ دنیا کے علوم کا ازل سے پرچم بردار بن گیا۔ یہ خواب مسلم امہ کو پورا کرنا چاہیے تھا جو بلاشبہ اس دنیا کے علم کی چھ صدیوں تک بلاشرکتِ غیرے حکمران رہی ہے' لیکن اپریل 2010ء میں بھارت کے چند صاحبانِ علم نے مل کر سوراج یونیورسٹی (Swaraj University) کی بنیاد رکھی جس کا مقصد اس علم سے نجات ہے جو نوآبادیاتی تسلط کی وجہ سے دنیا میں عام کیا گیا۔ یونیورسٹی کے اس چار سالہ تجربے کو وہ لوگ (Decolonization) یعنی نوآبادیاتی فکر سے آزادی کہتے ہیں۔ اس یونیورسٹی میں 16 سال سے تیس سال کے نوجوانوں کو داخلہ دیا جاتا ہے۔ یونیورسٹی خالصتاً ہندوستان کی تہذیب و ثقافت اور اس سے پھوٹنے والے علوم کے چشموں سے تعلق استوار کرتی ہے۔ یہ لوگ کوئی مخصوص مغربی محاورہ بھی استعمال نہیں کرتے، ان کے ہاں ''سکالرز'' یا سٹوڈنٹ نہیں بلکہ ''کھوجی'' ہوتے ہیں۔ بھارت کے علاوہ ایک اور ملک ایسا ہے جس نے گوروں کے متعصب علم میں صدیاں گزاریں، جس نے گوروں کی نسلی برتری کے عذاب سے حال ہی میں چھٹکارا حاصل کیا، جنوبی افریقہ کے ایک پروفیسر مولیفی کیٹ اسانتے (Molifi kete Asante) نے بھی ایک خاکہ ایسی یونیورسٹی کا پیش کیا ہے جہاں انسانی علوم کو افریقی نقطہ نظر سے پیش کیا جائے۔ اس کے نزدیک جنوبی افریقہ کی تمام یونیورسٹیوں میں وہی نظامِ تعلیم ہے جس کا مقصد عالمی غلبے کے خالص یورپی سسٹم کو برقرار رکھنا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ افریقہ کے بچوں کو یونان اور روم نہیں بلکہ مصر اور نوبیا (Nubia) کو علم کے مستند سرچشموں کے طور پر اختیار کرنا ہوگا۔ اس کے نزدیک ان بچوں میں ایسے نظریات کی آبیاری کی جائے جو افریقی پس منظر سے ابھر کر سامنے آتے ہوں۔

مغرب کے اس تعصب کو واضح کرنے اور اس کی بدنیتی کا پول کھولنے کے لیے جس شخص کی تحریروں نے طوفان کھڑا کر رکھا ہے' وہ سی کے راجو ہے، جس کی کتاب ''تعلیمی سامراجیت کا خاتمہ ایک آغاز'' (Ending Academic imperialism..... a beginning) مغربی علوم کی سامراجیت کا پول کھولتی ہے۔ اس کتاب میں اس نے پوری انسانی تاریخ میں مسلمانوں کے عظیم کارناموں کو روشن ترین باب قرار دیا ہے اور مغرب کی اس تاریخی بددیانتی کا بھی پردہ چاک کیا ہے۔ اس کے نزدیک مغرب نے کس ڈھٹائی سے ریاضی کو ایک یورپی مضمون بنا کر پیش کیا۔ انہوں نے انڈین 'Calculus' کو 'Pre calculus' کہہ کر پکارا کہ دوسری تہذیبوں کی تحقیر کی جا سکے۔ اس نے ثابت کیا ہے کہ سائنس کے تمام مضامین جن میں ریاضی، طبیعات، اور حیاتیات وغیرہ شامل ہیں' مغربی نظریات سے آلودہ ہیں۔ اس کے نزدیک یہ وہم دنیا بھر کے بچوں کے دلوں میں ڈالا گیا ہے کہ مغربی نظامِ تعلیم کا کوئی متبادل نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ریاضی تمام سائنسوں کی ماں ہے لیکن مغرب نے اس کے اندر اپنی مذہبیت بھی شامل کر دی ہے۔ اگر ہم متبادل ریاضی کو فروغ دیں جو یورپی مذہبیت سے جدا ہو تو پورے کے پورے مغرب کا بستر گول ہو جائے۔ سی کے راجو کی کتاب 'Euclid and Jesus' یہ انکشاف کرتی ہے کہ کس طرح چرچ کی دو مذہبی جنگوں کے دوران ریاضی کو تبدیل کر ڈالا۔ لیکن جو کتاب آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے اور مغرب کی بدنیتی اور تعصب کا پردہ چاک کرتی ہے تو' وہ "Is Science Western in Origin?" (کیا سائنس واقعی مغربی ہے؟) ہے۔ یہ کتاب سائنس اور تاریخ کے ہر طالب علم کا اندازِ فکر بدل سکتی ہے۔ وہ حیران ہو کر لکھتا ہے کہ ایران کے بادشاہ خسرو اول علم کا بہت دلدادہ تھا، اس نے بیش بہا کتب دنیا بھر سے جمع کیں۔ اس نے عالموں کو ہندوستان بھیجا تاکہ علم اور کتب تک رسائی ہو لیکن کسی کو ایتھنز اور سکندریہ نہ بھیجا۔ سی کے راجو کے نزدیک بغداد کے علماء نے دنیا بھر کے علم کی نقل نہیں کی بلکہ ان علوم کو حاصل کرنے کے بعد انہیں نئی منطق اور نئی توجیہہ کے ساتھ تحریر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان مسلمان سائنس دانوں نے منطق استخراجیہ اور منطقِ استقرائیہ کی بھول بھلیوں سے نکل کر علم میں تجربے کی بنیاد رکھی اور آج کی تجرباتی سائنس جسے 'Empirical Science' کہا جاتا ہے اور جس پر تمام طبعی اور معاشرتی سائنسوں کی بنیاد ہے' ان مسلمانوں کی مرہونِ منت ہے۔ اس بات کا اعتراف تو برٹرینڈ رسل جیسے فلسفی نے بھی کیا' جس کی مذہب دشمنی اور مسلمان دشمنی عیاں ہے۔ وہ اپنی کتاب 'Impact of Science on Society' میں تحریر کرتا ہے کہ یونانی فلسفے کی بھول بھلیوں میں گم تھے اور لوگوں کی تحقیق یا گنتی کو ایک عامیانہ اور چھوٹے لوگوں کا کام قرار دیتے تھے۔ یہاں اس نے ارسطو کے حوالے سے ایک واقعہ تحریر کیا ہے کہ اس نے منطق سے یہ بات ثابت کی کہ عورت کے اٹھائیس دانت ہوتے ہیں۔ دلیلوں پر دفتر کے دفتر لکھ دیے۔ اس کی دو بیویاں تھیں لیکن منہ میں انگلی ڈال کر گنا نہیں کہ اس کے نزدیک گننا وغیرہ چھوٹے لوگوں کا کام تھا۔

سائنس تو ایک محدود طریقے سے مغربی کہی جا سکتی تھی لیکن تاریخ اور معاشرت کو جس طرح بددیانتی سے تحریر کیا گیا اور جس طرح اسے آج دنیا کے نصابوں میں پڑھایا جاتا ہے' اس سے صرف یہ تاثر دینا مقصود ہوتا ہے کہ یونان کے بعد پوری دنیا میں تاریکی تھی اور پھر کئی صدیوں بعد اچانک یورپ میں تحریک احیائے علوم چلی اور زمانہ روشن ہو گیا۔ بیچ کے دور کو قرونِ وسطیٰ یعنی 'Medieval' کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ دنیا کے ہر پڑھے لکھے شخص کی زبان پر عام ہے۔ جان سٹورائٹ مل کے والد جیمز مل نے برطانوی ہندوستان پر ایک بہت بڑی کتاب لکھی جسے انگریز بیوروکریسی کے لیے پڑھنا لازمی تھا۔ اس نے ان تمام مؤرخوں کی طرح تاریخ کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ قدیم، قرونِ وسطیٰ اور جدید۔ قدیم کو تو جیسے تیسے ملیامیٹ تہذیبوں کے کھاتے میں ڈال کر گم شدہ ادوار کہا لیکن قرونِ وسطیٰ کو اس نے جاہلانہ افکار، مذہبی تعصب اور عدم رواداری کا دور قرار دیا۔ یہی رویہ تمام مؤرخین کا ہے' وہ قرونِ وسطیٰ کو جب یورپ کا سیاہ ترین تاریک دور کہتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی پوری دنیا کو بھی تاریکی میں ڈوبا ہوا تحریر کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ دور وہ تھا جب مسلمان پوری دنیا میں علم، سائنس، تہذیب اور ثقافت کے نئے باب رقم کر رہے تھے۔ یہ وہ تہذیب تھی جس سے متاثر ہو کر یورپ میں تحریک احیائے علوم چلی۔ ایک پندرہ سو الفاظ کا کالم اس بددیانتی کا احاطہ کیسے کر سکتا ہے؟ ہاں! کوئی تو ہو جو سوراج یونیورسٹی کی طرح مسلم امہ میں ایک ایسی یونیورسٹی قائم کرے جو تاریخ، سائنس اور تہذیب کے مآخذ کو سچائی کی بنیاد پر تحریر کرے۔ کوئی ایک شخص پوری ڈیڑھ ارب ملتِ اسلامیہ میں۔ صرف ایک شخص۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

بدترین غلامی کی جانب

کیا کسی کو اندازہ ہے کہ ہم جیسے پسماندہ ملکوں میں بڑے بڑے موٹروے' شاندار ایئرپورٹ' شہری زندگی کے چمک دمک والے منصوبے' عالمی فاسٹ فوڈ کی دکانیں' ہر طرح کے فیشن برانڈ' شاپنگ مال' عالمی معیار کے تھیٹر' سینما گھر اور ثقافتی مرکز کیوں کھولے جاتے ہیں۔ غربت کی ماری ان اقوام کا ایسا جزیرہ نما روشن چہرہ کس مقصد کے لئے تخلیق کیا جاتا ہے۔ یہ تمام پسماندہ ممالک سرمایہ کاری کے لئے دنیا بھر میں بدنام سمجھے جاتے ہیں' لیکن کوئی سوال نہیں کرتا کہ فاسٹ فوڈ کے ریستورانوں' فیشن کی دکانوں اور دیگر مصنوعات پر آپ کی سرمایہ کاری خطرے میں کیوں نہیں پڑتی۔ جس ملک (پاکستان) میں چھ کروڑ لوگ بس کا نمبر تک نہ پڑھ سکتے ہوں وہاں شاندار ایئر کنڈیشنڈ بس چلادی جائے۔ جہاں روزانہ لاکھوں لوگ صاف پانی نہ ہونے کی وجہ سے جان لیوا بیماریوں کا شکار ہو جائیں وہاں ان کے کچے مکانوں' اور تعفن زدہ محلوں کے درمیان سے چمکتی ہوئی موٹروے گزرے' ایک چمکدار سڑک جس کے دونوں جانب کروڑوں مفلوک الحال رہتے ہوں جن کی بستیاں ایک ہزار سال پرانے دور کی یادگار معلوم ہوں اور موٹروے پر سفر کرنے والے بڑی بڑی گاڑیوں میں بیٹھے وہاں پر موجود لوگ زندگی کو ایسے دیکھیں جیسے افریقہ کے سفاری پارک میں گاڑیاں گزارتے ہوئے قدرتی ماحول میں اچھلتے کودتے جانوروں کو دیکھتے ہیں۔

میرے جیسے غریب وافلاس کا شکار لیکن زمینی وسائل سے مالا مال ملک ایک عالمی تماشہ گاہ ہیں۔ جہاں کے رہنے والے کروڑوں لوگوں کی تعلیم' صحت' رہائش اور روزگار کے لئے کوئی قرضہ نہیں دیتا۔ جہاں معاشی اور صنعتی ترقی کے لئے کوئی امداد مہیا نہیں کرتا' بلکہ صرف اور صرف بڑے بڑے انفراسٹرکچر بنانے کے لئے دنیا بھر کے ممالک اور عالمی مالیاتی ادارے دولت کی بوریاں اور بڑی بڑی سفارشات لے کر ان ملکوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ یہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ ان ممالک کے سیاسی رہنما' دانشور اور صحافی اگر صرف دو کتابوں کا مطالعہ کرلیں تو انہیں ہر ایسے "شاندار" منصوبے سے نفرت ہونے لگے۔ انہیں وہ مستقبل نظر آجائے جو ہر اس غریب ملک کا مقدر بنا' جنہوں نے ان منصوبوں کے لئے اپنی قوموں کو قرض کی دلدل میں اتارا' ان منصوبوں کی تعریف وتصریف سے شہرت کے محل کھڑے کیے' لیکن ان عوام کو صحت' تعلیم' صاف پانی' سیوریج' امن وامان' بنیادی رہائش اور روزگار فراہم نہ کرسکے۔ ان حکمرانوں کے نام کی تختیاں ان ایئرپورٹوں' موٹرویز' ثقافتی مراکز اور یادگاروں پر لٹکتی رہیں اور عوام کی نسلیں غربت وافلاس کے باوجود ان عیاشیوں کے لئے لیا گیا قرض ادا کرتی رہیں۔ یہ دونوں کتابیں ایک ایسے معیشت دان نے لکھی ہیں جو دنیا بھر کے ممالک میں ایسے تباہ کن منصوبے لے کر جاتا رہا اور ان منصوبوں کی وجہ سے یہ تمام ملک بدترین انجام تک پہنچے۔ یہ شخص جان پرکنز JohnPerkins ہے اور اس کی پہلی کتاب "Confessions of an Economic Hitman" 2006ء میں آئی اور دوسری کتاب "The Secret History of American Empire" 2009ء میں آئی۔ خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ دونوں کتابوں کا اردو ترجمہ "ایک معاشی غارت گر کی کہانی" اور "امریکی مکاریوں کی تاریخ" کے نام پر سے اب ہو چکا ہے۔ یہ دونوں کتابیں کسی ناول کی طرح دلچسپ' حیرت ناک اور سنسنی سے بھرپور ہیں۔ اس نے پانامہ' کولمبیا' وینزویلا' یوسی ڈور، انڈونیشیا' مصر اور افریقہ کے ممالک میں اپنی سرگرمیوں کی داستانیں بیان کی ہیں۔ اس کی کتابیں پڑھنے کے بعد آپ کو اپنے رہنماؤں کی بے ضمیری' وطن فروشی اور بددیانتی پر رونا آنے لگتا ہے۔ آپ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کھیتوں میں کام کرنے والا' سڑک پر بجری کوٹنے والا' مشینوں پر زندگی ختم کرنے والا اور نائی' موچی' ترکھان' جولاہا اور کمہار ان شاندار انفراسٹرکچر پراجیکٹ اور ترقی کی علامت موٹرویز اور شہری سہولیات کا قرض اتارتے' اتارتے افلاس اور بیماری میں خون تھوکتے زندگی کی بازی ہار جاتا ہے۔ پرکنز اپنی کتابوں میں اس ساری سازش کے تین مدارج بتاتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ دنیا بھر کے وہ تمام امیر ممالک جن کی نظر غریب ممالک کے معدنی وسائل پر ہوتی ہے وہ میرے جیسے "معاشی ضرب کار" EconomicHitman پالتے ہیں۔ ان افراد کی تنخواہ اور اخراجات وہ بڑی بڑی کنسٹرکشن کمپنیاں اور تیل و معدنی وسائل پر قبضہ کی خواہش مند کارپوریشن اٹھاتی ہیں۔ ان معاشی ضرب کاروں کو جس بھی ملک میں بھیجا جاتا ہے' یہ اس کے حوالے سے بڑی بڑی سڑکوں' ایئرپورٹوں اور دیگر خوشنما منصوبوں سے بھری رپورٹیں تیار کرتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کس طرح اس غریب ملک کو زیادہ سے زیادہ قرضے کی دلدل میں ڈبویا جاسکتا ہے۔ جہاں دورویہ سڑکوں کی ضرورت ہوتی ہے وہاں مستقبل کی منصوبہ بندی کا بہانہ بناکر چار رویہ سڑکوں پر زور دیا جاتا ہے۔ یہاں وہ اپنے ایک ہم پیشہ کی مثال دیتا ہے جس نے انڈونیشیا کے بارے میں ایک حقیقت پسندانہ سکیم بنائی تو اسے نوکری سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد پرکنز کو ذمہ داری سونپی گئی اور اس نے پچیس گنا لاگت کے منصوبے بناکر پیش کیے جنہیں عالمی بنک اور قرضہ دینے والے ممالک نے خوشدلی سے قبول کرلیا۔ جب ایسے منصوبے تیار ہو جاتے ہیں تو پھر یہ "ہٹ مین" اس ملک کی سیاسی قیادت' بیوروکریسی اور دیگر کارپردازوں کو انتہائی خوشنما طریقے سے بریفنگ دیتا ہے۔ اس دوران اس کی تلاش ایسے بددیانت' لالچی' بے وقوف یا شہرت کے بھوکے اہل اقتدار پر ہوتی ہے جو ان منصوبوں سے سستی شہرت بھی کمائیں اور مال بھی بٹوریں۔ یہاں ان لوگوں کا ایک جتھہ بن جاتا ہے۔ ہر کوئی میٹنگوں میں ان کی تعریف میں رطب اللسان ہوتا ہے۔ انہیں ملک کی بقا اور سلامتی کی علامت بتاتا ہے۔ یوں جب یہ منصوبے منظور ہو جاتے ہیں تو اس امیر ملک یا مالیاتی ادارے سے قرضے کی رقم کا بندوبست بس ایک کارروائی سی ہوتی ہے۔ حیرت ناک بات یہ ہے کہ یہ رقم اس امیر ملک سے غریب ملک میں منتقل نہیں ہوتی۔ امریکہ ہو یا فرانس' ترکی ہو یا چین۔ یہ ممالک قرضے کی یہ رقم اپنی کنسٹرکشن کمپنیوں کو اپنے ہی ملک میں ادا کر دیتے ہیں۔ رقم اسی ملک میں رہتی ہے اور قرضہ غریب ملک کے عوام کی گردن پر۔ اس کے بعد ان ہٹ مینوں کی بنائی ہوئی جعلی اعداد وشمار کی رپورٹوں پر مبنی پراپیگنڈہ شروع ہوتا ہے۔ یہ موٹروے بنا تو تجارت اتنے گنا بڑھے گی' یہ بندرگاہ بنی تو ملک پورے مشرق وسطیٰ کی تجارت پر چھا جائے گا۔ یہ ٹرین یا بس چلی پڑی تو عام آدمی کے دن بدل جائیں گے۔ ان بسوں میں اور ان موٹرویز پر چلنے والی پبلک ٹرانسپورٹ میں مفلس' نادار' بیمار' بے روزگار' ان پڑھ اور پسماندہ لوگ سفر کرتے ہیں جنہیں نہ تعلیم ملتی ہے' نہ دوا' نہ گھر میسر ہوتا ہے اور نہ نوکری۔ لیکن یہی لوگ ہیں جو ان موٹرویز' بندرگاہوں اور ایئرپورٹس کا قرض اتار رہے ہوتے ہیں۔ جب کسی ملک پر ڈھیر سارا قرض چڑھ جاتا ہے تو پرکنز کے مطابق وہاں عقاب Hawks کو بھیجا جاتا ہے۔ یہ وہ کمپنیاں اور کارپوریشن ہوتی ہیں جن کی نظر اس ملک کے معدنی وسائل' تیل' لوہا' تانبہ' سونا اور دیگر دھاتوں پر ہوتی ہے۔ کچھ وہاں کی زرعی زمینوں پر کارپوریٹ فارمنگ چاہتی ہیں۔ یہ عقاب اس قرضے میں جکڑی قوم کے وسائل پر یوں ٹوٹتے ہیں جیسے بھوکے بھیڑیئے۔ افریقہ اس کی بدترین مثال ہے۔ پرکنز کہتا ہے کہ میں حیران ہوتا تھا کہ ان افریقی ممالک میں جہاں کروڑوں لوگ بھوک سے مر رہے تھے وہاں برگر' پیزا اور عالمی فوڈ ریستوران دھڑا دھڑ کھلتے جا رہے ہیں۔ ان کو چلانے کے لئے ایک مڈل کلاس بنائی جاتی ہے جس کو کارپوریٹ کلچر مناسب تنخواہ دیتا ہے۔ این جی اوز کو فنڈ ملتے ہیں' جنگے کے لئے مہنگی تعلیمی سہولیات اور مہنگے ہسپتال۔ یہ لوگ ہیں جو اس انفراسٹرکچر کی ترقی کو اخباروں اور ٹیلی ویژن پر اصل ترقی بتاتے ہیں۔ ایسے غریب ملکوں میں اگر کوئی ان "عقابوں" کی بات نہ مانے تو لیڈروں کو موت کی نیند سلا دیا جاتا ہے۔ چلی کا آلندے، کانگو کا لومبا اور پانامہ کا صدر اس کی مثالیں ہیں۔ اس کے ساتھ ان ملکوں کو حقوق کی جنگ کے نام پر قتل وغارت تحفے میں دی جاتی ہے۔ صرف سوڈان' روانڈا اور دارفور کی لڑائیوں میں چالیس لاکھ لوگ مارے گئے۔ یوں جہاں دہشت گردوں کا راج ہو وہاں ان سے معاہدہ کر کے معدنیات حاصل کی جاتیں ہیں اور جہاں امن ہو وہاں حکومت کو بلیک میل کر کے۔ انگولا اس کی بدترین مثال ہے۔ اگر لیڈروں کو قتل کرنے سے بھی کام نہ چلے اور کوئی ملا عمر یا صدام حسین جیسا لوہے کا چنا ثابت ہو جائے تو پھر اس کے ملک میں فوجیں اتار دی جاتی ہیں۔ یہ ہے وہ گھن چکر' اس لیے جب کوئی موٹروے بنتا ہے' ماس ٹرانزٹ سکیم آتی ہے' ایئرپورٹ کی توسیع ہوتی ہے تو میں کانپ اٹھتا ہوں۔ اٹھارہ کروڑ بھوکے ننگوں کے اس انجام پر جو پہلے ان عیاشیوں کا قرضہ ادا کریں گے اور پھر بدترین غلامی' دہشت اور خوف میں زندگی گزاریں گے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

روزنامہ دنیا

بددیانتی اور تعصب کی انتہا

اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

دنیا کے کسی ملک کے سائنس دان، فلسفی، دانشور، سیاست دان حتیٰ کہ طالب علم سے بھی اگر آپ سوال کریں کہ موجودہ سائنسی اور عمرانی علوم کا آغاز کہاں سے ہوا تھا تو کسی جھجک اور وقت ضائع کیے بغیر وہ صرف ایک ہی نام لے گا..... یونان۔ اگر وہ یونان اور اس کے شہر ایتھنز کو نہیں جانتا تو پھر بھی اس کی یادداشت میں سقراط، افلاطون، ارسطو اور بقراط جیسے نام ضرور موجود ہوں گے۔ سائنس اور تاریخ کی کتابوں میں اگر کسی نے مفکرین اور سائنس دانوں کے حالات پڑھے ہوں تو وہ ایک دم یونان سے چھلانگ لگا کر سولہویں صدی کے یورپ میں آنکلے گا اور موجودہ دور تک کی سائنسی اور عمرانی علوم کی ترقی کے معماروں کے نام گننے لگے گا۔ گیلیلیو سے کوپرنیکولس اور نیوٹن سے آئن سٹائن تک اسے سب لوگوں کے نام ازبر ہوں گے۔ یوں لگتا ہے کہ دنیا کی پانچ ہزار سالہ تاریخ میں سائنس اور علم صرف یورپ میں تھا، باقی دنیا جس میں چین، مصر، عراق، ایران اور ہندوستان کی عظیم تہذیبیں شامل ہیں، سب کی سب جہالت کے اندھیروں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ ان کے ہاں ماضی میں کوئی علمی روایت تھی نہ آج ہے، جو کچھ تھا وہ صرف اور صرف یورپ میں تھا اور آج بھی وہیں ہے۔ یہ تاثر خود بخود قائم نہیں ہوا بلکہ باقی پوری دنیا کو ازل سے جاہل اور تہذیب سے عاری ثابت کرنے کے لیے یورپ نے ایک اجتماعی کوشش کی تاکہ دنیا کے سامنے یہ نظریہ حقیقت بنا کر پیش کیا جائے کہ صدیوں پہلے بھی یورپ عظیم اور علم و ہنر سے مالا مال تھا اور آج بھی وہی پوری دنیا کا ہر میدان میں قائد ہے۔

یورپ کو بالادست اور عظیم تر ثابت کرنے کا کھیل جس طرح کھیلا گیا اس کا اندازہ عالمی نقشے کی ترتیب الٹنے سے لگایا جا سکتا ہے۔ دنیا کے نقشے میں یہ دکھانا مقصود تھا کہ یورپ چونکہ غالب ہے، اسے اوپر ہونا چاہیے؛ چنانچہ دنیا کے نقشے کو شمال کی سمت کو اوپر رکھ کر ترتیب دیا گیا تاکہ پورا یورپ بلند اور برتر جبکہ مشرق اور دیگر ممالک پست نظر آئیں۔ اس سے پہلے دنیا کے مروجہ نقشے جو مسلمانوں نے بنائے اور جن کا اقتدار ہسپانیہ سے ملائیشیا تک تھا، وہ جنوب کو اوپر کی سمت رکھ کر بنائے گئے تھے۔ یہی نہیں بلکہ نقشہ سازی میں یورپ کا حجم بڑا دکھانے کے لیے جن Cylindrical Projections کو رائج الوقت "مرکیٹر (Mercator) نقشہ سازی" میں استعمال کیا گیا اس سے یورپ جو ایک نسبتاً چھوٹا علاقہ ہے، اس کا حجم افریقہ سے بھی بڑا نظر آتا ہے۔ آج آپ دنیا کے کسی ملک میں چلے جائیں، کوئی اٹلس کھول لیں یا بچوں کے جغرافیے کی کوئی کتاب اٹھا کر دیکھ لیں، نقشے میں کرۂ ارض کو شمال کی جانب اوپر دکھایا گیا ہے جس سے یورپ تمام اقوام پر بالا نظر آتا ہے۔ ایسے نقشے انسانی تاریخ میں اس سے پہلے نہیں تھے۔ اس کا ذہن پر یہ اثر پڑتا ہے کہ ایک بچہ آغاز ہی سے اپنے آپ کو انتہائی پست ترین جگہوں کا مکین سمجھتا ہے اور یورپ کے باسیوں کو بلند و بالا۔

معاشرتی تاریخ مرتب کرنے میں بددیانتی کی گئی؛ چین، عراق، ایران، مصر اور ہندوستان کی تہذیبوں کا حصہ کم کر کے پیش کیا گیا اور پھر انہیں انتہائی پسماندہ ظاہر کیا گیا۔ چلیے، معاشرتی تاریخ کی بددیانتی تو تاریخ میں تعصب کے نام پر معاف کر دی جائے لیکن اس "عظیم" بددیانتی کا کیا کیا جائے جو سائنس کی تاریخ لکھتے اور سائنسی ایجادات اور سائنسی علوم کا ذکر کرتے ہوئے کی گئی کہ سب کچھ یونان کے کھاتے میں ڈال دیا گیا۔ یورپ میں لکھی گئی کوئی کتاب اٹھا کر دیکھ لیں ہر مضمون کی تاریخ کے آپ کو دو دور نظر آئیں گے..... یونانی (Hellenist) دور اور احیائے علوم کی تحریک کے بعد کا دور۔ ان کتابوں کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ پہلے دور میں یونان کے سوا باقی پوری دنیا جاہل، ان پڑھ اور گنوار تھی، پھر یونان اور تحریک احیائے علوم کے بعد والے یورپ کے درمیان جو صدیوں کا فاصلہ ہے اس میں انسان نے کوئی ترقی نہیں کی۔ درمیان کی صدیوں میں سے چھٹی صدی عیسوی (529ء) میں روم کے 'عظیم' بادشاہ جسٹینن (Justinion) نے اسکندریہ میں تاریخ کی سب سے بڑی لائبریری کو آگ لگا دی تھی۔ اس لائبریری میں پانچ لاکھ کتب تھیں جنہیں مصریوں نے پیپرس نامی درخت کی چھال پر لکھ کر محفوظ بنایا تھا۔ اس وقت مصر سے اس چھال کی برآمد بند کر دی گئی تھی۔ جب پوری دنیا میں علوم و فنون ترقی کر رہے تھے، اس دور میں یورپ میں سب سے بڑا ماہر ریاضی 'اوریلیک کا گربرٹ' تھا جس نے ریاضی پر ایک بہت ضخیم کتاب لکھی جو آج کل بچوں کی Abex یعنی کھلونا سمجھی جاتی ہے جبکہ یہی وہ دور تھا جب پورے یورپ سے عیسائی قرطبہ اور بغداد میں پڑھنے اور علم سیکھنے کے لیے اس طرح جاتے تھے جیسے آج کل دنیا بھر سے لوگ آکسفورڈ اور کیمبرج جاتے ہیں، اس زمانے میں کوئی یونان یا روم نہیں جاتا تھا۔ نویں صدی میں مسلمانوں کا دارالحکومت بغداد بہت بڑا شہر تھا اور پوری مسلم دنیا میں اتنے کتب خانے تھے کہ کتابوں کی ترسیل کے لیے چین سے کاغذ کی صنعت کو درآمد کیا گیا تھا۔ عربوں کے ہاں یہ علم رسول ﷺ کی اس حدیث پر عمل کرنے سے آیا کہ "علم مومن کا گمشدہ مال ہے"۔ بغداد، قرطبہ میں تراجم؛ ایران، مصر، ہندوستان اور سپین میں علمی مراکز قائم کیے گئے اور مختلف علوم و فنون پر اعلیٰ پائے کی کتب تصنیف کی گئیں لیکن آج یورپ میں لکھی گئی تاریخ اس پورے علمی سرمائے کو یونان کے کھاتے میں ڈال دیتی ہے۔

یونان کو ان تمام علوم کا ماخذ صلیبی جنگوں کے بعد ایک خاص مقصد کے لیے بنایا گیا۔ یہ علم صلیبی جنگوں کے بعد سپین کے شہر طلیطلہ (Toledo) میں قائم لائبریری کے ذریعے عیسائیوں کے ہاتھ آیا، 1085ء میں اس پر قابو پایا گیا اور پھر اسکندریہ کی لائبریری کی طرح اس کو جلایا نہیں گیا بلکہ اس کے تراجم شروع کیے گئے۔ ترجمے کا یہ عمل 1125ء میں شروع ہوا جس سے یورپ میں تحریک احیائے علوم کا آغاز ہوا اور وہاں جہالت کا خاتمہ ہوا۔ ظلم یہ ہوا کہ ان تمام کتب میں علم کے جتنے بھی ماخذ تھے وہ دنیا بھر کے ممالک سے لیے گئے تھے لیکن ترجمہ کرتے ہوئے انہیں یونانی قرار دیا گیا۔ ریاضی میں یونانیوں کے جمع تفریق اور ضرب تقسیم کے لیے رومن ہندسے تھے جیسے IVXM وغیرہ جبکہ موجودہ آسان ریاضی ہندوستان سے آئی تھی۔ یہ بددیانتی پہلے بھی کی گئی، جب سکندر نے ایران پر حملہ کیا تو دارا کے کتب خانے کی تمام کتابوں کا یونانی میں ترجمہ کرایا اور اصل کتب کو جلا دیا۔ یونان کی اس وقت حالت یہ تھی کہ وہاں کوئی کتب خانہ موجود نہ تھا، ارسطو پہلا شخص تھا جس کا اپنا کتب خانہ تھا اور وہ بھی یونان سے اس لیے فرار ہو گیا کہ اسے ڈر تھا کہ اسے سائنس کی کتابیں رکھنے کے جرم میں سزائے موت دے دی جائے گی۔ اسکندریہ کا کتب خانہ جس میں پانچ لاکھ کتب تھیں اسے سارے مورخین یونان کی تحریریں کہتے ہیں جبکہ یونان کی آبادی چند ہزار تھی اور وہاں نہ کتاب لکھنے کا کوئی رواج تھا اور نہ ہی سائنس پڑھنے پڑھانے کی کوئی روایت۔ ایک بددیانتی اور کی گئی کہ مسلمان سائنس دانوں کے اصل ناموں کو توڑ مروڑ کر رومن زبان میں بدل دیا گیا جیسے ریاضی کے جد امجد 'الخوارزمی کو Algoritmas کیا گیا اور طب کے بانی بوعلی سینا کو Avicenna تاکہ آنے والی نسلوں کو احساس تک نہ ہو کہ یہ لوگ یورپی نہیں تھے۔ کوپرنیکولس جسے جدید فزکس کا بانی کہا جاتا ہے وہ ایک عام سا پادری تھا' اسے سائنس کی الف بے بھی نہیں آتی تھی' اس نے نصیرالدین طوسی کی کتابوں کا ترجمہ اپنے نام سے چھاپا اور سائنس کا موجد بن گیا۔ اس بددیانتی کا آغاز باقاعدہ چرچ کی سربراہی میں ہوا اور چرچ کے مورخ Orosius نے ایک کتاب تحریر کی جس کا نام تھا History Against Pagans۔ اس کتاب میں اس نے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ دنیا کو علم سے روشناس یونانیوں نے کیا، اس سے پہلے دنیا تاریک اور جہالت سے بھری ہوئی تھی اور اس کے بعد کی چھ صدیوں میں مسلمانوں نے صرف یونانیوں کے علم کو محفوظ کیا۔ اس تاریخی بددیانتی کی انتہا موجودہ دور کے مورخ ول ڈیورانٹ کی کتاب Story of Civilization ہے جس کی گیارہ جلدیں ہیں، ان میں صرف ایک جلد Our Eastern Heritage یعنی ہمارا مشرقی ورثہ ہے۔ گزشتہ پانچ سو سالوں کا یہی تعصب ہے کہ مشرق میں رہنے والا ہر فرد یہ سمجھتا ہے کہ علم صرف یورپ میں پیدا ہوا، جوان ہوا اور اپنی بلندیوں پر پہنچا جبکہ ہم لوگ جاہل' ان پڑھ اور اجڈ تھے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

بتانِ رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا

حرف راز

اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

ایک صدی سے بھی کم عرصے میں اسی ملک برطانیہ کے نشریاتی اداروں پر ایک ایسی درخواست اور اپیل نشر ہوئی جس کا تصور بھی شاید آج سے بیس سال قبل کسی نے نہیں کیا ہوگا۔ یہ تو وہ ملک ہے جس نے ملت اسلامیہ کو ٹکڑوں میں بانٹنے' رنگ' نسل' زبان اور علاقوں میں تقسیم کرنے کے لیے ایک بھرپور سازش کا آغاز کیا تھا۔ اسی دھرتی نے لارنس آف عریبیہ کو جنم دیا جس کو مختلف خفیہ ایجنسیوں نے کئی سال اس مقصد کے لیے ہزاروں گُر سکھائے' اسلامی تعلیمات اور عربی زبان و بیان کا ماہر بنایا اور اسے یہ کام سونپا گیا کہ مسلمانوں کی مرکزیت کی علامت' خلافتِ عثمانیہ کو ختم کرنے کی راہ ہموار کی جائے۔ خلافت عثمانیہ کسی جنگ سے ختم نہ ہوئی بلکہ امتِ مسلمہ میں زبان' رنگ' نسل اور علاقے کی عصبیت کا بیج بو کر اسے ممکن بنایا گیا۔

اس کے بعد کی کہانی ایک مسلم امہ کے درجنوں ٹکڑوں کی کہانی ہے۔ ان ٹکڑوں کو موجودہ ''تہذیب یافتہ'' دور میں قومی ریاستیں کہا جاتا ہے۔ ان ریاستوں کے باشندوں کو ادب' تاریخ، سیاسیات اور نصابِ تعلیم کے ماہرین گزشتہ سو سال سے دن رات یہ سکھانے میں مصروف ہیں کہ تقریباً پانچ درجن کے قریب مسلمانوں کی قومی ریاستیں دراصل صدیوں سے علیحدہ علیحدہ شناخت رکھتی تھیں۔ مصر والے فرعونوں کے وارث ہیں، عراق والے دجلہ و فرات کی عظیم تہذیبی تاریخ کے امین ہیں' ایران والے سائرس اعظم اور پاکستان والے وادیٔ سندھ کے فرزند ہیں... غرض، علم کی ایک شاخ وضع کی گئی جس کے ذریعے ہر خطے کو اس کے ہزاروں بلکہ لاکھوں سالہ ماضی کے ساتھ جوڑ کر اس کے باسیوں میں یہ عقیدہ راسخ کر دیا گیا کہ ان ملکوں میں رہنے والے لوگ بس اچانک کسی ایک دور میں مسلمان ہو گئے تھے، اس لیے ان کی آئندہ نسلیں بھی مسلمان ہی چلی آ رہی ہیں۔ ان کا کسی دوسرے ملک یا علاقے کے مسلمانوں کے ساتھ کوئی رشتہ اور تعلق نہیں ہے۔ ان کی اپنی تہذیب اور ثقافت ہے اور اپنا رہن سہن۔ ان کا کلچر' ثقافت' آثارِ قدیمہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ صرف یہ بات لوگوں کے ذہن میں بٹھانے کے لیے زبردست محنت کی گئی کہ انڈونیشیا میں بسنے والے مسلمان کا ہندوستان کے مسلمان سے کوئی تعلق نہیں اور عراق میں آباد مسلمان کی مصر کے مسلمان سے ایک الگ تہذیب اور ثقافت ہے۔

قومی ریاستوں کے وجود میں آنے سے ایک عالمی منافقت کے دور کا آغاز ہوا، انہیں یہ باور کرایا گیا کہ قوموں کے باہمی تعلقات صرف اور صرف مفادات کی بنیاد پر ہو سکتے ہیں۔ ان میں دوستی' محبت یا بے غرض تعلق نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ روابط کے اس جدید نظام کو دو طرفہ تعلقات کی سفارت کاری کہا گیا۔ اس منافقت کے علم کو دنیا بھر کی یونیورسٹیوں میں ڈپلومیسی کے نام پر پڑھایا گیا۔ آپ کبھی دنیا کے کسی بھی سفارت خانے کے اعلیٰ سطح کے ملازم سے گفتگو کر کے دیکھ لیں، آپ کو اس کی گول مول باتوں میں سے بڑی مشکل سے سچ تلاش کرنا پڑے گا۔ پوری دنیا میں سفارت کاروں کی اپنی ایک الگ زبان ہوتی ہے اور اس کے اپنے مطالب۔ سفارت کاری کی یہ پوری کی پوری تربیت قومی تعصب کی بنیاد پر استوار کی جاتی ہے' پھر ایسے لفظ ایجاد کیے جاتے ہیں جن کے کئی مطالب ہوں۔ یہ مفادات کی دنیا اور قومی مفادات کا تعصب ہی ہے جو ریاستوں کو ایک دوسرے کے ساتھ دست بگریبان کرتا ہے۔ آج کے دوست کل کے دشمن اور کل کے دوست آج کے دشمن بن جاتے ہیں۔ جب پوری دنیا اس طرح تقسیم کر دی گئی ہو تو ایسے میں امت مسلمہ یا بحیثیت مسلمان کے ایک قوم کا تصور تو خواب بن کر رہ جاتا ہے۔ کون اس بات پر یقین کرے کہ ان کے پیغمبر سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا تھا کہ مسلمانوں کی مثال ایک جسدِ واحد کی ہے، اگر ایک عضو کو کانٹا چبھتا ہے تو پورا بدن اس تکلیف کو محسوس کرتا ہے (مفہوم)۔ اس جسدِ واحد کو ستاون سے زیادہ ٹکڑوں میں تقسیم کر کے یہ لوگ مطمئن تھے کہ اب ہم نے اس تصور کو مسلمانوں کے خوابوں سے بھی نکال دیا کہ وہ ایک ملت یا ایک قوم ہو سکتے ہیں۔

لیکن کیا کریں 11 ستمبر کے بعد شروع ہونے والی جنگ نے بقول اقبال ''مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے'' اس امت میں ایسے سرفروشوں کے دل دھڑکنے لگے جو اگر یمن میں بھی تھے تو بوسنیا اور چیچنیا کے لیے بے تاب تھے اور سوڈان میں پلے بڑھے تھے مگر افغانستان کے بھائیوں کا ساتھ دینا چاہتے تھے۔ یہ تو خیر مسلمان امت کے ممالک کی بات ہے لیکن وہ لوگ جو برطانیہ کی درس گاہوں میں پل بڑھ کر جوان ہوئے' جنہیں یہاں کی نرسری نظموں کی لوریاں ملیں' جنہوں نے عظمت برطانیہ کے ترانے اپنے نصابوں میں پڑھے' جو نسلاً گورے تھے اور گوروں کو عظیم تر سمجھتے تھے، ان لوگوں نے جب اسلام کی حقانیت کو سمجھا اور کلمۂ طیبہ کو اپنے سینے میں اتارا تو ان میں ملت اسلامیہ کے جسدِ واحد ہونے کا تصور ایسا راسخ ہوا کہ آج برطانیہ کے نشریاتی اداروں پر برطانوی پولیس کی جانب سے برطانوی ماؤں کے لیے ایک اپیل نشر ہوئی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو شام میں جا کر اپنے مسلمان بھائیوں کے شانہ بشانہ لڑنے سے روکیں۔ اس وقت تقریباً بائیس برطانوی گورے مسلمان شام کے محاذ پر حافظ الاسد کی آمریت کے خلاف اور اس کی بربریت کے مقابلے میں لڑتے ہوئے شہید ہو چکے ہیں۔ انہوں نے جہاد کسی مدرسے سے نہیں سیکھا' آکسفورڈ' کیمبرج اور لندن سکول آف اکنامکس سے سیکھا ہے۔ یہ ہے وہ المیہ جس نے ایک صدی پہلے کے برطانیہ کو الٹ کر رکھ دیا ہے۔ کوئی سوچ سکتا تھا کہ پوری امت کو نسل اور رنگ کے نام پر تقسیم کرنے والی عظیم مملکت کے اپنے لوگ اس نعرے پر یقین کرنے لگیں گے:

بتانِ رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا

allurdupdfnovels.blogspot.com

بدترین انجام کے منتظر

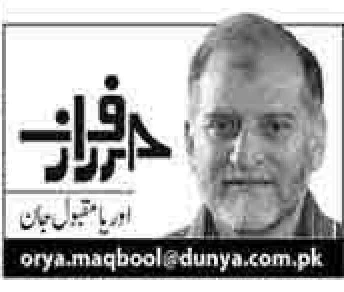

اردو ادب کے ایک خوبصورت افسانے کی کہانی ایک ایسے گاؤں کے گرد گھومتی ہے جس کے باسی بارش کے پانی سے اپنی محدود زمینیں آباد کرتے ہیں۔ بارشیں رُک جائیں تو قحط سالی آجاتی ہے، جمع شدہ اناج سے گزر بسر کی جاتی ہے یا پھر کچھ عرصے کے لیے شہر کی جانب ہجرت کر کے محنت مزدوری سے پیٹ پالا جاتا ہے۔ بارانی علاقے کی اس زمین پر بہت سے مٹی کے بڑے بڑے ڈھیر ہیں جنہیں ٹبے کہا جاتا ہے۔ ان ٹبوں کے بارے میں لوگوں کا یہ گمان ہے کہ یہاں کبھی انسان رہا کرتے تھے، شہر آباد تھے لیکن وقت نے انہیں کھنڈر کر دیا۔ قحط سالی کے زمانے میں آثارِ قدیمہ کے ماہرین کی ایک ٹیم یہاں کے ایک ٹبے کے گرد پڑاؤ ڈالتی ہے اور گاؤں میں سے چند لوگوں کو کھدائی کے لیے مزدور رکھ لیتی ہے۔ ایک فاقہ زدہ غریب شخص بھی ان مزدوروں میں شامل ہو جاتا ہے۔ دن بھر کھدائی کے بعد رات کو مزدوری لے کر گھر آتا ہے تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا۔ اسے لگتا ہے کہ اب غربت کے دن رخصت ہو گئے۔ بیوی اکثر اس سے سوال کرتی ہے کہ تم وہاں کھدائی کرتے ہو، آخر وہ لوگ کیا ڈھونڈ رہے ہیں؟ پہلے پہل تو اسے صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ مٹی کے اندر سے ٹوٹے برتنوں کے ٹکڑے، سکے یا کوئی اور استعمال کی چیز مل جائے تو فوراً اسے ماہرِ آثارِ قدیمہ کے سامنے لا کر پیش کر دیا جاتا۔ وہ اسے صاف کرتا، ''ڈسٹلڈ واٹر'' سے دھوتا اور اپنے سامنے رکھی ہوئی چیزوں پر ترتیب سے رکھ دیتا۔ مزدور اپنی کھدائی میں مصروف رہتے جبکہ وہ بڑے بڑے محدب عدسوں کے ذریعے ان ٹھیکریوں کا بغور مطالعہ کرتا رہتا۔ کھدائی کا عرصہ طویل ہوتا گیا، ان چند مزدوروں کے گھر میں خوشحالی آ گئی، لیکن اس مزدور کی بیوی کے سوال ختم نہ ہوئے۔ وہ پوچھتی کیا یہ لوگ پاگل ہیں، آخر کیا ڈھونڈ رہے ہیں، ان ٹوٹے ہوئے برتنوں سے انہیں کیا ملے گا؟ خود اس کی سمجھ میں بھی کچھ نہ آتا۔

آخر اسے وہاں موجود ماہرین کی باتوں سے پتا چلنے لگا کہ یہ لوگ تین چار ہزار سال پرانے اس شہر میں بسنے والے لوگوں کے زیرِ استعمال اشیاء کی تلاش میں ہیں۔ ان میں سب سے اہم ایک بہت بڑا مٹکا ہے جس کے گیارہ ٹکڑے دریافت ہو چکے ہیں اور بارہویں کی تلاش جاری ہے تاکہ مٹکا مکمل ہو جائے۔ تلاش طویل ہو جاتی ہے، وہ ٹکڑا نہیں ملتا، مگر مزدوروں کا رزق چلتا رہتا ہے۔ اچانک شور اٹھتا ہے کہ وہ ٹکڑا مل گیا۔ اسے لا کر اس بڑی سی میز پر رکھا جاتا ہے۔ ایک دم خوشی و مسرت میں ماہرین رقص کرنے لگتے ہیں۔ ان سب کی خوشی دیدنی ہوتی ہے۔ اگلے دن صبح مزدور کام پر آتے ہیں تو ماہرین کا سامان باندھا جا رہا ہوتا ہے، گاڑیاں تیار کھڑی ہوتی ہیں، وہ ان سب کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور کچی سڑک پر دھول اڑاتے غائب ہو جاتے ہیں۔ یہ شخص مایوس گھر واپس لوٹتا ہے۔ قحط سالی اب بھی قائم ہے۔ چند دن بچی کھچی آمدن سے گھر کا گزارہ چلتا ہے، پھر فاقے شروع ہو جاتے ہیں۔ پریشان حال وہ شخص گھر کے صحن میں بیٹھا سوچوں میں گم ہے، بیوی اسے مزدوری ڈھونڈنے کے لیے کہتی ہے۔ کتنے دن اس لڑائی، ناکامی اور نامرادی میں گزرتے ہیں۔ نہ بارش برستی ہے، نہ مزدوری ملتی ہے اور نہ فاقے ختم ہوتے ہیں۔ ایک دن وہ سخت پیاس کے عالم میں گھڑونچی پر رکھے ہوئے گھڑے کے پاس پانی پینے کے لیے آتا ہے۔ پانی پی کر گھڑا اٹھاتا ہے اور اسے گھر کے باہر زور سے پٹخ دیتا ہے۔ بیوی غصے سے پاگل ہو جاتی ہے۔ کہتی ہے، ایک تو گھر میں پیسے نہیں، اوپر سے تم نے پانی بھر کے لانے والا گھڑا بھی توڑ دیا۔ اس مزدور کا جواب ثقافت کے ٹھیکیداروں کے منہ پر ایک زناٹے دار تھپڑ ہے۔ وہ اپنی بیوی سے کہتا ہے: آج سے تین ہزار سال بعد جب یہ گاؤں ایک ٹبہ بن چکا ہو گا تو ایسے ہی ماہرین آثارِ قدیمہ آئیں گے اور مزدوروں کو اس گھڑے کے ٹکڑوں کی تلاش میں لگائیں گے۔ یوں کتنے لوگوں کو مزدوری مل جائے گی۔

ثقافت کے رنگا رنگ منظر کی یہ کہانی دنیا میں ہر اس حکمران نے دہرائی ہے جسے عوام کے دکھوں سے کوئی دلچسپی نہ ہو، لیکن وہ چند دن کے میلوں ٹھیلوں سے ان کو مصروف کر کے اپنے اقتدار کو طول دینا چاہتا ہو۔ میکاوَلی نے اپنی مشہور عالم کتاب ''پرنس'' میں بادشاہوں کو جو مشورے دیئے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ بار بار میلوں ٹھیلوں اور رنگا رنگ تقریبات کا انعقاد کیا جائے تاکہ اس عرصے میں لوگ اپنی غربت و افلاس کے دکھوں کو بھول جائیں۔ پورا روم جب اپنی ترقی کے عروج پر تھا تو عام آدمی کی زندگی انتہائی تلخ اور مشکل تھی، لیکن اشرافیہ کے گھر کے فواروں میں بھی خوشبودار پانی استعمال ہوتا تھا۔ ان کے ہاں تہذیب و ثقافت کے نام پر ہر وقت بڑی بڑی تقریبات کا اہتمام ہوتا رہتا تھا، لیکن ان غریب عوام کو چند دن تقریبات کے کھلونے سے بہلانے کے لیے رومن کھیلیں منعقد کی جاتی تھیں جن میں بگھیوں کی ریس سب سے بڑا تماشا ہوتی تھی۔ اس کے لیے نیل کے ساحلوں سے باریک ریت جہازوں میں منگوائی جاتی اور اس بڑے سٹیڈیم میں بچھائی جاتی۔ صرف یہی نہیں، ہر سال تقریباً بارہ سو مجرموں کو بھوکے شیروں کے سامنے ڈالا جاتا۔ ہاتھیوں، گینڈوں، بیلوں، چیتوں اور جنگلی سوروں کی لڑائیاں ہوتیں۔ دو سو خوبصورت دوشیزاؤں کو پاگل نوجوانوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جاتا۔ قیدیوں کو خوراک کھلا کر پالا جاتا، ورزش کروائی جاتی جنہیں وہ گلیڈی ایٹر کہتے۔ پھر ان کو بھوکے شیروں سے لڑنے کو کہا جاتا۔ سٹیڈیم میں تین لاکھ پچاس ہزار افراد بیٹھے یہ تماشا دیکھتے۔ جب تک جشن چلتا لوگوں کو مفت کھانا ملتا۔ یہ چند دن ایسے گزرتے جیسے پورے روم میں کوئی دکھ نہیں، بھوک ہے نہ غربت، ننگ ہے نہ افلاس۔ سب سے تکلیف دہ بات یہ تھی کہ اس زمانے کے دانش ور، قلم کار، شاعر اور ادیب ان کھیلوں کو روم کی ثقافت کا مظہر قرار دیتے، اسے ترقی کی بنیاد اور مذہبی جکڑ بندیوں سے آزادی کا زینہ تصور کرتے۔

لیکن ان رنگا رنگ تقریبات کے مدح خوانوں کے درمیان ایک فلاسفر سینیکا (Seneca) بھی تھا۔ وہ ان ثقافتی تقریبات کا مخالف تھا۔ اسے اپنے اردگرد بھوک، ننگ، افلاس اور غربت نظر آتی تو چیختا۔ وہ سمجھتا کہ یہ سب اس بھوکی ننگی قوم کے ساتھ مذاق ہے۔ وہ ان تقریبات میں شرکت نہ کرتا بلکہ اپنے گھر میں بیٹھا ان دنوں میں روتا رہتا۔ اس کے بہت سے مداح پیدا ہو گئے، یہاں تک کہ روم کے وزیرِاعظم کے عہدے کا فرد جسے ٹرابیون کہتے تھے وہ بھی اس کے مداحوں میں شامل ہو گیا۔ بادشاہ کو اس کی مقبولیت کا علم ہوا تو اسے دربار میں طلب کیا گیا۔ اس سے پوچھا گیا کہ تم ان ثقافتی تقریبات کو کیا سمجھتے ہو؟ اس نے کہا: یہ ایک مذاق ہے جو غربت میں پسی ہوئی قوم کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ تم بھرے دربار میں اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو قتل کرو۔ دربار کے سناٹے میں وزیرِاعظم نے اس کی سفارش کی لیکن ثقافت کے اس دشمن اور روم کی تہذیبی روایات کے مخالف کی جان کیسے بخشی جا سکتی تھی۔ سینیکا نے بھرے دربار میں خودکشی کر لی۔ لیکن تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ یہ رنگا رنگ تقریبات روم کے بادشاہوں کو بدترین انجام سے نہ بچا سکیں۔ ان پر شمالی افریقہ کے تہذیب سے ناآشنا قبائل ایسے چڑھ دوڑے کہ بڑے بڑے ثقافتی مراکز کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی اور آج وہ عبرت کے نشان کے طور پر موجود ہیں۔ تاریخ اس بات کی بھی شاہد ہے کہ اس سے کوئی عبرت حاصل نہیں کرتا۔ کسی کو ''موئن جو دڑو'' (مرجانے والوں کا ٹبہ) میں میلے لگانے کا شوق ہے تو کوئی جشنِ بہاراں اور سپورٹس فیسٹیول مناتا ہے۔ انجام سے بے خبر لوگ کیا تہذیب سے ناآشنا قبائل کا انتظار کر رہے ہیں؟

allurdupdfnovels.blogspot.com

بے نیاز نیاز صاحب

یوں تو اس دفتر کی ترتیب کو بدلے ہوئے ایک عرصہ ہو چکا۔ ایک انتہائی جدید عمارت میں حسنِ ترتیب کے ساتھ رکھی ہوئی کتابیں' جن کے ایک جانب اوپر والی منزل کو جاتا ہوا زینہ' جسے طے کر کے کسی بڑے کارپوریٹ آفس کی طرح بارعب دروازے کے پیچھے ایک طویل و عریض میز اور کونے پر خوبصورت صوفہ سیٹ' لیکن میری آنکھوں میں آج بھی وہی منظر گھومتا رہتا ہے جس میں کتابوں سے بھرا ایک بڑا سا ہال جس کے ایک حصے میں درویش کے تکیے کی طرح ایک پنڈال جس میں اس فقیر صفت انسان کے اردگرد اس شہر کے صاحبانِ علم و دانش میں سے کوئی نہ کوئی شخص ضرور مل جاتا تھا۔ پاک ٹی ہاؤس کو اجڑے ایک عرصہ ہو گیا تھا لیکن یہ ڈیرہ ان کی صحت تک آباد رہا۔ ایک مقناطیسی شخصیت جس کے سحر سے نکلنا کسی حصار میں آئے شخص کے لیے ناممکن تھا۔ میں نے جب لاہور کو خیرباد کہا اس وقت لاہور کی ادبی دنیا بہت آباد تھی۔ علم کی پیاس میں طلب کی راہ پر چلتے افراد کے لیے کیا کیا ٹھکانے تھے۔ احمد ندیم قاسمی صاحب کا فنون' ریڈیو پاکستان کی کینٹین' لارڈز ہوٹل کے سامنے سڑک پر رکھی کرسیاں' شورش کاشمیری کا چٹان' انڈس ہوٹل' چائنیز لنچ ہوم' مال روڈ کا شیزان' ٹولنٹن مارکیٹ کا کیپری' لکشمی چوک میں بھیگتی رات کی محفلیں' نسبت روڈ کے چائے خانے' وائی ایم سی اے کے کمرے میں حلقۂ اربابِ ذوق اور سب سے بڑھ کر پاک ٹی ہاؤس۔ مال روڈ کے ایک کونے سے چلنا شروع ہوں تو دائیں بائیں کتابوں کی اتنی دکانیں کہ ان میں ٹھہرتے' کتابیں دیکھتے گھنٹے بیت جائیں۔ یہ آج سے 34 سال پہلے کا لاہور تھا کہ مارچ 1980ء میں' میں بلوچستان یونیورسٹی میں تدریس کے لیے چلا گیا۔ اس کے بعد ہر سال جب بھی لاہور آتا کوئی نہ کوئی ٹھکانہ اجڑا ہوا نظر آتا' لیکن ایک فرد کے تکیے' محفل اور رونق میں دن بدن وسعت ہی ہوتی رہی اور وہ تھا نیاز صاحب کا سنگ میل۔ بلوچستان کے چوبیس سالہ قیام کے دوران میری ان سے ملاقاتیں محدود لیکن ان کا تاثر لامحدود تھا۔ ان سے اکثر ملاقاتیں کشور ناہید کے اقبال ٹاؤن والے گھر میں ہوئیں جہاں میرے لاہور آنے پر کشور شہر بھر کے ادیبوں شاعروں کو جمع کر لیتی۔ کون تھا جو اس محفل میں نہ آتا۔ میرے جیسے ''رجعت پسند'' بھی اور خالصتاً دہریئے بھی لیکن نیاز صاحب کی مسکراتی شخصیت ان محفلوں میں دونوں شدت پسند انتہاؤں کے درمیان ایک مرنجاں مرنج صوفی کی طرح موجود ہوتی۔ اس ہجوم میں نیاز صاحب ہنگامۂ ہائے شوق سے بے نیاز ان سب کو اپنی اپنی اناؤں میں مست دنیا جہان کے مسائل پر تبصرہ کرتے' ان کا حل نکالتے دیکھتے رہتے۔ ان محفلوں میں ان کا قیام بھی اکثر مختصر سا ہوتا۔ وہ چلے جاتے تو محفل کے عین شباب میں ان کا چہرہ تلاش کرنے کی کوشش کرتا تو وہ نظر نہ آتے۔ ایسے میں کبھی کبھی مجھے یہ احساس ہوتا کہ وہ گفتگو کی تلخی اور محفل کے شباب سے دور بھاگتے ہیں لیکن جب کبھی ان سے اکیلے ملنے کا اتفاق ہوا' ان کی گفتگو کا رس کانوں میں گھلتا چلا جاتا۔ میرے لیے یہ بہت عجیب تجربہ ہوتا۔ ایک خالصتاً کاروباری پبلشر لیکن سارے کا سارا رکھ رکھاؤ ایک ملامتی صوفی والا۔ کہیں کسی پر یہ کھل نہ جائے کہ وہ لوگوں کی پریشانیوں پر بے تاب ہو کر کیسے ان کی مدد کو نکل کھڑے ہوتے ہیں اور پھر ان کے اردگرد تو لوگ بھی ادیب' شاعر' افسانہ نگار تھے' جنہوں نے اپنے اردگرد بیش بہا ضروریات ہی لپیٹی ہوتی ہیں۔

میں ان کے سنگ میل پبلیکیشنز تک کے سارے سفر سے بہت دور رہا ہوں' لیکن گزشتہ دس سال میں ان کے ادارے کا ایک ایک لمحہ میری آنکھوں پر ثبت ہے۔ مجھے نہیں علم کہ انہوں نے کتنی محنت سے اپنی کسمپرسی میں اس انتھک محنت والے کام میں ہاتھ ڈالا ہو گا۔ کام بھی ایسا کہ جس کی قدر و قیمت وقت کے ساتھ اس بے حس معاشرے میں کم ہو رہی تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ اگر کسی ادیب یا شاعر کی کتاب چھپ جاتی تو یہ اس پر پبلشر کا ایک احسان ہوتا لیکن نیاز صاحب نے اس رسم کو بالکل الٹ کر رکھ دیا۔ ان کے نزدیک کوئی ادیب یا شاعر اگر انہیں کتاب چھاپنے کے لیے کہتا ہے تو وہ ان پر اور ان کے ادارے پر احسان کر رہا ہوتا۔ جس زمانے میں انہوں نے ادیبوں کو رائلٹی دینے کی رسم ڈالی' اس دور میں ایسی خبریں کسی دور دیس سے آیا کرتی تھیں کہ کسی ادیب' شاعر یا مصنف کو کتاب لکھنے اور چھپنے کے بعد اتنا معاوضہ مل جاتا ہے کہ وہ چین کی زندگی گزار سکتا ہے۔ مدتوں ہم ایک ایسے معاشرے میں زندہ رہے' بلکہ آج بھی زندہ ہیں جہاں کتاب کی اشاعت کے دوران کاغذ ڈھونے والے' اسے پریس مشین میں ڈالنے والے' کتاب کی جلد کرنے والے' اس کی کتابت اور تزئین و آرائش کرنے والے یہاں تک کہ اسے گاڑی میں رکھ کر بک سٹالوں پر پہنچانے والے سب افراد کو ان کی محنت کے مساوی معاوضہ دیا جاتا ہے جبکہ وہ جس کے خونِ جگر کی آمیزش سے یہ تحریر وجود میں آئی تھی اسے معاوضہ نہیں ملتا۔ یہی المیہ مدتوں اخبارات اور ادبی رسالوں کا رہا ہے۔ ان کے چھاپنے والے مصنفین کی عزت و تکریم کریں گے' ان کی تصنیفات کے گن گائیں گے' ان کی یاد میں تقریبات منعقد کریں گے لیکن انہیں معاوضہ نہیں دیں گے۔ نیاز صاحب نے یہ ریت توڑی۔ وہ پبلشنگ کے برہمن مافیا کے مقابلے میں لنگر بچھانے والے ایسے درویش تھے جن کے لنگر پر ادیب اور پبلشر کے درمیان ذات پات کی تقسیم ختم ہو جاتی تھی۔ ایسا تو کسی نے کبھی سوچا تک نہ تھا۔ سعادت حسن منٹو جیسا مقبول ترین افسانہ نگار فوری ضرورت کے لیے خود ناشر کے پاس جا کر اپنی کہانیاں تھوڑے داموں فروخت کرتا تھا۔ کون تھا جس نے اپنے وقت کے بڑے بڑے ادیبوں کو معاوضے کے لیے خون نہ تھکوایا ہو' چکر نہ لگوائے ہوں۔ لیکن انہوں نے تو یہ رسم ہی بدل ڈالی۔

لیکن ادب پر ایک بڑا احسان ان کا ایسا ہے کہ جس کی آئندہ آنے والی نسلیں بھی قیمت نہیں ادا کر سکتیں۔ انہوں نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر وہ علم کے موتی جو ہمارے آباء نے اپنے قلم سے کتابوں کی صورت پروئے تھے' انہیں نکالا اور از سر نو خوبصورت انداز میں شائع کیا۔ کتاب خواہ یورپ کے کتب خانوں سے ملی یا کسی ناخلف اولاد کے کباڑ خانوں میں' انہوں نے اسے حاصل کیا اور آنے والی نسلوں تک یہ ورثہ پہنچایا۔ اس میں انہوں نے زبان کی بھی کوئی تخصیص نہ کی۔ اس خطے سے متعلق کسی نے بھی جو لکھا خواہ وہ انگریز حاکم ہی کیوں نہ تھا' اسے شائع کیا۔ سنگ میل ان کے دنیا کے رخصت ہونے سے تھوڑا پہلے بہت بدل چکا تھا۔ وہ بیماری کی وجہ سے صرف دروازے تک آتے' گاڑی میں بیٹھے رہتے اور چلے جاتے۔ جاپان سے واپسی پر مجھے جب ان کے انتقال کی خبر ملی تو میں ان کے بیٹے افضال سے تعزیت کے لیے گیا۔ کس قدر خوش نصیب ہوتا ہے وہ باپ جسے مغفرت کے لیے ہاتھ اٹھانے والا ایسا بیٹا میسر آ جائے جس نے خود اپنے لیے ایک ریاضت کی دنیا منتخب کر رکھی ہو۔ اس نے اچھا کیا' نیاز صاحب کی نشست کا وہ منظر ہی بدل دیا۔ ورنہ میرے جیسے لوگ اس بڑی سی نشست گاہ جس پر درویش کے تکیے کا گمان ہوتا تھا' وہاں داخل ہوتے تو شاید واپسی کا راستہ بھول جاتے۔ جس عمارت کے در و بام کے ساتھ کسی فقیر کی یادیں وابستہ ہوں وہاں سے بسلامتی ہوش و حواس باہر نکلنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

بزدلی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے

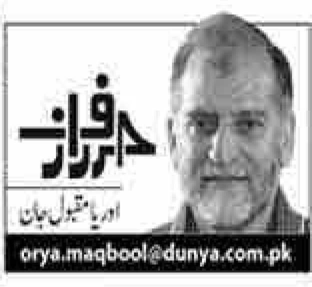

ان لوگوں کے چہرے بھی اُس زمانے میں ٹیلی ویژن چینلوں پر تمتما رہے ہوتے تھے اور آج بھی یہ اسی طرح جگمگا رہے ہیں۔ جولائی 2007ء کی سخت گرمی کے ساتھ ساتھ ان کے مزاج کی گرمی اور لہجے کی تلخی بھی نمایاں تھی۔ آج بھی آپ ان لوگوں کو دبے لہجے اور باتوں کو گھما گھما کر ڈرون حملوں کی حمایت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں‘ لیکن اُن دنوں تو ان سب کی آنکھوں کا تارا پرویز مشرف برسرِ اقتدار تھا۔ جمہوریت کے ان پروانوں نے تنقید کے لیے ضیاء الحق کو نشانے پر رکھا ہوتا ہے اور اس ملک میں سیکولرازم کی بنیادیں مضبوط کرنے کی تمام امیدیں پرویز مشرف سے وابستہ کی جاتی ہیں۔ اس سال جولائی میں اسلام آباد کے بیچوں بیچ لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے معرکے کے لیے راہ ہموار کی جارہی تھی۔ تجزیہ نگار، اینکر پرسن، سول سوسائٹی کے فیشن زدہ مرد اور عورتیں سب یک زبان تھے۔ کیسے کیسے تلخ جملے تھے: ''مذاق بنایا ہوا ہے، پوری دنیا میں پاکستان کا مذاق اُڑایا جا رہا ہے، دارالحکومت کے عین درمیان تماشا لگا ہوا ہے، چند دہشت گردوں نے یرغمال بنایا ہوا ہے، حکومت کیا کر رہی ہے، حکومت کی رٹ کہاں ہے؟ یہ تماشا بند ہونا چاہیے، انہیں آب پارہ والوں نے پال رکھا ہے، ایجنسیاں ان کو بچا رہی ہیں''۔ اس طرح کے بہت سے فقرے، تبصرے، تجزیے روز ٹی وی کے شام کے پروگراموں کو گرما رہے تھے۔ ایک دن ان لوگوں کے محبوب قائد پرویز مشرف نے صحافیوں کے سامنے کہا: ''ہم ایکشن کریں گے، پھر شور مت مچانا''۔ کیسی خاموشی تھی اس فقرے کے بعد۔ کیسی رضامندی تھی جو سر جھکا کر خاموشی سے ظاہر کی گئی۔ پھر اس کے بعد یہ پورا علاقہ ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ سے گونجنے لگا۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ‘ بموں کی گونج اور گولیوں کی آوازیں آنے لگیں اور اللہ کا گھر کھنڈر بن گیا اور بچیوں کا مدرسہ ملبے کا ڈھیر۔ پھر طویل سناٹا چھا گیا۔

کئی سالوں کے بعد جب پرویز مشرف پر لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے مقدمے کی آوازیں گونجیں تو اس ''شیر کے بچے'' نے کمال ''جرأت'' اور ''بہادری'' سے کہا: ''میں نے کب یہ ایکشن کیا؟ یہ تو اسلام آباد کی انتظامیہ کا فیصلہ تھا۔ اب بھلا کیا صدرِ مملکت تھانے کے ایس ایچ او کو حکم دیتا ہے؟ کیا وہ ایک ڈپٹی کمشنر کو کہتا ہے کہ اپنی مدد کے لیے ضابطۂ فوجداری کے تحت فوج کو طلب کرو؟'' کیا منطق ہے اس ''شیر'' کی جس کی اپنی جان پر بنی ہے تو وہ ایسی دلیلیں پیش کر رہا ہے۔ وہ جو مدتوں اس آپریشن کا دفاع کرتا رہا۔ لوگوں سے کہتا رہا کہ وہاں ایک بھی بچہ یا عورت نہیں مری۔ چلو اسے تو مقدمے کا ڈر ہے، موت کا خوف ہے، لیکن وہ جو اس کا ساتھ دے رہے تھے؟ وہ‘ جن کی زبانیں نہیں تھکتی تھیں، آج سب کے سب خاموش ہیں۔ سب کو سانپ سونگھ گیا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی سینہ پھلا کر جرأت کے ساتھ نہیں کہتا کہ مشرف پر غلط مقدمہ چلایا جا رہا ہے۔ کوئی انسانی حقوق کا ترجمان، پاکستان کے ایٹمی پروگرام کا دشمن، عورتوں کے حقوق کا محافظ، آزادیٔ رائے کا علمبردار، فیشن زدہ سول سوسائٹی کا مشعل بردار ہاتھوں میں پلے کارڈ لے کر اسلام آباد کی سڑکوں پر نہیں نکلا کہ مشرف پر مقدمہ غلط ہے‘ اس آپریشن کی تو ہم سب نے حمایت کی تھی‘ یہ آپریشن تو پاکستان کے وقار کی حفاظت کرنے کے لیے تھا۔ سب اپنے اس ''محسن'' کو بھول گئے ہیں جو اس وقت چک شہزاد کے فارم ہاؤس میں بیٹھا‘ بزدلی کے ساتھ اپنے گناہوں سے انکار کے راستے ڈھونڈ رہا ہے۔ سیاست دان تو چلو وقت کی ہوا دیکھ کر بدل جاتے ہیں لیکن دانشوروں اور سول سوسائٹی کے کرتا دھرتا لوگوں کا یہ ٹولہ تو اپنے آپ کو اصول پرست اور راست گو کہتا ہے۔ آج ان کے منہ سے سچ نہیں نکل رہا۔ چلو‘ میرے جیسے لوگ تو اس وقت معتوب تھے، ہم فرسودہ اور دقیانوسی لوگ تھے۔

میں ان دنوں ایران میں ایک بین الاقوامی ادارے میں مقابلے کے امتحان کے بعد ایک اہم عہدے پر تعینات تھا، جب یہ سانحہ رونما ہوا۔ میرے لیے رزقِ حلال سے معاشی حالات بہتر بنانے کا یہ اچھا ذریعہ تھا‘ لیکن اللہ نے اس معاشی استحکام کو بھی میری کمزوری نہ بننے دیا، مجھے ہمت دی۔ میں نے لکھا اور پھر ڈھائی ماہ کے اندر ہی مجھے زبردستی ایران سے واپس بلا لیا گیا حالانکہ میری پوسٹنگ چار سال کے لیے تھی۔ ایک طویل انکوائری کا آغاز ہوا۔ حیرت کی بات یہ کہ اس پورے معرکے میں میرا ساتھ میرے ایرانی باس نے دیا جس نے لکھ کر دیا کہ یہ اگرچہ سفارتی ذمہ داری پر تھا‘ لیکن ہماری اجازت سے حق لکھ رہا تھا۔ اللہ نے توفیق دی اور بہترین اجر بھی اسی کے ہاں ہے۔ میں آج بھی اپنے مؤقف پر قائم ہوں اور ظلم کو ظلم کہتا ہوں۔ لیکن ظلم کو جائز قرار دینے والے آج کیوں خاموش ہیں؟ اور ظلم کرنے والا اپنے آپ کو اس سارے واقعے سے بے خبر کیوں قرار دے رہا ہے؟

اسی ''عظیم‘‘ سپہ سالار کا ایک اور کارنامہ نواب محمد اکبر خان بگٹی کا قتل تھا۔ اکبر بگٹی سے میرا تعلق تیس سال پرانا تھا اور میں انہیں ایک عظیم محبِ وطن پاکستانی کی حیثیت سے جانتا تھا۔ ان کے سانحے پر لکھا جانے والا میرا کالم میرے لیے عذابِ جاں بنا دیا گیا تھا۔ صمد لاسی‘ جو اس وقت ڈیرہ بگٹی میں ڈپٹی کمشنر تھا، ایک زمانے میں میرا ماتحت رہا تھا۔ میں نے اس واقعے سے پہلے کئی بار اسے کہا کہ تم اصل صورت حال ان لوگوں کو کیوں نہیں بتاتے؟ تم جانتے ہو کہ یہ آگ سے کھیل رہے ہیں اور اس کے بعد لگنے والی آگ بجھے گی نہیں۔ اس کا جواب یہی تھا کہ میری سنتا کون ہے۔ پھر وہ بھی ان کے رنگ میں رنگ گیا۔ سانحہ ہو گیا اور بلوچستان آگ اور خون میں نہلا دیا گیا۔ بگٹی قبیلے کے وہ لوگ‘ جو بلوچ علیحدگی پسندوں کو روس اور بھارت کا ایجنٹ کہتے تھے‘ خود ان طاقتوں کے ہاتھوں میں کھیلنے لگے۔ اس سانحے کی سب سے زیادہ مصیبت وہاں صدیوں سے رہنے والے پنجابیوں پر ٹوٹی۔ پاکستان میں پہلی دفعہ شناختی کارڈ دیکھ کر قتل کرنے کا واقعہ بولان کے علاقے پیر غیب میں ہوا۔ میرے لیے کس قدر دکھ کا دن تھا کہ مرنے والے بھی اور زندہ چھوڑ دیے جانے والے بھی بلوچستان ڈویلپمنٹ اتھارٹی میں میرے ساتھ کام کرتے رہے تھے۔ سب ایک ساتھ وہاں پکنک منانے گئے تھے۔ پکنک منانے والے ان بلوچوں، براہیوں، پشتونوں اور پنجابیوں کو کیا خبر تھی کہ اس سانحے نے حالات کو کیسے بدل دیا ہے۔ لیکن ''بہادر سپہ سالار'' جب اس ملک سے دور اپنی آرام گاہ میں جا کر آباد ہوا تو اس نے دیدہ دلیری سے اس جرم سے بھی انکار کر دیا۔ کہنے لگا وہاں گورنر تھا، وزیر اعلیٰ تھا، چیف سیکرٹری تھا، ڈپٹی کمشنر تھا۔ کیا میں نے ان کو حکم دیا تھا کہ جا کے مار دو؟ کبھی صدر بھی ایسے احکامات دیتا ہے۔ یہ ہے جرأت اور بہادری کی زندہ مثال۔ عزم و ہمت کی جیتی جاگتی داستان۔

موت کا رقص بھی عجیب چیز ہے۔ آنکھوں کے سامنے دکھائی دے تو جنہیں اللہ اور روزِ قیامت پر یقین تک نہ ہو‘ ان کے پاؤں تلے سے بھی زمین نکل جاتی ہے۔ جب قوت و اقتدار کا حامل تھا‘ تو امریکہ نے نیک محمد کو ڈرون حملوں سے مارا اور یہ کہتا پھرتا تھا کہ ہم نے مارا ہے۔ ڈمہ ڈولہ میں وضو کرتے ہوئے نوجوان بچوں کے جسموں کے پرخچے اڑے اور ڈرون کی آوازیں تک لوگوں نے سنیں تو سینہ پھلا کر کہا کہ ہم نے حملہ کیا ہے‘ یہ سب کے سب دہشت گرد تھے۔ اس وقت تو امریکہ کے قتل بھی اپنے کھاتے میں اور آج اپنے قتل بھی مقامی انتظامیہ کے کھاتے میں۔ لیکن وہ جو آج منہ موڑے‘ اس کے گناہوں سے دور کھڑے ہیں‘ وہ جو اس جرم کے ارتکاب پر اسے اُکساتے رہے۔ اسے ''شیر بن شیر بن'' کی تلقین کرتے رہے‘ آج مہر بہ لب ہیں اور کچھ دیر کے بعد یہ لوگ ڈرون حملوں کے خلاف بھی سینہ سپر ہو جائیں گے۔ اس لیے کہ ان کے دل پسند مغربی دانشوروں نے ان کو ظلم قرار دے دیا ہے۔ حالانکہ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ان ڈرون حملوں کو ابابیل کہتے تھے اور ان کی زد میں آ کر مرنے والے معصوم بچوں کو ابرہہ کا لشکر قرار دیتے تھے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

کارپوریٹ سرمائے کا لٹریری فیسٹول

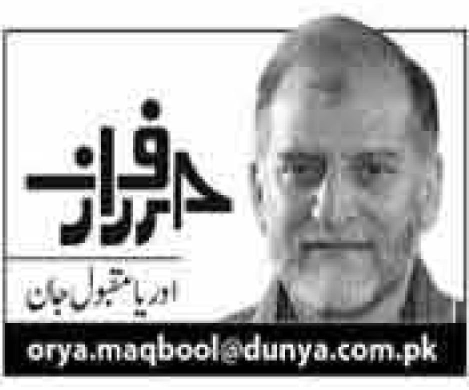

orya.maqbool@dunya.com.pk

برصغیر پاک و ہند پر برطانوی اقتدار کی تاریخ تقریباً دو صدیوں پر محیط ہے۔ پہلی صدی کلکتہ سے شروع ہوتی ہے اور 1857 تک مکمل اقتدار پر ختم ہوتی ہے۔ اس کے بعد کے نوے سال تاجِ برطانیہ کے مکمل اختیار کے ہیں۔ ان دو صدیوں کے بدیسی اقتدار نے بھی اس قوم کے ساتھ اس قدر بھونڈا مذاق نہیں کیا جو مذاق پاکستان کے ثقافتی مرکز لاہور میں کارپوریٹ سرمائے کے بل بوتے پر لاہور لٹریری فیسٹول منعقد کر کے کیا گیا۔ یہ اس قوم کا تمسخر اڑانے کے مترادف ہے جس کی اپنی ایک تہذیب ہے' شناخت ہے اور جس کی زبان میں اس قدر عظیم ادب موجود ہے کہ دنیا کی بہت کم زبانوں میں اس کی مثال ملتی ہے۔ وہ دن جرمنی' فرانس' چین یا کسی اور ملک کے لیے کتنا حیران کن ہو سکتا ہے جب ان کے کسی بڑے شہر میں انگریزی ادب کو ان کا ادب تصور کر کے ایک فیسٹول منعقد کیا جائے اور پھر اسے ان کی تہذیب کا حصہ قرار دے دیا جائے۔ شاید یہ قومیں اس دن غیرت و حمیت سے ڈوب مریں۔ کیا یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ ایسا ہی واقعہ لندن کے البرٹ وکٹر ہال میں ہو جہاں فرانسیسی لکھاریوں کو لندن لٹریری فیسٹول کے نام پر جمع کیا جائے، مباحث اور مذاکروں کی زبان فرانسیسی ہو اور تڑکے کے طور پر انگریزی ادب کے بھی کچھ شہ پارے پیش کر دیے جائیں؟ شاید ایسا واقعہ انگلستان کی تاریخ میں کبھی پیش نہ آ سکے اور اگر کوئی کارپوریٹ سرمائے کے بل بوتے پر ایسا کرنے کی کوشش کرے تو پورا لندن جاگ اٹھے۔

لیکن جس قوم کے حلق میں' گزشتہ تیس برسوں سے میٹھے زہر کی شکل میں پہلی کلاس سے او اور اے لیول تک افسانوں' کہانیوں' کارٹونوں اور نظموں کی صورت میں پوری انگریزی تہذیب و ثقافت کو اتارا گیا ہو، جن کے خوابوں میں ان سارے کرداروں کو اودھم مچانے کی آزادی ہو، جن کے ذہنوں کے پردوں پر سنڈریلا' سانتا کلاز اور سنو وائٹ جیسی تصویروں کے نقش و نگار بنائے گئے ہوں، ان کے لیے اپنے ملک کے ہیر رانجھا' سسی پنوں' سوہنی مہینوال اور آدم خان درخانیے سب کے سب ایک بدیسی مخلوق اور اجنبی کردار ہیں۔ وہ اس ملک کی تہذیب کے کرداروں کو اسی طرح دیکھتے ہیں جیسے امریکہ کے قابضین ریڈ انڈین مخلوق کو جانتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ تاریخ کا حصہ ہے اور اسے کسی کلچرل شو میں' میوزیم کی الماریوں میں یا تاریخ کی کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان پر صرف انگریزی زبان میں بڑی بڑی تحقیقی کتابیں تحریر کی جا سکتی ہیں۔

اس ملک کے جس نوجوان طبقے کو گزشتہ تیس برسوں میں انگلش میڈیم سکولوں کے ذریعے تخلیق کیا ہے، اس کا رویہ اور اس کی سوچ بالکل ویسی ہی ہے۔ یہ پاکستان کے مسائل کا ادراک کرنا چاہے تو سب سے پہلے ان تمام انگریزی مصنفین کو پڑھتی ہے جو اپنے خاص تعصب اور مخصوص عینک کے ساتھ دیکھتے اور لکھتے ہیں۔ عالمی میڈیا سے جنم لینے والی کہانیاں اور تصورات اس کی سوچ کا حصہ بن جاتے ہیں۔ پھر ان میں ایک ایسی نسل پیدا ہو چکی ہے جو یوں تو پاکستانی ہے لیکن اس کا اس زمین سے اتنا ہی رشتہ ہے جتنا کسی ریڈ انڈین پر انگریزی زبان میں کتاب لکھنے والے کا ہوتا ہے۔ یہ پاکستانی نژاد انگریز یا انگریزی نژاد پاکستانی ہیں جو انگریزی زبان میں اس مظلوم قوم کا المیہ تحریر کرتے ہیں۔ دنیا بھر کی یونیورسٹیاں اور پبلشر ان کی پذیرائی کرتے ہیں اور عالمی کارپوریٹ سرمائے سے چلنے والے ٹیلی ویژن انہیں پاکستان کے معاملات پر ایک اتھارٹی سمجھ کر مدعو کرتے ہیں اور ان کی کہی ہوئی باتوں کو ہزاروں مضامین اور لاکھوں تحقیقی مقالوں میں سند کے طور پر درج کرتے ہیں اور پھر پورے مغرب میں ان کی کہی ہوئی باتوں کو عام کرتے ہیں۔ یہ وہ نسل ہے جو اس ملک کے عوام کو پسماندہ' بدتہذیب' جاہل' ان پڑھ' گنوار' متعصب جیسے اہانت آمیز القابات سے پکارتی ہے۔ یہ نسل پوری قوم کی بحیثیت مجموعی کتنی ہی توہین کرے' اسے مکمل عزت و احترام دیا جاتا ہے اور انہیں ایک آزاد اور روشن خیال مصنف کے طور پر عالمی سطح پر اجاگر کیا جاتا ہے۔

لاہور میں چند دن ایسے ہی لوگوں کا میلہ تھا جسے لاہور اور پاکستان کی ثقافت کا نام دیا گیا۔ اس میں ریڈ انڈین کی طرح تڑکے کے طور پر پرانے مصنفین کے اوراق بھی پڑھ کر سنائے گئے اور رقص و موسیقی کے نمونے بھی دکھائے گئے۔ ان میں موجود لوگوں کو شاید ہی علم ہو کہ اس ملک میں کس قدر ادب تخلیق ہو رہا ہے اور کیسے کیسے لوگ راتیں جاگ کر تحقیق کرتے ہیں۔ صرف شاعری کی کتابوں کا ذکر کریں تو ہر سال سو سے زیادہ کتابیں مارکیٹ میں آتی ہیں۔ گزشتہ برسوں میں جس قدر ترجمے نے رواج پایا اس کی پہلے عشروں میں مثال نہیں ملتی۔ ہر تازہ کتاب کا ترجمہ چند ماہ میں مارکیٹ میں آ جاتا ہے۔ یہ کسی قوم کی تخلیقی جستجو کا کمال ہوتا ہے۔ دنیا کی ہر زبان ترجمے سے آگے بڑھی۔ افسانہ اور تحقیق پر بھی کتب آئے روز چھپ رہی ہیں، یہاں تک کہ اب تو بچوں کا ادب تحریر کرنے والے بھی دوبارہ کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ یہ سب کتابیں کئی کئی ایڈیشنوں میں شائع ہوتی ہیں اور پڑھی جاتی ہیں ،لیکن چونکہ کارپوریٹ سرمائے نے یہاں ایک دنیا آباد کرنی ہے تا کہ اس کا مال بکے تو اسے وہی مصنف چاہئیں جو اپنی تحریروں میں ایسی دنیا تخلیق کریں جس میں قتلمے کی جگہ پیزا' بند کباب کی جگہ برگر' شلوار قمیض کی جگہ جینز' جیکٹ اور چپل کی جگہ جاگر والے کردار نظر آئیں۔ آرائش حسن و جمال کے سامان لے سے کر لباس کے رنگ ڈھنگ تک سب کا سب بدل جائے تو ان کے مال کی کھپت ہوتی ہے۔

یہ لٹریری فیسٹول نہیں عالمی منڈی کا ایک خوبصورت اشتہار تھا جو کئی دن میرے شہر لاہور میں سجایا گیا۔ جب چائے ہندوستان میں متعارف کرائی گئی تو ہر چوک پر چائے کے مفت سٹال لگائے گئے اور لوگوں کو پلائی گئی اور آج آپ چائے کی درآمد پر کثیر زرمبادلہ خرچ کر رہے ہیں۔ یہی حال اس ملک کا ہے جہاں ایک سچا اور کھرا ادیب خون تھوک تھوک کر مر جاتا ہے۔ جہاں شاعر' ادیب اور افسانہ نگار اپنی کتاب بغل میں تھامے پبلشرز کی منتیں کر رہا ہوتا ہے، وہاں کارپوریٹ سرمائے سے ایک ایسا میلہ سجایا جاتا ہے جس کی زبان اس ملک کے 99.9 فیصد عوام جانتے تک نہیں۔ اس قدر ظلم' اتنا تمسخر تو انگریز حکمرانوں نے بھی ہمارا نہیں اڑایا تھا۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

روزنامہ دنیا

دلیل کی موت

حرف راز
اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

گزشتہ بیس برس دنیا بھر میں میڈیا کے عروج کے سال رہے ہیں۔ الفاظ‘ قلم کاغذ کی دنیا سے نکل کر خوبصورت اور رنگا رنگ کمپیوٹر سکرین پر جلوہ گر ہوئے اور مجالس کی بحث ٹیلی ویژن کے جگمگاتے ماحول میں جا پہنچی۔ پہلے مکانوں کی چھتوں پر بڑے بڑے ڈش انٹینا لگے، آسمان سے باتیں کرتے سیٹیلائٹ لوگوں تک دنیا بھر میں ہونے والے واقعات کی لحہ بہ لمحہ خبریں پہنچانے لگے۔ موبائل فون نے عام آدمی کو رابطے کے تخت پر بٹھا دیا۔ ریڑھی پر پھل بیچنے والا اور امریکی صدر پوری دنیا میں رابطے کی طاقت میں یکساں ہو گئے۔ ہر چند ماہ بعد اس چھوٹے سے طلسماتی آلے میں ترقی ہونے لگی۔ پہلے یہ صرف آواز سننے تک محدود تھا‘ پھر تحریر کی صورت میں بات پہنچائی جانے لگی۔ تصویر آ گئی، فلم آ گئی اور اب تو پورا کمپیوٹر سمٹ کر موبائل فون میں سما گیا ہے۔ سکائپ اور دوسرے پروگراموں کے ذریعے آپ ہزاروں میل دور بیٹھے شخص کو گھر کے لاؤنج میں لا بٹھاتے ہیں اور گفتگو کرنے لگتے ہیں۔ کمپیوٹر انٹرنیٹ‘ موبائل اور ٹیلی ویژن...... اب یہ تینوں ہر خاندان کے تین جیتے جاگتے ارکان ہیں۔ یہ چوبیس گھنٹے جاگتے ہیں۔ رات کو سوتے ہوئے بھی آپ کے موبائل پر کوئی خبر، اطلاع یا لطیفہ آ سکتا ہے۔ آپ گہری نیند میں ہوتے ہیں لیکن ٹیلی ویژن ایک زندہ فیملی ممبر کی طرح بولے چلے جا رہا ہوتا ہے۔ کمپیوٹر بند ہو تب بھی اس کے ای میل، فیس بک اور ٹوئٹر آپ کے لیے پیغامات جمع کر رہے ہوتے ہیں۔

یہ سب کچھ اس تیزی سے ہو رہا ہوتا ہے کہ کسی کو اس بات کی تہہ تک پہنچنے کا وقت ہی نہیں مل پاتا کہ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ۔ ایک طوفان ہے کہ امڈا چلا آ رہا ہے۔ جس کا ذرائع ابلاغ پر قبضہ مستحکم ہوتا ہے اس کی بات زیادہ زور سے پھیل رہی ہوتی ہے۔ ذرائع ابلاغ نے ہمارے معاشرے میں دو ایسے رویے پیدا کر دیے ہیں جن کی وجہ سے پورا معاشرہ دلیل سے عاری اور ہیجان کا شکار ہو چکا ہے۔ پہلا رویہ انٹرنیٹ پر موجود افراد میں پیدا ہوا کہ کمپیوٹر پر بیٹھا شخص جس کو چاہے اور جس وقت چاہے گالی دے سکتا ہے، الزام تراشی کر سکتا ہے اور اس کے خلاف جھوٹی معلومات لوگوں تک پہنچا سکتا ہے۔ عام زندگی میں ایک دوسرے کے سامنے موجود ہوں تو آپ سو طرح کے آداب ملحوظ رکھتے ہیں۔ آپ کبھی غصہ پی جاتے ہیں، کبھی کسی کی عمر کا احترام کر جاتے ہیں، کبھی عورت ہونے کی وجہ سے اسے کچھ نہیں کہتے‘ لیکن انٹرنیٹ وہ دنیا ہے کہ جس کے منہ میں جو آئے کہہ دیتا اور اپنے اندر کی ساری گندگی اور غلاظت اس پر بکھیر دیتا ہے۔ اسے نہ تو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ جو جھوٹ وہ بول رہا ہے، جس طرح کی زبان استعمال کر رہا ہے‘ اسے اس (مرد یا عورت) کے قریبی رشتے دار، عزیز و اقارب یا اس سے محبت کرنے والے بھی پڑھ رہے ہوں گے۔ کمپیوٹر کی وجہ سے یہاں ایک ایسا غیر مرئی قسم کا ماحول پیدا ہو چکا ہے جس میں انسانوں کی حیثیت بالکل ایک دیوار، ریت کی بوری یا نشانہ بننے والے ٹارگٹ کی سی ہو کر رہ گئی ہے، جس پر ہر کوئی اپنا غصہ نکالتا ہے۔ نفرت کی آندھی اور محبت کی ہوا دونوں اس زور سے ان پر چلتی ہیں کہ کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ حیرت ہے کہ اس طوفان کو سوشل میڈیا کا نام دیا جاتا ہے۔ سوشل کا لفظی ترجمہ ہے لوگوں کا آپس میں میل جول، لیکن یہاں تو کوئی کسی کو جانتا تک نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے ہزار دو ہزار لوگ جس شخصیت کے ٹوئٹر یا فیس بک اکاؤنٹ پر اسے محبت یا غصے سے نواز رہے ہوں، وہ اکاؤنٹ کوئی گمنام شخص اس کی جگہ پر چلا رہا ہو۔

دوسرا معاملہ سو کے قریب ٹیلی ویژن چینلوں کا ہے۔ ان میں سے 25 کے لگ بھگ خبر سے متعلق ہیں اور باقی دوسرے موضوعات کے حوالے سے چوبیس گھنٹے ہر گھر میں ہنگامہ برپا کیے ہوئے ہیں۔ ان تمام چینلوں میں آنے والے ''عظیم'' سیاستدان، دانشور، اداکار اور دوسری بڑی بڑی شخصیات جب کیمروں کے سامنے آ کر بیٹھتی ہیں تو انہیں اس بات کا بخوبی ادراک ہوتا ہے کہ انہیں اٹھارہ کروڑ عوام کی اکثریت دیکھ رہی ہے۔ اتنا بڑا ہجوم تو زندگی میں کسی بڑے سے بڑے لیڈر کو بھی میسر نہیں آیا ہوتا۔ یہیں سے کردار کی منافقت کا آغاز ہوتا ہے۔ جو پارسا نظر آنا چاہتا ہے وہ ایسی گفتگو کرتا ہے جیسے گناہ اسے چھو کر بھی نہیں گزرا‘ جسے ایمانداری کا زعم ہوتا ہے اس کے دعوے اس قدر بلند ہو جاتے ہیں کہ اس سرزمین پر اس سے زیادہ ایماندار کوئی دوسرا شخص نہیں۔ یہ تو ذاتی حوالوں سے ریا، جھوٹ اور منافقت کا رویہ ہے، لیکن سب سے زیادہ معرکہ آرائی س وقت ہوتی ہے جب دو گروہوں میں مختلف نظریات رکھنے والوں میں اور دو مذہبی یا سیاسی پارٹیوں کے افراد میں بحث شروع ہوتی ہے۔ اب میدان سجتا ہے۔ اب منہ سے جھاگ نکلتی ہے، آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں، غصے سے آواز اس قدر بلند ہو جاتی ہے کہ الامان و الحفیظ۔ ایسا لگتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک اکھاڑے میں اتر آیا ہو اور اب داؤ پیچ سے اپنے مدِمقابل کو چت کرنا ہو۔ سیاسی لوگ تو خیر اس کے عادی ہوتے ہیں کہ وہ بغیر دلیل کے اپنی پارٹی یا اپنے لیڈر کے حق میں بولتے ہیں لیکن دانشوروں اور پڑھے لکھے لوگوں سے تو مختلف رویے کی توقع کی جاتی ہے۔ انہیں تو علم نے دلیل کے ساتھ گفتگو کرنا اور دلیل کے ساتھ گفتگو سننا سکھایا ہوتا ہے۔ لیکن کمال دیکھئے میڈیا کے اس میدان جنگ کا کہ کیمرے آن ہوتے ہی مہذب ترین دانشور بھی شور اور ہنگامے پر اُتر آتے ہیں۔ ہر ایک کے منہ سے جھاگ نکل رہی ہوتی ہے۔ حیرت اس بات پر بھی ہوتی ہے کہ ان میں سے کئی ایک اعلیٰ یونیورسٹیوں میں پڑھاتے ہیں، بڑے بڑے اخبارات میں کالم لکھتے ہیں، شستہ اردو اور انگریزی بولتے اور لکھتے ہیں۔ لیکن شاید ہی کوئی ایسا ہو جو میڈیا کے کیمروں کے سامنے سچ بولے‘ اس لیے کہ سچ بولنے میں ان کے نظریے کی شکست ہوتی ہے۔ جو طالبان کی حمایت کرتا ہے، اسے ان میں کوئی برائی نظر نہیں آتی اور جو ملالہ کے حامی ہیں وہ انہیں دنیا کی مافوق الفطرت صلاحیتوں کی حامل بچی نظر آتی ہے۔

یہ سب وہ لوگ ہیں جن کی تحریروں کو اس وقت یہ قوم اپنی آخری امید سمجھ رہی ہے‘ لیکن یہ دانشور کالم بھی تحریر کریں تو دلیل کی بجائے کشتی اور دنگل کے موڈ میں ہوتے ہیں اور ٹیلی ویژن پر بھی آئیں تو پہلوان ہی لگتے ہیں۔ کسی قوم کی اس سے زیادہ بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کے سب سے زیادہ پڑھے لکھے، دانشور اور قابل تقلید لوگ کالم نگار اور اینکر پرسن ہو جائیں۔ ایسے معاشروں میں دلیل اپنی موت آپ مر جاتی ہے۔ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی دور کے بارے میں فرمایا تھا: ''حضرت انس ابن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا‘ دجال کے خروج سے پہلے چند سال دھوکہ و فریب کے ہوں گے۔ سچے کو جھوٹا بنایا جائے گا اور جھوٹے کو سچا بنایا جائے گا۔ خیانت کرنے والے کو امانتدار بنا دیا جائے گا اور امانت دار کو خیانت کرنے والا قرار دیا جائے گا اور ان میں رویبضہ بات کریں گے۔ پوچھا گیا رویبضہ کون ہیں؟ فرمایا گھٹیا لوگ۔ وہ لوگوں کے معاملات میں بولا کریں گے''۔ (مسند احمد: 1332، مسند ابی یعلی: 3715، السنن الواردۃ فی الفتن)

allurdupdfnovels.blogspot.com

دس سال بعد پھر عدالتی محاذ پر

جس سفر کا آغاز 1991ء میں ہوا تھا اور جس عدالتی جہاد کو اس ملک میں سودی نظام کے پروردہ سیاسی اور فوجی حکمرانوں نے حیلہ سازی اور تاخیری حربوں سے روکنے کی کوشش کی اور ہر کسی نے مقدور بھر اپنا حصہ ڈالا۔ اب اس کی ایک اور منزل آ گئی ہے۔ وفاقی شرعی عدالت ضیاء الحق نے بنائی اور ساتھ ہی یہ پابندی لگا دی کہ یہ مالی معاملات کے بارے میں دس سال تک کوئی کیس نہیں سن سکے گی۔ جیسے ہی 1991ء میں پابندی ختم ہوئی لوگ وفاقی شرعی عدالت میں چلے گئے۔ شرعی عدالت نے سود کے خلاف فیصلہ دیا۔ نواز شریف حکمران تھے، وہ اس فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ چلے گئے۔ اس کے بعد بے نظیر، پھر نواز شریف' سب کے دور میں یہ کیس لٹکتا رہا۔ پرویز مشرف نئے نئے تخت نشین ہوئے تھے کہ سپریم کورٹ کے شریعت بنچ نے سود کے خلاف فیصلہ دے دیا۔ ایک دم ایوانوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ ایک پرائیویٹ بنک کی طرف سے نظرثانی کی اپیل کروائی گئی۔ تمام عدالتی اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے نئے بنچ نے پہلے بنچ کا فیصلہ کالعدم قرار دے دیا اور پھر اس کی جگہ خود فیصلہ لکھنے کی بجائے کیس کو لٹکانے کے لیے واپس وفاقی شرعی عدالت میں بھیج دیا۔ گزشتہ دس سال سے یہ کیس وہاں گرد آلود فائلوں میں پڑا تھا۔ 21 اکتوبر 2013ء کو فیڈرل شریعت کورٹ میں ایک دفعہ پھر یہ امت اس بات پر بحث کرے گی کہ سود حرام ہے یا حلال، کون سا سود حرام ہے اور کیا موجودہ دور میں سود کو ترک کر کے ہم زندہ رہ سکتے ہیں۔ یہ سب بھی اس لئے ممکن ہوا کہ شریعت کورٹ سے لے کر سپریم کورٹ کے شریعت بنچ تک ہر کوئی ایک ہی سوال کرتا تھا کہ "سودی نظام کا متبادل کیا ہے؟" لیکن اب درہم و دینار تحریک کے روح رواں عمر ابراہیم وڈیلو نے ستر صفحات پر مشتمل ایک مکمل متبادل نظام تحریر کیا اور اسے نئی اپیل کا حصہ بنایا گیا ہے۔ عمر ابراہیم وڈیلو 8 جولائی 2012ء کو العلم ٹرسٹ کی دعوت پر پہلی دفعہ پاکستان آئے اور انہوں نے ایوان اقبال لاہور میں پاکستان کے کونے کونے سے آنے والے افراد کے سامنے ایک پُرجوش خطاب کیا جس کی لمحہ بہ لمحہ ترجمے کی سعادت اس گنہگار کو حاصل رہی۔ ایوان اقبال پاکستان کا شاید سب سے بڑا ہال ہے جو کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ چار گھنٹے تک تقریب جاری رہی۔ اس دوران بجلی بند رہی، صرف یو پی ایس سے چند بلب اور پنکھے چلتے رہے۔ لیکن لوگوں کا جذبۂ ایمانی ایسا تھا کہ پورا ہال ہمہ تن گوش رہا۔ اسی تقریب میں حمیرا اویس شاہد نے پنجاب اسمبلی میں منظور ہونے والے اس بل پر بھی روشنی ڈالی جو بیع سلم کے بارے میں تھا۔ اس بل کے ذریعے آڑھتیوں کے سود سے نجات ملتی تھی۔ حمیرا پنجاب اسمبلی کی ممبر تھیں اور اللہ نے انہیں یہ توفیق عطا فرمائی کہ وہ اس جہاد کی علمبردار بن جائیں۔ بل منظور ہوا' لیکن حکومت پنجاب آج تک اس پر عملدرآمد نہ کر سکی۔ پاکستان کی سرزمین چونکہ صدیوں سے امت مسلمہ کی امیدوں کا مرکز رہی ہے اور اس کی وجہ سید الانبیاء ﷺ کی وہ احادیث ہیں جو آپ نے اس خطے کے بارے میں ارشاد فرمائیں اور جن کا ذکر اقبال نے اس مصرعے میں سمو دیا "میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا یہاں سے"۔ شاید یہی وجہ تھی کہ عمر ابراہیم وڈیلو کو ان کے مرشد شیخ عبدالقادر کی جانب سے حکم ہوا کہ پاکستان جا کر آباد ہو جاؤ۔ اندلس کے شہر غرناطہ میں پیدا ہونے والا یہ شخص اس مملکت خداداد پاکستان میں یوں مکین ہوا کہ جب مجھے عمر ابراہیم وڈیلو نے حمیرا اویس شاہد سے نکاح کی خوشخبری سنائی تو میری آنکھوں سے اللہ کے حضور تشکر کے آنسو نکل آئے۔ دعوت ولیمہ کی وہ تقریب جو لاہور کے ایک شاندار ہوٹل میں ہوئی اس میں عمر ابراہیم وڈیلو نے اس ملک میں آنے کی غایت اور اللہ کی طرف سے نصرت کا جس طرح ذکر کیا اس کے گواہ لاہور کے شہری ہیں۔ وہ غرناطہ میں پیدا ہوئے جسے یورپ کی تمام مسیحی قوتوں نے مل کر ایسا تباہ کیا تھا کہ وہاں ایک مسلمان بھی زندہ نہ رہے۔ جس شہر کی مشہور مسجد قرطبہ میں آج بھی نماز ادا نہیں ہوتی، وہیں اسی شہر میں اللہ نے ایک ایسے گھر میں اس شخص کو مسلمان کیا جو پادریوں کا گھر تھا۔

یہ بتانا اس لئے مقصود تھا کہ حمیرا اویس شاہد کے ذریعے دس سال سے سرد خانے میں پڑے ہوئے اس کیس کو زندہ کیا جا رہا ہے۔ 1991ء میں محمود الرحمٰن فیصل کے ذریعے یہ پٹیشن دائر ہوئی تھی اور اب وہ غائب ہیں۔ شاید مقصد یہی تھا کہ پٹیشن مردہ رہے۔ بہرحال اس کی وجوہ وہ خود ہی بہتر جانتے ہوں گے۔ لیکن اب ایڈووکیٹ فہد احمد صدیقی کے ذریعے اس پٹیشن کو زندہ کرنے کی درخواست دی گئی ہے اور حمیرا اویس شاہد اس کی محرک ہیں۔ اس پٹیشن میں تیس سال سے کیے جانے والے سب سے بڑے اعتراض کا جواب جمع بھی کروایا گیا ہے کہ "کیا سودی نظام کا کوئی متبادل ہے"۔ یہ پورا جواب العلم ٹرسٹ کی ویب سائٹ ALILMTRUST.COM.PK اور ALILMTRUST کے فیس بک پیج پر بھی موجود ہے۔ میری درخواست ہے کوئی صاحب علم پیش کردہ اس متبادل نظام کا اردو میں ترجمہ کر دے تاکہ ہم اسے شائع کر سکیں۔ میں بھی ترجمے کی کوشش میں ہوں لیکن وقت کی تنگی آڑے آ رہی ہے۔ اس پٹیشن کی شنوائی 21 اکتوبر 2013 کو وفاقی شرعی عدالت میں ہوگی۔

لیکن اس پیشی سے پہلے شرعی عدالت نے اپنے سینئر ایڈوائزر قاضی فضل الٰہی کے ذریعے ایک چودہ نکاتی سوال نامہ ہمیں ارسال کیا ہے۔ اس سوالنامے کا جواب ترتیب دیا جا رہا ہے' لیکن اس سوالنامے کے چند سوال میں اس قوم کے سوچنے والوں کے سامنے رکھ رہا ہوں کہ پڑھیے اور حیرت میں ڈوب جائیے۔

1- کیا قرض اور Loan دونوں قرآن کے نزدیک ہم معنی ہیں؟

2- کیا سود کے حرام ہونے کا اطلاق غیر مسلم شہریوں پر بھی کیا جائے گا اور دوسرے ملکوں سے جو قرض لیا گیا ہے اس پر اس قانون کو کیسے لاگو کیا جائے؟

3- کرنسی کی شرح میں کمی بیشی میں سود کی حرمت کیسے نافذ کی جائے؟

4- "راس المال" یعنی اصل زر اگر کچھ عرصے کے بعد اپنی قدر کھو دے اور قرض دینے والے کو جو پیسے واپس ملیں وہ اصل سے بہت کم ہوں تو اس مسئلے کا کیا حل ہے؟

ان سوالوں کے بعد وہی سوال دہرایا گیا ہے کہ متبادل کیا ہے اور کیا اس وقت ملک میں موجودہ اسلامی بینکاری اس کمی کو پورا نہیں کر رہی ہے۔

اسلامی بینکاری کے بارے میں پٹیشن کے ساتھ ملک بھر کے علماء کا ایک فتویٰ لگا دیا گیا ہے جو اسے حرام تصور کرتے ہیں۔ یہ فتویٰ بھی انشاء اللہ العلم ٹرسٹ کی ویب سائٹ اور فیس بک پیج پر مل جائے گا۔ لیکن اصل مسئلہ سوالات اور ان کی نوعیت کا ہے۔ چونکہ معاملہ عدالت میں ہے' اس لئے ہم جو کچھ بھی کہیں گے عدالت میں کہیں گے۔ یہ سوال صرف اس قوم کے اہل دانش کو حیرت میں ڈالنے کیلئے رکھ دیے ہیں کہ اگر یہی اصول تمام قوانین وضع کرنے کیلئے مان لیا جائے تو کل یہ سوال بھی کیا جا سکتا ہے کہ کیا قتل، چوری، زنا، بہتان وغیرہ کے اسلامی قوانین کا اطلاق غیر مسلموں پر بھی ہوگا۔ زیادہ بحث نہیں کرنا چاہتا کہ بحث 21 اکتوبر 2013ء کو عدالت میں ہوگی۔ آپ سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو استقامت عطا فرمائے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

دہشت گردی، شدت پسندی...علاج......(1)

انسان کی اہم ترین صفات میں سے ایک یہ ہے کہ وہ تنہائی پسند نہیں بلکہ ہمیشہ گروہ کی صورت میں زندگی گزارتا آیا ہے۔ اگر اسے اکیلے رہنا پسند ہوتا تو قیدِ تنہائی کبھی بدترین سزا تصور نہ ہوتی۔ یہ سزا انسانی معاشروں میں صدیوں سے رائج ہے اور انتہائی تکلیف دہ تصور کی جاتی ہے۔ انسان نے درختوں کی کھوؤں، پہاڑوں کے غاروں اور دوسرے محفوظ مقامات سے نکل کر جب چھوٹی چھوٹی بستیاں آباد کیں، شکار کے ساتھ ساتھ کھیتی باڑی کو اپنایا تو اس نے ان بستیوں میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ان بستیوں میں لوگ سب کام باہم مل کر انتہائی خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے۔ وہ کاروبار کرتے، مریضوں کی دیکھ بھال کے لیے طبیب بھی موجود ہوتے، پڑھنے لکھنے کے لیے معلم، دوسرے کاموں کے لیے لوہار، ترکھان، موچی، جولاہا وغیرہ... ہر ضرورت کے لیے انہوں نے ازخود کوئی نہ کوئی پیشہ ایجاد کر لیا تھا۔ وہ اپنے یتیموں، معذوروں، بیواؤں اور مسکینوں کی بھی خود دیکھ بھال کرتے۔ ان سب کاموں کے لیے انہیں کسی مخصوص ادارے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی' لیکن دو معاملات ایسے تھے جن کے لیے انہیں ایک ایسے ادارے کی ضرورت محسوس ہوئی جو اس ذمہ داری کو ادا کر سکے۔ یہ تھے.....انصاف اور امن و امان۔ پنچایت، جرگہ، شہری حکومت اور بالآخر ریاستی حکومت کا بنیادی مقصد انہی دو معاملات میں اپنا اختیار استعمال کرنا تھا۔ لوگوں نے پنچایت، جرگے، شہری حکومت اور ریاستی حکومت کو یہ اختیار اپنی مرضی اور مکمل اعتماد کے ساتھ دیا اور ان اداروں کی بالادستی کو برضا و رغبت قبول کیا۔ اس بالادستی اور عوام کی طرف سے اس کی مکمل تابعداری کو موجودہ دور میں ریاست یا حکومت کی رِٹ یا عملداری کہا جاتا ہے۔ اس رٹ کا تعلق نہ حکومت کی طاقت اور قوت سے ہے اور نہ اس کے بے محابا استعمال سے بلکہ اس کا بنیادی تعلق اس بات سے ہے کہ ریاست اپنی یہ دونوں ذمہ داریوں یعنی انصاف اور امنِ عامہ کے قیام کو بحسن و خوبی انجام دے۔

دنیا میں کسی بھی ریاست کے پاس اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ پوری قوم کو قوت کے ذریعے مغلوب رکھے۔ عوام کی اکثریت حکومت کے سامنے ازخود سر تسلیم خم کر لیتی ہے کہ اسے انصاف اور جان و مال کا تحفظ مل رہا ہوتا ہے۔ البتہ ہر معاشرے میں ایک اقلیت ایسی ہوتی ہے جو انصاف اور جان و مال کے تحفظ کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے جسے ریاست آسانی سے دبا لیتی ہے کیونکہ باقی رعایا ریاست کے انصاف اور امنِ عامہ کے قیام سے مطمئن ہوتی ہے۔ اکثریت کو صرف اور صرف حکومت اور ریاست سے ہمدردی ہوتی ہے' لیکن اگر حکومت یا ریاست ان دو ذمہ داریوں میں ناکام ہو جائے تو ہر وہ گروہ جو ریاست کے خلاف آواز بلند کرے، اس سے نفرت کرے، اس کی املاک کو نقصان پہنچائے، اس کے خلاف ہتھیار اٹھائے، اس کے لیے عوام کے دل میں نرم گوشہ ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ تصور کر لیتے ہیں کہ یہ لوگ ان کی نفرت کا اظہار ہیں، چاہے انہیں پسند کرنے والے واضح اکثریت میں نہ ہوں پھر بھی وہ پورے معاشرے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔

پاکستانی معاشرہ اسی کیفیت سے گزر رہا ہے۔ اس کے ہر کونے میں کوئی نہ کوئی شدت پسند گروہ ریاستی رٹ کے خلاف کسی نہ کسی نظریے، مطالبے یا صرف ردِعمل کے طور پر برسرِ پیکار ہے۔ گوادر کے ساحلوں سے گلگت کے پہاڑوں تک ایسے لاتعداد گروہ ہیں اور ان سے ہمدردی رکھنے والے ہزاروں افراد بھی موجود ہیں۔ ہر گروہ کی اپنی اپنی نفرت اور اپنا اپنا نظریہ ہے، لیکن ان سب کا جنم صرف ایک وجہ سے ہوا کہ ریاست انصاف فراہم کرنے اور عدل مہیا کرنے میں ناکام ہوئی۔ ہر گروہ کو یہ پختہ یقین ہو جاتا ہے کہ اسے ریاست سے انصاف ملے گا' نہ وہ اس کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے قابل ہے۔ جب یہ مرحلہ آتا ہے تو ہر چھوٹا گروہ ایک ایسا علاقہ منتخب کر کے اس پر دھونس سے قابض ہو جاتا ہے جہاں اس کا حکم چلتا ہے۔ اس ملک میں کتنے ایسے گاؤں ہوں گے جہاں چند بدمعاشوں، منشیات فروشوں یا سمگلروں کا راج ہے۔ وہ گاؤں کی پنچایتی حکومت کے سربراہ ہوتے ہیں اور ان کی مرضی کے بغیر کوئی بھی کام نہیں ہوتا۔ وہ لوگوں کے درمیان فیصلے کرتے اور انہیں نافذ کرتے ہیں۔

اس طرح کے کچھ گروہ حکومت یا ریاست کے اداروں کی نااہلی، کرپشن یا سرپرستی سے چلتے ہیں اور کچھ اتنے بڑے ہو جاتے ہیں کہ ریاست بھی ان کے سامنے خاموش تماشائی بن جاتی ہے۔ نسل اور زبان کی عصبیت کے نام پر، مسلک کی بنیاد پر یا پھر کسی نظریے کی آڑ لے کر جتنے بھی گروہ تشکیل پاتے ہیں ان کے پاس اپنے پیروکاروں کے لیے مضبوط دلیل موجود ہوتی ہے جو حکومت کی ناانصافیوں اور نااہلیوں سے جنم لیتی ہے۔ کوئی کسی نسل سے بے انصافی کی بات کرتا ہے تو کوئی کسی گروہ سے۔ کسی کو اپنے مسلک کے خلاف ریاستی بے انصافی کا شکوہ ہوتا ہے اور کوئی اپنے غم و غصے کو ایک اعلیٰ نظریاتی ڈھال بنا کر پیش کرتا ہے تاکہ اس کا مقصد اعلیٰ اور ارفع محسوس ہو، جیسے کمیونزم کا نفاذ یا اسلام کی بالادستی۔ ان تمام گروہوں کے مقابلے میں ریاست کی افرادی قوت موجود ہوتی ہے۔ وہ ان کے مسلح جتھوں سے زیادہ ہوتی ہے لیکن وہ انہیں ختم نہیں کر پاتی، اس لیے کہ ایسے گروہوں کی کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی صورت میں عوام میں پذیرائی موجود ہوتی ہے۔

برصغیر پر انگریز نے چند ہزار بدیسی فوج کے ساتھ ریاستی بالادستی کیسے قائم کر لی؟ ماضی میں کوئی فاتح عوام کے مقابلے میں مختصر سی فوج کے ساتھ برسوں حکمران بنا رہتا، اس کی حکومت تب ختم ہوتی جب کوئی دوسرا حکمران اپنی فوج لے کر اس پر حملہ آور ہوتا۔ اس طرح قائم ہونے والی کامیاب حکومتوں کا جائزہ لیں تو ان میں دو صفات صاف نظر آئیں گی... ہر معاملے میں انصاف کی بالادستی اور لوگوں کو امن و امان کی فراہمی۔ انگریز کے زمانے میں ایک مجسٹریٹ اور تھانے کے چند سپاہی بدیسی حکمرانوں کی رٹ قائم کرتے اور لوگوں میں یہ تاثر موجود تھا کہ ان کے ذاتی معاملات، جھگڑوں اور گروہی اختلاف میں کبھی ناانصافی نہیں ہو گی۔ ریاست طاقت کے بل بوتے پر اختیار نہیں قائم کرتی۔ ہر گھر کے باہر سپاہی کھڑا نہیں کیا جا سکتا۔ ریاست اپنے لیے عوام میں اعتماد اور بھروسہ قائم کرتی ہے اور پھر چند سپاہیوں سے اپنی رٹ قائم کر لیتی ہے۔

موجودہ دور کے انتہائی شورش زدہ ملک میں امن و امان کے قیام کی کہانی بیشتر لوگوں کو ہضم نہیں ہوتی، بہت سے ''عظیم'' اور ''روشن خیال'' دانشور ہچکچاتے ہوئے یہ بات زبان پر نہیں لاتے، لیکن اس ملک کی صورت حال میرے ملک پاکستان سے مختلف نہیں بلکہ بدتر تھی۔ پاکستان میں اس قدر جنگجو اور مجاہد گروہ نہیں تھے جتنے افغانستان میں تھے۔ مجاہدین کی سات تنظیمیں تھیں جن کے پاس کلاشنکوف سے لے کر ٹینک شکن میزائل اور سٹنگر میزائل تک اتنا اسلحہ تھا کہ ایک بڑی فوج بھی اس کا مقابلہ نہ کر پاتی۔ ہمارے پاس تو اس اسلحے کی تلچھٹ بھی نہیں پہنچی تھی۔ وہاں پوست کی کاشت اور ہیروئن سازی سے سرمائے کی بہتات تھی۔ عالمی مداخلت کا یہ عالم تھا کہ عالمی طاقتوں اور پڑوسی ممالک کے گماشتے وہاں دندناتے پھرتے تھے۔ پورا ملک جنگ کمندان کے زیرِ اثر ایک سو سے زیادہ علاقوں میں تقسیم تھا اور ہر علاقے پر کسی نہ کسی مسلح گروہ کی عملداری تھی۔ پاکستان کے شہر چمن سے نکلیں تو قندھار پہنچنے تک صرف ستر میل کے علاقے میں چار جگہ مختلف گروہوں کو تاوان ادا کرنا پڑتا تھا۔ یہ افراتفری، لاقانونیت، طوائف الملوکی 1988ء سے 1995ء تک تقریباً سات سال رہی۔ اس کے بعد چھ سال تک ریاست کی بالادستی اور امن کیسے قائم ہو گیا؟ وہ افغان جو اسلحے کو اپنا زیور سمجھتے تھے ان سے اسلحہ واپس لیا گیا اور اس کے بدلے میں انہیں ریاستی تحفظ دیا گیا۔ پوست کی کاشت امریکہ مختلف ممالک میں آپریشن سے بھی ختم نہ کرا سکا اور افغانستان تو دنیا کا سب سے زیادہ پوست پیدا کرنے والا ملک تھا، اسے صرف ایک انتظامی حکم سے ''پوست فری'' ملک بنا دیا گیا۔ یہ کارنامہ کسی بڑی فوج، انتظامی مشینری، اعلیٰ ماہرانہ ''اینٹی ٹیررازم'' دماغوں نے نہیں کیا تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے پانچ سال افغانستان جیسے ملک میں امن قائم کیا ان کی تعداد صرف پچاس ہزار تھی۔ (جاری)

allurdupdfnovels.blogspot.com

روزنامہ دنیا کراچی

حرف راز
اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

دہشت گردی' شدت پسندی' علاج......(2)

یہ پچاس ہزار افراد کسی سول سروسز اکیڈمی کے تربیت یافتہ نہیں تھے' انہوں نے کوئی ملٹری اکیڈمی یا پولیس سروس کے ٹریننگ سکول بھی نہیں دیکھے تھے۔ انہوں نے قانون کی کتابوں میں موجود لاکھوں باریک نکتوں کا بھی مطالعہ نہیں کیا تھا۔ انہوں نے دہشت گردی سے نمٹنے یا سول وار سے نبرد آزما ہونے کے لیے اعلیٰ اداروں کے کورس بھی نہیں کیے تھے۔ بیوروکریسی کی بھول بھلیوں سے بھی نا آشنا تھے۔ نہ فائل کا حسن جانتے تھے اور نہ اسے سرخ فیتے کا شکار کرنا' لیکن ان پچاس ہزار افراد نے افغانستان میں اس لیے امن و امان قائم کر لیا کہ انہیں ریاست کی دو اہم ذمہ داریوں کا مکمل طور پر ادراک تھا۔۔۔۔۔ ایک انصاف اور دوسری امن عامہ کا قیام۔ افغانستان میں گزشتہ سو سال سے انصاف نام کی چڑیا کو بھی کوئی نہیں جانتا تھا۔ ایک دفعہ حاکم ناراض ہو کر کسی کو جیل میں ڈال دیتا تو پھر بھول جاتا۔ گزشتہ پندرہ سال تو ایسے گزرے تھے کہ جس کے پاس چند اسلحہ بردار ہوتے' وہی علاقے میں اپنی مرضی سے جو چاہتا کرتا۔ ہر کسی نے اپنے مخالفین کو بند کرنے کے لیے کنٹینرز رکھے ہوئے تھے، اسی میں مخالف بھی بند ہوتے اور مغوی بھی۔ اردگرد کے ملکوں سے جرائم پیشہ لوگ وہاں پناہ لیتے تھے۔ آخری سات سال تو ایسے تھے کہ پورا ملک وار لارڈز کی چراگاہ بنا ہوا تھا۔ یہ پچاس ہزار لوگ جنہیں جاہل' گنوار اجڈ اور تہذیب سے عاری کہا جاتا ہے' انہیں اتنا علم ضرور تھا کہ حکومت کی رٹ اور بالادستی عدل سے قائم ہوتی ہے۔ فوری انصاف اور عدل تھا جس نے ان کا احترام پیدا کیا اور جب انہوں نے اسلحہ واپس مانگا تو کسی نے انکار نہ کیا۔

پولیٹیکل سائنس کے اصولوں کے مطابق کامیاب ریاست وہ ہوتی ہے جو نظر نہ آئے یعنی Invisible ہو۔ ایک شہر میں دس یا پندرہ سپاہی امن قائم کرتے تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب پاکستان نے ڈیورنڈ لائن پر پہلی دفعہ برجیاں لگائیں، یہاں سے کوئی چور ڈاکو وہاں پناہ نہیں لے سکتا تھا۔ جب کسی کار چور نے پرانا افغانستان سمجھتے ہوئے گاڑی چوری کر کے وہاں لے جانے کی کوشش کی تو گرفتار ہوا اور گاڑی لوٹا دی گئی۔ پوست کی کاشت جس پر بہت سے لوگوں کی معیشت چلتی تھی' ایک حکم نامے سے ختم کر دی گئی۔ ان کے خلاف لکھنے والے ان کی اس کارکردگی میں نقص نہیں پاتے تو کبھی داڑھی کی بات کرتے ہیں یا عورتوں کو برقعہ پہنانے کی، عورتوں کے سکول بند کرنے کی یا بدھا کے مجسمے گرانے کی اور پھر شور مچتا ہے کہ وہ زبردستی شریعت نافذ کر رہے تھے۔ دنیا کے ہر ملک میں زبردستی بہت سے قانون نافذ کیے جاتے ہیں۔ فرانس میں زبردستی حجاب نہ پہننے کی پابندی ہے' عورتیں گرفتار ہوتی ہیں لیکن ریاست کامیاب ہے۔ ایران مہذب ملک ہے لیکن وہاں عیسائی' یہودی اور بہائی عورت بھی حجاب کے ساتھ بازار میں آسکتی ہے۔ کسی کو اقلیت کے حقوق یاد نہیں آتے لیکن ریاست کامیاب ہے۔ ماؤزے تنگ نے ثقافتی انقلاب کے دوران کئی سال تعلیمی ادارے بند رکھے کہ قوم کو ایک نئے ڈھب پر تیار کرنا ہے' لیکن چین کی ریاست دونوں ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی وجہ سے کامیاب ہے۔ بھارت میں بابری مسجد گرائی جاتی ہے لیکن کوئی نہیں کہتا کہ ریاست ناکام ہے۔ مجھے یہ سب اس لیے لکھنا پڑا کہ تعصب کے پراپیگنڈے کی اس قدر بہتات ہے کہ سچ کو ماننے کے لیے کوئی تیار نہیں ہوتا۔ آج میڈیا کے دور میں سچ بولنا اور لکھنا بدترین آمریتوں اور ظالم بادشاہتوں سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ یہاں جھوٹ کو اس قدر خوبصورتی سے سچ بنایا جاتا ہے کہ سچ بولنے والے پر ہر کوئی برس پڑتا ہے' اس پر آستین چڑھا لیتا ہے۔

پاکستان میں کسی بھی گروہ کی شدت پسندی یا دہشت گردی کو دیکھ لیں، آپ کو اس کی وجہ ریاست کی انصاف کی فراہمی میں ناکامی نظر آئے گی۔ یوں تو بلوچستان کی تحریک کا پودا ایک خاص مقصد کے تحت 1948ء میں لگایا گیا اور اسے آزاد بلوچ ریاست کو جبری پاکستان میں شامل کرنے کے جھوٹے پراپیگنڈے سے ہوا دی گئی لیکن اس پراپیگنڈے کو سچ ثابت کرنے کے لیے ہمارے گزشتہ ساٹھ سال کافی تھے۔ بلوچ زندگی کے ہر شعبے میں اجتماعی انصاف اور عدل سے محروم رہا اور پھر اس نفرت کے پودے کو مسلسل پانی ملتا رہا۔ ہم اس کا حل ریاستی طاقت سے نکال کر رٹ اور بالادستی قائم کرنے کے فارمولے پر عمل کرتے رہے۔ یہ فارمولا وہ زہر قاتل ہوتا ہے جو وقتی طور پر مخالفین کی قبریں تو بنا دیتا ہے لیکن ان سے مسلسل نفرت کی آگ سلگتی رہتی ہے۔ ہم وہاں لوگوں کو انصاف مہیا کر کے مطمئن نہیں کرتے بلکہ اس کو طلب کرنے والے ہر شخص کو خاموش کر دیتے ہیں۔ اس حوالے سے ایک بہت تلخ حقیقت یہ ہے کہ بلوچستان میں سب سے پُرامن دور ایک آمر ضیاءالحق کے گورنر رحیم الدین کا تھا۔ اس نے اپنی سیاسی کابینہ بھی نہیں بنائی تھی لیکن تمام بے انصافیوں کے ازالے کے لیے اس نے اقدام شروع کیے۔ پچاس سال بعد وہاں گیس آئی جہاں سے نکل کر پورے ملک کو ملتی تھی، بجلی اس کے طول و عرض میں پہنچنے لگی۔ سڑکیں' سکول' کالج' یونیورسٹیاں' سب کا آغاز اسی دور میں ہوا۔ کوئٹہ سے کراچی تک راستہ اسی دور میں کھلا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ثمرات سے بعد میں آنے والی حکومتوں نے بھی فائدہ اٹھایا اور پرویز مشرف کے برسر اقتدار آنے تک اس علاقے میں ڈکیتی نہ ہونے کے برابر تھی' صوبائی تعصب کی جڑ اکھڑ چکی تھی' چھبیس اضلاع میں سے بیس کے ڈپٹی کمشنر دوسرے صوبوں میں سے تھے اور لوگ ان کو اس لیے پسند کرتے تھے کہ ان میں علاقائی اور قبائلی تعصب نہیں ہوتا تھا اور وہ سب سے انصاف کرتے تھے' لیکن جیسے ہی ہم نے حکومتی رٹ کو طاقت سے نافذ کرنے کی کوشش کی اور انصاف کو بالائے طاق رکھ دیا تو ایسی نفرت نے جنم لیا جو گرم ہوا کی صورت ہوتی ہے، اسے جو بھی غبارہ ملتا ہے اس میں بھرتی چلی جاتی ہے۔ اسی طرح شدت پسند گروہ تخلیق ہوتے ہیں۔ انہیں اپنے غم و غصہ اور نفرت کے اظہار کے لیے کوئی اخلاقی ضابطہ نہیں چاہیے ہوتا، وہ تو ریاست کی دیوار کے ساتھ سر ٹکرانا شروع کر دیتے ہیں۔ ایک اندھی نفرت جس کو عوامی نفرت کی بھی خاموش تائید مل جاتی ہے۔ اس نفرت کو وسائل چاہیے ہوتے ہیں جو بھی انہیں مہیا کر دے۔ جب وسائل مہیا ہو جاتے ہیں تو پھر یہ گروہ اپنے زیر اثر چھوٹے چھوٹے علاقے بنا لیتے ہیں۔ انگریزی میں انہیں Fiefdams کہتے ہیں۔ وہ ان علاقوں میں اپنے ٹیکس لگاتے ہیں' بھتہ وصول کرتے ہیں' اغواء برائے تاوان سے رقم حاصل کرتے ہیں' سمگلروں اور منشیات فروشوں کو راستہ دے کر دولت میں اضافہ کرتے ہیں۔ اصل مقصد کیا ہوتا ہے؟ ریاست سے لڑنا۔ ادھر ریاست بھی وہی راستہ اختیار کرتی ہے۔۔۔ طاقت کا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جنگ جاری رہتی ہے۔ کچھ عرصہ خاموشی سے گزرتا ہے تو ہم سمجھنے لگتے ہیں کہ ریاست نے قابو پا لیا ہے، لیکن کچھ عرصے کے بعد یہ آتش فشاں پھر پھٹ پڑتا ہے۔ 1974ء میں ذوالفقار علی بھٹو کے فوجی آپریشن کے بعد ریاست کی رٹ اور بالادستی قائم ہو گئی تھی۔ پھر ضیاءالحق کے دور میں کسی طور ان مسائل پر پیش رفت ہوئی مگر ریاستی طاقت کے استعمال کے زخم اتنے گہرے تھے کہ ان قبروں سے مسلسل دھواں اٹھتا رہا اور آج یہ ایک آتش فشاں کے لاوے کی طرح ہے۔ جتنے لوگ وہاں سرگرم عمل ہیں ان کو سب جانتے ہیں' سب ان کے قبیلے کے لوگ ہیں' لیکن پھر بھی ان کے خلاف لوگ ریاست کی مدد کیوں نہیں کرتے اس لیے کہ عوام کے نزدیک شدت پسند اور ریاست دونوں ہی ایک سکے کے دو رخ ہیں۔ ریاست بھی خونخوار ہے اور شدت پسند بھی خونخوار۔ وہ ان دونوں کی لڑائی کا تماشہ دیکھتے رہتے ہیں۔

کراچی میں شدت پسندی کا تصور تک نہ تھا۔ یہ شہر ہر آباد ہونے والے کے لیے امن' رزق اور خوشحالی کے دروازے کھولے ہوئے تھا' پورے ملک سے سندھی' پنجابی' پٹھان اور بلوچ یہاں آباد ہوئے تو اس شہر کی زبان اور ثقافت میں ایسے گم ہو جاتے کہ اپنے گھر کا رستہ بھول جاتے' پھر ایسا کیوں ہو گیا کہ شہر کا شہر مقتل بن گیا۔ (جاری)

allurdupdfnovels.blogspot.com

دہشت گردی، شدت پسندی......علاج (3)

شہر مقتل گاہیں کیسے بن جاتے ہیں۔ یوں تو کسی بہت بڑے شہر میں اس بات کے امکانات موجود ہوتے ہیں کہ وہ جرائم کی آماج گاہ بن جائے‘ اس لیے کہ بڑے شہر لاکھوں اجنبیوں کے ہجوم ہوتے ہیں جبکہ چھوٹے شہر، دیہات اور قصبوں میں انسان دھاگے کی وہ تاریں ہوتی ہیں جو مضبوط کپڑے کی طرح آپس میں بُنی ہوتی ہیں۔ پورے معاشرے کا ایک سوشل کنٹرول سسٹم ہوتا ہے جس میں جرم اور مجرم کو پناہ نہیں ملتی۔ یہ دونوں اس وقت پھلتے پھولتے ہیں جب انہیں افرادی قوت زیادہ میسر آ جائے یا پھر اسلحہ کی بہتات اور انتظامیہ کی آشیرباد ان کے ساتھ ہو۔ لیکن بڑے شہروں کا معاملہ ہی مختلف ہوتا ہے‘ وہاں کون، کب اور کیسے آ کر آباد ہوا، کسی کو خبر تک نہیں ہوتی۔ نہ کوئی کسی کے آباؤاجداد کو جانتا ہوتا ہے اور نہ ہی کسب معاش کو۔ ایک واجبی سا تعلق اور وہ بھی کسی ضرورت کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ بڑے شہروں میں امن اور سکون دو وجہ سے قائم اور مستحکم ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ اس کی آبادی کو منظم طریقے سے بڑھایا جائے اور کسی اصول اور ضابطے کے تحت توسیع دی جائے جبکہ دوسرا ایک ایسی انتظامیہ جو انصاف فراہم کرنے کے معاملے میں بے داغ ہو۔ اکثر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ انصاف عدالت سے ملتا ہے۔ عدالت تو اس وقت سامنے آتی ہے جب انصاف کا قتل ہو جائے۔ انصاف، تھانے، پٹوار خانے‘ ٹیکس کے دفتر، واپڈا، واسا اور دیگر مقامات پر ملتا ہے جہاں انسانوں کو روزانہ اپنے مسائل اور ضروریات کے حوالے سے سابقہ پڑتا ہے۔ انہی دفاتر پر انصاف ملتا ہے اور یہیں انصاف کا قتل بھی ہوتا ہے‘ لیکن اس مملکتِ خداداد پاکستان کا المیہ یہ ہے کہ یہاں انصاف بھی زبان، نسل، سیاسی گروہ کے رشتے اور توسط سے ملتا ہے یا پھر سرمائے کے بل بوتے پر۔ کراچی شہر میں شدت پسندی کی بنیادیں خاصی گہری ہیں۔ ایک غیر مربوط اور بغیر منصوبے سے آباد ہونے والا انسانوں کا جنگل اور اس پر انصاف کی فراہمی سے انکار۔ لوگوں کو جب علم بلکہ یقین ہو جائے کہ ان کے کام کسی زبان، مسلک، عقیدے یا سیاسی گروہ کے حوالے سے ہوتے ہیں تو پھر یہ گروہ مضبوط ہونے لگتے ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد سے اس شہر اور پاکستان کی بیوروکریسی میں اُردو بولنے والوں کی اکثریت تھی۔ انصاف کی روایت تھی نہیں اس لیے ان کو اس زبان کے تعلق نے مراعات یافتہ طبقہ ہونے کا احساس دلا دیا‘ لیکن 1970ء کے انتخابات کے بعد جب سندھی بولنے والوں نے اسی راستے پر چلنے کی کوشش کی جو اُردو بولنے والی اکثریت کا تھا‘ تو تصادم کا آغاز ہوا۔ سالوں کا غصہ پورے کراچی کو دو گروہوں میں تقسیم کر گیا۔ اس کا مداوا تو اسی طرح ممکن تھا کہ ہر سطح پر انصاف کی فراہمی کو یقینی بنایا جائے لیکن اس کی فکر کس کو تھی۔ پورا ڈھانچہ بددیانت اور بے انصاف ہو چکا تھا۔ شہر بڑھتا گیا، نہ انسانوں کی آمد کا کوئی حساب اور نہ کوئی معاشرتی کنٹرول۔ بددیانتی اور بے انصافی میں صرف ایک ہی راستہ باقی رہ جاتا ہے۔ طاقت کا حصول اور بے پناہ طاقت کا حصول تاکہ اپنے گروہ، مسلک اور لسانی گروپ کی بات منوائی جا سکے۔ جرم پہلے انفرادی ہوتا ہے‘ پھر گروہی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ اسے سب کی مشترکہ حمایت اور سرپرستی حاصل ہونے لگتی ہے۔ دنیا بھر کے مافیا اسی طرح وجود میں آئے۔

پشتون علاقے میں پشتون قومیت کی نظریاتی بنیاد عرصہ دراز سے موجود تھی۔ اس کی جڑیں مغلیہ دور میں لڑائیوں، سکھوں کے برسراقتدار آنے اور انگریزوں کی بالادستی کی کوششوں میں موجود تھیں۔ انگریزوں کی افغانستان میں عبرتناک شکست نے پشتون غرور میں بے پناہ اضافہ کیا۔ پاکستان کے اسلامی نظریے کے مقابلے میں بھی اس قوم پرستی کو بالقصد آگے بڑھایا گیا‘ لیکن روس کے افغانستان پر حملے نے اس خطے میں قوم پرستی کی جڑیں ہلا کر رکھ دیں۔ وہ جو عمر بھر قوم پرستی کا نعرہ بلند کرتے تھے، افغانستان پر روس کے حملے کے بعد روس کے حمایتی بن گئے اور مزاحمت کی علم بردار ایک عالمی اسلامی مزاحمتی سوچ بن گئی۔ اس سوچ نے پشتون علاقوں میں امتِ مسلمہ کے ان تمام سرگرم کارکنوں کو جمع کر دیا جو ملتِ اسلامیہ کو ایک جسم و جان سمجھتے تھے۔ مدتوں پشتون قوم پرستی کا نعرہ بلند کرنے والے عالمی سیاست کی بھول بھلیوں میں الجھ گئے اور امریکہ روس کی لڑائی میں بھول گئے کہ اسلام کے نعرے کی جذباتیت اس میدانِ جنگ کو کہاں لے جائے گی۔ روس کی شکست کے بعد افغان جہادی گروہوں کی خانہ جنگی نے اس معاملے کو اور الجھا دیا۔ کہیں کہیں پشتون، تاجک اور ازبک قومیت کے شاخسانے ابھرنے لگے لیکن کئی سال کی خانہ جنگی اور قتل و غارت سے تنگ آئی ہوئی افغان قوم کو طالبان کے اقتدار کی صورت ایک پُرامن دور میسر آ گیا۔ اس دور کی ٹھنڈی ہوا ملحق پاکستانی علاقوں کو آنے لگی تو لوگ اپنے مقدمے لے کر طالبان کی عدالتوں میں جا پہنچے اور وہیں سے فیصلے کروانے لگے۔ اس کے مقابلے میں پاکستان میں عدل کی فراہمی کا نظام اور پولیس کا ماحول اس قدر بوسیدہ ہو چکا تھا کہ اس کے سامنے کسی بھی فوری اور درست انصاف کرنے والے گروہ کا چراغ جلنا بہت ہی آسان تھا۔ خیبر پختونخوا کے سرحدی علاقوں سے لے بلوچستان کے علاقے ژوب تک لوگوں میں یہ تاثر ابھرنے لگا کہ ایک متبادل نظام موجود ہے جو فوری انصاف مہیا کرتا ہے۔ اس تاثر نے ایک بہت بڑی آبادی کو اپنا ہمنوا بنالیا۔

موجودہ دور کا ماڈرن لائف سٹائل اور اس کی آزادیاں پشتون معاشرے کا کبھی مسئلہ نہیں رہیں۔ وہ تو اپنی روایات میں بندھے سادہ زندگی گزارنے کے عادی لوگ تھے۔ حجاب اور برقعہ ان کی اجتماعی زندگی کا حصہ تھا، نماز روزہ ان کی روایات میں شامل اور حصول دین کی خاطر کسی مدرسے کا طالب علم ان کے شادی کے گیتوں کا ہیرو تھا۔ ’’تورہ طالبازے ناجوڑیم‘‘ (اے کالے طالب میں بیمار ہوں)۔ یہ شادی کے گیتوں کا ایک مصرعہ ہے۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ طالب پشتون معاشرے میں کس قدر اثر رکھتا ہے۔ پشتونوں نے تو کئی دہائیاں بدامنی کی دیکھی تھیں اور کئی سو سال ان کے ہاں عدالتی انصاف نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ البتہ جرگے ان کے جھگڑوں کے فیصلے کرتے تھے۔ اس اچانک تبدیلی نے ان کے اندر ایک خواب زندہ کیا کہ انصاف اور امن و امان اتنی آسانی سے بھی قائم ہو سکتا ہے۔ افغانستان کی اس لڑائی نے پاکستان میں بھی ایک ایسے طبقے کو جنم دیا جو ریاستوں کی سرحدوں کی بجائے پوری امتِ مسلمہ پر یقین رکھنے لگا۔ اس طرح مزاحمت کو ایک عالمی تحریک کا درجہ ملتا گیا۔ اس سارے ماحول میں گیارہ ستمبر اور افغانستان پر امریکی حملہ ہو گیا۔ بدقسمتی سے اس زمانے میں پرویز مشرف کی حکومت نے پاکستان کے گزشتہ بیس سالہ مؤقف سے بالکل برعکس امریکہ کا اس طرح ساتھ دیا کہ مختصر سی جنگ میں ستاون ہزار دفعہ جہاز پاکستان ہوائی اڈوں سے اڑے اور افغانوں پر بم برساتے رہے۔ ایسے تمام لوگ جو پوری دنیا سے اس مظلوم قوم کی مدد کرنے آئے تھے انہیں پکڑ کر امریکہ کے حوالے کیا گیا۔ اس دوران پاکستان کی سرحدوں کو مقدس بنانے کے لیے ’’سب سے پہلے پاکستان‘‘ کا نعرہ لگایا گیا۔ لیکن شاید اس کے مقابلے میں پوری امت کی سوچ رکھنے والوں کی بھی ایک بہت بڑی تعداد پیدا ہو چکی تھی۔ پاکستان اپنے آغاز سے ہی ایک نظریاتی بحث کا شکار تھا۔ اس ملک میں ایک وسیع آبادی اسلامی قوانین کے نفاذ کو ملک کی وجہ تخلیق سمجھتی تھی اور قوم کی واضح اکثریت ان تمام مغربی اخلاقیات سے متنفر تھی اور اُسے اپنی ثقافت پر حملہ تصور کرتی تھی۔ ایسے میں زبردستی مغربی اخلاقیات‘ میڈیا کے ذریعے اور سرکاری سرپرستی میں اس ملک پر تھوپنے کی کوشش کی گئی۔ یوں ایک سلگتی ہوئی نفرت نے پورے ملک کی آبادی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک وہ جو ترقی کے نام پر مغربی لائف سٹائل چاہتے تھے اور دوسرے وہ جو اپنے گھروں پر ثقافتی حملوں کی یلغار سے خوفزدہ تھے۔ اس نفرت کے پودے کو دو چیزوں نے ہوا دی‘ ایک انصاف کی عدم فراہمی اور دوسرا امن و امان کی خرابی۔ جس ملک میں گلگت سے لے کر گوادر تک ہر پولیس سٹیشن بھتہ خور گروہ کے ’’دفتر‘‘ کا درجہ رکھتا ہو اور وہ ہر جائز اور ناجائز کاروبار کرنے والے سے ماہانہ وصول کرتے ہوں‘ جہاں کسی بھی دفتر میں بغیر بھتے کے کام نہ ہوتا ہو‘ جہاں قانون نافذ کرنے والے ادارے لوگوں کو بلاوجہ اٹھا کر لے جائیں‘ ان پر مقدمے بنائیں اور مقدمہ خارج کرنے کے لیے بھتہ وصول کریں‘ جہاں آپ کو احساس ہو کہ ریاست آپ کا تحفظ نہیں کرے گی‘ بلکہ آپ فلاں لسانی گروہ، فلاں سیاسی پارٹی یا فلاں مسلک سے تعلق رکھیں گے تو آپ کی جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ ہوگا‘ تو ایسے ملک میں شدت پسندی اور دہشت گردی کے پودے کو نہ کوئی پھلنے پھولنے سے روک سکتا ہے اور نہ کوئی طاقت اس کا سر کچل سکتی ہے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

دہشت گردی، شدت پسندی.....علاج (آخری قسط)

انصاف کی عدم فراہمی اور امنِ عامہ کی خرابی نے اس ملک میں شدت پسندی اور دہشت گردی کو سات دہائیوں تک بنیادیں فراہم کیں۔ لوگوں کا اعتماد حکومت سے اٹھا تو ریاست پر بھی ان کا ایمان متزلزل ہو گیا۔ یوں تو اس خطے میں لوگوں نے خواب دیکھے تھے کہ یہاں ایک اسلامی فلاحی مملکت وجود میں آئے گی جہاں امن، انصاف اور خوشحالی ہوگی۔ خواب دیکھنے والوں کو اسلامی تو دور کی بات ہے ایسی ریاست بھی نہ مل سکی جو ان کی جان کی ضمانت دے سکے اور ان کے درمیان انصاف کر سکے۔ اس کا براہِ راست نتیجہ یہ نکلا کہ عام آدمی کی اکثریت مایوس بلکہ متنفر ہوگئی۔ ریاست میں لوگوں کو ضروریات زندگی تو خریدنا ہی ہوتی ہیں، لیکن اگر انہیں انصاف اور امن بھی خریدنا پڑ جائے تو ریاست محبت کا مرکز نہیں رہتی۔ ان حالات میں اکثریت ناراض، لاتعلق اور بے بس ہوتی ہے۔ مایوسی کے اس عالم میں ہر گلی، محلے، شہر اور علاقے میں ایسے لوگ ضرور پیدا ہو جاتے ہیں جو غم وغصے سے ابل رہے ہوتے ہیں' جو بسا اوقات انہیں شدت پسندی کی جانب دھکیل دیتا ہے۔ غصے سے کھولتے ہوئے لوگ جس طرح کا بھی نقطۂ نظر رکھیں، انہیں دہشت گردی کی طرف مائل کرنے والے رہنما مل جاتے ہیں۔ یہ کسی قوم پرست گروہ کا ساتھ دیں یا کسی مذہبی رہنما کی شعلہ بیانی کے گرویدہ ہو جائیں، ہر صورت میں مخالفین کا خون بہانے پر اتر آتے ہیں۔ شدت اور نفرت کا لاوا انہیں ایسے گروہوں کا آلہ کار بنا دیتا ہے۔ ان گروہوں میں گھسنے کے بعد نکلنا مشکل ہوتا ہے، تہہ در تہہ جرم، حکومت کی طاقت کا خوف، گناہ گار اور بے گناہ کے درمیان تمیز کا فقدان، حکومت کے انصاف سے عاری رویے ان میں مزید ناراضگی، غصہ اور شدت پیدا کر دیتے ہیں اور یوں ایک ایسا چکر چلنے لگتا ہے جس کو توڑنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ ریاست انصاف اور امن فراہم نہ کرے تو وہ کمزور ہو جاتی ہے، جب ریاست کمزور ہو تو وہ جھنجھلاہٹ میں انتقام پر اُتر آتی ہے اور اسے حکومت کی رٹ سمجھتی ہے۔

یہ سب کچھ گزشتہ ساٹھ برسوں سے چل رہا تھا لیکن جلتی پر تیل کا کام اس فحش اخلاقیات نے کیا جو پرویز مشرف کے دور سے اس ملک پر زبردستی نافذ کرنے کی کوشش کی گئی۔ گوادر سے گلگت تک اس ملک کی اکثریت بلکہ واضح اکثریت اپنے گھروں میں صدیوں سے شرم وحیا اور غیرت وشرافت کے ماحول میں زندگی گزار رہی تھی۔ مادر پدر آزاد میڈیا گھروں کی چار دیواری میں ایسا گھسا کہ جس کسی نے خبروں کے درمیان نیم عریاں ڈانس دیکھا، شادی شدہ مردوں اور عورتوں کو عشق کی پینگیں بڑھاتے ہوئے ڈراموں کی بھرمار ملاحظہ کی، اس کی پہلے تو شرم سے آنکھیں جھکیں اور پھر اس کا خون غصے سے کھولنے لگا۔ انصاف کی عدم فراہمی، امن وامان کی خرابی کے ساتھ جب ریاست کی سرپرستی میں لوگوں کے سروں سے حیا کی چادر بھی چھینی جانے لگی تو عام آدمی میں غصہ تو آنا ہی تھا۔ ردّعمل کے طور پر نوجوانوں کی بڑی تعداد ایسی بھی پیدا ہوگئی جن کے سینے غصے کی شدت سے کھول رہے تھے۔ مغربی نظام تعلیم اور اسی ماحول میں ڈوبے ہوئے نصاب تعلیم نے پڑھے لکھے طبقے کو دو واضح گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ستر کی دہائی' جس میں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اسلامی جمعیت طلبہ کامیاب ہوتی تھی، میں بھی یونیورسٹیوں میں اکا دکا لڑکی ہی حجاب پہنتی تھی اور چند ایک لڑکے داڑھی رکھتے تھے۔ آج یونیورسٹیوں میں حجاب پہننے والی لڑکیوں کی ایک کثیر تعداد ہے اور داڑھی رکھے ہوئے لڑکے بھی کافی بڑی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ یہ ہے وہ ردّعمل جو ایک پڑھے لکھے طبقے میں نظر آتا ہے۔ یہ ردّعمل گیارہ ستمبر کے واقعے سے پہلے موجود نہ تھا۔ اگر پڑھے لکھے طبقے میں شدت کا یہ عالم ہے، لاوا اس قدر شدید ہے تو عام آدمی جو روایت پسند اور روایت پرست ہوتا ہے، اس میں شدت کس قدر زیادہ ہوگی۔ اس ساری شدت نے لوگوں کی نفرت جہاں حکومت اور ریاست کی جانب موڑی' وہیں اس کا رخ براہِ راست امریکہ کی جانب بھی کر دیا۔

آج اس ملک کے شدت پسند گروہوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو امریکہ کے استعمار اور اس کے ایجنڈے پر عمل کرنے والی حکومت کے خلاف ہیں۔ انہیں شریعت کے نفاذ کا خوش کن نعرہ دستیاب ہے۔ دوسرے وہ جو اس غصے کو مسلکی اختلاف کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ تیسرے وہ جو لسانی اور قومی بنیاد پر محرومیوں کو اپنا نعرہ بنا کر دوسری قوم کو غاصب اور ظالم ثابت کرتے ہیں اور پھر قتل وخون کا کھیل شروع ہو جاتا ہے۔ یہ ہے اس مملکتِ خداداد پاکستان کی موجودہ حالت جس میں حکومت اور ریاست کے پاس اپنے آپ کو ٹھیک کرنے کے لیے نہ کوئی لائحہ عمل موجود ہے اور نہ عزم۔ جہاں ایسی شدت پسندی یا دہشت گردی ہو وہاں دو ہی راستے اختیار کیے جا سکتے ہیں..... مذاکرات سے مسئلہ حل کر دو یا ایکشن سے مسئلہ دبا دو۔ لیکن یہ دونوں راستے عارضی اور ناکام ہیں، نہ ایکشن ان مسئلوں کو ختم کر سکتا ہے اور نہ ہی مذاکرات پائیدار امن لا سکتے ہیں۔ اگر ملک میں بنیادی وجوہ برقرار رہیں تو شدت پسندی کسی دوسری جگہ کسی اور صورت میں دوبارہ سر اٹھا سکتی ہے۔

اس کا حل کیا ہے؟

1: پاکستان کے آئین کا ایک غیر نافذ شدہ ایجنڈا ہے اور وہ ہے اس کی اسلامی دفعات پر مکمل عملدرآمد۔ یہ عمل وہ ہے جو کسی بھی شدت پسند سے اس کا نعرہ چھین سکتا ہے۔ وہ ہوا جو شدت کے غبارے میں بھری جا چکی ہے، بہت کم ہو سکتی ہے۔ میڈیا کا ایک مہذب اور ثقافت سے ہم آہنگ ضابطۂ اخلاق ماحول سے وہ اثرات ختم کر سکتا ہے جن سے خون کھولتا اور لاوا ابلتا ہے۔ آئین کی اسلامی شقوں پر قانون سازی کے عمل کا آغاز کر کے کسی بھی ایسے اقدام کی شرمندگی سے بچا سکتا ہے جو مذاکرات کی کامیابی کے بعد مجبوراً اٹھانا پڑیں۔

2: پاکستان کے عدالتی نظام کے تفصیلی جائزے اور اسے موجودہ حالات کے مطابق ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔ یہ نظام ایک تھانیدار کی کاٹی ہوئی ایف آئی آر اور چالان کے گرد گھومتا ہے۔ سپریم کورٹ تک اسی کی ترتیب دی ہوئی گواہوں کی فہرست اور کہانی زیر بحث آتی ہے۔ ایس ایچ او کی غلط ایف آئی آر کا توڑ ہائی کورٹ کی رٹ پٹیشن ہے یا سوؤ موٹو ایکشن۔ دنیا بھر میں دس ایسے عدالتی نظام چل رہے ہیں جہاں جج بھی تفتیش کرتا ہے جو اسلام کی روح سے مطابقت رکھتی ہے۔ لیکن ہم اسی اٹھارویں صدی کے قانون میں پھنسے ہوئے ہیں۔

3: ہمارا جمہوری نظام اور طریقِ انتخاب اس طرح وضع کیا گیا ہے کہ اس میں صرف دھونس دھاندلی اور مخصوص گروہوں کی بالادستی سے ہی جیت ممکن ہوتی ہے۔ یہ پورے کا پورے نظام بددیانت انتظامیہ کو جنم دیتا ہے اور انصاف کی فراہمی کا خاتمہ کرتا ہے۔ دنیا میں بہت سے ایسے ملک ہیں بلکہ تقریباً تمام ملکوں نے اپنے حالات کے مطابق اپنا نظام وضع کر رکھا ہے۔ ایک ہم ہیں کہ ابھی تک ویسٹ منسٹر جمہوریت کی کاربن کاپی کو یہاں نافذ کیے بیٹھے ہیں۔

4: مسلکی اختلاف کے خاتمے کا واحد راستہ قرآنی عربی کی ہر کسی کو تعلیم ہے تاکہ وہ قرآن کو ویسے ہی سمجھے جیسے وارث شاہ کی ہیر یا غالب کے دیوان کو سمجھتا ہے۔ اس شاعری کا کوئی کسی سے مطلب پوچھنے نہیں جاتا اور نہ کسی کو ان کے ترجمے کا مزا آتا ہے۔ قرآن کو ہم نے ترجمے پر چھوڑا اور اس کو سمجھنے کے لیے ایک طبقہ تخلیق کر لیا۔ اسی طبقے نے مسلکی اختلاف سے پورا ملک تقسیم کر دیا۔

5: مغربی نصاب تعلیم کے مطابق چند طلبا پڑھتے ہیں، یعنی او اور اے لیول جس میں صرف ایک لاکھ بچے زیر تعلیم ہیں۔ ان طلبہ نے باقی ان لاکھوں بچوں کے دلوں میں احساس کمتری، نفرت اور غصہ پیدا کیا ہے جو عام سکولوں میں زیر تعلیم ہیں۔ آگے چل کر صرف یہی ایک لاکھ افراد اس ملک کی پالیسی، حکومت، میڈیا اور دیگر اداروں پر غلبہ حاصل کر لیتے ہیں جہاں عام آدمی کو اپنی اخلاقیات نظر آتی ہے اور نہ اپنا ماحول۔ دنیا کا کوئی ملک یہ دوغلا پن اپنا کر چین سے نہیں بیٹھ سکتا۔

یہ ہیں وہ چند بنیادی اقدامات جن کا راستہ سب کو مل کر تلاش کرنا ہے، ورنہ اگلے سو سال ایسی جمہوریت اور یہی نظام چلتا رہے گا، روز مذاکرات بھی ہوں گے اور ایکشن بھی لیکن نہ چین میسر آئے گا نہ آرام۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک ری کنسٹرکشن

اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

تخلیقِ پاکستان سے لے کر آج تک ایک رویہ دنیا بھر کے روشن خیال، کمیونسٹ، قوم پرست اور لامذہب دانشوروں کا یہ رہا ہے کہ تحریک پاکستان میں شامل کروڑوں مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی سربلندی کا جو جذبہ موجزن تھا اور جس کی شدت نے پورے ہندوستانی معاشرے کو کفر و اسلام کے درمیان تقسیم کر دیا تھا، اس جذبے سے قائداعظم کی شخصیت کو علیحدہ کر کے پیش کیا جائے۔ کبھی ان کے لباس، لائف سٹائل اور مغربی تعلیم کی بات کی جاتی ہے اور کبھی یہ تصور پیش کیا جاتا ہے کہ قیام پاکستان سے پہلے تو قائداعظم اسلام اور اسلامی نظام کے بارے میں تقاریر کرتے تھے لیکن پاکستان بننے کے بعد انہوں نے اس ملک کو سیکولر بنیادوں پر استوار کرنا چاہا اور اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے کچھ بھی نہ کیا۔

آج سے دو برس قبل جب قائداعظم کی زندگی میں قائم ہونے والے پہلے محکمے 'ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک ری کنسٹرکشن' کے اغراض و مقاصد کی اصل کاپی مجھے دستیاب ہوئی اور میں نے اس جدوجہد پر کالموں کا سلسلہ شروع کیا تو ایک صاحب نے ایک طویل کالم لکھا کہ اس پورے کام کا قائداعظم سے کوئی تعلق نہ تھا۔ میں اس بحث میں الجھنا نہیں چاہتا تھا کہ ایسی کج بحثی کسی بھی اعلیٰ و ارفع مقصد کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہوتی ہے۔ ایسے کج بحث لوگ کسی اعلیٰ تصور کی نفی نہ کر سکیں تو کتابت کی غلطیوں کو بہانہ بنا کر یا اعداد و شمار کی بحث میں الجھا کر مقصد کو تباہ کرتے ہیں، لیکن جب گزشتہ دنوں قائداعظم کے یوم پیدائش پر میں نے کچھ ٹیلی ویژن پروگراموں میں یہ دستاویز دکھائی اور برادرم انصار عباسی نے اسے ایک طویل خبر کی صورت میں تحریر کیا تو موصوف پھر گویا ہوئے اور اس محکمے کے سربراہ علامہ محمد اسد کی زندگی کے ایک ماہر کی حیثیت سے پھر یہ دعویٰ لے کر آئے کہ یہ محکمہ تو دراصل اپنے طور پر وزیراعلیٰ پنجاب نواب ممدوٹ نے شروع کیا تھا' قائداعظم کا اس سے کیا تعلق؟

اس ضمن میں انہوں نے تمام حوالے محمد اکرام چغتائی کی ان دو کتابوں سے لیے جو انہوں نے انگریزی اور اردو میں مرتب کیں۔ ان کتابوں میں علامہ محمد اسد کی اپنی تحریر کردہ یادداشتیں، مضامین، انٹرویوز اور ان کی اہلیہ پاؤلا حمید کی مرتب کردہ یادداشتیں شامل ہیں۔ محمد اکرام چغتائی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ان واقعات، جن کا تذکرہ علامہ محمد اسد اور ان کی اہلیہ نے کیا، کے ممکنہ حد تک حوالہ جات اکٹھے کیے اور انہیں کتاب کے آخر میں جمع کر دیا۔ موصوف کالم نگار نے اپنے دلائل انہی کتابوں سے اخذ کیے اور انہی یادداشتوں کو بنیاد بنایا۔ تحقیق کے عالمی اصولوں کے مطابق یادداشتیں دوسرے درجے کے ماخذ تصور کی جاتی ہیں کہ ان میں لکھنے والے کا ذاتی نقطہ نظر اور نظریہ اسے مکمل طور پر ایک آزاد ذریعہ تحقیق نہیں رہنے دیتا، پہلا درجہ مکمل طور پر غیر جانبدار ریکارڈ اور شہادتوں کو حاصل ہوتا ہے۔ جہاں تک پہلے درجے کے ماخذ کا تعلق ہے اس کے بارے میں کتاب کے حوالہ جات میں محمد اکرام چغتائی نے خود ہی یہ اعتراف کیا ہے کہ ''حکومت مغربی پنجاب کے تحت قائم ہونے والے اس ادارے کا سنگ بنیاد کب رکھا گیا، کچھ معلوم نہیں۔ اس سے متعلقہ ریکارڈ بھی پنجاب آرکائیوز میں محفوظ نہیں''۔ (حوالہ 63)

اس ادارے کے بارے میں اخبارات کی خبریں اور ریڈیو پاکستان کو علامہ اسد کا طویل انٹرویو ہی اس ادارے کے اغراض و مقاصد اور قیام کی گواہی دیتے ہیں۔ علامہ اسد نے اپنی یادداشتوں میں اس کے قیام کا تذکرہ یوں کیا ہے: ''جونہی میں ان کے دفتر میں داخل ہوا ممدوٹ صاحب رسمی تعلقات کی پروا کیے بغیر کہنے لگے، میرے خیال میں اب ہمیں نظریاتی مسائل کو حل کرنے کے لیے ٹھوس اقدام کرنا چاہئے۔ آپ نے ان کے بارے میں تقریراً اور تحریراً بہت کچھ کیا۔ آپ کیا تجویز کرتے ہیں۔ کیا ہمیں وزیراعظم سے رجوع کرنا چاہیے؟'' علامہ اسد اس کے بعد مشورہ دیتے ہیں کہ آپ کو خود پنجاب میں ایسا ادارہ قائم کرنا چاہیے۔ اس کے بعد ادارہ قائم ہوا۔ علامہ محمد اسد نے اس کے اغراض و مقاصد تحریر کیے اور اسے حکومت نے شائع کیا۔ اس کے بعد علامہ اسد کے رسالے 'عرفات' کو حکومت نے شائع کرنا شروع کیا جس میں اسلامی نظامِ حکومت کو قائم کرنے کے طریق کار پر مضامین شائع ہوتے رہے۔ اس کے ساتھ ہی حکومت کے ایما پر علامہ محمد اسد نے ریڈیو پاکستان سے سات تقاریر کیں جو پاکستان کے اسلامی آئین اور اسلام کے معاشی اور سیاسی نظام کے متعلق تھیں۔ یہاں علامہ اسد کی یادداشتوں کا ایک اقتباس ہے کہ ممدوٹ صاحب نے کہا: ''میں نے ابھی ابھی آپ کا مضمون 'اسلامی دستور سازی کی جانب' پڑھا ہے''۔ آپ انہی خطوط پر قدرے شرح و بسط کے ساتھ ایک میمورنڈم تیار کیجئے، میں اسے مغربی پنجاب کی حکومت کی جانب سے شائع کراؤں گا اور اس کو دیکھ کر ممکن ہے مرکزی حکومت اس جانب متوجہ ہو؛ چنانچہ 1948ء میں میرا یہی مضمون مع اردو ترجمہ مغربی پنجاب کی حکومت کی زیر نگرانی طبع ہوا۔ کچھ ہفتوں بعد وزیراعظم کی جانب سے مجھے کراچی آنے کا پیغام موصول ہوا۔ یہ میری لیاقت علی خان سے پہلی ملاقات نہیں تھی''۔ اس کے بعد لیاقت علی خان نے ملک کی مالی مشکلات، کشمیر کی جنگ اور عالمی برادری میں ساکھ کے حوالے سے دلائل دیے اور فی الحال دستور سازی کا اساسی کام ختم کر کے علامہ اسد کو قائل کیا کہ وہ سفارتی مشن پر چلے جائیں۔ علامہ اسد سفارتی مشن پر چلے گئے اور پھر ان کے جانے کے بعد اسلامی دستور سازی کے اس اہم ادارے میں ایک رات آگ بھڑک اٹھی اور سب کچھ جل گیا۔

پنجاب کے محکمہ آرکائیوز میں سات لاکھ فائلیں ہیں لیکن اس محکمے کی فائلیں موجود نہیں ہیں۔ مجھے یہ اغراض و مقاصد بھی نہ ملتے اگر میں دیگر محکموں کی فائلیں نہ چھانتا۔ اس محکمے کو قائم کرنے اور باقاعدہ فنڈز کی ترسیل کے لیے جو خطوط مرکزی حکومت کو لکھے گئے ان کے ساتھ مجھے اغراض و مقاصد کا یہ کتابچہ اور علامہ اسد کی ریڈیو تقریروں کے مسودات بھی مل گئے۔ ان کاغذات میں مرکزی حکومت کی وہ منظوری بھی شامل تھی جس کے سربراہ قائداعظم تھے۔ جو لوگ حکومتی معاملات کو جانتے ہیں، انہیں علم ہونا چاہیے کہ یہ کوئی پارٹی کارروائی نہیں کہ اس میں براہِ راست لیڈر نے احکام دینے ہوتے ہیں۔ حکومتوں میں ڈائریکٹوز کا فیشن تو آج کے دور کی پیداوار ہے۔ مرکزی حکومت کی منظوری قائداعظم کی منظوری تھی۔ قائداعظم کو پوری ملت اسلامیہ کے شعور سے علیحدہ کرنے کے لیے یہ لوگ قائداعظم کو ایک ایسا گورنر جنرل بنا کر پیش کرتے ہیں کہ انہیں اپنے زیر سایہ ہونے والے اس اہم ترین کام کا کوئی علم تک نہ تھا۔ اس ملک کے واحد نشریاتی ادارے ریڈیو پاکستان پر ایک اہم سرکاری ملازم (علامہ اسد) ایک حکومتی نمائندے کی حیثیت سے "Calling all Muslim" کے نام سے سات تقریریں کرتا ہے جس میں وہ اپنے ادارے کے کام کو واضح کرتا ہے اور پاکستان کے اسلامی دستور پر حکومت کے کام کی وضاحت کرتا ہے۔ 19 اکتوبر 1947ء کو ڈائریکٹر ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک ری کنسٹرکشن کی حیثیت سے پاکستان ٹائمز میں اس کا تفصیلی انٹرویو شائع ہوتا ہے جس میں اسلامی آئین کے بارے میں وہ اپنے کام کے خدوخال بتاتا ہے اور قائداعظم اس قدر بے خبر کہ انہیں اس کا علم تک نہیں ہوتا۔ اس زمانے میں ایک ہی ریڈیو تھا اور وہ بھی سرکاری اور چند اخبار تھے جن میں پاکستان ٹائمز بہت اہم تھا۔ یہ تقریریں انگریزی میں ہیں اور انٹرویو بھی انگریزی اخبار ہی میں چھپا تھا ورنہ یہ بہانہ بنایا جا سکتا تھا کہ قائداعظم کو تو اُردو پڑھنا نہیں آتی تھی۔ اس زمانے میں بہت سے ٹی وی چینل بھی نہ تھے کہ قائداعظم کی نظر سے یہ سب کچھ نہ گزرا ہو۔ ملک کے لیے اسلامی دستور کی تشکیل، اسلام کے معاشی اور معاشرتی نظام کو مرتب کرنے کا کام ایک حکومتی ادارہ انتہائی تندہی سرانجام دے رہا ہے جسے مرکزی حکومت فنڈز بھی فراہم کرتی ہے، اس سے قائداعظم کی ذات کو علیحدہ کرنے کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ اس وقت کے کروڑوں مسلمان اور لیگی رہنماؤں کی اکثریت تو ایک اسلامی حکومت چاہتی تھی لیکن قائداعظم مغرب زدہ تھے، وہ تو سیکولر تھے۔

لیکن ایسے 'عظیم' اور 'بالغ نظر' دانشوروں کے منہ قائداعظم نے اپنی آخری تقریر کے دوران بند کر دیے۔ یہ تقریر بھی ایک سرکاری ادارے سٹیٹ بینک کے افتتاح پر یکم جولائی 1948ء کو کی گئی تھی جس میں قائداعظم نے کہا تھا کہ میں اس سٹیٹ بینک کے ریسرچ کے ادارے کی کارکردگی کا ذاتی طور پر جائزہ لیتا رہوں گا کہ یہ اسلامی اصولوں کے مطابق معاشی نظام کیسے مرتب کرتا ہے۔ یہ تقریر سٹیٹ بینک کی ویب سائٹ پر موجود ہے۔ اس کو کسی سازش کے ذریعے نذر آتش نہیں کیا جا سکا۔ علامہ اسد کا نام کسی نصابی کتاب میں نہیں، انہیں تحریک پاکستان کے رہنماؤں میں شامل نہیں کیا گیا، ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک کنسٹرکشن کا انکار اس لیے کہ یہ وہ واحد کڑی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ قائداعظم اور مسلم لیگ کے رہنما اس ملک میں ایک اسلامی دستور اور اسلامی نظام حکومت چاہتے تھے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

اسٹیبلشمنٹ

برصغیر پاک و ہند پر برطانوی استعمار کی جڑیں 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد مستحکم ہوئیں۔ یہ وہ جنگ تھی جس نے انگریز کے گزشتہ سوسالہ اقتدار کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس سے پہلے وہ سراج الدولہ اور سلطان ٹیپو کو شکست دینے کے بعد چین سے اپنے مفتوحہ علاقوں پر حکومت کر رہا تھا۔ مغل بادشاہ کو بھی اس نے اپنا باج گزار بنالیا تھا۔ اس جنگ آزادی میں جہاں حریت کے پیکر مسلمانوں کے جذبۂ جہاد کا نظارہ دکھائی دیتا ہے' وہیں انگریز کی فوج میں جوق در جوق بھرتی ہونے والے مسلمانوں کے مکروہ چہرے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ 1849ء میں پنجاب کی فتح کے بعد جس طرح یہاں کے چودھریوں' نوابوں اور گدی نشین پیروں نے انگریز کو اپنا مائی باپ تسلیم کیا وہ ایک شرمناک باب ہے۔ لیکن 1857ء کی جنگ آزادی کے حریت' پسند' مسجدوں کی چٹائیوں سے اٹھے تھے۔ تین جلدوں پر مشتمل غدر رپورٹ MutinyReport جو انگریز نے مرتب کی اس میں صرف اور صرف مسلمانوں کی بغاوت کا تذکرہ ملتا ہے جو موجودہ دور کے مشہور مورخ ولیم ڈارل پل نے اپنی کتاب LastMoughal میں بھی واضح کیا کہ یہ جنگ آزادی نہیں بلکہ جہاد تھا جس کا اعلان جامع مسجد دہلی سے کیا گیا تھا اور اس میں صرف مسلمان شریک تھے۔ اس عظیم جنگ آزادی کے کرداروں پر نظر ڈالی جائے تو منبر و محراب کے امین علماء کا کردار روشن ستاروں کی طرح چمکتا نظر آتا ہے۔ جنگ آزادی سے پہلے 33 علمائے کرام نے اپنے دستخطوں سے انگریز کے خلاف جہاد کے لیے فتویٰ تحریر کیا جس میں ہر مکتبہ فکر کے علماء شامل تھے اور ان میں سے مفتی صدرالدین آزردہ اور رحمت اللہ کیرانوی تو کمانڈر کی حیثیت سے جنگ لڑتے رہے لیکن ایک دوسرا گروہ ان علماء کا بھی تھا جن کے ساتھ سرسید احمد خان بھی شامل تھے۔ انہوں نے کہا "انگریز حاکم وقت ہے' مسلمان اس کی پناہ میں ہیں (مستامن ہیں)۔ پس اطاعت واجب اور غدر حرام"۔ لیکن خیبر سے لے کر کلکتہ تک جہاد کے حق میں لکھے گئے فتوے کی نقول ہاتھ سے لکھ کر تقسیم ہوتی رہیں۔ یہ ایک طویل اور خونچکاں داستان ہے۔ لڑنے والوں میں دونوں جانب کلمہ گو شامل تھے۔ وہ سپاہی جس نے لال قلعے کے بند ہوتے ہوئے دروازے میں اپنی گردن دے دی تھی تاکہ دروازہ کھلا رہ جائے اور انگریز فوج اندر داخل ہو جائے اس کی رجمنٹ 2 ایف ایف مدتوں تک اپنی یونیفارم کے کالر پر اعزازی طور پر نیلی پٹی لگاتی رہی۔ اس سپاہی کو کس قدر یقین تھا کہ یہ انگریز حکومت جائز ہے اور اس کے خلاف لڑنے والے واجب القتل۔ 31 مئی 1857ء کو شروع ہونے والی اس جنگ کا آخری معرکہ 14 ستمبر کو دہلی کی جامع مسجد میں لڑا گیا۔ اس دن ہزاروں مسلمان وہاں جمع تھے۔ ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا جس نے اس امتحان میں کامیاب ہونا ہے وہ شمالی دروازے کی جانب بڑھے اور جس نے جان بچانی ہے وہ جنوبی دروازے سے نکل جائے۔ کوئی ایک بھی جنوبی سمت نہیں گیا۔ وہ تمام علماء جنہوں نے فتوے پر دستخط کیے تھے' ان میں سے اکثر اسی لڑائی میں شہید ہو گئے۔ غدر رپورٹ بہت سے انکشافات کرتی ہے۔ یہ بتاتی ہے کہ انگریز فوج ہندوؤں کے گاؤں میں اطمینان سے داخل ہو جاتی جبکہ مسلمانوں کے گاؤں پر پہلے حملہ کر کے پہلے اسے تباہ کرتی۔ رپورٹ میں ان تمام غداران ملت' راجوں' مہاراجوں اور زمینداروں کا ذکر وائسرائے لارڈ کیننگ کے تعریفی جملوں سے ہے۔ اس معرکے میں فتح کے بعد ایسے تمام مسلمان جن کا تعلق مسجد کی چٹائیوں اور درس و تدریس سے تھا انہیں چوراہوں پر پھانسیاں دی گئیں' توپوں کے آگے باندھ کر اڑایا گیا اور گولیوں کی باڑ کے سامنے رکھ کر بھون دیا گیا۔ لیکن اس جنگ آزادی یا انگریز کی زبان میں غدر کے بعد ہندوستان کو تاج برطانیہ کے زیر نگیں کر دیا گیا اور انگریز نے اس خطے کو ایک بدترین تحفہ دیا جسے اسٹیبلشمنٹ کہتے ہیں۔ اس کے دو اہم ترین ادارے تھے سول انتظامیہ اور فوج۔ ان دونوں اداروں کو سیکولر بنیادوں پر استوار کرنے کے لئے سیکولر قوانین ترتیب دیئے گئے۔ چھ سو سال سے اس ملک پر اسلامی فقہ نافذ تھی۔ اس کی جگہ تعزیرات ہند کا قانون آیا' روزمرہ تنازعات کے لئے ضابطہ دیوانی اور ان سب قوانین کے نفاذ کے طریق کار کو ضابطہ فوجداری کے ذریعے منظم کیا گیا۔ جب پورے ملک کا قانون سیکولر بنیادوں پر استوار ہو گیا تو پولیس کے قوانین مرتب ہوئے اور ان قوانین کے تحت دو عہدوں کو فرعون کی سطح کے اختیارات دیئے گئے' ایک ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور دوسرا ایس ایچ او۔ اسی قانون کے تحفظ اور عملداری کے لیے سیکولر عدالتی نظام قائم کیا گیا جس کے طریق کار کا نہ اسلام سے کوئی واسطہ تھا اور نہ برطانوی اینگلو سیکسن قانون سے۔ یہ تمام کے تمام قوانین' ضابطے اور ادارے آج بھی اسی طرح قائم و دائم ہیں اور اپنی اس سیکولر شناخت کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ اسلام کے نظام عدل میں سب سے زیادہ اہمیت گواہ کے کردار پر ہوتی ہے' اسے ترک کر کے ایک سیکولر قانون شہادت نافذ ہوا جس کی جڑیں مغربی سیکولر عدالتی نظام سے ملتی تھیں۔ فوج کو نظریے نہیں بلکہ مادر وطن اور علاقے کی پاسداری کے لیے منظم کیا گیا۔ اسلام کی سربلندی' امت مسلمہ کی سرفرازی اور امت کے مظلوم گروہوں کو ظلم سے بچانا فوج کے تصور سے خالی ہو گیا۔ یہی وہ بنیادیں تھیں جس کی وجہ سے سراج الدولہ' ٹیپو سلطان اور جنگ آزادی میں مسلمانوں کو قتل کرنے والے ہیرو بنا دیئے گئے۔ ریاست کی وفاداری دلوں میں ایسی جاگزیں ہوئی کہ کسی کو پہلی جنگ عظیم میں عراق میں اپنے مسلمان بھائیوں کو قتل کرنے اور خانہ کعبہ پر گولیاں برسانے پر بھی شرمندگی محسوس نہ ہوئی۔ نوے سال کی انگریز حکومت نے اس اسٹیبلشمنٹ کو سیکولر اور قومی بنیادوں پر اس طرح ترتیب دیا کہ یہ پوری قوم پر ایک خوفناک بلا کی طرح مسلط ہو گئی۔ جاسوسی کا ایک مربوط نظام بنایا گیا جسے سی آئی ڈی کہتے تھے۔ اس کا مقصد صرف اور صرف ملک کے اندر اٹھنے والی آوازوں کی انتظامیہ خبر دینا تھا تاکہ ان کا بروقت قلع قمع کیا جا سکے۔ یہ لوگ مسجدوں میں جا کر مسلمانوں کی نماز کے بعد اجتماعی دعائیں تک سنتے اور اگر کوئی صرف یہ دعا بھی مانگتا کہ اے اللہ تو ان ظالموں سے مظلوموں کو نجات دے "تو اسے غدار قرار دے کر گرفتار کر لیا جاتا اور گولی کا نشانہ بنا دیا جاتا۔ ایک طویل عرصہ لوگ صرف تہجد کی نمازوں میں دعائیں کرنے لگے۔ مدرسوں کو دہشت گردی اور بغاوت کا اڈہ سمجھا گیا اور سب سے پہلے شاہ ولی اللہ کی قائم کردہ اسلامی یونیورسٹی مدرسہ رحیمیہ کو توپوں سے اڑا دیا گیا اور اس کی زمین ایک ہندو لالہ رام کشن داس کے ہاتھ فروخت کر دی گئی۔ مسجد اکبری جہاں شاہ عبدالقادر نے چالیس برس درس دیا تھا اسے گرا کر وہاں ایک کلب قائم کیا گیا جہاں سول اور فوجی افسران شراب اور رقص سے لطف اندوز ہوتے اور آج بھی یہ کلب قائم ہے۔ یہ سب اس اسٹیبلشمنٹ سے کروایا گیا جس میں مسلمان بھی بدرجہ اتم موجود تھے لیکن انہیں ریاستی قانون' امن و امان کے قیام اور وطن کے تحفظ کی ایسی لوریاں دی گئی تھیں کہ انہیں اس بات کا ادراک تک نہ ہوتا کہ یہ جو کچھ وہ کرنے جا رہے ہیں اس کے لئے انہیں ایک دن آخرت میں اللہ کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا۔ ان کے نزدیک O.B.E,K.B.E' خان صاحب' خان بہادر اور وکٹوریہ کراس جیسے میڈل ہی زندگی کی متاع بن گئے جنہیں وہ اپنے سینوں پر سجائے فخر سے ریاست کی وفاداری میں اپنا سر بلند کرتے۔

ملک تقسیم ہوا۔ یہ ایک ایسا معجزہ تھا جس نے موجود دنیا کو حیران کر کے رکھ دیا تھا۔ تین سو سال یونیورسٹیوں میں پڑھائے جانے والے اس علم کی نفی ہو گئی تھی کہ قومیں رنگ' زبان' نسل اور علاقے سے بنتی ہیں۔ ملک تقسیم تو جنگ عظیم اول کے بعد سے ہو رہے تھے۔ مسلم امہ چھوٹی چھوٹی قومی سیکولر ریاستوں میں بٹ رہی تھی لیکن پاکستان ایک حیران کن ملک تھا جو اسلام کے نام پر وجود میں آیا اور اس نے ثابت کیا کہ کروڑوں لوگ صرف اس لیے اپنی دھرتی ماتا کو چھوڑ کر ہجرت بھی کر سکتے ہیں۔ پاکستان بن گیا لیکن ورثے میں ایک سیکولر قومی اسٹیبلشمنٹ ملی جس کی رگوں میں ایک ایسا خون دوڑتا تھا' ذہنوں میں جو سبق موجود تھا اور دلوں میں یہ ایمان تھا کہ اس دنیا میں مسلم امہ نام کی چڑیا کا کوئی وجود نہیں۔ مذہب ہر کسی کا ذاتی معاملہ ہے اور برطانیہ کا دیا گیا سیاسی اور فوجی نظام ارفع و اعلیٰ۔ اس ملک کے لئے بہترین ہے آزادی کے پہلے دن سے ہی اس آزاد ملک کے عوام اور اسٹیبلشمنٹ مقابل آ کر کھڑے ہو گئے۔ اسٹیبلشمنٹ میں سول اور فوج کے علاوہ وہ خان' چودھری' وڈیرے اور سردار بھی شامل تھے جو 1857ء سے انگریز کے وفادار رہے تھے۔ سرحدیں بن گئیں' امت تقسیم ہو گئی' ہر مسلمان ملک کی ایک قومی ریاستی اسٹیبلشمنٹ وجود میں آ گئی۔ وہ سرحدیں جو مغرب نے بنائیں۔ سو سال پہلے اس کا تحفظ مقدس ہو گیا لیکن اب نصف صدی کے بعد نقشہ دوبارہ ترتیب دیا جا رہا ہے۔ ہر ملک کی اسٹیبلشمنٹ سرحدوں کے تحفظ کی جنگ لڑ رہی ہے' مغربی دنیا نئی لکیریں کھینچنا چاہتی ہے' لیکن درویشان باصفا کہتے ہیں اب اب لکیریں اللہ کی مرضی سے بنیں گیں۔ ابھی تو ابتلا کا دور ہے' ابھی تو جنگ ہے' ابھی تو قتل و غارت ہے۔ وہ جنہوں نے اس امت کو فرقہ پرستی کے عذاب میں مبتلا کیا ان کے عمامے خون سے رنگین ہونے والے ہیں اور جنہوں نے سیکولر قومی تشخص کی جنگ لڑی ہے انہوں نے بھی اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔ پاک ہے وہ ذات جو فرماتی ہے کہ اگر ہم ظالموں کو ظالموں سے نہ لڑائیں تو دنیا میں امن قائم نہ ہو۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

گرداب

جب تاج برطانیہ کی پورے ہندوستان پر حکومت تھی' اس نے اپنی انتظامی ضروریات کے تحت پورے ملک میں بہت سی لکیریں کھینچ دی تھیں۔ ان لکیروں میں دو بہت اہم تھیں۔ ایک ضلع کی حدود' جس کا سربراہ ڈپٹی کمشنر بہادر تھا' جو اختیارات کے لحاظ سے ایک چھوٹا سا وائسرائے ہوتا تھا اور دوسری صوبے کی حدود' جن میں کہیں ایجنٹ ٹو گورنر جنرل اور کہیں چیف کمشنر حکمرانی کے تخت پر بیٹھتا تھا۔ ضلع کی حدود کے آگے یہ لکیریں تحصیل اور تعلقے تک جا نکلتیں لیکن انتظامی لحاظ سے آزاد، خودمختار اور طاقتور تخت صرف ضلع اور صوبے کی حکمرانی کا ہوتا تھا۔ پاکستان میں آج بھی کئی صوبے اپنی مقدس اور محترم حدود کے رکھوالے اور نگہبان ہیں۔ یہ حدود صحیفہ آسمانی نہیں' نہ ہی صدیوں سے آباد لوگوں کی بنائی ہوئی حد بندیاں ہیں بلکہ یہ انگریز حکمرانوں کی کھینچی ہوئی لکیریں ہیں۔ یہ لکیریں عوامی مطالبے پر ڈالی گئیں نہ ان کی کوئی تاریخی حقیقت ہے' اس لیے کہ انسانوں کا صدیوں سے یہ معمول ہے کہ وہ ایک خطۂ زمین کو ماں کہتا ہے، دھرتی ماتا اور وطن کے نام سے اسے یاد کرتا ہے لیکن یہ اس قدر بے وفا اور بودا رشتہ ہے کہ جب اس ماں پر قحط سالی آتی ہے، اس کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں، انسان پیاس سے تڑپنے لگتے ہیں اور جانوروں کے لیے چارہ میسر نہیں ہوتا تو یہ محبتوں کے گیت' گانے اور دھرتی کے ترانے لکھنے والا انسان اس پر لعنت بھیج کر کسی اور سمت روانہ ہو جاتا ہے۔ انسانوں کی تاریخ ان ہجرتوں سے بھری پڑی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ 'قبضہ گروپ'' کا علمبردار یہ حضرت انسان فوراً اس نئی جگہ کو اپنا وطن، ماں یا دھرتی ماتا کہنے لگتا ہے۔ اس نے کبھی بنجر، خشک، ویران یا قحط زدہ ماں کے لیے جنگ نہیں کی بلکہ یہ اس پر پھیلے گھاس سے بھرے میدانوں، سبزے سے بھری چراگاہوں، ہرے بھرے کھیتوں، چشموں، دریاؤں اور پھلوں سے لدے درختوں کے لیے خون بہاتا رہا اور ان کے لیے گیت گاتا رہا ہے۔ انسان وطن یا دھرتی ماں کے رشتے سے باوفا ہوتا تو افریقہ جب صحرا میں بدلا تو یہ اسے نہ چھوڑتا۔ آریا کبھی بھی وسطی ایشیا میں موجود اپنے ٹھکانوں کو خیرباد نہ کہتے۔ یہی وہ لالچی اور مادی رشتہ ہے جس کی بنیاد پر انگریز نے زمین پر حدود کی لکیریں کھینچ کر صوبوں کو مستحکم کیا۔

اسی برطانوی راج نے 9 نومبر 1901ء کو اپنی سلطنت میں ایک لکیر اور کھینچی۔ ایک صوبے کی حدود بنائیں جس کا نام شمال مغربی سرحدی صوبہ رکھا۔ 29 مارچ 1849ء کو انگریزوں نے ایک اعلامیہ جاری کیا تھا کہ چونکہ سکھوں کو شکست ہو چکی ہے اور لاہور اور امرتسر کے معاہدات کے مطابق تمام علاقے اب انگریزوں کے قبضے میں آ چکے ہیں، اس لیے سرحدی صوبہ (موجودہ خیبر پختونخوا) کا علاقہ بھی برطانوی ہند کا حصہ بنایا جاتا ہے۔ اس علاقے کو رنجیت سنگھ کی افواج نے 1818ء میں فتح کرنا شروع کیا تھا۔ 1836ء میں جمرود کی فتح کے بعد پورا علاقہ رنجیت سنگھ کی حکومت کا حصہ بن گیا تھا اور ہری سنگھ نلوا یہاں کا حکمران بنا۔ وہی ہری سنگھ نلوا جس نے ہری پور شہر آباد کیا۔ 29 مارچ 1849ء سے 9 نومبر 1901ء تک یعنی پورے 52 سال یہ صوبہ انتظامی طور پر پنجاب کا حصہ رہا۔ باون برسوں میں تین نسلیں کسی ایک جگہ پروان چڑھتی ہیں۔ اس سے پہلے یہ علاقہ احمد شاہ ابدالی کی حکومت کا حصہ تھا۔ اُس دور میں یہ صوبہ مغربی پنجاب کہلاتا تھا اور اس کی حدود جمرود سے ستلج کے آس پاس تک پھیلی ہوئی تھیں۔ انگریز پنجاب میں دنیا کا سب سے بڑا نہری نظام بنا رہا تھا اور بنجر اور سنگلاخ اراضی ہری بھری ہو رہی تھی۔ یہی وہ نہری نظام تھا جس کی بدولت پنجاب کا یہ خطہ پورے ہندوستان کی زرعی ضروریات کو پورا کرتا رہا۔

اسی صوبہ پنجاب (جس کا شمالی مغربی سرحدی صوبہ یعنی موجودہ خیبر پختونخوا ایک حصہ تھا) کے چیف انجینئر آبپاشی جنرل کروفٹن (Crofton) کو 1871ء میں ایک نوٹ کسی گاربیٹ (Garbett) نامی انجینئر نے پیش کیا تھا' جس میں تحریر تھا کہ کالاباغ کے مقام سے ذرا اوپر دریائے سندھ ایک تنگ گھاٹی سے ہو کر گزرتا ہے' اس سے پہلے دریا کا پانی ایک بڑے تالاب کی شکل اختیار کر جاتا ہے جو قدرتی طور پر ایک ڈیم ہے اور پانی کا ذخیرہ بھی۔ یہاں پانی سطح سمندر سے 796 فٹ بلندی پر ہے۔ اس مقام کے جنوبی طرف قدرت نے پتھروں سے ایک ایسی ڈھلان بنا دی ہے جہاں سے پانی کو نہر کی صورت میں بدلا جا سکتا ہے۔ دریا کا رُخ موڑنا پڑے گا نہ اسے ایک Weir میں تبدیل کرنے کے لیے کوئی زیادہ محنت درکار ہو گی۔ یہ مقام دریائے جہلم سے بہت زیادہ بلندی پر واقع ہے' یوں یہ نہر سندھ اور جہلم دریاؤں کے دوآبہ میں سے آسانی کے ساتھ گزاری جا سکتی ہے۔ 1871ء میں یہ فائل دیگر منصوبوں کی وجہ سے پس پشت چلی گئی لیکن 1881ء میں دوبارہ اس پر غور شروع ہوا کیونکہ انگریز حکومت اس وقت پورے پنجاب میں کالونی ڈسٹرکٹ بنا رہی تھی تاکہ ہندوستان میں غذائی قلت کا خاتمہ ہو سکے۔ اس وقت تک نو کالونی اضلاع بن چکے تھے اور دسواں اس کالاباغ کے مقام سے نہر نکال کر بنانے کا منصوبہ تھا۔ اس مقصد کے لیے حکومت ہند نے حکومت پنجاب کو سات لاکھ پچاس ہزار پونڈ بھی دے دیے تھے۔ میجر جنرل ایچ ڈبلیو گلیور محکمہ آبپاشی میں جائنٹ سیکرٹری تھا، اس نے اپنے خط نمبر 910 مجریہ 19 اگست 1881ء میں اس منصوبے کی خوبیاں اور خامیاں لکھ کر حکومت کو بھجوائی تھیں۔ اس کے مطابق دریا میں پانی اس قدر وافر ہے کہ نیچے سمندر تک کسی بھی علاقے میں کمی کا کوئی خطرہ نہیں۔ اس پورے علاقے میں زیرزمین پانی کی سطح نوے فٹ تک نیچے ہے اور صرف چند ایکڑ زمین ہی یہاں سے سیراب ہو سکتی ہے لیکن نہر نکلنے سے باون لاکھ پچاس ہزار ایکڑ زمین زیر کاشت آئے گی۔ اس پورے منصوبے کی سب سے بڑی مشکل یہ بتائی گئی کہ اس علاقے میں آبادی بہت کم ہے اور اگر یہ نہر گزاری بھی جائے تو لوگ بہت کم میسر ہوں گے جو زمین کاشت کریں۔ اس کے لیے پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر نے یہ تجویز دی کہ کالاباغ کے شمال کی جانب آباد پختونوں کو اس خطے میں زمین دے کر آباد کیا جائے، اس لیے کہ صدیوں سے یہ لوگ اپنے ریوڑوں کے ساتھ سردیوں کے موسم میں یہاں آباد ہو جاتے ہیں۔ ان کے اپنے ہاں زمین بہت کم ہے لیکن ان کے اندر محنت اور جانفشانی دو ایسی خصوصیات ہیں جو اس خطے کو سرسبز کر سکتی ہیں۔ سر ایڈگرٹن (Edgerton)، جو اس وقت لیفٹیننٹ گورنر تھے، نے اس ضمن میں بنوں، پشاور اور مہمند کی مثالیں بھی اپنی رپورٹ میں پیش کیں۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ 1855ء سے ہم نے افغان بارڈر کو نرم کر رکھا ہے اور کابل اور قندھار سے ہزاروں لوگ ان اضلاع میں آ کر آباد ہوئے ہیں اور آج یہ امن پسند شہریوں کی حیثیت سے رہ رہے ہیں' لیکن اس پیش رفت کے چند سال بعد شمال مغربی سرحدی صوبہ بنا دیا گیا اور پھر انگریز جنگ عظیم اوّل میں الجھ گیا۔ اسے یہاں سے کرائے کے فوجی چاہئیں تھے اس لیے زراعت اور کالونی اضلاع کا منصوبہ ختم کر دیا گیا تاکہ لوگ خوشحال نہ ہو سکیں اور فوج میں بھرتی کا راستہ نکلتا رہے۔ پھر دوسری جنگ عظیم اور اس کے بعد انگریز کی رخصتی۔

مدتوں یہ منصوبہ فائلوں کی زینت بنا رہا' لیکن جب بھارت سے پانی کے تنازعے کا آغاز ہوا تو 1956ء میں پھر اسی کالاباغ کی جگہ کو قدرت کا ایک فطری منصوبہ سمجھ کر زیر بحث لایا گیا جس کی لاگت کا تخمینہ 2.3 ارب ڈالر لگایا گیا۔ اس منصوبے کی سب سے بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ دریائے سندھ کا پانی بھارت روک نہیں سکتا تھا۔ یہاں ہماری بیوروکریسی کے کمالات سامنے آئے۔ سندھ طاس معاہدے کے لیے ایک کنسورشیم بنا جو پاکستان کے آبی معاملات کی بہتری کے لیے تھا۔ پاکستان کی بیوروکریسی' بھارت کے سیاست دان اور مغرب کے کھلاڑی مل گئے اور اس منصوبے کی جگہ جہلم پر منگلا اور دیگر ڈیموں کا منصوبہ بنا دیا گیا۔ انڈس واٹر منصوبہ 1960ء میں ایوب خان کے دستخط سے دستاویز بنا جو 9 ارب ڈالر کے فنڈ پر مشتمل تھا جس میں ساڑھے پانچ ارب کنسورشیم کی گرانٹ تھی اور بھارت نے بھی اس میں ایک کروڑ ستر لاکھ ڈالر دیے تھے۔ پاکستان کو عالمی بینک نے ایک کروڑ 78 لاکھ ڈالر قرض دیا اور یوں پاکستان اس بنیادی منصوبے سے ہٹ کر ایک ایسے گرداب کی جانب چل نکلا جس سے آج تک نہیں نکل سکا۔ غلام اسحٰق خان کہتے تھے کہ میں نے اسی وقت ایک اجلاس میں کہا تھا کہ اگر آپ آج کالاباغ ڈیم نہیں بناتے اور بیوروکریسی کے ہاتھوں میں کھیلتے رہے تو پھر آپ یہ کبھی نہیں بنا سکیں گے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

دنیا

گرمئ بازار تو تم خود پیدا کرتے ہو

orya.maqbool@dunya.com.pk

جس دن سے دنیا کے نقشے پر تقسیم اور حد بندیوں کا عمل شروع ہوا، ریاستوں کی سرحدیں متعین ہونا شروع ہوئیں' کسی کو گمان تک نہ تھا کہ کرۂ ارض پر ایک ایسی ریاست بھی وجود میں آ جائے گی جو خالصتاً اسلام کے نام پر قائم ہوگی' جسے اس خطے کے رہنے والے عوام اپنے فیصلے سے قائم کریں گے اور فیصلہ بھی ایسا کہ بڑے بڑے عالمی مفکرین اور سیاسی دانشوروں کو اس کے قیام کے وقت یقین آیا تھا نہ وہ آج اسے تسلیم کرنے کو تیار ہیں۔ بھلا کیسے تسلیم کرلیں' انہوں نے دو صدیاں یہ علم لوگوں کو پڑھایا کہ قومیں رنگ، نسل، زبان اور علاقے سے بنتی ہیں' لیکن یہ بے وقوف لوگ کہاں سے آ گئے جن کے دادا پردادا ایک، زبان ایک، جو بھنگڑا ایک طرح کا ڈالیں، ساگ ایک طرح کا کھائیں، دھوتی ایک جیسی پہنیں، ہیر ایک ساتھ گائیں، لیکن ''پاگل پن'' ایسا کہ ایک دوسرے کو بھائی نہیں کہتے۔ کیوں بھئی! یہ کیسے؟ تمہاری رگوں میں تو ایک ہی نسل یا برادری کا خون دوڑ رہا ہے۔ پوری ہٹ دھرمی سے کہتے ہیں' یہ اس لئے میرا بھائی نہیں کہ یہ لا الہ الا اللہ نہیں پڑھتا۔ بس دونوں میں یہ فرق ہے اور یہی سب سے بڑا فرق ہے۔ اسی فرق کی بنیاد پر دنیا بھر کے مفکرین کی چھاتی پر مونگ دلنے کے لیے وہ ریاست وجود میں آ گئی جسے پاکستان کہتے ہیں۔

جس دن سے یہ مملکت وجود میں آئی، ایک طبقہ ایسا ہے جس کی گفتگو' خیالات' مضامین' شاعری اور افسانے اٹھا کر دیکھ لیں ان کا ایک ہی رونا ہے کہ یہ ملک بنا ہی غلط ہے اور اس کا قائم رہنا مشکل ہے۔ دنیا کے کسی ملک میں حتیٰ کہ افغانستان جیسے پسماندہ ترین ملک میں بھی اس کے دانشور یہ تجزیہ پیش نہیں کرتے کہ یہ ملک نہیں رہے گا۔ افغانستان میں اکثریت پشتونوں کی ہے۔ ان کے علاوہ وہاں ازبک، تاجک، ہزارہ اور دوسری قومیں آباد ہیں لیکن کسی اہل دانش کو خواب میں بھی افغانستان کے ٹوٹنے کا منظر دکھائی نہیں دیتا۔ میرے ملک کی بدقسمتی یہ ہے کہ اس کے پڑھے لکھے طبقے کا بڑا حصہ اس ملک کے قیام کی اساس سے متنفر ہے جو بھیس بدل بدل کر اس کے قیام سے ہی اس کے ٹوٹنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ اس طبقے کی ذہنی آبیاری انگریز حکومت کے سو سالہ اقتدار اور نظام تعلیم و حکومت نے کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس ملک کے قائدین آئین مرتب کرنے لگے تو انگریز کی وفادار بیوروکریسی اپنے سکہ بند قائد غلام محمد کی سرکردگی میں قراردادِ مقاصد کا مسودہ لے کر سامنے آ گئی جو ہو بہو بھارت کی قراردادِ مقاصد کی نقل تھا۔ اسے پاکستان بنانے والے قائدین نے مسترد کر دیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ہم نے اس ملک کے لیے جدوجہد کس لیے کی ہے۔ پھر برسوں یہ لاحاصل بحث ہوتی رہی کہ یہ ملک اسلام کے لئے نہیں مسلمانوں کے لیے بنایا گیا تھا۔ کیا مسلمان اور اسلام ایک دوسرے سے الگ حیثیت رکھتے ہیں؟ پاکستان کے قیام سے لے کر روس کے ٹوٹنے اور کمیونزم کا بت پاش پاش ہونے تک جہانِ دانش کے یہ شہوار اس ملک میں قومیت اور زبان و نسل کی بنیاد پر نفرت کے بت تراشتے رہے۔ پہلے مغربی پاکستان کو غاصب قرار دیا گیا اور مشرقی پاکستان کے بنگالیوں کو محروم۔ پھر پنجابی استعمار کا نعرہ اس زور شور سے لگایا گیا کہ باقی تمام صوبے مظلوم قومیتوں کے خود ساختہ حصار میں قید ہو گئے جس کی وجہ سے ملک میں امن، سکون اور اطمینان خواب ہو گیا۔ روس کے ٹوٹنے اور سامراجی غلبے کے بعد یہ تمام لوگ جن کے دلوں میں اس ملک کی اساس سے نفرت بھری ہوئی تھی زقند لگا کر سامراج کی گود میں جا بیٹھے۔ بڑے بڑے کمیونسٹ، سوشلسٹ اور سامراج سے لڑنے والے دانشور آنِ واحد میں سیکولر اور لبرل ہو گئے۔ تمام عمر جمہوریت کو سرمایہ دارانہ نظام کی کٹھ پتلی سمجھ کر گالی دینے والے ایک دم جمہوریت پرست بن گئے۔ جو انسانی حقوق کی تنظیموں کو کمیونزم کے خلاف مغربی سازش سمجھتے تھے وہ اس کے کرتا دھرتا بن بیٹھے اور جو لوگ این جی اوز اور سماجی خدمات کی تنظیموں کو انقلاب کے راستے کی رکاوٹ قرار دیتے تھے ان کے جذبات کے غبارے سے ہوا نکل گئی۔ انہوں نے خود این جی اوز بنا لیں اور اس اتحاد کو سول سوسائٹی کا نام دے دیا۔ گویا اٹھارہ کروڑ کی آبادی میں یہی چند ''سول'' (مہذب) اور باقی عام لوگ ''نان سول'' یعنی غیر مہذب اور پسماندہ ہیں۔ ان سب کا مقصد ایک ہے...... پہلے تو دنیا میں ایسے ملک کا وجود ہی باقی نہیں رہنا چاہیے جس کی اساس اسلام ہو اور اگر باقی رہے تو اسے اس کی اساس سے اتنا دور کر دیا جائے کہ یہ ایک معمول کی عام سی قومی ریاست نظر آئے۔ ان سب کے گلے کی ہڈی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں دین اسلام سے محبت ہے۔ ان کے گلے کی پھانس پاکستان کا آئین ہے' آئین میں موجود قراردادِ مقاصد ہے، اسلامی دفعات ہیں اور قرآن و سنت جس کے قانون کا منبع ہے۔ یہاں ان لوگوں کی سوئی پھنس جاتی ہے، راستہ نہیں ملتا، اس لیے کہ ان کے نزدیک کسی سیکولر ریاست میں مقننہ کا بنایا ہوا آئین سب سے بالا ہوتا ہے اور اس آئین کے تحت بنی ریاست میں فوج لاکھ چاہے اس میں درج مقاصد سے باہر نہیں نکل سکتی۔ مدتوں اس فوج کو ایک قومی فوج بنانے کی تگ و دو ہوئی، لیکن مسلمان کو موت کی جانب صرف ایک ہی چیز مائل کر سکتی ہے اور وہ ہے جذبہ شہادت۔ وہ امر نہیں ہونا چاہتا، نشان حیدر یا کتابوں میں تذکرے نہیں چاہتا، زمین اور جائداد کا لالچ اسے موت کی آغوش میں مسکرانا نہیں سکھا سکتا۔ اسے تو بس شہادت کی موت اور اللہ کے حضور سرخروئی درکار ہے جو اسے صرف اللہ کے کلام اور محمد رسول اللہ ﷺ کے ارشادات سے ملتا ہے۔ آئین میں اسلام، عوام کے دلوں کی دھڑکن میں اسلام، فوج کے جذبہ جہاد میں اسلام...... جائیں تو جائیں کہاں؟ یہاں یہ لوگ بند گلی میں آ جاتے ہیں۔ پہلے وہ اسی صورت حال سے دوچار ہوتے تھے تو کمیونزم' روس اور مزدور کسان سیاست انہیں اپنی باطنی الجھن سے نکال لیتی تھی لیکن اب پھنستے ہیں تو امریکہ، دہشت گردی کے خلاف جنگ، انسانی حقوق کی بالادستی اور جمہوریت کا تسلسل انہیں باہر نکال لیتا ہے۔ ان کی خواہشات کے عین مطابق اکتوبر 1999ء سے پرویز مشرف کی ''روشن خیال سیاست'' نے اس ملک کے کوچہ و بازار میں جنگ کا سماں پیدا کر رکھا ہے۔ کتنی بڑی کامیابی ہے' ایسا ملک جس کا دعویٰ ہے کہ وہ اسلام کے نام پر وجود میں آیا' وہاں خون کی ندیاں بہتی ہیں، امن روٹھ جاتا ہے اور ان سب کو اپنا پرانا تبصرہ کرنے کا موقع مل جاتا ہے کہ یہ ملک نہیں رہ سکتا، یہ ٹوٹ جائے گا۔ ان کی سب سے بڑی خواہش یہی ہے کہ امریکہ اور پاکستان کی سکیورٹی ایجنسیاں مل کر ہر اس آواز کا گلہ دبا دیں جس میں اسلام سے محبت کی رمق پائی جاتی ہو؛ چنانچہ وہ آج کے موجودہ اتحاد کو غنیمت سمجھ رہے ہیں۔

تاریخ کی کہانیوں سے سبق تراشنے والے یہ دانشور اگر اپنے ہی مفکرین کی لکھی کتابوں کو غور سے پڑھ لیتے تو شاید اس روش پر نہ چلتے۔ ول ڈیورانٹ انہی کا ہم نوا دانشور اور مفکر تھا۔ اس کی کتاب 'ہیروز آف ہسٹری' اٹھائیں، وہ پوری انسانی تاریخ کا نچوڑ چند فقروں میں بتاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب بھی کسی حکمران نے لوگوں کی معاشرتی اخلاقیات، سماجی چال ڈھال اور مذہبی خیالات کے برعکس زبردستی آزاد خیال، روشن خیال اور مصنوعی اخلاقیات نافذ کرنے کی کوشش کی تو وہ ملک لٹھ ماروں اور مسلح جدوجہد کرنے والوں کی آماجگاہ بن گیا اور پورا معاشرہ شدت کے ساتھ مذہبی ہو گیا۔ وہ اس ضمن میں روم کے بادشاہوں اور انگلینڈ کی ملکہ الزبتھ دوئم کی مثال دیتا ہے۔ میرے ملک میں بھی یہی ہوا۔ 2007ء کی جولائی میں جامعہ حفصہ کے بعد تحریک طالبان پاکستان نے جنم لیا۔ ملک میں خودکش حملے ہونے لگے۔ یہ سمجھتے تھے کہ آواز دبا دی گئی، لیکن اقتدار کے تحفظ اور انتقام نے مل کر وہ کھیل کھیلا کہ پناہ ملنا مشکل ہو گئی۔ معلوم نہیں کون انہیں سمجھاتا ہے کہ قائد مار دو تو کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ ایک عام سی سوچ کا آدمی بھی سمجھتا ہے کہ پھر انتقام جوانوں کے ہاتھ میں آ جاتا ہے۔ اکبر بگٹی کو ختم کرنے کے بعد یہ سمجھتے تھے معاملہ ختم ہو جائے گا۔ نواب اکبر بگٹی جو بلوچوں میں سب سے متنازعہ شخص تھا، اس کی موت بلوچ علیحدہ پسند قیادت کے لیے ایک تحفہ بن گئی۔ آپ نے علیحدگی پسندوں کے ہاتھ میں لاش کا پرچم دے دیا۔ یہی کچھ نیک محمد اور پھر بیت اللہ محسود کے ساتھ ہوا۔ اس کے بعد حکیم اللہ محسود آیا تو اس نے امریکی سی آئی اے کو تاریخ ساز نقصان پہنچایا۔ سی آئی اے نے جب سے اپنا آپریشن شروع کیا ہے اس کے نوے افراد مارے گئے جن کو سی آئی اے ہیڈ کوارٹر میں داخلی لابی کے سامنے کی دیوار پر ستاروں کے ساتھ مزین کیا گیا ہے۔ ان نوے ستاروں میں بارہ وہ ہیں جو حکیم اللہ محسود کے ہاتھ سے مارے گئے۔ امریکہ اور ہمارے یہ دانشور اب بھی یہ سمجھ رہے ہیں کہ کمر ٹوٹ گئی' لیکن انہیں ایک دفعہ ول ڈیورانٹ دوبارہ پڑھ لینا چاہیے۔ انہوں نے خون گرمانے، جوش پیدا کرنے اور آرزو جوان رکھنے کے لیے طالبان کو ایک اور ''شہید'' تحفے میں دے دیا ہے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

جنرل صاحب نے یہ کیا کہہ دیا

حرفِ راز
اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

میڈیا کے کیمرے اس سیمینار میں نہیں تھے۔ اسلام آباد کے سرد موسم میں دسمبر کی ایک صبح مشہورِ زمانہ لال مسجد اور مرحوم جامعہ حفصہ کے قریب ایک ہوٹل کے زیرِ زمین ہال میں شہر کے لوگوں کا جمِ غفیر تھا۔ تنظیمِ اسلامی نے دہشت گردی کے سدِباب کے عنوان سے ایک مذاکرے کا اہتمام کیا تھا۔ دو مقررین کا تعلق پاکستان کے قبائلی علاقے سے تھا اور وہ ملک کے انتظامی ڈھانچے کے اہم ستون یعنی بیوروکریسی کے اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز رہ چکے تھے۔ ایک ایاز وزیر تھے جن کا تعلق شمالی وزیرستان سے ہے، خیبر لاء کالج پشاور سے وکالت کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد وہ سول سروس کے امتحان میں کامیابی حاصل کرتے ہوئے محکمہ خارجہ سے منسلک ہوئے، وہ اپنے محکمے میں افغان امور کے ماہر تصور ہوتے تھے۔ افغانستان میں اس زمانے میں پاکستان کے سفیر تھے جب امریکی اور پاکستانی حکام طالبان کو یہ سمجھانے میں مصروف تھے کہ امریکہ کے سامنے جھک جاؤ۔ دوسرے رستم شاہ مہمند جو پاکستان کی سول سروس یعنی ڈی ایم جی سے تعلق رکھتے تھے۔ خیبر ایجنسی اور جنوبی وزیرستان میں پولیٹیکل ایجنٹ، شمالی وجنوبی وزیرستان کے کمشنر اور افغان مہاجرین کے کمشنر رہنے کے بعد پاکستان کے سیکرٹری داخلہ رہے۔ افغانستان اور قبائلی امور پر مہارت کی وجہ سے انہیں سول سروس سے ریٹائرمنٹ کے بعد افغانستان میں پاکستان کا سفیر مقرر کیا گیا۔ تیسرے مقرر پرویز مشرف کے دستِ راست ریٹائرڈ لیفٹیننٹ جنرل شاہد عزیز تھے۔ افغانستان پر امریکی حملے کے وقت وہ چیف آف جنرل سٹاف کے عہدے پر متمکن تھے، ایک ایسا عہدہ کہ جب اس ملک سے افغانوں پر حملے کرنے کے لیے مکمل مدد فراہم کی جا رہی تھی، اس عہدے کی آنکھیں ان تمام واقعات کی گواہ بنتی رہیں۔ دسمبر 2003ء سے اکتوبر 2005ء تک وہ لاہور کے کور کمانڈر رہے اور ریٹائرمنٹ کے بعد نیب کے چیئرمین بنے۔ یوں تو اس دور میں بہت سے لیفٹیننٹ جنرل رہے لیکن اپنے ضمیر کی خلش سے بے قرار ہو کر اور خاموشی توڑ کر کتاب صرف لیفٹیننٹ جنرل شاہد عزیز نے لکھی۔ اس کتاب میں لکھا جانے والا سچ اس قدر کڑوا تھا کہ اس نے بھونچال کھڑا کر دیا۔ ان کی کتاب ''یہ خاموشی کہاں تک'' پر بہت عرصہ اخباروں اور ٹیلی ویژن کے ٹاک شوز میں تبصرہ ہوتا رہا۔ پرویز مشرف نے غصے میں لال بھبھوکا ہوتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ شاہد عزیز کا دماغ چل گیا ہے۔ اس سیمینار میں قبائلی امور کے باقی دونوں ماہرین اور خود قبائلی پس منظر رکھنے والے اعلیٰ بیوروکریٹس نے بہت سی ایسی باتیں کیں جنہیں اس ملک کا میڈیا بیان نہیں کرتا اور شاید مدتوں نہیں کرے گا۔ سیمینار میں جنرل شاہد عزیز نے ایک حیران کن انکشاف کیا اور یہ ایسی حقیقت ہے جسے سوات کا بچہ بچہ جانتا ہے لیکن نہ یہ میڈیا پر نشر ہوتی ہے اور نہ ہی اسے کوئی سیاست دان، دانشور یا تبصرہ نگار بیان کرنے کی جرأت کرتا ہے۔ جنرل شاہد عزیز نے 'جو اپنی لکھی ہوئی تحریر پڑھ رہے تھے اور جس کی ریکارڈنگ تنظیم اسلامی کے پاس موجود ہے اور ہو سکتا ہے چند دنوں کے بعد وہ ان کی ویب سائٹ پر بھی موجود ہو، کہا: ''سوات میں امن معاہدہ حکومت اور فوج نے امریکہ کے دباؤ پر توڑا اور اس کا الزام طالبان پر لگا دیا''۔ یہ فقرہ ایسا تھا جس سے پورے کا پورا ہال سناٹے میں آ گیا۔ اس فقرے کی گونج میں اگر ہم میڈیا پر گزشتہ پانچ سال کی گرجتی برستی آوازوں اور دانشوروں کے قلم سے نکلے ہوئے زہرخند جملوں کو یاد کریں تو یوں لگتا ہے کہ کئی سال پوری کی پوری قوم ایک جھوٹ کے الاؤ میں جلتی رہی۔ پاکستان کی پوری سیاسی قیادت' جو سوات آپریشن کے وقت برسرِاقتدار تھی، میں سے کسی بیان یا ٹی وی پر تبصرہ نکال کر دیکھ لیں، ایسے لگے گا جیسے یہ لوگ امن کی فاختائیں اڑا رہے تھے اور طالبان کی طرف سے انہیں ذبح کر دیا جاتا تھا۔ یہ اس قدر صابر تھے کہ انہوں نے امن کی ہر کوشش کی لیکن اسے طالبان نے تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ اس سوال کا جواب تو جنرل شاہد عزیز ہی دے سکتے ہیں کہ فوج کی ایسی کیا مجبوری تھی کہ وہ امن جو مذاکرات کی میز پر وقوع پذیر ہو گیا تھا اسے ایک فوجی آپریشن میں کیوں بدل دیا گیا جس کے آج تک ہم زخم چاٹ رہے ہیں۔ آج بھی دبی دبی آوازیں سوات کے بازاروں میں سنائی دیتی ہیں اور صرف ایک وقت کا انتظار ہے کہ جب قصبوں، محلوں اور دیہاتوں میں سنائی جانے والی کہانیاں میرے ملک کے طول و عرض میں بیان ہونے لگیں گی؛ پھر کوئی معافی، غلطی کا کوئی اعتراف ان زخموں کو مندمل نہ کر سکے گا۔ اس سارے کھیل تماشے میں جو تھیٹر میڈیا پر سجا اور آج بھی سجا ہوا ہے اس نے قوم کو نفسیاتی مریض بنایا ہوا ہے۔ آج بھی دلیل یہ دی جاتی ہے اور کتنے زور شور سے دی جاتی ہے کہ طالبان پر بھروسہ کیسے کریں' وہ تو سوات میں معاہدہ کر کے توڑ دیتے ہیں۔ طالبان کو جس طرح میڈیا میں گالی بنایا گیا وہ صرف سوات کے امن معاہدے کے ایک واقعے سے نہیں بلکہ اس میڈیا نے ہر اس قتل کو طالبان کے کھاتے میں ڈال کر دکان سجائی جو کہیں کسی اور جگہ بھی ہوتا رہا۔ سوات ہی کی مشہور گلوکارہ غزالہ جاوید جب اپنے باپ کے ہمراہ قتل ہوئی تو کتنے دن میڈیا یہ ماتم کرتا رہا کہ شدت پسندی اور طالبان کی سوچ نے اس خوبصورت گلوکارہ کی جان لے لی۔ ابھی سوات میں لڑکی کے کوڑوں والی جعلی ویڈیو ٹی وی کی سکرین پر نہیں آئی تھی کہ اس سے تقریباً دو ہفتے قبل ایک پروگرام میں انسانی حقوق کی ترجمان ثمر من اللہ نے کہا کہ دیکھنا کچھ عرصے بعد ایک ویڈیو سامنے آنے والی ہے جو طالبان کی حقیقت آشکار کر دے گی۔ اکثر یہ سوال اٹھتا ہے کہ آخر طالبان سے اس قدر دشمنی کیوں ہے؟ اس ملک میں اور بھی تو شدت پسند گروہ بستے ہیں۔ شناختی کارڈ دیکھ کر قتل کرنے والے تو بلوچستان میں بھی ہیں۔ قتل و غارت کا بازار گرم کرنے والے تو کراچی میں بھی کسی کو چین سے بسنے نہیں دیتے۔ ایسی ایسی بوری بند لاشیں برآمد ہوتی ہیں کہ جن کی ہڈیوں میں ڈرل سے سوراخ کیا گیا ہوتا ہے، ناخن کھینچے گئے ہوتے ہیں۔ ان کے لواحقین پر کیا گزرتی ہوگی جب وہ یہ لاشیں دیکھ کر سوچتے ہوں گے کہ ان کے پیاروں نے زندگی کے آخری لمحے کس اذیت سے گزارے ہوں گے۔ پھر بھی میڈیا پر صرف ایک ہی شدت پسند گروہ کے ''ترانے'' کیوں گائے جاتے ہیں۔ یہ مرض بہت پرانا ہے، یہ حربہ اور ہتھکنڈہ بہت پُراثر ہے اس لیے کہ اس کا ہدف طالبان نہیں اسلام ہوتا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کی عرب ریاستوں میں سے اکثریت پر گزشتہ نصف صدی سے سیکولر ڈکٹیٹر برسرِاقتدار تھے، ان کا اسلام یا اس کے اصولِ زندگی سے دور دور کا بھی واسطہ نہ تھا لیکن دنیا بھر کے اخبارات یا ٹیلی ویژن پروگرام اٹھا لیں، انہیں سیکولر ڈکٹیٹر نہیں مسلمان ڈکٹیٹر کہا جاتا تھا۔ کسی نے جرمنی کے ہٹلر، سپین کے فرانکو یا فلپائن کے مارکوس کو آج تک عیسائی ڈکٹیٹر نہیں کہا اور نہ ہی لکھا۔ اسلام کو اور مسلمانوں کو ہدف بنا کر جس قدر تسکین دنیا بھر کے میڈیا اور میرے ملک کے ''عظیم'' دانشوروں کو ہوتی ہے اس کا اندازہ آپ صرف کسی نیوز روم میں بیٹھ کر لگا سکتے ہیں، وہ نیوز روم جہاں کسی دھماکے، قتل، اغوا یا ایسے کسی جرم کی خبر آ چکی ہو اور ٹیلی ویژن پر چل بھی رہی ہو تو متلاشی نظریں اور کان بے چینی سے انتظار کر رہے ہوتے ہیں، تجسس میں ایک دوسرے سے سوال کیے جاتے ہیں: ''طالبان نے ذمہ داری قبول نہیں کی ابھی تک؟ پتہ تو کرو، عالمی میڈیا کو دیکھو، کسی ویب سائٹ پر ڈھونڈو'' اور اگر ذرا بھی تاثر مل جائے تو پھر دیکھیں اگلے چوبیس، اڑتالیس یا بہتر گھنٹے کی نشریات کے لیے موضوع مل جاتا ہے۔ خبر چلاؤ اور رگڑ دو شرعی قوانین کو، اسلام کی شرعی حیثیت کو اور خود اسلام کو۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

گورے انگریز سے کالے انگریز تک

اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

یہ اس خطے کے لوگوں کے مستقبل سے کھیلنے اور انہیں زیور تعلیم سے محروم رکھنے کا دوسرا مجرمانہ کھیل تھا جو انگلش میڈیم سکولوں کی چکا چوند' خوبصورت یونیفارم اور نرسری گیتوں کی صورت میں ایک میٹھے زہر کی صورت میں گزشتہ تیس برسوں سے اس قوم کی رگوں میں اتارا جا رہا تھا۔ آج اس کے خوفناک نتائج سامنے آنا شروع ہو گئے ہیں۔ مجھ جیسے دقیانوسی' فرسودہ اور قدیم خیالات والے شخص کی باتوں پر یقین نہ کریں، لیکن ایک عالمی ادارے کی رپورٹ تو آپ کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہونی چاہیے۔ یہ عالمی ادارہ یونیسکو ہے' جس میں مدرسے کے پڑھے ہوئے' عرف عام میں جاہل ملّا یا پھر مجھ جیسے ماضی پرست شخص کا کوئی گزر نہیں ہو سکتا۔ اس میں سب کے سب اس ''مہذب'' دنیا کے عالمی معیارِ تعلیم سے آراستہ درس گاہوں سے پڑھے ہوئے لوگ موجود ہیں۔ ان کے نزدیک تعلیم' شرح خواندگی' تخلیقی صلاحیت اور فنی استعداد سب کے وہی معیارات ہیں جو مغرب زدہ لوگوں کے ذہنوں اور ان کی تحریروں میں نظر آتے ہیں۔ اس عالمی ادارے نے پاکستان کی تعلیمی حالت پر اپنی 2012ء کی رپورٹ شائع کی ہے جس کے مندرجات خوفناک حد تک دہلا دینے والے ہیں۔ یہ رپورٹ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں اس ملک کی تعلیم کے زوال کی تصویر نظر آتی ہے۔ رپورٹ کے مطابق 2012ء میں پاکستان میں سب سے زیادہ ناخواندہ یعنی ان پڑھ افراد نوجوان ہیں جن کی عمریں 15 سال سے 24 سال کے درمیان ہیں۔ ان میں سے 72 فیصد نوجوان مکمل طور پر ان پڑھ ہیں۔ اس کے بعد اگر آپ آگے بڑھتے جائیں تو جو لوگ عمر میں جتنے زیادہ ہیں ان میں ناخواندہ یا ان پڑھ لوگوں کی تعداد اتنی ہی کم ہے۔ 25 سال سے 44 سال تک کی عمر کے لوگوں میں ان پڑھ افراد کی تعداد 57 فیصد ہے اور 45 سال سے 54 سال کی عمر کے لوگوں میں ان کی تعداد 46 فیصد ہے۔ وہ لوگ جو اس دور میں پیدا ہوئے جب اس ملک میں صرف چند ایک انگلش میڈیم سکول تھے' جب ٹاٹ یا چٹائی پر بیٹھ کر پڑھنے والے محنتی اور مخلص استاد سے فرسودہ سے اردو میڈیم سکول میں پڑھتے تھے اور اس وقت جن کی عمریں 55 سال سے 64 سال کے درمیان ہیں' ان میں ان پڑھ لوگوں کی تعداد صرف 38 فیصد ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ ان میں 62 فیصد لوگ پڑھے لکھے ہیں' یعنی آج کے نظامِ تعلیم میں جتنے لوگ ان پڑھ ہیں اس دور میں پیدا ہونے والے افراد اتنے ہی پڑھے لکھے تھے۔ اس وقت 55 سال کی عمر کو پہنچنے والا شخص 1958ء میں پیدا ہوا ہو گا۔ اس دور میں چند ایک عیسائی مشنری سکولوں کے سوا کوئی اور انگلش میڈیم سکول نہ تھا۔ پورے ملک میں آکسفورڈ اور کیمبرج کے ''او'' اور ''اے'' لیول کے امتحانات کا بھی کوئی رواج نہیں تھا۔ پورے ملک میں شاید ہی چند سکول ہوں جہاں لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے پڑھتے تھے، یہاں تک کہ مشنری سکولوں میں بھی لڑکیوں اور لڑکوں کے علیحدہ سکول ہوا کرتے تھے۔ چند انگلش میڈیم سکولوں کے طالب علم اور اردو میڈیم کے لاکھوں طلبہ' سب کے سب ایک ہی بورڈ سے امتحان دیتے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ دونوں اپنا پرچہ الگ الگ زبانوں میں حل کرتے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں سرکاری محکمہ تعلیم کی سند ہوتی تھی اور یہ سلسلہ یونیورسٹی کی تعلیم تک جاری رہتا تھا۔ اس دور میں ملک کے کونے کونے میں ایسے سکول تھے جن کی چٹائیوں اور ٹاٹ پر ایک ڈپٹی کمشنر' بریگیڈیئر' ایم این اے یا بڑے جاگیردار کے بچے عام گلی کوچوں میں رہنے والے انسانوں کے بچوں کے ساتھ پڑھتے تھے۔ پورے ملک میں چند لوگ ایسے تھے جو اپنے سرمائے کے بل بوتے پر بچوں کو ملک سے باہر بھیجتے تھے۔ ایچی سن جیسے اداروں میں خاندانی وجاہت اور نسلی تفاخر کی بنیاد پر بچوں کو داخلہ دیا جاتا تھا۔ اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ انگریز کے بنائے ہوئے حکمران طبقوں کی اولادوں کو زیورِ تعلیم سے اس طرح آراستہ کیا جائے کہ وہ انہی کے رنگ ڈھنگ سیکھ کر اس ملک کے عام لوگوں پر حکمرانی کریں۔ یہ تھی اس ملک کی تعلیمی صورت حال، یہ تھی وہ نسل جس کی عمر آج 55 سے 64 سال کے درمیان ہے اور اس میں شرح خواندگی 62 فیصد ہے اور اس میں ان پڑھ لوگ صرف 38 فیصد ہیں۔

اب اس نسل کی طرف آئیں جو موجودہ نظامِ تعلیم اور اس کے معیار کا پھل کھا کر جوان ہوئی ہے۔ وہ جن کی عمریں 15 سے 24 سال کے درمیان ہیں۔ 24 سال قبل یعنی 1989ء میں اس ملک میں انگلش میڈیم سکولوں کا فیشن عام ہو چکا تھا۔ چند بڑے سکول سسٹم قائم ہوئے جن میں ایک خاص طبقے نے اپنے بچے داخل کروانا شروع کیے۔ اس کے بعد ہر گلی کے کونے پر ایک گھر کرائے پر لے کر' اس کی دیواروں پر مغرب زدہ کارٹونوں کی تصویریں بناتے ہوئے ایک مشکل سا انگریزی نام رکھ کر سکول کھولا گیا۔ نصاب کی جو کتاب کسی پبلشر یا کتابوں کے تاجر نے کسی بھی ملک سے منگوائی اسے بغیر سوچے سمجھے نصاب کا حصہ بنایا گیا۔ بدترین حد تک نقالی کی گئی کہ بچوں کو السلام علیکم کی جگہ گڈ مارننگ اور گڈ آفٹر نون جیسے آداب سکھائے گئے۔ اسّی کی دہائی وہ عرصہ تھا جس میں اس ملک میں تعلیم ایک کاروبار بن گئی۔ غریب والدین' جو اپنے بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنا چاہتے تھے' کی جیبوں پر ڈاکے ڈالے گئے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی طرف سے تعلیم کو قومیانے کی پالیسی سے پہلے اس ملک میں ہزاروں پرائیویٹ سکول تھے لیکن نہ ان میں نصاب مختلف ہوتا تھا اور نہ ہی ان کی فیسیں سرکاری مدرسوں سے زیادہ ہوتی تھیں۔ ہر قصبے اور قریے میں مخیّر حضرات نے سکول کھولے ہوئے تھے، جن کے پاس کہیں سے چند لاکھ روپے آ جاتے اور انہیں کوئی کاروبار نہ سوجھتا تو وہ ایک سکول کھول لیتا۔ ان سکولوں میں اساتذہ کی تعلیم اور تربیت کا یہ عالم تھا کہ جس گھر میں کوئی بچی یا بچہ میٹرک یا ایف اے کا امتحان دے کر نتیجے کا انتظار کر رہا ہوتا اسے بھی استاد بنا دیا جاتا اور بڑے بڑے سکولوں میں تو اعلیٰ سول اور فوجی افسران کی بیویاں بغیر کسی تربیت کے استاد کی کرسی پر جا بیٹھیں۔ پورے ملک میں امیر اور مڈل کلاس نے ان سکولوں کا رخ کیا تو سرکاری اردو میڈیم سکول ریڑھی والوں' مزدوروں' کلرکوں' خوانچہ فروشوں اور مفلوک الحال انسانوں کے بچوں کے لیے رہ گئے۔ یہ سکول پھر ایسے اجڑے کہ ان کی ویرانی پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ ان کا نصاب جدا' ان کے ہاتھ میں کتاب علیحدہ' ان سے علم حاصل کرنے والوں کے پاس ڈگریاں اور سرٹیفکیٹ مختلف۔ یوں تباہی کی وہ داستان لکھی گئی جس کا نتیجہ یونیسکو کی یہ رپورٹ ہے۔

یہ حملہ اس خطے پر دوسری دفعہ ہوا ہے۔ پہلی دفعہ جب 1857ء میں انگریز نے اپنی حکومت کو پورے ہندوستان پر وسعت دی تو برصغیر میں موجود تعلیمی نظام کی کمر توڑنے کے لیے اپنا مغربی نظام تعلیم رائج کیا۔ 1879ء میں ہر ضلع کے گزیٹر لکھے گئے۔ یہ تمام گزیٹر پنجاب آرکائیوز میں موجود ہیں۔ ان کے مطابق اس وقت ہندوستان کی شرح خواندگی 90 فیصد سے اوپر تھی اور پھر جب انگریز 1947ء میں یہ ملک چھوڑ کر گیا تو اس کی شرح خواندگی پندرہ فیصد تھی۔ پہلے اس ملک کی تعلیم کو گورے انگریز نے تباہ کیا اور اب کالے انگریز کر رہے ہیں۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

ہمارے جوتے ہمارا سر

آپ کو اس فقرے کی صداقت پر یقین نہیں آئے گا کہ "ورلڈ بینک، ایشین ڈویلپمنٹ بینک اور وہ عالمی ادارے جو پاکستان کو قرضے دیتے ہیں ان پر برائے نام سود ہوتا ہے جو دراصل وہ اخراجات ہوتے ہیں جو بینک چلانے کے لیے ضروری ہوتے ہیں"۔ یہ فقرہ گزشتہ کئی برسوں کی ورلڈ بینک اور ایشین ڈویلپمنٹ بینک کی رپورٹوں کا نچوڑ ہے۔ ورلڈ بینک کی 2012ء کی رپورٹ کے مطابق یہ شرح 2.34 فیصد تھی۔ بعض قرضوں پر تو یہ ڈیڑھ فیصد سے بھی کم ہے۔ اس کے باوجود اس ملک میں سود کے پرچم کو بلند کرنے والے دانشور، معیشت دان اور صرف اسلام سے بغض رکھنے والے سیکولر کہتے پھرتے ہیں کہ سود سے کیسے نجات مل سکتی ہے۔ ہم تو عالمی طور پر اس نظام میں جکڑے ہوئے ہیں، یہ سود تو اب ہر شخص اور ادارے کی رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ میں نے ان سیکولر حضرات کو صرف اسلام سے بغض رکھنے والا اس لیے کہا ہے کہ یہ لوگ تمام مذاہب کے رسوم و رواج اور عقیدوں کا احترام کرتے ہیں' انہیں بابری مسجد گرانے والے ہندو اچھے لگتے ہیں اور یہ ان کے ہر ڈرامے کے ہر دوسرے سین میں پوجا پاٹ کو مذہب کا بے جا استعمال نہیں کہتے، تمام مشنری سکولوں میں بائیبل کے اسباق اور اخلاقیات پڑھانے پر انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ بدھ، کنفیوشس' تاؤ اور دیگر تمام مذاہب کے ماننے والوں کے ہاتھوں ہزاروں مسلمانوں کا قتل دیکھتے ہیں لیکن کبھی یہ اس مذہب کو بُرا نہیں کہتے۔ لیکن کسی ڈرامے میں مسجد یا مولوی دکھایا جائے' کہیں کسی مسلمان کے ہاتھوں قتل ہو جائے یا نصاب میں اسلام کی تعلیمات پڑھائی جانے لگیں تو ان کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگتا ہے۔ یہ ایک دم چیخنے لگتے ہیں۔ ان کا نشانہ مسلمان نہیں بلکہ سیدھا سیدھا اسلام ہوتا ہے۔ یہ ذکر اس لیے کیا کہ گزشتہ چالیس سال سے سود کے مکروہ نظام کے خلاف جو جدوجہد ہو رہی ہے، اس کا مخالف یہی ہراول دستہ ہے۔ یہ دانشور، معیشت دان اور انسانی حقوق کے داعی سود کی مخالفت کو ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بتاتے ہیں اور یہ سود کی مخالفت کرنے والے لوگوں کو رجعت پسند، فرسودہ، جاہل اور متشدد جیسے ناموں سے پکارتے ہیں؛ حالانکہ دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا معیشت دان خواہ وہ کینز (Kenyes) ہو یا ملٹن فریڈمین (Milton Friedman) کوئی بھی سود کی حمایت نہیں کرتا۔ سب کے سب اسے معاشی ترقی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ گزشتہ دہائی میں دنیا کا ہر بڑا معیشت دان صرف ایک ہی نعرہ بلند کرتا ہے کہ اس دنیا کی معاشی تباہی کا سب سے بڑا ذمہ دار سود پر مبنی بینکنگ سسٹم ہے۔ سٹیو کین (Steve Keen) کا لگایا ہوا یہ نعرہ "آؤ بینکوں کو دیوالیہ کرو" (Bankrupt the Banks) اس وقت ایک مقبول ترین پکار بن چکی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دنیا بھر کا سرمایہ 43 ہزار ملٹی نیشنل کمپنیوں کے پاس ہے جن کو پانچ سو کے قریب بڑی ملٹی نیشنل کمپنیوں کا ایک مخصوص گروہ (Core Group) کنٹرول کرتا ہے۔ پھر ان سب کو بیس بڑے بینک کنٹرول کرتے ہیں جو عوام کی بچت اور اس بچت سے پیدا شدہ مصنوعی دولت ان ملٹی نیشنل کمپنیوں کو دے کر پوری دنیا کی معیشت پر سانپ بن کر بیٹھے ہیں۔ پھر اسی مصنوعی دولت سے دنیا کی سیاست، کاروبار بلکہ معاشرت کو بھی قابو کیے ہوئے ہیں۔ انہی بینکوں کی دولت سے جنگیں ہوتی ہیں، "اخلاق یافتہ" میڈیا چلتا ہے اور لوگوں کی معاشرت میں زبردستی چال چلن متعارف اور مقبول کروایا جاتا ہے۔ علامہ محمد اقبال جنہیں اللہ نے قرآن کے علم کا امین بنایا تھا، انہوں نے 1906ء میں اس پورے مکروہ معاشی نظام پر ایک کتاب تحریر کی جس کا نام "علم الاقتصاد" ہے۔ یہ کتاب لوگوں کی نظروں سے چھپا دی گئی تھی۔ لیکن اب اسے لاہور کے ایک پبلشر نے دوبارہ چھاپا ہے۔ یہ کتاب اُس وقت لکھی گئی جب یہ بینکنگ سسٹم اپنی جڑیں مضبوط کر رہا تھا۔ اقبال کا ادراک اس سسٹم اور مصنوعی دولت کے بارے میں اس قدر وسیع تھا کہ وہ لکھتے ہیں: "بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بینک کم شرح سود کے عوض ایک سے روپیہ مستعار لیتے ہیں اور دوسرے کو زیادہ شرح سود کے عوض مستعار دے کر فائدہ اٹھاتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بینک کبھی روپیہ قرض نہیں دیتا بلکہ ساکھ کے بل پر اپنی موجودہ زرِ نقد کی مقدار سے زیادہ کے اوراق جاری کر کے یا اعتبار کی اور صورتیں پیدا کر کے فائدہ اٹھاتا ہے"۔ یہ ہے وہ ادراک اور علم جو اللہ نے اقبال کو عطا کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پورے سودی نظام کو صرف ایک شعر میں سمو دیتے ہیں:

ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جواء ہے
سود ایک کا' لاکھوں کے لیے مرگ مفاجات

لیکن اگر ورلڈ بینک اور ایشین ڈویلپمنٹ بینک جیسے ادارے سود نہیں لیتے تو پھر پاکستان کون سے قرضے اور سود کی لعنت کا شکار ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ پاکستان بیرونی قرضے ادا کرنا چاہے تو اسے سود نہیں دینا پڑے گا' اگر دینا بھی پڑا تو بہت ہی کم لیکن ہمارے حکمرانوں کو ملک کے اندر بینکوں سے قرض لینے کا ایک شوق اور جنون ہے۔ اس شوق کی دو وجوہات ہیں...... ایک یہ کہ جو قرضہ انہوں نے بیرون ملک سے لیا ہوتا ہے وہ اسے بجٹ سے ادا نہیں کرتے بلکہ اسے اللّوں تللّوں میں خرچ کر دیتے ہیں اور اندرون ملک بینکوں سے مہنگے ریٹ پر سودی قرضے لے کر اسے واپس کرتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ ان بینکوں کے ساتھ ان کے مفادات وابستہ ہوتے ہیں۔ ان کے مالکان یا ان سے قرضہ لے کر ملیں بنانے والے سرمایہ داران کی پارٹیوں کے فنانسر ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ان بینکوں کے سرمائے سے پل کر موٹے ہوئے ہوتے ہیں اور یہ اس سرمائے سے حکمرانوں کی بھی آڑے وقتوں میں مدد کرتے ہیں۔ خود بینک بھی اس مصنوعی دولت سے مہران بینک کی طرح انہیں سرمایہ فراہم کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس ملک کا اندرونی قرضہ بیرونی قرضے سے دن بدن کئی گنا بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اندرون ملک بینکوں سے سود پر قرض لے کر ملک کو چلانے کی لت اس قوم کو قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو نے ڈالی۔ 1972-73ء میں 17.8 ارب روپے بینکوں سے قرض کے طور پر لیے گئے۔ اس مقصد کے لیے پہلے تمام بینکوں کو قومی ملکیت میں لیا گیا اور پھر لوگوں کے جمع شدہ سرمائے کو بے دردی سے خرچ کیا گیا۔ 1977ء میں جب وہ حکومت سے علیحدہ کیے گئے تو اس وقت ان کی مہربانیوں سے یہ ملک 32.7 ارب روپے کا مقروض تھا۔ ضیاء الحق کو بیرونی امداد بھی ملتی رہی لیکن پھر بھی اندرون ملک بینکوں سے سود پر قرض لینے کی لعنت سے چھٹکارا حاصل نہ کیا۔ 1988ء میں جب ان کے طیارے کو حادثہ ہوا تو اُس وقت ان بینکوں کا ملک پر 290.1 ارب روپے سودی قرضہ تھا۔ بینظیر (پہلا دور) 448.7 ارب، نواز شریف (پہلا دور) 608 ارب، بینظیر (دوسرا دور) 908.9 ارب، نواز شریف (دوسرا دور) 1389.3 ارب، پرویز مشرف 2610 ارب اور زرداری صاحب کے زمانے میں ان قرضوں کو پر لگ گئے اور یہ 7637 ارب تک جا پہنچے۔ اور اب صرف سو دنوں میں ان بینکوں سے لیے جانے والے قرضوں کی مقدار 8795 ارب روپے تک جا پہنچی ہے۔ یہ ہے اس قوم کی بدبختی کی تاریخ۔ پرویز مشرف کے دور میں ان قرضوں میں 53 فیصد اضافہ ہوا، آصف علی زرداری کے زمانے میں 135 فیصد اور گزشتہ چند ماہ میں 169 فیصد اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ لوگ ان قرضوں کو اتارنے کے لیے لوگوں پر ٹیکس لگاتے ہیں۔ ان کی بجلی، پٹرول، گیس، تیل، آٹا، چینی مہنگا کرتے ہیں اور پھر یہ سب ٹیکس اکٹھا کر کے اپنے پیارے، چہیتے، منظورِ نظر اور مصیبت میں کام آنے والے بینکاروں کو واپس کرتے ہیں۔ ان بینکوں میں سرمایہ بھی عوام کا ہوتا ہے۔ عوام سے قرض لیا جاتا ہے، پھر انہی پر ٹیکس لگا کر سود سمیت وصول کیا جاتا ہے اور پھر انہی کھاتے داروں کو واپس کیا جاتا ہے یعنی عوام کا جوتا زبردستی ان کے پاؤں سے اُتارا جاتا ہے اور پھر زور زور سے ان کے سروں پر مارا جاتا ہے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

حرف راز
اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

ہم دلدل میں کیسے پھنستے ہیں؟

اس کتاب میں ہر اس حکومت اور فوج کے لیے کئی سبق ہیں جو کسی بھی قبائلی اور نیم خانہ بدوش علاقے میں اپنا اثر ورسوخ یا موجودہ صحافتی اور سیاسی زبان میں "رٹ" قائم کرنے کے لیے اپنی طاقت کو واحد ہتھیار سمجھتی ہے۔ برطانیہ کی وزارتِ دفاع میں کئی ماہ یہ بحث زوروں پر رہی کہ اس کتاب کو شائع ہونے سے روکا جائے، لیکن اب آنے والے بدھ کو یہ کتاب منظر عام پر آ جائے گی۔ یہ کتاب برطانوی فوج کے ایک کپتان مائیک مارٹن (Mike Martin) نے تحریر کی ہے۔ ایک سال تک وہ اس کتاب کی اشاعت کے لیے وزارت دفاع سے لڑتا رہا، اس لئے کہ یہ کتاب برطانوی افواج میں صلاحیتوں کے فقدان اور بار بار کے تجربوں سے کچھ نہ سیکھنے کی ہٹ دھرمی کے بارے میں بہت سے رازوں سے پردہ اٹھاتی ہے۔ برطانیہ جہاں آزادیٔ اظہار کے نعرے گونجتے ہیں اور پوری دنیا کو بھی اس کا درس دیا جاتا ہے، کی وزارتِ دفاع نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ حاضر سروس فوجی کتاب تحریر تو کرسکتا ہے لیکن اس کی کچھ حدود وقیود ہیں۔ مائیک مارٹن یہ جنگ لڑتا رہا، بات نہ بنی تو فوج سے استعفیٰ دے دیا اور اب یہ کتاب منظر عام آ رہی ہے۔ کتاب کا نام ہے An Oral History of Helmand Conflict---1978- 2012 یعنی "ہلمند تنازع کی زبانی تاریخ، 1978ء سے 2012ء تک"۔ ہلمند افغانستان کا وہ علاقہ ہے جس کی ایک شاندار تاریخ ہے۔ 19 جون 2009ء کو برطانوی افواج نے اس صوبے کو فتح کرنے کے لیے بہت بڑا آپریشن شروع کیا، جولائی 2009ء میں امریکی افواج بھی ان کے ساتھ آملیں۔ اس آپریشن میں چارسو کے قریب برطانوی سپاہی مارے گئے لیکن ہلمند آج بھی طالبان کے زیر تسلط علاقوں میں اہم ترین ہے۔ ہلمند پاکستان کے ضلع چاغی سے ملحق علاقہ ہے اور بیس ہزار مربع میل پر مشتمل افغانستان کے بڑے صوبوں میں سے ایک ہے۔ تقریباً چودہ لاکھ افراد اور ایک ہزار دیہات والے اس صوبے کا مرکز "لشکر گاہ" ہے۔ یہ علاقہ آتش پرست ایران کا حصہ تھا، مسلمان ہوئے تو یہ پہلے خلافت کے زیر اثر ہوا لیکن جب ایران پر صفوی حکومت آئی تو اس خطے سے میر وائس ہوتکی نے جنم لیا جس نے اسے ایک آزاد اور خود مختار علاقہ بنا دیا۔ احمد شاہ ابدالی نے جب افغان سلطنت کی بنیاد رکھی تو ہلمند کے قبائل اس کا حصہ بن گئے۔ افغانستان میں انیسویں صدی کے برطانیہ کے ساتھ لڑائیوں میں ہلمند کے لوگوں کا کردار بے جگری اور بہادری سے لڑنے والوں کا تھا۔ برطانیہ کو شکست دینے کے بعد تقریباً سو سال اس خطے میں امن رہا، یہاں تک کہ 1979ء میں روس نے وہاں اپنی فوجیں داخل کیں اور افغان تاریخ کا ایک اور باب رقم ہوا جس میں سوویت یونین کی جدید ٹیکنالوجی کو شکست ہوئی۔ یہ واحد صوبہ ہے جس میں پشتون اور بلوچ صدیوں سے مل جل کر رہ رہے ہیں۔ پشتونوں کی پشتو بھی وہاں بولی جاتی ہے اور محمد حسنی بلوچوں کی براہوی بھی۔ چاغی کے علاقے سے ملنے والی اس صوبے کی سرحد مدتوں پوست کی کاشت کے لیے مشہور رہی بلکہ منشیات کی سمگلنگ کی چند بڑی عالمی گزرگاہوں میں سے ایک ہلمند اور چاغی سے گزرتی ہے۔ طالبان حکومت کے چند سالوں کو چھوڑ کر یہ علاقہ پوست کی کاشت اور ہیروئن کی تیاری سے لے کر سمگلنگ تک دنیا کے نقشے پر ایک سرخ نشان کی حیثیت رکھتا رہا ہے۔

مائیک مارٹن نے کنگز کالج لندن سے وار سٹڈیز میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر رکھی ہے اور وہ انتہائی روانی سے پشتو بول سکتا ہے۔ اس کتاب سے پہلے اس نے ہلمند کی مختصر تاریخ کے نام سے ایک کتاب لکھی جو ہر اس سپاہی کے لیے لازمی تھی جو وہاں متعین ہوتا تھا۔ اس نے دو سال ایک برطانوی فوجی کی حیثیت سے ہلمند میں گزارے اور وہ اس دوران ہر برطانوی کمانڈر کا مشیرِ خاص رہا۔ اس نے برطانوی فوج کے اس آپریشن میں بھی حصہ لیا جسے 9 HERRICKs- 16 کہا جاتا ہے۔ اس دوران اس نے افواج کے لیے ایک کتابچہ مرتب کیا جو انہیں وہاں کی ثقافت اور مخصوص انسانی خصوصیات سمجھنے میں مدد دیتا تھا۔ موجودہ کتاب اس کے فوجی اور تحقیقی تجربے کا نچوڑ ہے۔ اس کتاب میں اس نے پشتو زبان میں کیے گئے ایک سو پچاس انٹرویو بھی شامل کیے ہیں۔ اس کا نقطۂ نظر موجودہ تجزیہ کاروں، تبصرہ نگاروں اور دفاعی ماہرین سے بالکل مختلف ہے۔ اس نے کتاب میں یہ بات سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ قبائلی معاشرے، اس کے اندر پائے جانے والے اختلافات، قبائلیوں کی مخصوص سوچ اور طرزِ زندگی سے ناآشنا لوگ جب وہاں کے معاملات کو طاقت یا فوجی حکمتِ عملی سے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو جنگ کو مزید ہوا دیتے، اسے طویل کرتے اور اپنی اس حکمت عملی سے خونریزی کو شدید کر دیتے ہیں۔ اس طرح سب کچھ ان کے اہداف سے مختلف ہو جاتا ہے۔ مائیک مارٹن کی اس کتاب پر برطانیہ کی پارلیمنٹ کی دفاعی کمیٹی میں بہت بحث ہوئی اور فوج اس بات پر بضد رہی کہ ان کی حکمت عملی صدیوں کے تجربے کا نچوڑ ہے اور 2020ء میں مستقبل کی فوج کا خاکہ ویسا ہی رہنا چاہیے۔ لیکن چیف آف جنرل سٹاف سر پیٹر وال (Peter Wall) نے اس بات کا اعتراف کیا کہ افغانستان اور عراق کے قبائلی معاشروں میں ہماری حکمت عملی بری طرح ناکام ہوئی اور ہمیں ان تیرہ برسوں کے تجربے سے سیکھنا چاہیے، ان تجزیہ کاروں، دفاعی ماہرین اور عالمی مبصرین سے اجتناب کرنا چاہیے جو ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھ کر دفاعی کتابوں، خبروں اور خفیہ ایجنسیوں کی رپورٹوں کی بنیاد پر ہمیں مشورے دیتے ہیں؛ بلکہ ہمیں ان لوگوں پر بھروسہ کرنا چاہیے جو ان قبائلی معاشروں کو اندرونی طور پر جانتے ہیں اور ان کی ثقافت، زبان اور طرزِ زندگی سے واقف ہیں۔

اس کتاب میں دیا گیا سبق پاکستان پر کس قدر صادق آتا ہے، اس کا اندازہ صرف اس بات سے لگائیں کہ وزیرستان اور بلوچستان پر لکھنے والوں، ٹاک شوز میں گفتگو کرنے والوں اور حکمت عملی کا درس دینے والوں کی اکثریت ایسی ہے جنہوں نے زندگی میں ایک مسافر یا سیاح کی حیثیت سے بھی یہ علاقے نہیں دیکھے، ان میں سے نہ تو کوئی ان لوگوں کی زبان سے واقف ہے اور نہ ہی رسم و رواج سے۔ ان لوگوں سے زیادہ برا حال ان خفیہ اداروں کا ہے جن کے دفاتر میں وہ لوگ اثر ورسوخ حاصل کر لیتے ہیں؛ جن کی مدتوں سے ان گروہوں کے ساتھ قبائلی دشمنی ہوتی ہے اور وہ فوج یا قانون نافذ کرنے والوں کے ذریعے اپنا حساب چکانا چاہتے ہیں۔ زبان اور ثقافت سے ناآشنا افسران ان کی جھوٹ سچ اطلاعات پر اپنا ایک ذہن بنا لیتے ہیں، اس پر ایک رپورٹ مرتب کی جاتی ہے جس میں طے کر دیا جاتا ہے کہ کون غدار ہے، کون دہشت گرد ہے، کون حکومت مخالف اور کون بیرونی طاقتوں کا آلۂ کار ہے۔ ان ایجنسیوں کے اہل کاروں اور تجزیہ نگاروں کو اندازہ تک نہیں ہوتا کہ انہیں کس طرح استعمال کیا جا رہا ہے۔ قبائلی معاشرے میں متحارب قبائل کی ایک مجبوری ہوتی ہے، اگر ایک قبیلے کی حکومت کے ساتھ ٹھن جاتی ہے تو دوسرا اس موقع کو غنیمت جانتا ہے اور وہ ریاست کا وفادار بننے کی کوشش کرتا ہے۔ یوں حکومت کے وفاداروں اور مخبروں میں وہ لوگ بھی شامل ہو جاتے ہیں جو اپنے مجرمانہ مفاد کا تحفظ چاہتے ہیں، جیسے سمگلر، منشیات فروش اور مفرور۔ اسی طرح حکومت مخالف گروہ میں بھی ایسے لوگ پناہ لے لیتے ہیں جنہیں خوف ہوتا ہے کہ اگر وہ کسی مسلح گروہ کے ساتھ نہ ہوئے تو ان کے قبائلی دشمن، جو اب حکومت کے ساتھ ہیں، انہیں پکڑوا دیں گے۔ حکومت سے برسرِ پیکار گروہوں کی ایک مجبوری ہوتی ہے۔ انہیں اپنی اس جدوجہد کے لیے ایک نظریے کی تلاش ہوتی ہے۔ یہ نظریہ ایسا ہونا چاہیے جس کے لیے لوگوں کے دلوں میں پہلے سے جگہ موجود ہو۔ ایسے میں قومی حقوق اور استحصال کا نعرہ یا پھر شریعت کے نفاذ اور غیر شرعی ماحول کے خاتمے کی جدوجہد مقبول ترین اہداف بن جاتے ہیں۔ جوں جوں جنگ بڑھتی ہے، خونریزی میں اضافہ ہوتا ہے۔ گھروں میں لاشیں پہنچتی ہیں، انتقام کے نعرے کی گونج تیز ہونے لگتی ہے۔ خطرناک ترین جنگ وہ ہوتی ہے جو قبائلی انتقام کے غصے کو نظریے کے قالب میں ڈھال کر لڑی جاتی ہے۔ ایسی جنگ صدیوں تک چلتی رہتی ہے، لیکن کیا کریں، ہم ان تجزیہ کاروں، دانشوروں، تبصرہ نگاروں، دفاعی مبصروں اور ایسے اداروں کے اہلکاروں کے ہاتھ میں یرغمال ہیں جنہیں نہ قبائلی معاشرے کا علم ہے نہ وہ ان کی زبان جانتے ہیں اور نہ ان کی ثقافت سے آشنا۔ چند کتابیں، کچھ اخبار اور مخصوص ذہنیت ہمیں اس دلدل میں اتار دیتی ہے جس میں امریکہ اور برطانیہ بھی اترے تو ناکامی اس کا مقدر ہوتی ہے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

ہمیں کسی دشمن کی ضرورت نہیں

”ایک چھوٹا سا بیج بویا گیا اور اس کے پھل سے ہم آج فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ یہ عدالتی زبان کی تبدیلی تھی۔ فارسی کی جگہ انگریزی رائج کر دی گئی۔ ہندوستان کی تعلیم کو مغربیت کا رنگ دینے کے لیے یہ لازمی امر تھا۔ بظاہر یہ تبدیلی معمولی معلوم ہوتی تھی اور اس کے نتائج بھی معمولی نظر آتے تھے، لیکن مسلمانوں نے اس تبدیلی پر سخت احتجاج کیا اور فی الواقع یہ ان کے لیے سخت تباہ کن تبدیلی تھی“۔ یہ الفاظ کھترین میو (KatherineMayo) کی کتاب ”مدر انڈیا“ سے ہیں۔ یوں تو یہ خاتون 27 جنوری 1867 کو امریکی ریاست پنسلوینیا میں پیدا ہوئی لیکن وہ ایک ایسی سیاسی مورخ تھی جو دنیا بھر پر سفید فام اینگلو سیکسن پروٹسٹنٹ لوگوں کے اقتدار کی خواہشمند تھی۔ اس کے نزدیک برطانوی گورے اینگلو سیکسن پروٹسنٹ عیسائی ہیں اور ان کا اقتدار دنیا پر قائم رہنا چاہیے۔ وہ امریکہ میں غیر سفید افراد کے داخلے کے خلاف تھی۔ اس نے امریکہ سے فلپائن کی آزادی کی شدید مخالفت کی۔ وہ صرف اپنی تحریروں تک ہی نسل پرست نہ تھی بلکہ اس نے نیویارک کے گردونواح میں مضافاتی پولیس کے قیام میں سرگرم حصہ لیا۔ اس پولیس کا مقصد امریکہ میں مزید لوگوں کی آمد پر کنٹرول کرنا تھا اور مزدوروں میں جو حقوق کے جنگ کی تحریک چل رہی تھی اس پر قابو پانا شامل تھا۔ کھترین میو اپنے اندر کے تعصب کو بالکل نہیں چھپاتی تھی اور وہ یہ سمجھتی تھی کہ دنیا میں کالے اور دیگر غیر گوری اقوام کے لوگ کسی بھی قسم کسی کی تحریک چلائیں یا بغاوت پر آمادہ ہوں تو یہ پیدائشی طور پر حق حکمرانی رکھنے والے برطانوی گوروں کے لیے خطرے کی ایک گھنٹی ہے۔ اس کی کتاب ”مدر انڈیا“ اس تصور کی بنیاد پر لکھی گئی تھی کہ ہندوستان کو آزاد نہیں کرنا چاہیے۔ ان لوگوں میں حکومت کرنے، ترقی کے لیے آگے بڑھنے اور دنیا پر چھا جانے کی کوئی اہلیت نہیں۔ ان کے اندر اختلافات اسقدر ہیں کہ یہ ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے رہیں گے۔ اس لیے انہیں آزاد نہیں کرنا چاہیے۔ اس کتاب پر بہت ہنگامے ہوئے، اس کو لوگوں نے جلایا بھی اور ساتھ میں کیھ ترین کا پتلا بھی نذر آتش کیا۔ یہ کتاب 1927ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب خلافت عثمانیہ کو توڑ کر مسلم امہ کو رنگ، نسل، زبان اور علاقے کی بنیاد پر ٹکڑوں میں تقسیم کیا جا چکا تھا اور ہندوستان ہی وہ واحد خطہ تھا جہاں سے مسلمانوں کی مرکزیت یعنی خلافت کے لیے ایک جاندار تحریک اٹھ چکی تھی۔ یہ برصغیر میں انگریزوں کے اقتدار کے بعد پہلی سیاسی تحریک تھی۔ اس ہنگامے میں یہ کتاب آئی اور اس کے خلاف پچاس سے زیادہ کتابیں یا کتابچے تحریر کیے گئے۔ گاندھی جیسے شخص نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جس کا کام معاشرے کے گٹروں کے ڈھکن کھول کر دنیا کو بتاتا تھا کہ اندر کتنی بدبو ہے۔ کھترین میو دنیا پر گورے لوگوں کی حکومت کا اپنا یہ خواب سلامت لے کر 9 اکتوبر 1940ء کو اس دنیا سے چلی گئی۔ اس کی زندگی میں برصغیر پاک و ہند پر برطانیہ کا پرچم ہی لہراتا رہا۔

کھترین میو کے تعصب اور نسل پرستی پر تنقید کرنے والے آپ کو ہزاروں مل جائیں گے لیکن اس کے بدترین مخالفین نے بھی اس پر تاریخی بددیانتی کرنے یا حقائق کو توڑ موڑ کر پیش کرنے کا الزام نہیں لگایا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ”مدر انڈیا“ میں ایک متعصب گورے کے اندر کا سچ کھول کر بتا دیا اور اس کے نزدیک کسی قوم کو غلام بنانے، اس کی صلاحیتوں کو ختم کرنے اور اس کو اپنے گھر اور ماحول سے بیگانہ کرنے کا سب سے آسان ترین نسخہ یہ ہے کہ ان کو تعلیم اس زبان میں دینا شروع کر دو جو گورے کی زبان ہے۔ آپ اپنی زبان میں کسی دوسرے ملک کی تہذیب و معاشرت کی کہانیاں کتنی تفصیل سے کیوں نہ پڑھیں، آپ ان سے مرعوب نہیں ہو سکتے، آپ ان کے رنگ میں نہیں رنگ سکتے۔ لیکن جیسے ہی آپ سکول میں داخل ہوتے ہی، تمام علوم کسی غیر کی زبان میں حاصل کرنے لگیں تو آپ کے دماغ کے تصوراتی ماحول میں جو نقشہ ایک فلم کی طرح تیار ہوتا ہے وہ آپ کا زندگی بھر کا خواب بن جاتا ہے۔ یہاں دو بچوں کی مثال لے لیتے ہیں۔ ایک وہ ہے جو اپنی زبان میں سرسوں کے کھیت، حقے کی گڑگڑ، چکی کی گھرگھر، بیلوں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کی آواز، موذن کی اذان، قطار میں کھڑے چاول کی پنیری لگاتے لوگ اور بانسری، ڈھول اور سارنگی جیسے سُروں کی کہانیاں اپنی کتابوں اور اپنی زبان میں پڑھتا ہے۔ ان کہانیوں میں اسے اپنی خاک سے جنم لینے والے ہیرو بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ دوسری جانب کھترین میو کے خوابوں کی دنیا والا بچہ ہے جو اسی کی مطلوبہ زبان انگریزی میں سکول میں گڈ مارننگ سے دن شروع ہوتا ہے اور کہانیوں میں ایک ایسے ماحول کی تضاد پر اپنے ذہن پر فلم کی طرح نقش کرنے لگتا ہے جو اس کے لیے خواب کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ انگوروں کی فصل پکنے اور شراب کشید کرنے کے رقص پڑھتا ہے، اس ماحول میں چیری کے پھول ہیں۔ بڑے بڑے کرسمس والے درخت ہیں۔ سانتا کلاز ہے۔ برفانی مجسمے ہیں۔ سنڈریلا ہے جو ماں سے جھوٹ بول کر گھر سے نکلتی ہے۔ سات بونے اور سنو وائٹ ہے۔ ان سب کرداروں کا ایک لباس، ماحول اور معاشرہ ہے۔ دو مختلف معاشرے دو مختلف ذہنوں میں فلم کی طرح نقش ہو رہے ہیں۔ سرسوں کے کھیت کا معاشرہ اور چیری کے پھولوں کا معاشرہ۔ ایک خواب ہے جسے اس بچے نے کبھی چھو کر نہیں دیکھا ہوتا لیکن وہ تمام عمر اس خواب کو سینے سے سجائے رکھتا ہے۔ لیکن دوسرا معاشرہ ایک حقیقت ہے، اس کے اردگرد کا ماحول ہے۔ یہ ماحول اسے اپنے اردگرد نظر آتا ہے لیکن یہ کسی نرسری کی نظم میں نہیں، کسی کردار کے بچوں کی کتابوں کے قصے میں نہیں، کسی آفاقی اور زمینی ہیروز کے تصور میں نہیں۔ دنیا کے کسی مہذب اور ترقی یافتہ ملک میں یہ دو معاشرے اور دو گروہ نہیں ہوتے بلکہ کسی غیر کی زبان میں علم حاصل کرنے والا گروہ تو سرے سے ہی وجود نہیں رکھتا۔ دنیا کے کسی ملک نے آج تک کسی دوسرے کی زبان میں علم حاصل کر کے ترقی نہیں کی۔ لیکن جن پسماندہ اور محکوم قوموں نے ایسا کیا ان کے افراد آپ کو ان غیر ملکوں میں اپنی صلاحیتوں کو بیچتے نظر آئیں گے۔ فرانس میں افریقی ممالک کے لوگ اور انگلینڈ میں اس کی زیر تسلط علاقوں کے لوگ۔ یہ لوگ کھترین میو کے غیر ملکی زبان تعلیم میں دیکھے گئے بچپن کے خوابوں میں زندہ رہتے ہیں اور اس ماحول کے سحر میں گرفتار ہوتے ہیں۔ اسی لیے انہیں اپنے گاؤں، اپنی مٹی، اپنے کھیت اجنبی لگتے ہیں۔ دھوتی والا جاہل اور داڑھی والا شدت پسند محسوس ہوتا ہے۔ برقعے والی فرسودہ اور سکرٹ والی ترقی یافتہ نظر آتی ہے۔ یہ اوّل تو اپنے خوابوں کی دنیا کے ماحول کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں اور وہاں جا کر آباد ہو جاتے ہیں۔ نہ ہو سکیں تو اپنے گھر، ماحول اور طرز زندگی کو ویسا ہی بنانے کی کوشش ضرور کرتے رہتے ہیں۔ گاؤ تکیے سے صوفے، رنگین پلنگ سے ڈبل بیڈ، قت لمے سے پیزا، اور شلوار سے جینز تک کے سفر میں انہیں ایک لمحے کے لیے شرمندگی نہیں ہوتی۔ ایک غیر زبان کی کہانیوں میں ابتدائی دس سالہ زندگی گزارنے کے بعد ان لوگوں کی زبان پر ایک ہی فقرہ ہوتا ہے ہم ”انگریزی کے بغیر ترقی نہیں کر سکتے“ اور پھر آہستہ آہستہ ان کی زندگیوں سے اپنا سارا ماضی ایسے محو ہو جاتا ہے کہ انہیں کچھ احساس تک نہیں ہوتا۔ جس قوم سے اس کا ماضی چھین لیا جائے وہ ایک بے زمین اور بے علاقہ قوم بن جاتی ہے۔ اس کے ذہین ترین افراد ان پرندوں کی طرح ہوتے ہیں جنہیں کوئی بھی خرید کر اپنے علاقوں کی زینت بنا لیتا ہے۔ بچپن میں پڑھا ہوا خوابوں کا جزیرہ ان کے لیے کشش کا باعث ہوتا ہے۔ وہ واشنگٹن ہو یا لندن، پیرس ہو یا برلن کسی بھی جگہ جائیں تو انہیں اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔ وہ سمجھتے ہیں ہم عین اس خواب کے ماحول میں آ گئے جو ہم نے بچپن میں سکول میں پڑھا تھا اور وہ ماحول کبھی ہمیں ہمارے اردگرد نظر نہیں آتا تھا۔ یہ ہے ان قوموں کا مستقبل جو ماضی سے ٹوٹ جاتی ہیں اور حال ان کا یہ کہ ٹوکریوں میں ایسے بچے سجائے بیٹھی ہوتی ہیں جنہیں دوسروں کی زبان میں علم، تربیت اور تہذیب سکھائی جاتی ہے اور مستقبل تو تاریک ہوتا ہی ہے۔ دنیا خریدار ہے اور ہم اپنی ذہین اولادیں بیچنے والے۔ ہمیں کسی دشمن کی ضرورت نہیں۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

دل کے پھر زخم تازہ ہوتے ہیں

بچوں کی نفسیات اورنشوونما کے ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ بچے کے ذہن کی دیواریں ایک خالی کینوس کی طرح ہوتی ہیں جس پر قصوں' کہانیوں' دیومالاؤں' عظیم انسانوں کے کرداروں اور اخلاقیات سے مزیّن سچی نصیحت آمیز داستانوں کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے'ایک ماحول کافسوں طاری ہوتا ہے'ایک خوابوں کی دنیا وجود رکھتی ہے۔خوابوں کی اس دنیا میں اچھے اوراعلیٰ کرداروں والے ہیرو ہوتے ہیں اور برے کرداروں والے ولن بھی۔ایک سرزمین ہوتی ہے جس پر پھول کھلتے ہیں' موسم بدلتے ہیں' فصلیں اپنی بہار دکھاتی ہیں اور گویا اس میں جیتے جاگتے انسان بستے ہیں۔بچپن میں جیسا ماحول اور جیسی خوابوں کی دنیا بچے کے ذہن کے کینوس پر منقش کردی جاتی ہے وہی دنیا پوری زندگی کے لیے اس کے لیے ایک حوالہ بن جاتی ہے۔جس طرح کے ہیرو اس کے ذہن کے پردے پر نقش ہوتے ہیں' وہ ساری زندگی ان کے سحر سے باہر نہیں نکل پاتا۔جس طرح کی اخلاقیات وہ سیکھتا ہے'وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ خود کسی بھی طرح کے کردار میں ڈھل جائے'اس کی اخلاقیات کا معیار وہی رہتا ہے۔یہی وہ زمانہ ہوتا ہے جب بچہ اپنے وطن' اپنے علاقے اور اپنے موسموں سے محبت سیکھتا ہے۔اسے آخری عمر میں بھی اسی ماحول کی ہواؤں کی سرسراہٹ اور مٹی کی خوشبو یاد آتی ہے۔اس خوابوں کی دنیا اور ذہن کی سکرین پر بننے والی متحرک فلم کی ایک زبان بھی ہوتی ہے، یہ وہی زبان ہوتی ہے جسے وہ عام دنیا میں بازار جاتے' گھر میں رہتے' محبت' سیاست یا جنگ پر گفتگو کرتے ہوئے استعمال کرتا ہے۔متحرک تصویریں اگر ایک علاقے کی ہوں اور زبان وہ دوسرے خطے کی بولیں تو ایک ایسی بے ربط سی دنیا وہاں آباد ہوجاتی ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن اگر زبان' ماحول' کردار اور اخلاقیات سب کی سب ایک ہوں اور وہ اس بچے کے اپنے اردگرد کے ماحول سے اجنبی ہوں تو اس کا پہلا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کی اپنے ماحول اور لوگوں سے بیگانگی پیدا ہوجاتی ہے اور خوابوں کی دنیا کے ماحول سے محبت اور چاہت۔یہ ایسا خطرناک زہر ہے جو گزشتہ تیس سال سے میری قوم کے بچوں کو آہستہ آہستہ پلایا جارہا ہے۔انہیں O لیول اور A لیول میں ایسی کہانیاں' قصے اور داستانیں ایسی زبان میں پڑھائی جارہی ہیں جو ان کے اردگرد کی زبان ہے' نہ میڈیا کی اور نہ ہی کسی شعبہ زندگی کی۔

یہ سب اس لیے یاد آرہا ہے کہ ڈیڑھ ارب ڈالر کی سعودی امداد پر ماتم کرنے والے' گورڈن براؤن کی ایک ارب ڈالر کی تعلیمی امداد پر خوشی کے شادیانے بجارہے ہیں۔یہ امداد کیوں دی جارہی ہے؟ ایسی کیا خیر خواہی ہے کہ دنیا کا ہر ترقی یافتہ ملک پاکستان کو تعلیمی شعبے میں مدد دینے کے لیے تیار ہے؟ یو ایس ایڈ (US-AID) سے لے کر ڈی ایف آئی ڈی (DFID) تک سب اداروں کے ماہرین ہمیں علم سکھانے آرہے ہیں۔ان کے تعلیمی ماہرین ہمارے نصاب کی نوک پلک سنوار رہے ہیں اور O اور A لیول کے امتحانات کو منعقد کرواکے ایک راستہ کھول چکے ہیں کہ ان امتحانات کے بعد آئندہ تعلیم کے لیے جب کوئی ان کی امداد یا اپنی دولت سے آکسفورڈ' کیمبرج یا ہارورڈ جائے تو اس کے دماغ کی دیواروں پر وہی ماحول ایک متحرک فلم کی طرح چل رہا ہو اور وہ جیسے ہی لندن' بوسٹن' ہائیڈل برگ یا برکلے پہنچے تو اسے یوں لگے جیسے وہ ان خوابوں کی سرزمین پر آگیا ہے جو اس نے بچپن میں دیکھے تھے۔یہاں میں صرف O لیول اور A لیول کے کورس کی چند کتابوں کا ذکر کروں گا، ان کتابوں کا نہیں جو ان سکولوں اور کالجوں کی لائبریریوں میں ہزاروں کی تعداد میں پہنچادی گئی ہیں اور جن میں تحریر قصے' کہانیاں' کردار یا اخلاقیات کا ہماری سرزمین یا علاقے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔نصاب کی چند کتابیں اور ان کی جزئیات دیکھیں اور حیرت میں گم ہوجائیں کہ آپ کون سا زہر اپنی اولاد کی رگوں میں اتار رہے ہیں۔

A Christmas Carol: پوری کتاب کرسمس کے تہوار اور عقائد کے گرد گھومتی ہے۔وہی ماحول اور ویسی ہی رنگارنگی دکھائی گئی ہے جیسی مغرب میں ہوتی ہے۔اس کا مقصد یہ ہے کہ بچے اپنے آپ کو اس مذہب اور تہذیب سے علیحدہ محسوس نہ کریں بلکہ اسے خواب کی صورت اپنے ذہن پر نقش کرلیں۔

The Golden Touch: یہ لیول II میں پڑھائی جانے والی یونانی دیومالاؤں کے خداؤں کی داستانیں ہیں۔جس بچے کو اللہ کی وحدانیت اور رسول ﷺ کی سیرت پڑھنی چاہیے' اسے وینس اور کیوپڈ کے معاشقے پڑھائے جاتے ہیں۔

King Soleman's Mines: یہ کہانی جنسی تعلقات اور جنسی ناہمواری کے انیسویں صدی کے تصورات پر لکھی گئی ہے۔یہ مرد اور عورت کے چھپے ہوئے جسمانی خزانوں کی تلاش کی کہانی ہے۔اس میں مرد اور عورت کی جسمانی ہیئت کو انتہائی بے ہودہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔یہ کتاب لیول IV میں پڑھائی جاتی ہے۔

The Emperor's New Clothes and other Stories: اس کتاب میں موجودہ کہانی "The Kiss" اگر والدین پڑھ لیں تو حیرت اور شرم سے پانی پانی ہوجائیں۔

Treasure Island: یہ لیول I میں پڑھائی جانے والی کتاب ہے۔بحری قزاقوں کا ماحول دکھایا گیا ہے جس میں قزاق اپنے قانون رکھتے ہیں اور شراب کے نشے میں دھت رہتے ہیں۔

The Adventures of Sherlock Holmes: عشق ومحبت اور رسیلے جنسی جذبات سے نچڑی جاسوسی کہانیاں۔جو لوگ نسیم حجازی کے ناولوں میں محبت پر اعتراض کرتے ہیں اس جاسوس کی جنسی زندگی کس مزے سے پڑھا رہے ہوتے ہیں۔

Around the world in eighty days: یہ لیول III کی کتاب ہے۔اس کا ہیرو ایک شرط لگا کر دنیا کی سیر کو نکلتا ہے، جگہ جگہ شراب کے نشے میں دھت رہتا ہے اور ہر جگہ نئی محبت میں گرفتار۔

Just 50 stones: لیول I میں پڑھائی جانے والی گوری نسل کے تعصب کے لیے یہ مشہور مصنف رڈیارڈ کپلنگ کی تحریر ہے۔کتاب میں خدا کو ایک عظیم جادوگر دکھایا گیا ہے جس نے پہلے زمین بنائی پھر سمندر۔

Tales of King Arther: یہ بادشاہ کی ملکہ Guinevere کی ایک اجنبی سے خفیہ عشق کی داستان ہے۔

یہ چند کتابیں تھیں جو ہمارے انگلش میڈیم سکولوں میں پڑھائی جارہی ہیں۔ان کی طویل فہرست میں سے چند اور یہ ہیں۔

The brave little Tailor, The canterville ghost, Heroes and heroines, The golden ghost and stories, The gift and other stories, A mid summer night's dream, Great expectations.

ان تمام کہانیوں میں جو ماحول' کردار' اخلاقیات اور طرزِ زندگی ہے' وہ سب کا سب مغرب کا ہے' جو ان بچوں کے ذہنوں پر متحرک فلم کی طرح نقش کیا جارہا ہے۔اسی لیے جب وہ بڑے ہوتے ہیں تو انہیں نہ سرسوں کے کھیت اچھے لگتے ہیں اور نہ ہی اوپلوں والی دیواریں' انہیں دھوتی کرتا پہننے والا شخص جاہل نظر آتا ہے اور داڑھی والا شخص دہشت گرد۔انہیں اپنے ملک کے گلی محلوں سے بو آتی ہے۔انہیں یہاں کا ہر شخص بددیانت' چور' بداخلاق' بیہودہ اور تہذیب سے عاری لگتا ہے۔ان کی اخلاقیات میں کوئی شیخ عبدالقادر جیلانیؒ شامل نہیں جو ڈاکوؤں کے خوف میں بھی سچ کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا بلکہ وہ تو سنڈریلا پڑھتے ہیں جو ماں سے جھوٹ بول کر گھر سے نکلتی ہے۔یہ ہے اس ایک ارب ڈالر کی کہانی جو مغرب سے ہمیں امداد کی صورت مل رہا ہے۔یہ ہے اس ملک پر مغرب کی مہربانیوں کی داستان، یہ ہے اس زہر کا قصہ جو ہماری رگوں میں اتارا جارہا ہے۔لیکن برا ہو ہمارے مسلکی اختلاف کا کہ ہمیں ایران اور سعودی عرب کے پیسوں اور مدد پر شور مچانا آتا ہے، ہمارے مذہبی رہنما روز ٹیلی ویژن پر غصے سے تھوک اگل رہے ہوتے ہیں' لیکن انہیں اس سرمائے اور غیرملکی امداد کے خلاف بات کرنے کی فرصت نہیں جس سے ایک ایسی قوم تیار ہورہی ہے جسے ایک دن اذان کی آواز' مسجد کے مینار اور قرآن کی تلاوت بھی اجنبی لگے گی۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

عمران خان اغیار کے نرغے میں

گزشتہ ڈیڑھ سو سال کی تعلیمی تخریب نے مملکتِ خداداد پاکستان میں جس طرح کے نابغۂ روزگار ماہرینِ تعلیم اور ماہرین اقتصادیات و معاشرت کے ٹولے کو جنم دیا ہے اس نے ملک کے سیاسی رہنماؤں اور دیگر بڑوں کو اپنا اسیر کر رکھا ہے۔ مجھے یہی خطرہ عمران خان کے بارے میں تھا' لیکن ایک امید بھی تھی کہ اسی برصغیر سے ایک فرد علامہ اقبال یورپ کی وادیوں میں علم کے حصول کے لیے گئے لیکن جب واپس لوٹے تو مغربی تہذیب اور اس کی طرز تعلیم کے سب سے بڑے ناقد بن گئے۔ پوری مسلم دنیا میں جس سطح پر علامہ اقبال نے مغربی تہذیب اور تعلیمی و اقتصادی نظام کا علمی لحاظ سے بطلان کیا اور اپنی دلیل سے جس طرح اس کا رد کیا' کسی عالم دین، سیاست دان یا دانشور کو نصیب نہ ہو سکا۔ عمران خان تو اقبال کو اپنا مرشد مانتے تھے اور شاید اب بھی مانتے ہیں۔ وہ مغرب سے بھی مرعوب نہیں' لیکن پھر بھی انہوں نے صوبہ خیبر پختونخوا میں انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ ایسا فیصلہ تو دنیا میں بسنے والی جاہل، گنوار اور پسماندہ ترین قوموں نے بھی نہ کیا ہوگا۔ عمران خان کے اردگرد موجود کن لوگوں نے اس فیصلے کی راہ ہموار کی اور اس کے فوائد گنوائے۔

ان لوگوں پر بات کرنے سے پہلے ایک حقیقت بتاتا چلوں جس کا جواب عمران خان صاحب کے بڑے سے بڑے تعلیمی ماہر کے پاس بھی نہ ہوگا۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا کی پانچ ہزار سال کی تاریخ مرتب ہوئی ہے۔ اس سے پہلے والا ماقبلِ تاریخ کا زمانہ کہلاتا ہے۔ ان پانچ ہزار برسوں میں کوئی ایک قوم بھی ایسی نہیں جس نے کسی دوسرے کی زبان میں علم حاصل کیا ہو اور پھر ترقی بھی کی ہو۔ دو ملکوں نے یہ بے وقوفانہ حرکت کی' ایک تھا سنگاپور اور دوسرا کسی حد تک بھارت۔ سنگاپور تو گزشتہ پانچ برس سے سر پکڑ کر بیٹھا ہے کہ کس طرح ہم واپس اپنی زبان کی طرف لوٹ سکتے ہیں' کیونکہ ایک نقال قوم بن کر رہ گئے ہیں اور ہماری تخلیقی صلاحیت مردہ ہو گئی ہے۔ ادھر بھارت نے جس مخصوص (Elite) کلاس کو جنم دیا اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہر سال 22 کروڑ بچے سکولوں میں داخل ہوتے ہیں لیکن 40 لاکھ سے بھی کم گریجوایٹ بن کر باہر نکلتے ہیں۔ یہ چند لاکھ بھی عالمی منڈی کے لیے سجا سجایا مال ہوتے ہیں۔ ان کی طرح سوچنے، خواب دیکھنے اور انہی کی طرح کے لائف سٹائل اپنانے والے۔

پاکستان کے تمام سیاسی لیڈروں کے اردگرد منڈلانے والے دانشور اور ماہرین تعلیم و اقتصاد بھی ایسے ہی ہیں۔ اسی طرح کے لوگوں نے عمران خان کو بھی گھیر رکھا ہے۔ یہ لوگ سکول میں آنکھ کھولتے ہیں تو کتابوں، نرسری کی نظموں، کومکس، کارٹون اور کہانیوں میں جس زندگی کو اپنے ذہنوں پر نقش کرتے ہیں' وہ گلگت سے لے کر گوادر تک اس پاکستان میں کہیں نہیں ملتی۔ یہاں نہ کوئی سنڈریلا ہے اور نہ سنو وائٹ، نہ لٹل مرمیڈ ہے اور نہ سانتا کلاز۔ ان کو پڑھائی جانے والی کتابوں میں بنی تصاویر میں جو لباس ہے وہ یہاں کہیں نظر نہیں آتا۔ جو ان کی خاندانی اخلاقیات ہیں ان کا یہاں نام و نشان نہیں ملتا۔ یوں نرسری سے ہائی سکول یعنی او لیول تک ان لوگوں کے دماغوں میں خوابوں کا ایک جہان اور پریوں کا دیس بس جاتا ہے۔ دماغ کے پردے پر بنی ہوئی اس زمانے کی تصویریں انتہائی گہری ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان عظیم مفکروں، دانشوروں اور تعلیمی ماہرین کو اے لیول کے بعد جب بیرون ملک اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے تو وہاں پہنچتے ہی انہیں یوں لگتا ہے جیسے وہ خوابوں کے اس دیس میں آ گئے ہیں جسے انہوں نے نرسری، پرائمری اور او لیول کے زمانے میں اپنی درسی کتب میں پڑھا تھا اور جس کی خوبصورتیوں نے انہیں اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ ان میں سے اکثر اپنی تعلیم مکمل کر کے وہیں کے ہو رہتے ہیں۔ انہیں اپنے ملک کے لوگ جاہل اور فرسودہ لگتے ہیں، یہاں کا سسٹم اور ماحول بے کار اور یہاں کی گلیاں بدبودار۔ یہ ان ملکوں کے اداروں میں زندگیاں گزارتے ہیں اور پھر ایک دن یہ کسی سیاسی پارٹی کے مشیر بن کر اس ملک میں لوٹتے ہیں، کسی اعلیٰ حکومتی عہدے پر فائز ہو کر یہاں کے لوگوں کو مشورے دیتے ہیں۔ گزشتہ 66 برسوں سے اس ملک کے اعلیٰ سطح کے مشیر یہی لوگ رہے ہیں اور آج تک تعلیم، معیشت اور امن عامہ میں ان کی کارکردگی صفر رہی ہے' اس لیے کہ انہیں نہ اس ملک کے حالات سے آگاہی ہوتی ہے اور نہ یہاں کے لوگوں کے مسائل کا علم۔ آکسفورڈ، کیمبرج، ہارورڈ اور کولمبیا جیسے اداروں سے پڑھے ہوئے یہ لوگ ان سیاست دانوں کو ایسے مشورے دیتے ہیں جن کا دنیا کے کسی بھی ترقی یافتہ ملک کی ترقی سے کوئی واسطہ ہوتا ہے اور نہ ہی ہمارے ماحول سے کوئی تعلق۔ ان کے ساتھ اس ملک کی بیوروکریسی مل جاتی ہے جنہوں نے گزشتہ دو سو سال سے لوگوں پر صرف اور صرف انگریزی کے بل بوتے پر راج کیا۔ یہ وہ منافق گروہ ہے جو لوگوں سے اردو میں بات کرتا ہے۔ ان کی شکایات ان کی زبان میں سنتا ہے۔ ان کے درمیان جھگڑے، ساری بحثیں، عدالتی بیانات سب اسی زبان میں ہوتے ہیں جو وہاں کے لوگ بولتے ہیں۔ لیکن یہ جب لوگوں کو آرڈر، فیصلہ یا حکم نامہ پکڑاتے ہیں تو وہ انگریزی میں ہوتا ہے۔ یہ ہے وہ دوغلا پن جس نے اس بیوروکریسی کو لوگوں پر مسلط کر رکھا ہے۔ یہ ایک طبقہ ہے جس میں اس ملک کے سرمایہ دار، جاگیردار، بیوروکریٹ اور مغرب کے عشق میں گرفتار دانشور شامل ہیں۔ یہ ہر اس فرد پر اپنا تسلط قائم کر لیتے ہیں جو اس ملک میں فیصلہ سازی کا اختیار رکھتا ہے اور پھر یہ اس سے اپنی مرضی کے فیصلے کرواتے ہیں۔ عمران خان صاحب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ انہیں مغرب کی ہوائیں تو مرعوب نہ کر سکیں لیکن انہیں وہاں سے پڑھے ہوئے دانشوروں نے مرعوب کر لیا۔ کیا عمران خان نے ان ماہرین سے کبھی یہ سوال کیا کہ آئس لینڈ، فن لینڈ، بیلجیم، ناروے اور سویڈن جیسے ممالک' جن کی آبادی لاہور شہر سے بھی کم ہے، میں انگریزی میں تعلیم کیوں نہیں دی جاتی؟ کیا وہ ترقی نہیں کرنا چاہتے؟ نہیں، اس لیے کہ انہیں اس بات کا علم ہے کہ کسی دوسرے کی زبان میں علم آپ کی تخلیقی صلاحیتوں کو مردہ کر دیتا ہے۔ آپ کا طریقِ اظہار تیس فیصد سے بھی کم رہ جاتا ہے۔ آپ اپنے ملک، علاقے، ثقافت اور تہذیب سے کٹ جاتے ہیں اور آپ کی محبتوں کا محور ہی کچھ اور ہو جاتا ہے۔

عمران خان صاحب! دنیا کی پانچ ہزار سال کی تاریخ میں صرف دو مواقع ایسے ہیں جب ترقی ہوئی یا آپ کے لفظوں میں ''تبدیلی'' ہوئی۔ ایک عرب اور دوسرے انگریز۔ عربوں کے دامن میں علم، سائنس، فلسفہ، اقتصادیات نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ سات قصیدے تھے جو کعبے کی دیواروں پر لٹکائے گئے تھے' لیکن ان کے ہاں ایک جنون پیدا ہوا کہ دنیا بھر کا سارا علم اپنی زبان میں منتقل کرنا ہے۔ ترجمے ہوئے، اپنی زبان کا دامن علم سے مالا مال کیا اور پھر سات صدیاں مسلمانوں نے علم کی دنیا کی تخلیقی طور پر قیادت کی۔ یہی حال انگریزوں کا تھا۔ ان کے دامن میں بھی شیکسپیئر اور رومانی شعرا کے سوا کچھ نہ تھا' لیکن اُن میں دنیا بھر کے علوم کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کا جنون تھا۔ انہوں نے بھی دنیا کی ہر کتاب کو اپنی زبان میں منتقل کیا۔ پھر جب اس علم کو انہوں نے اپنی زبان، اپنے محاورے اور اپنے تلازمے سے پڑھا تو ایسی تخلیقی صلاحیتیں ان میں پیدا ہوئیں جن کی وجہ سے وہ آج تک علم کی دنیا پر راج کر رہے ہیں۔ آپ تو غلامی کی زنجیریں توڑنا چاہتے تھے، لیکن اب آپ کا یہ فیصلہ اس قوم کو ایسی زنجیریں پہنائے گا جو وہ خوشی خوشی پہن لے گی اور پھر صدیوں تک ناکارہ، نامراد، مایوس، اپنے ماضی سے برگشتہ، اپنے ماحول سے ناآشنا اور تخلیقی صلاحیتوں سے عاری بن کر زندہ رہے گی۔ کیا آپ یہ ''تبدیلی'' تحفے میں دیں گے اس قوم کو؟

allurdupdfnovels.blogspot.com

جمہوری آمریت کی بنیادیں

اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

وفاقی شرعی عدالت نے سود کو حرام قرار دیا تو 30 جون 1992ء کو اس وقت کی حکومت اللہ کے اس فرمان سے بھاگتے ہوئے' جسے شرعی عدالت نے نافذ کرنے کے لیے کہا تھا' سپریم کورٹ میں اپیل دائر کرنے چلی گئی۔ حکومتیں آتی اور جاتی رہیں لیکن سات سال سود کے حق میں حکومتی مؤقف قائم رہا۔ بے نظیر اور نواز شریف دونوں کی حکومتیں قرآن پاک میں اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سود کے خلاف اعلانِ جنگ کے باوجود انتہائی ''جرأت اور دلیری'' سے اپنے مؤقف کا دفاع کرتی رہیں۔ گیارہ سو صفحات پر مشتمل فیصلہ تحریر کرنے سے قبل سپریم کورٹ نے ایک سوالنامہ جاری کیا جس کا جواب سرتاج عزیز صاحب نے بھی جمع کرایا۔ ان جوابات کے بعد سپریم کورٹ کا ان کے خلاف فیصلہ حق کی فتح تھی، لیکن تکلیف دہ بات یہ ہے کہ جوابات دیتے ہوئے انہوں نے خود کو اٹھارہ کروڑ عوام کا ترجمان قرار دے دیا۔ یہی وہ تصور ہے جو اس پورے جمہوری نظام کی بنیاد ہے۔ ایک الیکشن کے بعد چار سو لوگ اس ملک کے سیاہ و سفید کے مالک بن جاتے ہیں۔ یہ چار سو ارکان پارلیمنٹ اپنے اندر یہ مضبوط تصور رکھتے ہیں کہ جو ان کی اکثریت یا ان کا پارٹی لیڈر سوچتا ہے وہی سوچ عوام کی ہے۔ وہ اگر امریکہ کی غلامی کرنا چاہتا ہے تو ساری قوم کی رائے بھی یہی ہے، وہ اگر بھارت سے دوستی چاہتا ہے تو اٹھارہ کروڑ عوام بھی اس کے لیے بے تاب ہیں۔ اسے اگر حجاب اور پردے سے نفرت ہے تو پوری قوم بھی اس ''فرسودہ'' چیز کو تسلیم نہیں کرتی۔ یہی وہ تصور ہے جو پوری دنیا کی جمہوریتوں میں راسخ کیا گیا ہے۔ چار سو لوگ منتخب ہونے کے بعد پوری قوم سے پوچھے بغیر انہیں اربوں ڈالر کا مقروض کر دیں، انہیں دوا اور تعلیم کی ضرورت ہو لیکن ان کے پیسے سے ائرپورٹ، موٹروے یا شاندار یادگاریں تعمیر کر دیں' آمرانہ مزاج کہ ہمیں عوام نے ووٹ دے کر منتخب کیا ہے تو پانچ سال تک ہم جو چاہے کریں' ہمیں اس کا مکمل اختیار ہے، نہ عدالت ہمارے اس اختیار میں مداخلت کر سکتی ہے اور نہ ہی عوام کا احتجاج ہمارے ارادوں کو بدل سکتا ہے۔ یہی وہ تصور تھا کہ سرتاج عزیز صاحب سے جب سپریم کورٹ نے یہ سوال کیا کہ ''حکومت اور اس کے زیر اثر ادارے پرائز بانڈوں اور سرٹیفیکیٹس کے ذریعے عوام سے قرض لیتے ہیں اور اس پر لوگوں کو لگا بندھا یعنی ''فکسڈ'' منافع دیتے ہیں۔ کیا یہ منافع سود کے زمرے میں نہیں آتا؟'' تو اس کے جواب میں سرتاج عزیز صاحب نے پہلے تو یہ کہا کہ چونکہ عوام محکوم ہیں اور حکومت حاکم، اس لیے عوام اس طرح کا منافع وصول کرتے ہوئے کوئی استحصال نہیں کرتے اور نہ ہی وہ اس قابل ہیں کہ کسی حکومت کا استحصال کر سکیں۔ سود کا اصل مقصد استحصال کرنا ہے جبکہ عوام کسی سود خور کی طرح حکومت کو نہ تنگ کر سکتے ہیں اور نہ ہی اس پر کوئی جبر کر سکتے ہیں، اس لیے یہ منافع سود نہیں ہے۔ یوں تو یہ منطق ہی کمال کی ہے لیکن وہ فقرہ جس سے جمہوری استبداد کا اظہار اور اٹھارہ کروڑ عوام کی توہین ہوتی ہے' وہ یہ ہے۔ میں یہ فقرہ انگریزی میں درج کر رہا ہوں کہ غلط فہمی نہ ہو (It would be difficult for the Government to borrow on Musharka or other Islamic modes, because most citizens who want to invest their savings in Government saving schemes on bonds, want a predetermined and fixed return) ''حکومت کے لیے مشکل ہے کہ وہ مشارکہ یا دیگر اسلامی طریقوں سے قرض حاصل کرے کیوں کہ شہریوں کی اکثریت' جو اپنی بچت حکومتی سکیموں یا بانڈز میں لگاتی ہے' پہلے سے طے شدہ لگا بندھا یعنی فکسڈ منافع حاصل کرنا چاہتی ہے'' یہ ہے وہ رائے جو انہوں نے اٹھارہ کروڑ عوام کی اکثریت کی بنیاد پر عدالت عالیہ میں دی تھی۔ ایسے کسی شخص سے اگر یہ سوال کیا جائے کہ آپ نے یہ رائے کیوں اور کیسے دی تو وہ سینہ پھلا کر کہے گا کہ عوام نے مجھے منتخب کیا ہے، ووٹ دیا ہے' اس لیے مجھے یہ اختیار جمہوری طور پر حاصل ہے کہ میں ان کی جس طور پر یا جس طرح چاہے ترجمانی کروں۔ اس ترجمانی کا مطلب یہ ہے کہ اس ملک میں وہ لوگ' جو اپنی بچت حکومتی سکیموں میں لگاتے ہیں' سب کے سب یا ان کی اکثریت سود کھانا اور اس پر اپنا گزر اوقات کرنا جائز خیال کرتی ہے۔ یہ اتنی بڑی رائے تھی جس کا علم ان لاکھوں افراد کو شاید آج تک نہ ہوا ہو جو ان سکیموں میں سرمایہ لگائے ہوئے ہیں اور جن کی اکثریت کے بارے میں سپریم کورٹ میں اس وقت کے وزیر خزانہ نے دو تہائی جمہوری مینڈیٹ کے بل بوتے پر کہہ دیا کہ یہ سب سود کھانا چاہتے ہیں اور کسی ایسی بچت سکیم میں حصہ لینا نہیں چاہتے جس میں نقصان کا اندیشہ بھی شامل ہو۔

جمہوریت، جمہوری اداروں اور جمہوری سیاست کی یہی معراج ہے کہ آپ ایک دفعہ الیکشن کروا دو اور پھر منتخب ہونے والے شخص کے منہ سے جو بھی نکلے گا وہ عوام کی مسلمہ رائے سمجھی جائے گی۔ آپ ان کے بیانات دیکھ لیں، آپ ان کی پارلیمنٹ میں گفتگو ملاحظہ کر لیں یا ٹیلی ویژن کے مذاکروں میں گفتگو، آپ کو ایسے ہی کمال کے دعوے سننے کو ملیں گے۔ ہمیں عوام نے ووٹ دیا ہے' ہمیں پتا ہے وہ کیا چاہتے ہیں۔ یہی وہ خمار ہے جس کی بنیاد پر یہ لوگ جیسا چاہے فیصلہ کر گزرتے ہیں۔ سیکولر سٹیٹ ماڈل اور جمہوری طریقِ کار کا ڈیزائن ہی اس طرح تیار کیا گیا ہے کہ اقتدار کے بھوکے تمام تر افراد کو دو یا تین سیاسی گروہوں میں تقسیم کر دیا جائے جنہیں سیاسی پارٹیاں کہا جاتا ہے۔ ان کا ایک ڈھیلا ڈھالا سا منشور بنایا جائے، جاذب نظر سیاسی لیڈر شپ کے سہانے خواب اور خوبصورت پیکر سے لوگوں کو دیوانہ بنایا جائے، پھر الیکشن کے چند دنوں یا مہینوں کو ایک میلے کے ماحول میں گزارا جائے اور اس کی چکا چوند کے لیے بے تحاشا سرمایہ خرچ کیا جائے۔ لوگوں کو یہ یقین دلا دیا جائے کہ وہی اصل حکمران ہیں، انہی کے ووٹ سے حکومتیں بدلتی ہیں اور لوگ تخت پر سرفراز ہوتے ہیں اور یوں پارٹی فنڈنگ کے ذریعے ہر پارٹی کی قیادت کو اپنے قبضے بلکہ شکنجے میں لیا جائے۔ ان کی سانس تک ان لوگوں کے قبضہ قدرت میں ہو جو انہیں سرمایہ فراہم کریں یا جو ان کے لیے میڈیا اور دھونس سے ووٹوں کی کھیپ لا کر دیں۔ جب یہ قیادت برسر اقتدار آ جائے تو پھر ان کی میزوں پر اپنا ایجنڈا رکھ دیا جائے۔ ایجنڈا چاہے سود کا ہو، حقوقِ نسواں، سیکولر اخلاقیات، عالمی قرضے، دہشت گردوں سے جنگ، مذہب کی ریاست سے علیحدگی، سیکولر نظام تعلیم، غرض جیسی فنڈنگ ویسی قیادت اور ویسے ہی یہ بیان کہ ہم یہ اس لیے کر رہے ہیں کہ ہمیں عوام نے منتخب کیا، ہم عوام کی آواز ہیں، جو ہم بولتے ہیں وہ عوام کی روح ہے، پارلیمنٹ سپریم ہے۔ دنیا کا کوئی قانون ہم سے بالاتر نہیں۔ اگر اللہ کا نازل کردہ قانون بھی پارلیمنٹ منظور نہیں کرتی تو اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اور آمریت کیا ہوتی ہے؟

allurdupdfnovels.blogspot.com

جانے کب بگل بج جائے

حرف راز
اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

جن لوگوں کو مختلف معاشروں میں تشدد اور ہیجان کی وجوہ کا ادراک نہ ہو، ان کے ہاتھ میں ساری دنیا کی فوجی طاقت بھی دے دی جائے تو وہ انہیں ختم نہیں کر سکتے۔ یہ لوگ تشدد کی ایک شاخ کاٹتے ہیں تو دوسری نکل آتی ہے، دوسری کاٹیں تو تیسری اور چوتھی ساتھ ہی پھوٹ پڑتی ہے؛ چنانچہ تنگ آ کر یہ پورے درخت کو ہی جڑ سے کاٹ دیتے ہیں۔ انہیں اس بات کا علم تک نہیں ہوتا کہ اس خوبصورت پھل دار درخت پر یہ زہر آلود شاخیں نکلنا کیسے شروع ہوئیں۔ ایسے لوگ نہ معاشروں کے اجتماعی کردار سے آشنا ہوتے ہیں اور نہ ہی انہوں نے تاریخ کے جھروکوں میں جھانک کر دیکھا ہوتا ہے کہ لٹھ مار اور پُرتشدد گروہ کب اور کیسے پیدا ہوئے اور انہوں نے معاشروں کو کیسے یرغمال بنایا۔ اس طرح کے کم علم لوگ جب مسندِ اقتدار پر براجمان ہو جاتے ہیں تو تباہی و بربادی ملک کا مقدر ہو جاتی ہے۔ تاریخ اس طرح کے المناک واقعات اور دردناک وحشت سے بھری ہوئی ہے' جس کے پس منظر میں کم و بیش ایک ہی طرح کے محرکات ہوتے ہیں' صرف ایک مثال وضاحت اور اربابِ اختیار کو راستہ دکھانے کے لیے کافی ہوگی۔

یورپ میں نشاۃِ ثانیہ کا خمار نیا نیا چڑھا تھا۔ مائیکل اینجلو جیسے بڑے مجسمہ ساز، رافیل جیسے مصور اور میکاوَلی جیسے مصنف اور فلسفی روم میں مذہب کا اثر و رسوخ توڑنے اور معاشرے پر اپنی آزاد اخلاقیات مسلط کرنے میں مصروف تھے۔ ان کی خوش قسمتی کہ انہیں فریڈرک سوئم کی شکل میں روم کا ایک سیکولر سربراہ میسر آ گیا۔ لیکن یہ سب کے سب روشن خیال لوگ اس بات سے ناآشنا تھے کہ صدیوں سے مذہب نے انسان کو اخلاقیات کا شعوری اور لاشعوری طور پر قائل کر رکھا ہوتا ہے اور وہ اسے اپنی تہذیب کا حصہ سمجھتا ہے۔ اس دور کا معاشرہ بھی ایسا ہی تھا، اس میں خاندانی زندگی کی اقدار، شرم و حیا اور عفت و عصمت کا تصور موجود تھا۔ ان لوگوں کے ہاں فحاشی، عریانی اور بے حیائی ناقابلِ قبول تھی۔ وہ اپنی معاشرتی زندگی میں کسی قسم کی جنسی آوارگی اور لذت پسندی کو جرم تصور کرتے تھے۔ لیکن نشاۃِ ثانیہ کے خمار نے جب حکومتی سرپرستی حاصل کی تو ادب اور آرٹ نے برہنگی اور بے حیائی کو فن کا درجہ دے دیا۔ یہ تصور اس قدر عام ہوا کہ کلیسا کی دیواریں اور چھتیں بھی مجسموں اور تصاویر سے منقش ہونے لگیں۔ رافیل کی مشہور پینٹنگ Dispute de Sacremento ایک شاہکار تصور کی گئی جس میں، آدم، ابراہیم، موسیٰ، داوٴد، پطرس اور پولس کے ساتھ افلاطون اپنی کامل ریاست کا نقشہ پیش کرتے نظر آتا ہے اور ساتھ ہی سقراط، ارسطو اور فیثاغورث بھی اپنے نظریات کا مصورانہ اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایسا کچھ عیسائیت میں داخل کیا گیا جو اس سے پہلے شجرِ ممنوعہ تھا۔ اقتدار کے غلبے اور کارڈینلوں کے وقتی مفادات نے عیسائیت کو رنگا رنگ مذہب میں بدل دیا' جس کی کوکھ سے ایک ایسی سیکولر اخلاقیات نکلی جو معاشرے کے لیے قابلِ قبول نہ تھی۔ مذہبی رہنما جلتے کڑھتے لیکن مصلحت سے کام لیتے اور لوگ اس زوال پر ماتم کرتے۔

ایسے میں 2 جنوری 1522ء کا دن آ گیا جب پہلی دفعہ کارڈینلوں نے ایک غیر اطالوی شخص ایڈریان کو پوپ منتخب کر لیا۔ ہالینڈ کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہونے والا یہ شخص عام زندگی میں بہت معتدل مزاج اور سادہ تھا لیکن مذہب کے معاملے میں قدیم نظریات رکھتا تھا۔ پوپ بنتے ہی اس نے اصطبل کے ایک سو گھوڑوں میں سے چار گھوڑے رکھے، سب ملازمین فارغ کر کے صرف دو ملازم رکھ لیے اور حکم دیا کہ اس کے گھر کا خرچہ ایک ڈیوکٹ سے زیادہ نہ ہو۔ اس کے نزدیک تمام مصور، شاعر، ادیب اور سنگ تراش ان جاہلوں جیسے عقائد رکھتے تھے جنہوں نے حضرت عیسیٰ کو جلاوطن کیا تھا۔ اس نے ایسے لوگوں کو کلیسا سے بے دخل کر دیا اور کارڈینلوں کی اقربا پروری اور رشوت خوری کا خاتمہ کر دیا۔ بادشاہ کی طرف سے کلیسا کے عہدیداروں کو خریدنے کے لیے مراعات دی جاتی تھیں، اس نے یہ سب منسوخ کر دیں۔ اس نے تمام تعیشات بھی ختم کرنے کا حکم دے دیا۔ یہ سب کچھ اس نے آٹھ دن کے اندر کر دکھایا۔ سب حکام اور پادری اس کے خوف سے تھر تھر کانپتے تھے لیکن عوام اس نئی تبدیلی کو اپنی اخلاقیات کے عین مطابق تصور کرتے تھے۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ اس کے دور میں برائی نے کچھ دن کے لیے سر چھپا لیا، حکام اور پادری اس کی موت کا انتظار کرنے لگے۔ وہ سیکولر انتہا پسند بھی' جنہوں نے مذہبی رہنماوٴں کو اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا' اب صرف ایڈریان کی موت کا انتظار کرتے تھے کیونکہ اس کی مخالفت کرنا رائے عامہ کی مخالفت تھی۔ ایڈریان صرف بیس ماہ گزارنے کے بعد 14 ستمبر 1523ء کو انتقال کر گیا اور مرنے سے پہلے اپنی جائیداد غریبوں میں تقسیم کر دی۔

اس کی موت نے پورے روم کے سیکولر حلقوں میں ایک جشن کا سماں پیدا کر دیا۔ اسے ایک نفرت کی علامت بنا کر پیش کیا جانے لگا۔ عریانی، فحاشی، رشوت و اقربا پروری کا دور واپس لوٹ آیا۔ اس کے جانشین گلیوڈی میڈیچی نے وہ سب کچھ پھر سے عام کر دیا۔ ادب، آرٹ اور فن کے نام پر جنسی لذت پسندی رواج پانے لگی۔ لوگوں کا غصہ دیدنی تھا۔ 1526ء کی مقدس جمعرات جب سینٹ پیٹرز کے سامنے پوپ نے اپنا درشن کروایا تو ایک انتہا پسند سینٹ پال کے مجسمے پر چڑھا اور چلا کر بولا: ''اے سدوم کے حرامی، تیرے گناہوں کی وجہ سے روم برباد ہوگا۔ توبہ کر، اگر توبہ نہ کی تو چودہ دن کے اندر اندر تو خود دیکھ لے گا''۔ ایسٹر کی شام کو ایک مست جوگی جسے برانڈانو کہتے تھے، رات کے اندھیرے میں آواز لگاتا رہا، اے روم! کفارہ ادا کرو ورنہ خدا تم سے وہ سلوک کرے گا جو اس نے آلِ سدوم سے کیا تھا۔ تعیش پسند طبقے نے اسے دیوانے کی بڑ سمجھا اور اپنے عیش و عشرت، ادب، آرٹ اور فن میں مصروف رہا۔

لوگ اس روشن خیالی کو اپنی اخلاقیات پر حملہ تصور کرتے تھے لیکن ان کا بس نہیں چلتا تھا۔ وہ متحد ہونے لگے، ان میں سے کتنے ایسے تھے جو طاقت سے یہ سب روکنا چاہتے تھے۔ یہ سب ایک علاقے بوربون کے ڈیوک چارلس کے پاس جمع ہو گئے۔ 6 مئی کو بائیس ہزار بھوکے شدت پسندوں کا ایک ہجوم شہر میں داخل ہو گیا۔ انہوں نے راستے میں موجود ہر عورت، مرد، بوڑھے اور بچے کو قتل کیا۔ ان کا غصہ اس قدر تھا کہ وہ سانتو پریٹو کے ہسپتالوں اور یتیم خانوں میں گھس گئے اور ہر مریض اور یتیم کو قتل کر دیا۔ ہر اس بشپ، پادری، راہب کو قتل کیا جو اس نئی اخلاقیات کا حامی تھا۔ سینٹ پیٹرز اور ویٹیکن کی ایک ایک چیز لوٹ لی گئی۔ ہر بڑے محل نما گھرانے نے تحفظ کے لیے بڑی رقم ادا کی۔ جو کہتا میرے پاس کم رقم ہے اس کے بچوں کو اٹھا کر چھت سے پھینک دیا جاتا۔ ہر گھر کو لوٹا گیا، بہت سوں کو آگ لگائی گئی، عصمتیں لوٹی گئیں۔ آٹھ دن تک یہ خون آشامی چلتی رہی اور روم راکھ ہو گیا۔ نہ وہ مذہبی پیشوا بچے جو صدیوں پرانے اخلاقی تصور کے برعکس نئی سیکولر اخلاقیات نافذ کرنے کے لیے حکومت کے ساتھ ہو گئے تھے اور نہ وہ لوگ جنہوں نے اپنی زندگیوں میں ادب، فن اور آرٹ کے نام پر بے راہ روی اور عریانی و فحاشی کو عام کیا۔

لٹھ مار گروہوں کے معاشرے میں جنم لینے کی یہ صرف ایک مثال نہیں بلکہ تاریخ ایسی ہزاروں مثالیں پیش کرتی ہے اور شاید آنے والا مورخ پاکستان کی مثال کو بھی اسی طرح اپنی کتابوں میں عبرت کے طور پر درج کر رہا ہوگا کہ کیسے مدتوں ایک اخلاقی زندگی کے اصولوں پر تھوڑا بہت عمل پیرا معاشرے پر پرویز مشرف نے زبردستی اپنی سیکولر اخلاقیات نافذ کرنے کی کوشش کی۔ ادب، فن اور آرٹ کے نام پر وہ سب کچھ عام کیا جو یہاں ناگوار سمجھا جاتا تھا۔ نصاب میں تبدیلیوں سے لے کر سافٹ امیج کے نام پر ہر اس اخلاقی قدر کا چہرہ مسخ کرنے کی کوشش کی جس سے لوگ محبت کرتے تھے۔ آزادیِ اظہار کے نام پر دل آزاری اور علم کے نام پر مغربی تہذیب کو فروغ دیا گیا۔ اکا دکا کسی شہر میں کیسٹ جلانے کے واقعات ہوئے تو ٹینک اور توپ خانہ مساجد پر چڑھ دوڑا۔ ایسے میں درویش صدا لگاتے رہے کہ توبہ کرو ورنہ عذاب تم کو گھیر لے گا۔ روم کے شہر کے گرد تو بیس ہزار بھوکوں کا لشکر جمع ہوا تھا، ہم نے ہر گلی محلے اور شہر میں ایسے لشکر پیدا کر لیے ہیں۔ اب صرف تماشا شروع ہونے کے لیے بگل بجنے کا انتظار ہے۔ کب کس طرف سے بگل بج جائے اور ہم یہ سوچتے رہ جائیں کہ ایسے اچانک کیسے ہو گیا!

allurdupdfnovels.blogspot.com

دنیا

حرف راز
اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

جاپان کی ترقی اور عالمی تنہائی کا دور

دنیا کے مسلمہ تاریخی اور ثقافتی مراکز سے بہت دور اور عالمی انسانی ورثے سے ناآشنا جاپان کی سرزمین صدیوں تک یونان کے فلسفیوں' بابل و نینوا کے اصول حکمرانی' مصر کے ماہرین تعمیرات' روم کے انداز بادشاہی' ایران کی شعری روایت اور ہند کی دیو مالا سے ناآشنا رہی۔ علوم انسانی کی تاریخ مرتب کرنے والے بھی اس خطے کا ذکر نہیں کرتے۔ جنگ عظیم دوم میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر امریکی ایٹمی جارحیت' ذلت آمیز شکست اور پھر امریکیوں کی اس ملک پر ثقافتی اور معاشی یلغار اور پوری دنیا میں کارپوریٹ کلچر کی دھماچوکڑی کے باعث اس ملک کو تہذیبی' اخلاقی اور معاشرتی لحاظ سے مغربی تہذیب کا پرتو ہو جانا چاہیے تھا' لیکن ٹوکیو جیسے جدید ترین شہر میں گھومتے' دنیا کی تیزترین بلٹ ٹرین پر سفر کرتے' "اویاما" کے دیہی علاقوں میں گھومتے اور نگانو کے پہاڑی برف پوش سلسلوں میں موجود آبادیوں کو دیکھتے ہوئے میری حیرت کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا... شرم و حجاب' اخلاق' مروت' ادب و احترام' صبر و برداشت' شائستگی و نرم خوئی' غرض کون سی ایسی خوبی تھی جو اس قوم کے ہر فرد میں بدرجۂ اتم نہ پائی جاتی ہو۔ نفرت و تعصب تو اس قوم میں عالمی دہشت گردی کے خلاف دس سالہ جنگ بھی پیدا نہ کر سکی۔ پورے ملک میں دس ہزار پاکستانی ہیں' لیکن یہ واحد ملک ہے جہاں ان دس ہزار افراد کو کبھی دوسرے درجے کا شہری ہونے کا احساس نہیں ہوا۔ جن پاکستانیوں کی جاپانی عورتوں سے شادیاں ہوئیں' انہیں وفا شعار' خدمت گزار اور گھر کو سکون کا گہوارہ بنانے والی ایسی بیویاں ملیں اور وہ ان کے مذہب میں ایسے داخل ہوئیں کہ اسے اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ ان میں ایسی بھی تھیں کہ اپنے بچوں کو لے کر پاکستان میں اپنے سسرال جا بسیں کہ ان کی تعلیم میں اسلامی اقدار کی کمی نہ رہ جائے۔ امریکی تو جہاں گئے اس ملک کو قحبہ خانہ بنا کر نکلے۔ ویت نام' لاؤس' کمبوڈیا' کوریا اور تھائی لینڈ کے تعیش کے بازار انہی امریکیوں نے آباد کیے۔ فلپائن میں ان کی فوج کی ایک پوری یونٹ "آرمی ویلفیئر" کے نام پر دیہات سے نوجوان لڑکیاں اکٹھا کرتی اور منیلا کے بازاروں میں لا بٹھاتی تھی۔ دوسری جانب انگریزی ذریعہ تعلیم اور انگریزی تہذیب نے ان معاشروں میں جہاں اخلاق اقدار بگاڑیں وہیں انہیں ایک غیر تخلیقی اور نقال قوم بنا کر رکھ دیا۔ صرف ملٹی نیشنل کمپنیوں کے لیے سستے مزدور فراہم کرنا ان کا مقصد بن گیا' جسے آج کے دور میں خوبصورت لفظ "بیرونی سرمایہ کاری" سے یاد کیا جاتا ہے۔ کسی بھی ملک میں سستے اور غلام صفت مزدوروں کی فیکٹریوں میں بھرتی کو ملازمت کے مواقع اور بیرونی سرمایہ کاری جیسے خوش کن لفظوں سے قوموں کو فریب دیا جاتا ہے۔ یہ سب جاپان میں کیوں نہ ہو سکا؟ یہ سب نہیں ہوا' پھر بھی پوری دنیا کی معیشت پر جاپان کیونکر چھایا ہوا ہے؟

یہ سوال ہر دوسرے لمحے میرے سامنے آ کھڑا ہوتا۔ دنیا میں ترقی کے تمام معیارات پر جاپان ایک عظیم ملک ہے' لیکن کس قدر مختلف۔ یہ اتنی بڑی شکست اور بدترین امریکی غلامی کے بعد اتنی جلدی ترقی کیسے کر گیا؟ اس سوال کا جواب جاپانی تاریخ کے 1614ء سے 1854ء تک کے 214 سالوں میں موجود ہے۔ اس دور کو جاپانی تاریخ میں ساکوک "SAK OKU" کہتے ہیں جس کا مطلب ہے پوری دنیا میں علیحدگی اختیار کرنا۔ یہ وہ دور تھا جب دنیا کے کئی ملکوں میں یورپی طاقتیں کبھی کاروبار اور کبھی تبلیغ کے نام پر داخل ہو کر ان پر قبضہ جما رہی تھیں۔ ان میں ہسپانوی' ولندیزی' پرتگیز' انگریز اور فرانسیسی شامل تھے۔ ہوا یوں کہ 1604ء میں جاپان میں غیر ملکی تاجروں کی آمد کا اعلان ہوا۔ 1609ء میں ہالینڈ کے تاجروں کو اجازت نامہ دیا گیا۔ ان تاجروں نے شوگن بادشاہوں پر یہ راز کھولا کہ سپین اور پرتگال جاپان پر حملے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ ایسا انہوں نے بادشاہ کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے کیا' لیکن بادشاہ نے ان کی تجارت ناگاساکی تک محدود کر دی اور 1613ء میں برطانیہ کو بھی ناگاساکی میں تجارت کی اجازت دے دی۔ یہ سب تجارت کے ساتھ ساتھ عیسائیت کی تبلیغ بھی کرتے اور سادہ لوح جاپانیوں کو عیسائیت کے روپ میں یورپ کے مرکز میں پاپائے روم کے وفادار بناتے۔ ان کی انہی حرکتوں کی وجہ سے 1597ء میں ناگاساکی میں 26 پادریوں کو سزائے موت دی گئی۔ سپین' پرتگال اور ہالینڈ کے تاجر بھی تجارت کے ساتھ عیسائیت کے پرچار میں لگے رہے۔ یوں 1633ء میں جاپان نے سب سے پہلے اپنے لوگوں کے باہر جانے پر پابندی لگائی' پھر 1635ء میں وہ جاپانی جو کافی عرصہ دوسرے ملکوں میں آباد رہے تھے ان پر جاپان میں واپسی پر پابندی لگا دی۔ اب وہ مقامی آبادی جن کی وفاداریاں جاپان کی بجائے یورپ کے پاپائے روم سے وابستہ ہو گئی تھیں ان کے خلاف مہم کا آغاز کیا گیا اور شیمابارا میں تیس ہزار عیسائیوں کو قتل کر دیا گیا۔ 1641ء تک دنیا بھر کے تمام ممالک کی تجارتی گودیاں بند کر دی گئیں۔ اب جاپان تھا اور اس کا اپنے وسائل پر انحصار۔ یہاں سے ایک خودمختار اور خوددار قوم نے جنم لیا۔

ایک ایسی نفسیات پیدا ہوئی کہ پوری دنیا سے علیحدہ رہ کر بھی عزت و وقار کے ساتھ زندہ رہا جا سکتا ہے اور اپنی اقدار کا تحفظ بھی کیا جا سکتا ہے۔ جاپان کی زرعی زمینوں میں اضافہ ہوا اور چپے چپے پر صنعت و حرفت کا جال بچھ گیا۔ ماہی گیری اور نمک کی صنعت پروان چڑھی۔ ٹوکیو شہر دنیا کی گنجان آبادی والا شہر بن گیا۔ ہر علاقہ ایک خاص شعبے کے لیے مخصوص ہو گیا۔ اوساکا جاپان کا باورچی خانہ کہلانے لگا' کوتو آرٹسٹوں کا مرکز بن گیا۔ اس دور میں جاپان کے لوگوں میں دو صفات پیدا ہوئیں... ایک مسلسل اور مستقل محنت' دوسری سادگی و کفایت شعاری۔ یہاں ایک فلسفۂ حیات "بشیدو" (Bushido) نے جنم لیا جس میں وفاداری' کسی کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچانا اور کوئی ایسا کام نہ کرنا جس سے شرمندگی اٹھانی پڑے' کو فروغ ملا۔ یہ تمام صفات آج بھی جاپانی قوم میں پائی جاتی ہیں۔ وفاداری آج بھی ان کی اولین صفت ہے۔ اگر آج بھی کوئی بے وفائی یا دھوکے کا مجرم قرار پائے تو وہ سب کے سامنے اپنی انگلی کاٹ کر اپنے شوہر' بیوی' دوست یا مالک کو پیش کرتا ہے۔ کسی پارٹی یا گروپ سے بے وفائی ثابت ہو تو اسے ایک خنجر پکڑا دیا جاتا ہے اور وہ اس خنجر سے اپنا پیٹ چاک کرتا اور موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔

جاپانی قوم نہ انگریزی سے واقف ہے اور نہ ہی انگریزی ذریعہ تعلیم سے لیکن اس کی یونیورسٹیاں عالمی معیار کی ہیں۔ گزشتہ پندرہ سال سے تھوڑے بہت بورڈ انگریزی میں لکھے جانے لگے ہیں ورنہ سب کچھ جاپانی میں تھا۔ جاپان کا دنیا بھر کی تجارت میں ایک کثیر حصہ ہے اور ان کا دعویٰ ہے کہ دنیا کا کوئی گھر ایسا نہیں جہاں ان کی کوئی ایک چیز موجود نہ ہو خواہ وہ ایک آڈیو کیسٹ ہی کیوں نہ ہو۔ ٹوکیو کے بلند و بالا سکائی ٹری ٹاور پر کھڑے ٹوکیو شہر کی وسعت کو دیکھتے میں سوچ رہا تھا کہ اگر جاپان پر یہ 214 سال تنہائی کے نہ گزرتے تو ان کے ہاں بھی ایسے ہی دانشور' تجزیہ نگار اور مغرب زدہ عالم جنم لیتے جو انہیں ترقی کا ایسا راستہ دکھاتے جو انگریزی اور یورپ کی تہذیب سے ہو کر گزرتا اور جاپانی قوم آج اسی ذلت و رسوائی اور غربت و افلاس میں ہوتی جیسی ایسی تمام قومیں ہیں جنہوں نے مغرب کی تقلید میں اپنا سب کچھ گنوا دیا۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

جہلِ مرکب

جہل مرکب یا جہالت عربی زبان میں ایسی کیفیت کو نہیں کہتے جس میں آدمی مطلقاً بے علم ہو بلکہ جہالت ایک ایسی ذہنی حالت ہے کہ آدمی اپنے علم کو حتمی اور آخری سمجھے اور پھر اس کے حق میں جائز اور ناجائز دلیلیں ڈھونڈتا پھرے اور اس کے مخالف ہر علم اور ہر حقیقت کو رد کرتا رہے۔ اس کی مثال سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے یوں واضح ہوتی ہے کہ عمرو بن ہشام مکہ میں اس قدر صاحب علم و عقل و دانش تھا کہ اسے مکے کے لوگ ابوالحکم یعنی ''دانائی کا باپ'' پکارتے تھے، لیکن اپنے اس علم پر ہٹ دھرمی اور اللہ کے اتارے ہوئے علم اور دانائی یعنی حکمت سے انکار پر اسے ابوجہل کہا گیا جس کا مطلب ہے ''جہالت کا باپ''۔ یہ رویہ ہمارے دائیں اور بائیں بازو کے دانشوروں اور سیکولرازم کے دعویداروں میں بلاتخصیص پایا جاتا ہے۔ ایک رویہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کسی نظریے کو بلا دلیل جذباتی طور پر مان لے۔ مذہب کے بارے میں یہ عمومی رویہ ہے اور مدتوں کمیونزم کے بارے میں بھی اکثریت کا یہی طور تھا، لیکن بدترین رویہ یہ ہوتا کہ حقائق کے برعکس ایسی دلیلیں ڈھونڈی جائیں یا کھینچ تان کر تخلیق کی جائیں جس سے ایک عام علمی استعداد کا آدمی گمراہ ہو سکے۔ طویل عرصہ سے قومی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے حق میں جو تاریخ کے ورق میں نے الٹے اور دنیا کے ہر مہذب اور ترقی یافتہ ملک سے مثالیں پیش کیں، اس کے مقابلے میں سب سے مضبوط دلیل یہ دی جاتی رہی ہے کہ ہم عالمی برادری سے کٹ جائیں گے۔ میرے بہت ہی قریبی دوست کے فرزند اور میرے بہت پیارے عزیز نے ایسے دلائل دیے جس نے مجھے ایک عام پڑھنے والے کی درستی اور موصوف کی خودساختہ منطق کی اصلاح کے لیے جواب لکھنے پر مجبور کر دیا۔

جہاں تک پانچ ہزار سال کی تاریخ پر مبنی اس دعوے کا تعلق ہے کہ کوئی ایک قوم ایسی نہیں؛ جس نے کسی دوسرے کی زبان میں علم حاصل کیا ہو اور ترقی کی ہو، یہ بھی کہا گیا کہ ساری تاریخ کا احاطہ کیسے کیا گیا؟ تو دنیا میں ٹائن بی سے لے کر ول ڈیورانٹ تک بہت سے ایسے مورخ مل جائیں گے جنہوں نے دنیا کی تاریخ مرتب کی اور اس دعوے کی تصدیق ممکن ہے۔ غیر ملکی زبان میں تعلیم کا رواج نوآبادیاتی طاقتوں سپین، برطانیہ اور فرانس نے شروع کیا۔ فلپائن سے لے کر برصغیر، افریقہ اور جنوبی امریکہ کے ممالک اس کے گواہ ہیں جو موجودہ دنیا میں علم کے میدان میں پسماندگی کی علامت ہیں۔ جب انگریزوں نے ترقی کی منازل طے کرنا شروع کیں تو دنیا کا سارا علم عربی میں موجود تھا اور ہر بڑا صاحب علم اور سائنس دان اسی زبان میں کتابیں تحریر کر رہا تھا۔ ایک آسان طریقہ یہ تھا کہ عربی کو برطانیہ کے سکولوں میں پڑھایا جاتا اور ایک نقال اور غیر تخلیقی قوم پروان چڑھائی جاتی، لیکن ایسا نہیں کیا گیا بلکہ دنیا بھر کی لاکھوں کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا گیا اور یہ سلسلہ عربی تک محدود نہ رکھا گیا بلکہ، فرانسیسی، سنسکرت، ہسپانوی اور دیگر زبانوں میں جہاں سے بھی علم ملا اسے اپنی زبان میں ترجمہ کر کے پوری قوم کے لیے علم اکٹھا کیا گیا۔ جب یورپ میں تحریک احیائے علوم شروع ہوئی تو ہر قوم نے ترجمے سے اپنی زبان کا دامن مالا مال کیا۔ یورپ کے ہر مدرسے میں عربی زبان لازمی مضمون کے طور پڑھائی جاتی تھی تاکہ عربی میں موجود علم کو سمجھا جا سکے، لیکن کسی قوم نے بھی ذریعہ تعلیم عربی نہیں بنایا۔ چند لاکھ کی آبادی والے ملک بھی آج تک اس کلیے پر قائم ہیں اور اپنی ہی زبان میں ابتدائی سے لے کر اعلیٰ تعلیم دلواتے ہیں۔ کبھی کسی نے یہ دلیل نہیں دی کہ انگریزی زبان نہیں پڑھنی چاہیے، دلیل یہ دی جاتی ہے کہ انگریزی ذریعہ تعلیم نہیں ہونا چاہیے اس لیے کہ ایک انگریز بچہ چند گھنٹے انگریزی میں تعلیم حاصل کرتا ہے تو باقی بیس گھنٹے ذاتی زندگی میں بھی انگریزی ہی بولتا ہے۔ وہ سیاست، محبت، معاشرت سب انگریزی میں کرتا ہے اس لیے اس کا محاورہ ویسا ہی بن جاتا ہے اور ذریعہ اظہار بھی۔ لیکن یہاں پانچ گھنٹے بچہ سکول میں انگریزی پڑھتا ہے اور انیس گھنٹے اپنی زبان میں بولتا اور سنتا ہے، ویسے ہی جیسے ایک کالم نگار انگریزی کی تعریف میں رطب اللسان ہیں لیکن کالم اُردو میں لکھتے ہیں۔ اگر انگریزی اتنی موثر ہوتی تو ذریعہ اظہار بھی اسے ہی بناتے۔ دوسری دلیل یہ دی جاتی ہے اگر ہم اپنی زبان میں علم حاصل کرتے رہتے تو کیا یہاں بڑے بڑے سائنس دان پیدا ہو جاتے۔ موصوف کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ انہوں نے جن عظیم سائنس دانوں کا ذکر کیا، وہ تمام انگریزی زبان میں نہیں لکھتے تھے بلکہ انہوں نے علم اپنی زبان میں ہی حاصل کیا تھا اور کتابیں بھی اپنی زبان میں تحریر کیں۔ ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ البرٹ آئن سٹائن نے تعلیم جرمن زبان میں حاصل کی، کارل مارکس کی تحریریں بھی جرمن زبان میں تھیں، سگمنڈ فرائڈ نے بھی علم جرمن زبان میں حاصل کیا۔ نیوٹن اور ڈارون چونکہ انگریز گھرانے میں پیدا ہوتے تھے؛ اس لیے انہوں نے تعلیم مادری زبان انگریزی میں حاصل کی۔ میں دنیا کے ہزاروں سائنس دانوں کے نام پیش کر سکتا ہوں جو دنیا کے افق پر چھائے مگر وہ انگریزی زبان سے نابلد تھے، لیکن کیا کیا جائے کہ لوگ ان کا نام انگریزی میں پڑھنے کے بعد یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب انگریز تھے۔ اگر یورپ، چین، جاپان نے انگریزی زبان کو بطور ذریعہ تعلیم اختیار کیا ہوتا تو آج ان کے 'لیے' اور 'آیوب' سے بھی کوئی آئن سٹائن پیدا نہ ہوا ہوتا۔

ایک اور مثال دی گئی کہ جاپان میں ایک ہی زبان اور ثقافت ہے۔ دنیا کا کوئی ملک ایک زبان اور ثقافت کا ملک نہیں، ہر ملک میں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ صدیوں سے معمول ہے کہ ایک زبان ہمیشہ رابطہ کی زبان بن جاتی ہے اور اسی میں علم کا ذخیرہ آ جاتا ہے۔ جاپان کے معاشرے میں بھی Ruyakyvan اور Okinwan زبانیں ہیں اور صدیوں سے وہاں قدیم چینی Kanbun کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہے، لیکن جاپانی زبان نے قومی زبان کا مقام حاصل کیا۔ ایران میں فارسی صرف 47 فیصد لوگوں کی مادری زبان ہے لیکن وہاں کا علم اور ادب فارسی میں ہے اور رابطے کی زبان بھی وہی ہے۔ جب سے ایران نے فارسی میں تعلیم کا فیصلہ کیا ہر سال وہاں سے ایک شخص نوبل پرائز کے لیے سائنس کی دنیا میں نامزد ضرور ہوتا ہے۔ ایک اور مضحکہ خیز بات یہ کی گئی کہ اس وقت دنیا میں سائنس اور علم کی جو اصطلاحات ہیں انہیں ترجمہ کر کے دکھا دیں۔ اسے جہل مرکب کہتے ہیں۔ اس وقت قانون، طب، فزکس اور کیمسٹری کی اصطلاحات لاطینی (Latin) اور فرانسیسی زبان سے لی گئی ہیں، کسی نے ان کا ترجمہ نہیں کیا بلکہ ان کو اپنی زبان میں سمو لیا۔ میری گزارش ہے کہ درج ذیل قانونی اصطلاحات کا انگریزی میں ترجمہ کر کے دکھائیں جو آج بھی انگریزی قانون کا حصہ ہیں: "Pelo dese", "De jure", "De facto", "Versus", "ipsofacto", "Prima-facia" وغیرہ۔ ایسے ہزاروں الفاظ دنیا کی ہر زبان خصوصاً ان کی محبوب انگریزی میں موجود ہیں اور روزمرہ زندگی کا حصہ ہیں؛ البتہ انگریز وہ بددیانت تھا کہ اس نے علم تو مسلمانوں سے حاصل کیا لیکن ان مسلمانوں کے نام انگریزی زبان میں بگاڑ دیے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ یہ سب لوگ پیدائشی انگریز تھے... جیسے بوعلی سینا کو Avicena کہا گیا۔ اگر ہم اپنے بچوں کو ملکہ وکٹوریہ کی جگہ 'مائی وکی' پڑھانا شروع کر دیں تو کیسا لگے گا۔ آخری دلیل سرسید اور علامہ اقبال کی دی گئی کہ ان دونوں کی سوانح عمریاں غور سے پڑھ لیں، سرسید نے عربی، فارسی، قرآن و حدیث، فقہ اور دیگر علوم اپنے استاد حمیدالدین سے سیکھے، وہ کسی انگریزی مدرسے میں نہیں پڑھے۔ انہوں نے اپنے بھائی سے مل کر پہلا اُردو پرنٹنگ پریس لگایا اور ''سید الاکبر'' رسالہ نکالا۔ اقبال کی تعلیم تو مولوی میر حسن کے ہاتھوں ہوئی اور ان کا یہ اعتراف ہی کافی ہے کہ جب تک میر حسن کو شمس العلماء کا خطاب نہیں دیا جائے گا وہ سر کا خطاب نہیں لیں گے۔ سرسید کے مدرسے کے حالی، شبلی اور ڈپٹی نذیر احمد کس انگریزی سکول سے پڑھے تھے؟ ڈپٹی نذیر احمد کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے پورے انگریزی قانون کا اُردو میں ترجمہ کیا اور ضابطہ فوجداری اور ضابطہ دیوانی مدتوں عوام کی سہولت کے لیے موجود رہا اور موجودہ انگلش میڈیم کے جنون سے پہلے عدالتوں میں عرضی نویس اُردو میں درخواستیں لکھتے اور ریڈر اُردو میں فیصلے تحریر کرتے تھے۔ جہاں تک سرکاری افسروں کی زبان انگریزی ہونے کا تعلق ہے، ہمارا المیہ ہی یہ ہے کہ فوج اور بیوروکریسی غلط انگریزی لکھیں اور بولیں گے لیکن اُردو میں لکھنے میں شرمندگی محسوس کریں گے؛ اس لیے کہ ان کو اُردو سے شرمندہ کرنے کے لیے ایسے بہت سے دانشور موجود ہیں جو انگریزی میں علم حاصل کرنے کا درس دیتے ہیں اور کالم اُردو میں لکھتے ہیں، ٹی وی کے ٹاک شو میں بھی انگریزی نہیں اُردو بولتے ہیں اور عام زندگی میں بھی اسے ہی اپناتے ہیں۔ البتہ پوری قوم کو شرمندہ کرنے کا کوئی موقع ضائع نہیں جانے دیتے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

جھوٹ' فراڈ اور دھوکے کا کاروبار

اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

نوے کی دہائی کا آغاز تھا۔ گجرات سے جنم لینے والا نیشنل انڈسٹریل کوآپریٹو بینک اپنی پوری آب و تاب سے چل رہا تھا۔ اچانک شہر میں افواہ پھیلی کہ بینک بند ہو رہا ہے۔ صبح سویرے اس بینک کی برانچوں کے باہر لوگوں کی لائنیں لگی ہوئی تھیں جو اپنی رقوم نکالنا چاہتے تھے۔ چند ایک چیک تو کیش ہوئے پھر بہانے شروع ہو گئے...... کیش منگوایا ہے' ابھی آتا ہی ہو گا' ہیڈ کوارٹر سے وین چل پڑی ہے۔ گیارہ بجے تک ملازمین بینک کو تالا لگا کر بھاگ گئے۔ یہ صرف ایک شہر میں پھیلی ہوئی چھوٹی سی افواہ کا نتیجہ تھا۔ لوگ صرف بینک سے اپنے کاغذ کے نوٹ مانگ رہے تھے لیکن دھوکے باز' جھوٹی اور فراڈ پر مبنی سودی بینکاری کی اوقات یہ تھی کہ صرف دو گھنٹے میں یہ عمارت زمین بوس ہو گئی۔ ابھی تو نوبت کاغذ کے نوٹوں تک پہنچی تھی جس پر یہ عبارت تحریر ہوتی ہے: ''بینک دولت پاکستان ایک سو روپیہ' حاملِ ہٰذا کو مطالبہ پر ادا کرے گا۔ حکومت پاکستان کی ضمانت سے جاری ہوا''۔ اس عبارت کے نیچے گورنر سٹیٹ بینک کے دستخط ثبت ہوتے ہیں۔ یعنی یہ ایک رسید ہے' ایک وعدہ ہے' ایک حلف نامہ ہے کہ اس کے بدلے میں جب اور جس وقت رسید کا حامل سونا' چاندی' اجناس یا جو چیز طلب کرے حکومتِ پاکستان اس کو ادا کرے گی۔ اس وقت ملک میں ایک ہزار سات سو ستتر ارب کے نوٹ گردش میں ہیں۔ اگر ایک صبح اٹھارہ کروڑ عوام کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دیں کہ ہم ان ردی کے ٹکڑوں کو نہیں جانتے' تم نے اس پر جو تحریر لکھی ہے' جو وعدہ کیا ہے' جو اسٹامپ پیپر ہمیں دیا ہے' اس کے مطابق' ہمیں ان کاغذوں کے بدلے سونا' چاندی یا کوئی بھی جنس جو تم بہتر تصور کرتے ہو' دے دو' تو صرف پانچ منٹ میں یہ سود اور کاغذ کے نوٹوں پر کھڑی عمارت دھڑام سے گر جائے گی اور اس کے ملبے کے نیچے جمہوری حکومت ہو یا آمریت سب دفن ہو جائیں گے۔ اس مکار' چالاک' فریبی اور لوگوں کو دھوکہ دینے کے اصولوں پر مبنی سودی بینکاری کے اس معاشی نظام پر ہم بیش بہا کتابیں لکھتے ہیں۔ اس کے مستحکم اور غیر مستحکم ہونے کے اصول وضع کرتے ہیں۔ معاشیات یعنی اکنامکس کا مضمون یونیورسٹیوں تک پڑھایا جاتا ہے۔ پندرہ بیس سالوں کی تعلیمی محنت میں انہوں نے یہ سمجھنے کی مہارت حاصل کی ہوتی ہے کہ یہ کاغذ کے اسٹامپ پیپرز جنہیں کرنسی نوٹ کہا جاتا ہے اور یہ بینکاری نظام کیا ہے؟ کیسے ناپا جائے کہ اس کاغذ کی قیمت اوپر ہو گئی ہے یا نیچے؟ افراطِ زر کی چڑیا کس گراف پر فراٹے بھرتی ہے؟ کرنسی کے نوٹ جو سٹیٹ بینک چھاپتا ہے ان سے دولت (Money) کیسے جنم لیتی ہے؟ بینک کیسے انہی نوٹوں کو اپنے کھاتوں میں دوگنا اور تین گنا کر لیتا ہے جسے M1 اور M2 کا نام دیا جاتا ہے؟ بینک دیوالیہ ہو جائیں تو اس سودی نظام کو بچانے کے لیے کیسے حکومت عوام کے ٹیکسوں کا پیسہ انہیں دیتی ہے؟ کس طرح بینکوں کو بچانے کے لیے انہیں انشورنس کمپنیوں کے ذریعے آکسیجن فراہم کی جاتی ہے؟ عام آدمی کے پیسے سے ایک پورا متبادل نظام وضع کیا جاتا ہے کہ بینکوں کا سارا خسارہ ان انشورنس پالیسیوں سے پورا کیا جائے جو بینکوں نے خریدی ہوتی ہیں۔ لیکن اس نظام کے پیچھے ایک کاغذ ہے جس پر ایک چھوٹی اور بے سروپا عبارت تحریر ہے کہ ''حاملِ ہٰذا کو مطالبے پر ادا کرے گا''۔ دنیا کا کوئی بھی ملک امریکہ ہو یا برطانیہ' فرانس ہو یا جرمنی' بھارت ہو یا چین اپنا یہ لکھا ہوا وعدہ پورا نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ اس وعدے کی بنیاد ہی جھوٹ پر ہے۔ چند ماہ پہلے جب یونان میں معاشی بحران آیا تو لوگ بینکوں کے دروازوں پر نوٹ حاصل کرنے جمع ہو گئے۔ اس ملک کے تین شہر تو ایسے تھے کہ دکانداروں نے گاہکوں سے نوٹ لینے بند کر دیے اور کہا کہ گھر سے کوئی چیز بھی اٹھا لاؤ' ہم اس کے عوض سودا دے دیں گے لیکن اس بے کار ردی کے ٹکڑے پر بھروسہ نہیں کریں گے جس پر ایک چھوٹی سی عبارت تحریر ہے۔

یہ ایک خون چوسنے والا اور ظالم نظام ہے۔ اس کے رکھوالوں نے گزشتہ پچاس برسوں سے یہ طرزِ عمل اختیار کیا ہے کہ عام آدمی کی بجائے حکومتوں کو قرض دو۔ عام آدمی مر بھی سکتا ہے' دیوالیہ بھی ہو سکتا ہے' وہ کاروبار میں نقصان اٹھانے لگے تو اسے رعایت بھی دینی پڑتی ہے اور اسے ساتھ ساتھ یہ پتا بھی چلتا رہتا ہے کہ اس نے پانچ لاکھ قرضہ لیا تھا اور اب تک پندرہ لاکھ ادا کر چکا ہے لیکن پھر بھی اس پر قرض باقی ہے۔ لیکن حکومت کو قرض دینا کتنا فائدے کا سودا ہے۔ حکومت ایک تو اربوں میں قرض لیتی ہے اور شرح سود بھی اچھی ملتی ہے۔ عوام نے جو پیسہ یا بچت بنکوں میں جمع کروائی ہوتی ہے یہ سودی بینکار حکومت کو اگر پندرہ فیصد شرح سود پر دیتے ہیں تو اس میں سے پانچ یا چھ فیصد اپنے پاس رکھ کر آٹھ یا نو فیصد سود لوگوں کو دے دیتے ہیں۔ لیکن ہوتا کیا ہے؟ حکومت یہ سود اور قرض کیسے واپس کرتی ہے؟ کوئی اے جی این قاضی، شعیب، شوکت عزیز، حفیظ پاشا یا اسحاق ڈار انہی عوام پر ٹیکس لگاتا ہے۔ بجلی، پٹرول، گیس سب پر ٹیکس لگا کر پیسہ وصول کرتا ہے اور پھر انہی بنکوں کو لوٹا دیتا ہے جو اس سود کے کاروبار سے اس قوم کا خون چوس رہے ہوتے ہیں۔

جھوٹ اور فراڈ کا عالم یہ ہے کہ اس وقت 313 ارب روپے کے سونے کے ذخائر موجود ہیں اور اگر اس میں 4.6 ارب روپے کے سونے کے وہ ذخائر بھی شامل کر لیے جائیں جو انگلستان میں بنک آف انڈیا کے پاس پڑے ہیں جو 1947ء سے آج تک واپس ہی نہیں کیے گئے' تو یہ کل 318 ارب روپے کا سونا بنتا ہے۔ اس محدود سونے پر حکومت پاکستان نے جو رسیدیں یعنی کرنسی نوٹ جاری کیے ہیں اور جن پر لکھا کہ ''مطالبے پر ادا کرے گا'' وہ ایک ہزار سات سو ارب کی مالیت کی ہیں۔ یہ تو سٹیٹ بنک کے نوٹوں کی کہانی ہے۔ اس کے بعد سود خور بنکوں کا مرحلہ آتا ہے۔ بنکوں کو ایک خاص شرح ''ریزرو'' نوٹ رکھ کر مصنوعی دولت تخلیق کرنے (Artificial Credit Creation) کا اختیار ہے۔ اکتوبر 2007ء تک تمام بنک 7 فیصد نوٹ اپنے پاس رکھ کر باقی سرمایہ اپنی خط و کتابت یعنی Transaction سے دولت بنا سکتے تھے۔ لیکن نومبر 2012ء میں یہ شرح کم کر کے 3 فیصد کر دی گئی اور یہ آج تک قائم ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ بنک اصل نوٹوں کے مقابلے میں چالیس گنا زیادہ سرمایہ تخلیق کر سکتے ہیں جسے معیشت کی زبان میں M2 کہتے ہیں۔ اس وقت اس سرمائے کی کل مقدار نو ہزار آٹھ سو اٹھائیس ارب روپے ہے۔ کیا خوبصورت طریقہ ہے بنک کا! یہ کاغذ شوگر مل، کھاد والے، دوائیوں والے، مشینری والے، ملبوسات والے غرض مختلف ہاتھوں سے ہوتا ہوا گزرتا ہے اور ان میں نہ اصل نوٹ گھوم رہے ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کا کوئی متبادل۔ لوگ اپنی مصنوعات خرید و فروخت کرتے ہیں لیکن بنک کو امیر سے امیر تر بناتے جاتے ہیں؛ یعنی اگر اس وقت اس ملک کے تمام کھاتے دار اپنے چیک لے کر بنکوں کے دروازے پر کھڑے ہو جائیں کہ ہماری رقم ہمیں واپس کر دو تو بنک ان کو وہ رسیدیں بھی نہیں دے سکتے جو حکومت جاری کرتی ہے جسے کرنسی نوٹ کہا جاتا ہے' اور اگر اس ملک کے اٹھارہ کروڑ عوام اپنے ہاتھوں میں ایک ہزار سات سو ستر ارب کے نوٹ لے کر سٹیٹ بنک کے دروازے پر کھڑے ہو جائیں اور کہیں کہ اس پر لکھا ہوا اپنا وعدہ پورا کرو اور ہمیں اس کے بدلے میں سونا، چاندی یا کوئی اور جنس ہی دے دو تو صرف چند منٹوں میں یہ پورا نظام زمین بوس ہو جائے گا۔

کوئی اس جھوٹ اور فراڈ کے خلاف ایسی تحریک نہیں چلاتا، کوئی سیاسی پارٹی یہ نہیں کہتی کہ حکومت جو جھوٹ بول کر نوٹ چھاپ رہی ہے' اس رسید کو لینے سے انکار کر دو اور اس کے بدلے میں کوئی جنس طلب کرو جس کا انہوں نے وعدہ کیا ہے۔ اس لیے کہ اس پورے سودی نظام کو تحفظ دینے کے لیے جمہوریت، پارلیمنٹ اور اس طرح کے ادارے قائم کیے گئے جن کا کام ہی اس جھوٹ اور فراڈ کی معیشت کو سہارا دینا ہوتا ہے۔ یہ صرف پاکستان میں ہی نہیں دنیا کے ہر ملک میں ہے۔ پوری دنیا کے اربوں انسانوں کو اسی دھوکے، فراڈ اور جھوٹی رسیدوں کے ذریعے پاگل بنایا گیا ہے۔ کس قدر بودا، کمزور اور بے بنیاد ہے یہ پورا سودی نظام جسے صرف ایک گھنٹے کے اندر زمین بوس کیا جا سکتا ہے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

جس کا کھاتے ہو، اس کا گاؤ بھی

حرف راز
اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

گزشتہ چار دہائیوں سے یہ فقرہ سنتے سنتے کان پک گئے ہیں کہ دنیا میں پاکستان، پاکستانیوں اور پاکستانی پاسپورٹ کی کوئی عزت نہیں۔ ہر ملک کے ہوائی اڈوں پر ہم ذلیل و رسوا ہوتے ہیں۔ ہر ملک ہمیں دو نمبر کا شہری سمجھتا ہے۔ ہمیں دیکھتے ہی لوگ منہ پھیر لیتے ہیں، ہر مجرم کا کوئی نہ کوئی تعلق ہمارے ملک سے ہی نکلتا ہے۔ جس زمانے میں صرف اخبارات ہوتے تھے اور انہیں پڑھنے والوں کی بھی تعداد محدود تھی، اس دور میں بھی مملکت خداداد پاکستان کی توہین کا کوئی چھوٹا سا پہلو بھی نظر آ جاتا تو ایسے دانشور، محقق، تبصرہ نگار اور شاعر ہر دور میں موجود رہے ہیں جو اس ملک کی ذلت و رسوائی کو اپنی تحریروں اور تقریروں کا خاص موضوع بناتے تھے۔ ساٹھ کی دہائی میں جب دنیا میں چھپنے والی اکثر معاشیات کی کتابوں میں پاکستان کی ترقی کو ''سبز انقلاب'' کے طور پر ایک مثال کی حیثیت سے درج کیا جاتا تھا اور یہ کتابیں بھی پاکستان کے اکثر شہروں میں دستیاب تھیں لیکن ان لوگوں کو کبھی اس بات کی توفیق نہ ہوئی کہ چند فقرے اس ملک کے لیے خیر کے بھی کہہ دیں۔ میں گزشتہ چالیس سالوں سے نفرت کے اس مرض کا گواہ بھی ہوں اور اس کی اصل وجوہ کا شاہد بھی۔ اس لیے کہ یہ سب افراد میرے قبیلے اور میری برادری کے لوگ ہیں جنہیں پاکستان کے بارے میں کوئی بری خبر ملے سہی، ان کی باچھیں کھل اٹھتی ہیں۔ یہ شاعر، ڈرامہ نگار، مصنفین، تجزیہ نگار، اداکار، صحافی اور بیوروکریٹ ہیں۔ ستر کی دہائی میں مجھے شاعروں کی صحبت میسر ہوئی۔ اسی کی دہائی سے اب تک بیوروکریٹ مجھے برادری کا فرد ہونے کے ناطے برداشت کرتے ہیں اور اپنی محفلوں میں دخل دینے کی اجازت۔ نوے کی دہائی میں ڈرامہ نگاری نے مجھے اداکاروں، موسیقاروں، گلوکاروں اور ہدایت کاروں کے جھرمٹ میں لا بٹھایا اور گزشتہ پندرہ سالوں سے اس ملک کے ''اعلیٰ ترین دماغ'' یعنی کالم نگار اور تجزیہ نگار مجھے گھاس ڈالتے ہیں کہ میں ان کی برادری میں ایک گھس بیٹھیا ہوں۔ ان سب طبقات کے کچھ افراد میں پاکستان کی نفرت ایسے لمحوں میں عروج پر ہوتی ہے جب ''جام مے توبہ شکن'' سامنے ہو، گرم گرم بھنے ہوئے میوہ جات اور نمکو کے چٹخارے اور اگر ساتھ میں ٹھنڈی ہوا بھی چلنے لگے تو پہلا فقرہ جو منہ سے نکلتا ہے وہ یہ ہوتا ہے ''یار یہ کوئی ملک ہے'' اور پھر ساری دبی ہوئی حسرتیں اور ناکام خواہشوں کا غصہ اس ملک پر نکلتا ہے۔ یہ سب لوگ وہ ہیں جنہیں اس ملک نے رزق کے وافر ذرائع مہیا کیے ہیں، رہنے کو گھر، گھومنے کو سواری اور عزت کرنے کے لیے لاکھوں عوام دیئے ہیں۔ لیکن ان کی نفرت اس ملک سے کم ہونے کو ہی نہیں آتی۔ جب ان سے بحث چھیڑو تو اس عالم مدہوشی میں ایک سچی بات ان کے منہ سے نکل جاتی ہے۔ ''یار یہ ملک بنا ہی غلط تھا''۔ یہ ہے اس مرض کی اصل وجہ اور اس ملک سے نفرت کی بنیاد۔ یہ نفرت انہیں اس قدر اندھا کر دیتی ہے کہ انہیں اس ملک میں کوئی بھی قابل ذکر خوبی نظر نہیں آتی۔ اگر آ بھی جائے تو اسے بیان کرنا ان کی پاکستان سے نفرت کے نظریئے کو متاثر کرتا ہے۔ اسی لیے وہ چپ سادھ لیتے ہیں اور انتظار کرتے ہیں کہ کب کوئی پاکستانی چوری کرتا پکڑا جائے، کہیں کوئی کسی ملک سے نکالا جائے، بم دھماکہ ہو، سیلاب آئے، کہیں غیرت کے نام پر کوئی قتل ہو جائے، بس پھر یہ ہوتے ہیں اور چوبیس گھنٹے کبھی نہ رکنے والا میڈیا۔ دونوں کا چولی دامن کا ساتھ صرف میرے ملک میں ہی ہے۔ دلیل وہی دی جاتی ہے جو سعادت حسن منٹو نے دی تھی کہ اگر معاشرے میں گندگی، غلاظت اور تعفن ہے تو میں اسے ہی دکھاؤں گا۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں غلاظت، گندگی اور تعفن ہے، لیکن کیا یہ صرف ہمارے ملک میں ہی ہے؟ کیا دوسرے معاشروں میں یہ سب نہیں ہوتا؟ لیکن یہ ہزاروں کیمرے اس مکھی کی طرح ہیں جس کی بینائی تو بلا کی ہوتی ہے لیکن اگر پھولوں کے اوپر بھی اڑ رہی ہو تو غلاظت کو ڈھونڈ نکالتی ہے۔ جاپان کے سب سے بڑے میڈیا ادارے ''این ایچ کے'' میں انٹرویو دیتے اور لوگوں سے ملتے یہ سب لوگ بہت یاد آئے۔ اس کی وجہ ''این ایچ کے'' کی وہ ڈاکومنٹری تھی جو انہوں نے پاکستانی قوم کی تعریف میں بنائی تھی۔ جاپان وہ ملک ہے جس میں پاکستانی قوم اور پاکستانی پاسپورٹ کو نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ یوں تو گزشتہ چالیس سال سے مقیم پاکستانی استعمال شدہ گاڑیوں کے سب سے بڑے تاجر ہیں، کیسی بھی نیلامی ہو رہی ہو پہلی دس پوزیشنیں عموماً پاکستانیوں کی ہوتی ہیں۔ ان کے کاروباری رویے پر جاپانی بہت بھروسہ کرتے ہیں۔ اس لیے کہ پاکستانی صاف ستھرا کاروبار کرتے چلے آئے ہیں۔ لیکن پاکستانیوں کی بحیثیت قوم عزت و تکریم میں اس وقت بے پناہ اضافہ ہوا جب جاپان میں سونامی آیا۔ دنیا کے ہر ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ ممالک نے اپنے شہریوں کو واپس بلا لیا۔ یہاں تک کہ بنگلہ دیش نے بھی دو جہاز بھیجے اور اپنے شہریوں کو لے گیا، لیکن آفت کی اس گھڑی میں پاکستانی وہ واحد قوم تھی جو تھویاما کے برف پوش علاقوں اور ٹوکیو کی گنجان آباد بستیوں سے دیوانہ وار سامانِ خورونوش لے کر سونامی کے علاقوں میں جا پہنچے۔ جاپانی گرم گرم کھانا پسند کرتے ہیں۔ وہ حیران رہ گئے، یہ کیسی قوم ہے، اپنے ساتھ کھانا پکانے کا سامان لے کر آئی ہے اور ہمیں گرم گرم کھانا پکا کر کھلا رہی ہے! وہ جگہیں جہاں ان کا ایٹمی ری ایکٹر تباہ ہوا تھا اور جاپانی بھی تابکاری کے ڈر سے نہیں جاتے تھے، پاکستانی وہاں بھی جا پہنچے۔ حیرت کی بات یہ کہ یہ لوگ جب وہاں گئے تو ان میں کوئی کسی جماعت یا مذہبی گروہ کا علمبردار بن کر نہیں بلکہ پاکستانی بن کر گیا۔ جاپان کے وزارتِ عظمیٰ کے امیدوار پاکستانیوں کے کیمپوں میں جا کر تصویریں بناتے کیونکہ ''این ایچ کے'' نے پاکستانیوں پر سونامی کے سلسلے میں امدادی کارروائیوں پر ڈاکومنٹری بنائی تھی۔ جس رات یہ ڈاکومنٹری چلی، پاکستانی بتاتے ہیں کہ اگلے روز ان کے جاپانی دوست اور ساتھ کام کرنے والے انہیں دیکھتے ہی جھک جاتے، آنکھ میں آنسو بھر لاتے اور صرف اتنا کہتے یہ قوم آپ کا شکریہ کیسے ادا کرے گی۔ ان کے دل میں پاکستانیوں کی عزت تو پہلے ہی تھی۔ اس کا صرف ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ سلمان رشدی کی کتاب کا ترجمہ جاپان کی ایک پروفیسر نے کیا، اس کی تقریب رونمائی تھی۔ چند پاکستانی اس تقریب میں گئے اور کہا کہ اس کتاب سے ہمارے اور پوری امت مسلمہ کے دل دکھے ہیں۔ پولیس نے نہ صرف اس تقریب کو روکا بلکہ جاپان کے تمام بک سٹالوں سے وہ کتاب اٹھا دی۔ آج بھی وہ پاکستانیوں سے یہ سوال ضرور پوچھتے ہیں کہ وہ کتاب کہیں نظر تو نہیں آئی؟ اس پروفیسر کو چند ہی دنوں بعد کسی نے قتل کر دیا تھا۔ توہین رسالت پر کسی غیر مسلم معاشرے میں یہ قتل بہت اہم تھا۔ لیکن پاکستانیوں پر اعتماد کا یہ عالم ہے کہ کسی ایک بھی پاکستانی کو تفتیش کے لیے نہیں بلایا گیا۔ پاکستان کا جاپان میں سفیر فرخ عامل میرا اکیڈمی کا ساتھی ہے، اس نے بتایا کہ تم سوچ نہیں سکتے بحیثیت پاکستانی کسی غیر ملک میں میرا سر پہلی بار فخر سے بلند ہوا، جب میں بادشاہ کو اسنادِ سفارت دینے گیا تو اس نے اور پھر اس کی ملکہ نے کہا کہ پاکستانی وہ واحد قوم ہے جس نے سونامی میں ہماری مدد کی۔ جاپان کے پاکستانی بہت سادہ دل اور خوبصورت ہیں، انہیں دیکھ کر اور ان سے مل کر پاکستان کے مستقبل سے امید وابستہ ہونے لگتی ہے۔ یہ سب کے سب ابھی تک چار چار عیدیں کرانے والے پاکستانی مولویوں سے بھی دور ہیں اور اپنی سیاسی پارٹی کا ایک دفتر بیرون ملک کھولنے والے سیاسی شعبدہ بازوں سے بھی علیحدہ۔ لیکن ان سب تنظیموں کے نمائندے اب وہاں پہنچ چکے ہیں، سب نے اپنی اپنی نرسریاں بنانا شروع کر دی ہیں، لیکن ابھی تک یہاں کے پاکستانیوں پر پاکستانیت غالب ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسلام غالب ہے۔ وہ پاکستان کی بنیاد سے محبت کرتے ہیں۔ لیکن سب ان لوگوں کو کیسے نظر آ سکتا ہے جو کافی کے تلخ گھونٹ، سگریٹ کے مرغولے اور توبہ شکن مشروب کی ترنگ میں صرف یہ کہنا جانتے ہیں ''یار یہ کوئی ملک ہے؟''، ''یہ ملک بنا ہی غلط ہے!'' لیکن کیا کریں 80 کے قریب چینلوں میں کاش کوئی ایک ''این ایچ کے'' کی اس ڈاکومنٹری کی اردو میں ڈبنگ کر کے نشر کر دے۔ کاش کسی کو تو اس ملک کی عزت سے محبت ہو۔ جس زمین نے ہمیں عزت دی ہے، جس قوم نے انہیں سر پہ بٹھایا ہے، اسے بھی تو عزت دو!!

allurdupdfnovels.blogspot.com

جو بچ نکلے گا

اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

وہ قوم جو اس کائنات میں اللہ کی فرمانروائی کا اقرار تو کرتی ہو لیکن اس کے ہر دشمن کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہونے میں شرم محسوس نہ کرتی ہو، جسے اللہ کی طاقت سے ریاست کی طاقت پر زیادہ یقین ہو، جو تدبیر کو تقدیر پر مقدم جانتی ہو، جسے اسباب وعلل پر اس قدر یقین ہو کہ کسی کام میں اللہ سے مدد طلب کرنا اپنی توہین سمجھتی ہو، اگر کوئی اسے یہ سمجھانے چلے کہ یہ سب فساد جو برپا ہے تمہارے اعمال کا نتیجہ ہے تو اس قوم کے افراد زور کا قہقہہ لگائیں گے اور کہیں گے کہ یہ تو ہمارے درمیان کچھ فسادی گروہ ہیں جنہیں درپردہ حکومتوں کی پشت پناہی حاصل رہی ہے۔ ان میں سے کچھ اسے عالمی طاقتوں کا کھیل بتائیں گے، کسی کو ریاست کی کمزوری نظر آئے گی اور کوئی اسے گزشتہ کئی برسوں کی پالیسیوں کا تسلسل کہے گا۔

لیکن اب لگتا ہے یہ سب بحثیں ختم ہونے والی ہیں۔ ہم سب ایک ایسے وقت میں داخل ہو چکے ہیں جس کے بارے میں اللہ نے ارشاد فرمایا تھا: ''خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا ہے اور یہ ان کے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے تاکہ ہم مزا چکھائیں ان کو ان کے بعض اعمال کا تاکہ وہ باز آ جائیں'' (الروم 41:30) یہاں باز آ جانے کا مطلب اللہ کی جانب لوٹ آنا ہے۔ اللہ نے جہاں کہیں بھی قوموں پر مختصر عذابوں کا ذکر کیا، اس کا مقصد یہی بتایا کہ وہ انہیں جھنجھوڑتا ہے تاکہ وہ اللہ کی طرف رجوع کر لیں، اس سے مدد کے طلب گار ہوں، اس سے معافی مانگیں اور بے شک وہ بہت ہی رحیم اور معاف کرنے والا ہے۔ لیکن ہم اس سے نہ رحمت کی امید لگاتے ہیں اور نہ معافی کے طلب گار ہوتے ہیں۔ ایسے میں اس کے اٹل فیصلے صادر ہو جایا کرتے ہیں۔ برسوں سے ہم مہلت کی حالت میں تھے، لیکن لگتا ہے مہلت کے دن ختم ہو گئے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی علامات ہمارے تعصبات، ہماری انائیں، مادی وسائل پر اعتماد اور باہمی اختلافات ہیں جو ہمیں اس مقام پر لے آئے ہیں کہ کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا، کوئی حل نظر نہیں آتا، ایک اندھیری بند گلی ہے جس میں خوف، سناٹا، خون اور چیخ پکار ہے۔ نہ واپس پلٹنے کا ارادہ اور نہ ہی آگے بڑھنے کا کوئی راستہ۔

ہمیں راستہ کیوں دکھائی نہیں دے رہا؟ یہ سوال اس قوم کا ہر شہری اپنے آپ سے بھی کر رہا ہے اور ایک دوسرے سے بھی۔ ہر شہری مایوس بھی ہے اور خوفزدہ بھی۔ اسے مایوس اور خوفزدہ کرنے والے بہت ہیں۔ ہر روز اسے نفسیاتی بیمار بنانے والی تحریریں لکھی جاتی ہیں، ٹیلی ویژن کے ٹاک شوز میں فریقین باہم دست بگریبان ہوتے ہیں۔ کس قدر بدقسمتی کی بات ہے کہ ان سب لوگوں نے اس ملک کو ہیجان کی کیفیت میں مبتلا کیا اور اب ان میں سے ہر ایک، دوسرے پر الزام کا ملبہ پھینکتا ہے۔ گروہوں میں تقسیم در تقسیم یہ قوم اپنے تعصبات کا ایک راستہ دیکھنے کی عادی ہو چکی ہے اور وہ راستہ ہے ریاست کی طاقت کا۔

مدتوں پہلے جب بلوچستان میں تحریکوں کا آغاز ہوا (یہ ساٹھ کی دہائی تھی) ہر کسی کو ایک قومی سوشلسٹ انقلاب کے خواب نظر آنے لگے، بہت سے سردار اور ملک حکومت کے خیر خواہ ہو گئے، حکومتی مراعات نے ان کے اثر و رسوخ کا تحفظ شروع کر دیا۔ صوبے میں قومی تحریکوں نے ہتھیار اٹھائے تو ان مراعات یافتہ طبقوں کا ایک ہی مطالبہ تھا... ریاست ان باغیوں کا قلع قمع کیوں نہیں کرتی؟ یہ سب ڈاکو، چور اور مفرور ہیں جو ان قوم پرستوں کے ساتھ اکٹھے ہو گئے ہیں، ریاست اپنی رٹ قائم کرے۔ اس کے بعد یہ رٹ چار بار قائم کرنے کی کوشش کی گئی۔ ہر بار امن قائم کرنے کا دعویٰ، ہر بار ریاست کا غلبہ اور دشمنوں کا صفایا، لیکن آگ سلگتی رہی، راکھ میں چنگاریاں موجود رہیں اور آج یہ چنگاریاں اتنی بڑی آگ بن چکی ہیں کہ ریاست بے بس نظر آتی ہے۔

ریاست کب بے بس ہوتی ہے؟ ریاست کیوں بے بس ہوتی ہے؟ ریاست اس وقت بے بس ہوتی ہے جب اسے قتل و غارت کے پس منظر میں کسی نظریے کا سامنا کرنا پڑ جائے۔ انسانی تاریخ بڑی ظالم ہے۔ انسان نے ہر دور میں اپنی کسی نہ کسی محبت کے لیے بے گناہ انسانوں کا خون بہایا ہے۔ اس کے لیے صرف اور صرف مذہب یا آخرت کی سرخروئی ضروری نہیں ہوتی۔ ماؤزے تنگ جب چند لاکھ لوگوں کو لے کر لانگ مارچ کرنے نکلا تو وہ ایک ارب چینی عوام پر اپنی مرضی کی ''کمیونسٹ شریعت'' نافذ کرنا چاہتا تھا، چیانگ کائی شیک کی حکومت کو امریکہ کی مالی اور فوجی امداد میسر تھی۔ لانگ مارچ میں مرنے والوں کے لیے آخرت میں کوئی اجر، جنت یا حوروں کا وعدہ شامل نہ تھا، لیکن ریاست اپنی ناکامیوں کا منہ چاٹتی رہ گئی۔ یہی حال روس میں زارِ روس کے ان دستوں کا ہوا جو خاص طور پر یورپ کے جنگجو قبائل سے چن کر بنائے گئے تھے۔ لینن اور ٹراٹسکی کے ہمراہ بھی معدودے چند لوگ تھے جو روس میں اپنی مرضی کا نظام اور اپنی مرضی کی ''کمیونسٹ شریعت'' کا نفاذ چاہتے تھے۔ کسی بھی ملک میں یہ مکمل طور پر کچلے نہیں گئے۔ پورے جنوبی امریکہ میں گوریلے مدتوں ریاست کی فوجوں سے لڑتے رہے، کتنے ملک تھے جو ان گوریلوں کو امریکی امداد سے کچلنے کی کوشش کرتے رہے۔ پہاڑوں، دریاؤں، جنگلوں میں ان کے ساتھ مقابلہ رہا لیکن ان سب نے اس قتل و غارت کا جواز ایک نظریے میں ڈھونڈا ہوا تھا اور وہ نظریہ تھا... ''کمیونزم کا نفاذ''۔ یہی وجہ ہے کہ ان تمام ریاستوں نے 'جو جنوبی امریکہ میں واقع تھیں' ان سب گوریلوں کو اپنے ساتھ بٹھا کر معاملہ طے کیا۔ کہا جاتا ہے کہ سری لنکا میں ریاست نے کمال کر دکھایا۔ وہاں تامل ایک قابل شناخت آبادی تھی، ان کا رہنا سہنا، اٹھنا بیٹھنا اور زبان تک علیحدہ تھی۔ ان کے مقابلے میں جو دوسری قوم اکثریت میں تھی وہ متحد تھی اور وہ جنگ کر کے انہیں ختم کرنے کے لیے تیار تھی۔ لیکن جہاں قتل و غارت اور لوٹ مار کو ایک نظریے کی بنیاد فراہم کر دی جائے، یہ ملکی آبادی کے ہر طبقے میں پھیل جاتی ہے، کمیونسٹ گوریلے ایک رنگ، ایک نسل اور ایک زبان کے لوگ نہیں ہوتے تھے، ان کے ٹھکانے بھی ایک علاقے میں نہیں تھے، یہی وجہ ہے کہ یا تو انہوں نے ملکوں پر قبضہ کر لیا اور ریاست کو شکست دے دی یا پھر ریاست نے ان سے گفتگو کے بعد امن قائم کیا۔

تاریخ کا یہ سبق پاکستان میں ہر کسی نے پڑھا ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ چلی، ہنڈراس، ارجنٹائن اور کولمبیا جیسے ملکوں میں فوج اور پولیس کے لوگ بھی مر رہے تھے، عوام بھی قتل ہو رہے تھے لیکن ریاست نے عوام کے مفاد اور امن کی خواہش میں ان گوریلوں سے مذاکرات ختم نہ کیے۔ ہم میں سے ہر دانشور نے یہ تاریخ پڑھی ہے لیکن ہمارا تعصب ہمیں یہ مشورہ دینے پر مجبور نہیں کرتا۔ ہماری نفرت چاہتی ہے کہ یہ جنگ و جدل ایسے ہی جاری رہے۔ ریاست کی طاقت کے استعمال کے علم بردار کون ہیں؟ ایک طبقہ وہ ہے جو گزشتہ پچاس برس سے فوج کو گالی دیتا آ رہا ہے، جس نے بلوچستان سے لے کر مشرقی پاکستان تک ہر جگہ فوج اور ریاست کی طاقت کے استعمال کو ناجائز قرار دیا اور فوج کو مطعون کیا۔ آج یہ سب کے سب ریاست کے استعمال اور فوج کے حق میں آواز بلند کر رہے ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جن کا مسلکی اختلاف اپنی نفرت کا سارا زور آپریشن پر لگا رہا ہے تاکہ جو قتل و غارت کی خواہش ان کے دلوں میں امڈتی ہے وہ ریاست یا فوج پوری کر دے۔ ایسے میں میڈیا کے دانشور اس آگ اور کشت و خون کا منظر نامہ دیکھنے کی طلب میں بوڑھے ہو چکے ہیں۔

لیکن شاید اب قضا و قدر کے فیصلے یہ منظر دکھانا چاہتے ہیں۔ صاحبانِ نظر خوابوں میں ایک ایسی خونریزی دیکھ رہے ہیں جس میں نہ مسجدوں کے عمامے بچیں گے اور نہ سیاست دانوں کے سروں کے تاج۔ زمین اپنی جنبش کے لیے تیار ہے۔ ایک صاحب نے کہا سب الٹ جائے گا، جو پست ہیں وہ بلند اور جو بلند ہیں وہ پست ہو جائیں گے۔ ریاست کی طاقت والے بھی اس کا مزہ چکھ لیں گے اور فتنہ و فساد والے بھی... رہے نام اللہ کا جو یہ سب اس لیے برپا کرتا ہے کہ آپ اس کی جانب لوٹ جاؤ، جو بچ نکلے گا وہی اس ملک کا امین ہوگا۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

خبردار

حرف راز
اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

آج سے چھ سات سال قبل ایک نئے ٹیلی ویژن چینل کا آغاز ہوا تو ایک نوجوان اینکر پرسن بہت مقبول ہوا۔ اپنی مقبولیت کو برقرار رکھنے کے لیے اس نے بہت سے ایسے موضوعات کو چھیڑنا شروع کیا جس پر مدتوں لوگ اس لیے بحث نہیں کرتے تھے کہ اس سے فساد خلق کا خطرہ تھا یا معاشرے میں ہیجان پیدا ہونے کا ڈر تھا' لیکن الیکٹرانک میڈیا ایک ایسی چیز ہے جس میں مقبول ہونے اور پھر مقبولیت کو برقرار رکھنے کا خبط بہت کچھ کروا دیتا ہے۔ اس نوجوان مقبول اینکر کے بارے میں اس ٹیلی ویژن کے پروڈیوسر اور دیگر کارکنان ایک فقرہ بولا کرتے تھے کہ "ریٹنگ کے لیے کچھ بھی کرے گا" یہ فقرہ میڈیا کی اس بے رحمانہ دوڑ پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ ٹاک شوز کے اینکرز، ان پروگراموں کے پروڈیوسر اور متعلقہ سٹاف دن رات ایک نہ ختم ہونے والی بھاگ دوڑ میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کی راتوں کی نیندیں حرام اور دن کا سکون غارت ہے' محض اس لیے کہ کوئی ایسا موضوع ڈھونڈا جائے جس سے اس ملک کے لوگوں میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا کی جا سکے۔ پروگرام پیش کرنے والے کو اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ جذباتی صورتحال دیکھ کر لوگ نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہوتے ہیں، ان کے دلوں کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے یا پھر وہ مستقل بے یقینی کے مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یوں ایسے موضوعات زیر بحث آنے لگے ہیں جن پر کبھی لوگوں کی دل آزاری کی وجہ سے کوئی زبان نہیں کھولتا تھا۔ ان میں سے ایک موضوع مقامِ شہادت ہے۔ آپ کو اس ملک کے کونے کونے میں شہید نظر آئیں گے۔ افغان بارڈر کے سرحدی شہر چمن میں کئی لوگوں کا پیشہ سمگلنگ ہے۔ یہ بہت خطرناک کام ہے۔ سرحد عبور کرتے ہوئے، اکثر ان لوگوں کا مقابلہ کسٹم، لیویز یا ایف سی سے ہو جاتا ہے اور سمگلر مارے جاتے ہیں۔ چمن اور اس کے گردونواح کے قبرستانوں میں چلے جائیں۔ آپ کو ان سب کی قبروں پر شہید کے کتبے لگے نظر آئیں گے۔ بلوچ اور پشتون قبائل کے درمیان جب لڑائی شروع ہوتی ہے تو دونوں جانب کے ہزاروں لوگ مارے جاتے ہیں۔ دونوں اطراف کے لوگ اپنے اپنے جانبازوں کو شہید کہتے ہیں اور وہاں کوئی یہ بحث نہیں کرتا کہ یہ مقدس لفظ ان خونخوار قبائلی لڑائی میں مارے جانے والوں کے لیے کیسے استعمال کیا گیا۔ ہمارے معاشرے میں مرنے والے کے حامی اور مخالف دونوں جانب سے کوشش یہ کی جاتی ہے کہ خاموش رہا جائے۔ فرقہ وارانہ لڑائی میں جاں بحق ہونے والے ہزاروں افراد خواہ وہ شیعہ ہوں یا سُنی یا کسی دوسرے مسلک کے لوگ' سب نے اپنے مرنے والوں کے لیے شہادت کا لقب اختیار کر رکھا ہے۔ لیکن کوئی اس بحث کو نہیں چھیڑتا کہ اس سے فسادِ خلق کا خطرہ ہوتا ہے۔ ہر سیاسی پارٹی کا دامن شہیدوں کی قطار سے بھرا ہوا ہے۔ 1974ء میں بلوچستان کے چھ ہزار کے قریب مرنے والے بلوچ اور پشتون شہید تھے اور ان کو اپنی سیاسی انا کی بھینٹ چڑھانے والا بھی شہید۔ لیکن دونوں گروہوں نے کبھی یہ بحث نہیں چھیڑی کہ تم ہمارے قاتلوں کو شہید کیوں کہتے ہو۔ شہادت کا سرٹیفکیٹ ایک ایسا روّیہ ہے جو اس ملک کے گلی محلے میں ہر مفتی، مولوی، صحافی، افسانہ نگار، شاعر، ادیب حتیٰ کہ عام آدمی بھی بلا روک ٹوک جاری کرتا ہے اور کوئی اس سرٹیفکیٹ کے جعلی یا اصلی ہونے پر بحث نہیں چھیڑتا کہ فسادِ خلق کا ڈر ہوتا ہے۔

لیکن میڈیا کی تیز رفتاری اور چابک دستی کا کمال ہے کہ آج اس ملک کا ہر اینکر پرسن اجتہاد اور اِفتاء کے مقام پر فائز محسوس ہوتا ہے۔ ایسا اچانک شروع نہیں ہو گیا۔ کیا یہ کوئی غیر شعوری عمل تھا، کیا یہ سب بے ساختگی تھی؟ میڈیا کے بارے میں دنیا بھر کی کتابیں اور علم اس کی نفی کرتے ہیں۔ میڈیا میں ایک تکنیک استعمال ہوتی ہے جسے (Prompting) کہتے ہیں۔ اس کا ترجمہ ہے (To lead some one to say the desired words) یعنی کسی شخص کو کوئی خاص بات کہنے کی طرف راستہ دکھانا یا اسے اپنی مرضی کی بات کہلوانے پر مجبور کر دینا۔ یہ ایسے ہی ہے کہ ایک سپاہ صحابہ والے کو بلا کر سوال کیا جائے کہ اچھا تمہارے رہنما تو شہید ہوئے، لیکن وہ جو اس مقابلے میں شیعہ مارے گئے ان کے بارے میں کیا خیال ہے یا پھر یہی سوال کسی شیعہ رہنما سے کیا جائے۔ ظاہر ہے دونوں کے لئے جواب دینا بھی مسئلہ اور خاموشی بھی مسئلہ۔ اس سارے منظرنامے میں سوال کرنے والا اور جواب دینے والا' دونوں خواہ وہ مفتی ہوں، عالم ہوں یا دانشور، خود کو (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ کے تخت پر بٹھا کر فیصلہ صادر کر دیتے ہیں۔ ایسا ہی اس معاملے میں ہوا۔ سوال بہت کمال کا ہے: "اگر حکیم اللہ محسود شہید ہے تو پھر طالبان کے ساتھ لڑنے والے فوجی اگر مارے جائیں تو وہ کیا ہیں؟ ذرا میرے جیسے عام آدمی کی کنفیوژن دور کر دیں"۔ اس پروگرام کے بعد سے میں ایک خوف کا شکار ہوں۔ اس دن سے ڈر رہا ہوں جب یہ عام آدمی، یہ خود کو ایک معمولی اینکر پرسن کہنے والا شخص نواب بگٹی کے بیٹے یا پوتے سے یہ سوال نہ کر دے کہ نواب اکبر بگٹی تو شہید تھے تو کیا ان کے ساتھ غار میں مرنے والے فوجی افسران بھی شہید ہیں؟ یا پھر بزرگ سیاستدان عطاء اللہ مینگل کو اپنے پروگرام میں مدعو کر کے یہ نہ پوچھ بیٹھے کہ آپ اپنے بیٹے سمیت ان تمام بلوچوں کو شہید کہتے ہو جو مختلف آپریشنوں میں مارے گئے تو پھر میرے جیسے عام آدمی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا سانگاں، بابر کچھ اور گھائی پل میں جو فوجی 1974ء کے آپریشن میں مارے گئے یا پھر جو آج کل فوج کے قافلوں پر حملے ہوتے ہیں، ان میں مارے جانے والے بھی شہید ہیں؟ خود کو عام سا آدمی کہنے والا کہیں اپنی سادہ لوحی میں کراچی میں ایم کیو ایم پر ہونے والے 1992ء اور 1995ء کے آپریشن میں مارے جانے والے سکیورٹی فورسز کے افراد کے بارے میں یہ سوال قائد تحریک سے نہ کر بیٹھے۔ کیسا میدان سجے گا، کتنے جاندار ہوں گے وہ پروگرام۔

لیکن شاید ان اینکر پرسنوں، کالم نگاروں، علمائے کرام اور مفتیانِ عظام کو اس بات کا علم نہیں کہ کسی کو شہید یا جنتی کہنے کا منصب اور مقام صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات کا ہے۔ یہ مرتبہ اور مقام کسی اور کو حاصل نہیں۔ سیّد الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جن کو جنت کی بشارت دی' وہ اللہ کے حکم اور وحی سے دی۔ اللہ سورۃ النجم میں فرماتا ہے کہ "وہ نہیں بولتے اپنی خواہش نفس سے بلکہ ان کا کلام ہے جو وحی نازل کی جائے"۔ لیکن ہم ہیں کہ سرٹیفکیٹ دیتے بھی ہیں اور مانگتے بھی ہیں۔ خبردار کہ ہر ایک کا معاملہ روز محشر ضرور کھلے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "روز قیامت جن لوگوں کا سب سے پہلے فیصلہ کیا جائے گا، وہ یہ ہیں (1) وہ آدمی جو شہید ہوا، اسے لایا جائے گا، اللہ اپنی نعمتوں کا تعارف کرائے گا اور وہ اقرار کرے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ پوچھے گا تو نے کون سا عمل کیا ہے۔ وہ کہے گا: میں نے تیری خاطر لڑائی کی اور شہید ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹ بولتا ہے' تو تو اس لیے لڑا تھا کہ تجھے بہادر کہا جائے اور وہ کہا جا چکا ہے۔ پھر اس کے بارے میں حکم ہو گا اور اسے چہرے کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ (2) وہ آدمی جس نے علم سیکھا اور سکھایا اور قرآن مجید پڑھا، اسے لایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنی نعمتوں کا تعارف کروائیں گے، وہ اقرار کرے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ پوچھے گا، کون سا عمل کر کے آیا ہے؟ وہ کہے گا میں نے تیری خاطر علم سیکھا اور سکھایا اور قرآن مجید پڑھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا' تو جھوٹا ہے، تو نے تو علم اس لیے حاصل کیا تھا کہ تجھے عالم کہا جائے اور قرآن مجید پڑھا تا کہ تجھے قاری کہا جائے اور وہ کہہ دیا گیا۔ پھر اس کے بارے میں حکم دیا جائے گا اور اسے چہرے کے بل گھسیٹ کر جہنم کی آگ میں پھینک دیا جائے گا۔ (3) وہ آدمی جسے اللہ نے رزق میں فراوانی دی اور ہر قسم کا مال عطا کیا، اس کو لایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں کا تعارف کروائیں گے، وہ اقرار کرے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ پوچھے گا تو کون سا عمل کر کے لایا۔ وہ کہے گا میں نے ہر اس مصرف میں مال خرچ کیا' جہاں خرچ کرنا تجھے پسند تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ تو جھوٹا ہے، تو نے تو اس لیے کیا تا کہ تجھے سخی کہا جائے اور کہہ دیا گیا۔ پھر اس کے بارے میں حکم دیا جائے گا اور چہرے کے بل گھسیٹ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ (مسلم، نسائی)، الحاکم، البیہقی، ابو نعیم "الحلیہ"، الخطیب "تقیید العلم" مسند احمد)۔ روز حشر اللہ کے عرش سے ہونے والے فیصلے ہم ٹیلی ویژن کے ٹاک شوز میں کرتے ہیں یا مسجدوں، مدرسوں، گلیوں، بازاروں اور چائے خانوں میں، ہماری بدنصیبی کی بھی کوئی حد ہے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

روزنامہ دنیا

خوفِ خدا، خدمتِ خلق کی ضمانت

اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

تھرپارکر میں قحط سالی آئی تو ایک بار پھر مملکت خداداد پاکستان کے اس المیے کی یاد آئی جس نے ملک کو مسلسل منافقت کا شکار کر رکھا ہے۔ یہ منافقت اٹھارہ کروڑ عوام نہیں بلکہ ایک فیصد سے بھی کم اس طبقے کی علامت ہے جس کے دل و دماغ اور وفاداریاں غیر محسوس طریقے سے بیرونی سرمائے نے خرید رکھی ہیں اور وہ لوگ آپ کو روزانہ میڈیا پر اس ملک میں انسانی حقوق کی پامالی' عورتوں کی بے حرمتی' غربت و افلاس' بچوں کی اموات' آبادی میں اضافے اور اس طرح کی دیگر خامیوں پر دھواں دھار تقریریں کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ مخصوص عالمی دنوں پر واک بھی کرتے ہیں اور موم بتیاں بھی جلاتے ہیں۔ یہ اس شخص' گروہ یا جماعت سے نفرت کا اظہار کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں جس کا اسلام سے تھوڑا سا بھی تعلق ہو۔ ایسے لوگوں کے خلاف گفتگو کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے' غصہ تیز ہو جاتا ہے' آواز حقارت سے بھرپور ہو جاتی ہے اور ان کا بس نہیں چلتا کہ ہر داڑھی والے' ماتھے پر محراب کا نشان سجائے اور ٹخنوں سے اونچی شلوار والے شخص کو زندہ دفن کر دیں۔ ان کے ہمنوا دانشور' کالم نگار اور اینکر پرسن ان کی آواز میں آواز ملاتے ہیں اور ایسے لوگوں کو اپنی تحریروں اور پروگراموں میں تضحیک کا نشانہ بناتے ہیں لیکن جب کبھی اس ملک میں زلزلہ یا سیلاب آئے' قحط سالی ہو یا کوئی اور قدرتی آفت آ جائے تو ان کی حیرت اور شرمندگی کے لیے اللہ کے وہی نیک بندے خلقِ خدا کی خدمت میں جوق در جوق میدان میں آ نکلتے ہیں۔ وہی اللہ کو حاکم اعلیٰ ماننے والے' اسی کے سامنے سربسجود ہونے والے' اسی کی بڑائی اور عظمت کا درس دینے والے ہی اللہ کی مخلوق کی خدمت اور دادرسی کرتے نظر آتے ہیں۔ میرے ملک کے یہ دانشور آج تک اس بات پر یقین نہیں کر پائے کہ لوگوں کی خدمت اور انسانوں کی مدد کا تعلق مذہب' اللہ پر ایمان اور آخرت کی جوابدہی سے وابستہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کمیونسٹ ممالک یعنی روس' چین، کوریا اور کیوبا وغیرہ سے آج تک کوئی بڑا مخیر شخص پیدا نہ ہو سکا اس لیے کہ کمیونزم نے جبر اُدہریت کو فروغ اور مذہب کو دیس نکالا دیا۔

سول سوسائٹی' این جی اوز اور انسانوں کے دکھ میں بے حال ہوتے انسانی حقوق کے علمبردار آپ کو کسی آفت' بیماری' قحط' زلزلے اور سیلاب میں نظر نہیں آئیں گے۔ یہ لوگ کون ہیں اور ان کو پالتا کون ہے؟ ان کو پالنے والے کس ملک سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ میرے ملک میں کس ایجنڈے کے تحت اربوں ڈالر خرچ کر رہے ہیں؟ یہ اب پوشیدہ طور پر بھی نہیں بلکہ علی الاعلان اس ملک میں پھیلی ہزاروں این جی اوز کو سرمایہ فراہم کر رہے ہیں۔ ان کے کل سرمائے کو اگر اکٹھا کیا جائے تو اس ملک میں قحط' بیماری' خشک سالی اور غربت کا خاتمہ ہو جائے، لیکن ان کا یہ سرمایہ بڑی بڑی گاڑیوں' عالی شان دفتروں' ناقابل یقین حد تک بڑی تنخواہوں' ریسرچ رپورٹوں' سیمیناروں' آگاہی کے لیے لٹریچر' واک اور عالمی کانفرنسوں کے دوروں پر خرچ ہو جاتا ہے۔ جو لوگ ان ساری مراعات سے فائدہ اٹھا رہے ہوتے ہیں وہ سول سوسائٹی کے خوبصورت نام کے ساتھ اس ملک کے اٹھارہ کروڑ عوام کو روز یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ تم لوگ جاہل' ان پڑھ' ظالم' فرسودہ عقائد رکھنے والے اور پرلے درجے کے حیوان ہو جن میں انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔

پاکستان میں این جی اوز کو سرمایہ فراہم کرنے کے لیے ساٹھ کے قریب بڑے بڑے ڈونرز نے اپنے دفاتر کھولے ہوئے ہیں۔ ان ڈونرز میں بڑی بڑی مغربی حکومتیں بھی شامل ہیں اور ان کے اندر مخصوص مفادات کے لیے کام کرنے والی تنظیمیں بھی۔ حکومتوں کے ڈونرز نے اپنے اپنے سفارت خانوں میں یہ دفاتر کھول رکھے ہیں اور ''خواہش مند'' مرد و خواتین ان دفاتر میں پراجیکٹ بنا کر لے جاتے ہیں اور فنڈ حاصل کرتے ہیں۔ ان میں چند بڑے ڈونرز کے نام' ان کے کام اور ہیڈ کوارٹرز ملاحظہ کریں۔ Action Aid (لندن)' یہ غربت ختم کرنے کے لیے فنڈ دیتی ہے۔ Acumen Fund (نیویارک)، یہ معاشرتی مسائل کے حل تلاش کرنے پر ڈالر دیتی ہے۔ Aus Aid (کینبرا، آسٹریلیا) غربت کے خاتمے کے لیے' CFLI-CIDA (اوٹاوا' کینیڈا) غربت کے خاتمے کے لیے' یہ آغا خان کی سب سے بڑی ڈونر ہے۔ CRS (بالٹیمور، امریکہ) عورتوں' بچوں اور اقلیتوں کی فلاح' Church World Service (امریکہ) اقلیتوں کا تحفظ' Concern Pakistan (ڈبلن، آئرلینڈ)' غربت کا خاتمہ، DFID (لندن) عورتوں' بچوں اور غریبوں کی فلاح۔ DIL- Development in Literacy (کیلیفورنیا' امریکہ) بچیوں کی تعلیم' FES (بون' جرمنی) لوگوں کی عوامی مسائل میں شمولیت بڑھانا' FNST (جرمنی)' آزادی کی ٹریننگ' GEP-Gender Equality Project (برطانیہ) اس کا نام ہی اس کا کام بنا دیا گیا ہے، GTZ (جرمنی) لوگوں کی حالت بہتر بنانا' Lloyd Foundation (کیلیفورنیا' امریکہ)' ایڈز کے خاتمہ میں تحقیق' KFW (جرمنی) اداروں کو بہتر بنانا' NORAD (اوسلو' ناروے)، معاشی' معاشرتی اور سیاسی بہتری، OXFAM (آکسفورڈ' برطانیہ) غربت کے خاتمے اور آفات میں کام کرتی ہے' RNE (ہالینڈ) انسانی حقوق' خواتین اور اقلیتیں' SAVE THE Children (لندن)' امریکہ) بچوں کے حقوق کے لیے جدوجہد، SSI (سسکس' برطانیہ) نابینا افراد کے لیے، SDC (برن، سوئٹزرلینڈ) پسماندہ افراد کے لیے، TAF (سان فرانسسکو' امریکہ) جمہوریت اور عورتوں کے حقوق، Tracaire (آئرلینڈ) جمہوریت' انسانی حقوق اور اقلیتیں، USAID (واشنگٹن) یہ ہر اس گروہ کو سرمایہ فراہم کرتی ہے جو پاکستان میں امریکی ایجنڈے کی تکمیل کے لیے کام کرے۔

ان تمام ڈونرز نے اپنے فنڈز یا سرمایہ جن اہداف میں خرچ کیا ان میں 87 فیصد اہداف خواتین سے متعلق ہیں۔ ان کے کل سرمائے سے جو کام کیے گئے ان میں ٹریننگ یعنی کورسز' سیمینار وغیرہ' معلومات کا تبادلہ' گاڑیوں کی خریداری یا فراہمی' کمپیوٹر' مشینری وغیرہ۔ ان عالمی ڈونرز کے علاوہ اقوام متحدہ کے ذیلی ادارے بھی ہیں اور مختلف ممالک کے سفارت خانے بھی اس ملک کی سول سوسائٹی کو براہ راست سرمایہ فراہم کر رہے ہیں۔

یہ سول سوسائٹی' یہ انسانی حقوق کے علمبردار' یہ خواتین کے دردمند اور غربت و افلاس کے خاتمے کے علمبردار جو سارا سال اپنی تقریروں' تحریروں' سیمیناروں اور لٹریچر سے عورتوں' بچوں' اقلیتوں اور غریبوں کی آواز بنے پھرتے ہیں، ان میں کوئی اپنے ائرکنڈیشنڈ دفاتر' پرتعیش رہائش گاہوں اور خوبصورت ماحول کو چھوڑ کر تھرپارکر کے لق و دق صحرا میں ان خانماں برباد عورتوں' بچوں اور انسانوں کی مدد کے لیے نہیں گیا۔ یہ سب اس وقت بھی نظر نہ آئے جب زلزلے کے دوران منوں مٹی' سیمنٹ اور سریے کے نیچے انسان دفن ہو رہے تھے اور مدد کے لیے چیخ رہے تھے۔ ان کی صورتیں سیلاب زدگان کی مدد میں بھی نظر نہ آئیں۔ ان سیلاب کی آفت کے شکار لوگوں میں بچے بھی تھے اور عورتیں بھی' اقلیتیں بھی تھیں اور غریب بھی۔ ان تمام این جی اوز نے زیادہ سے زیادہ یہ کیا کہ ان آفتوں پر خوبصورت رپورٹیں شائع کیں جو تصویروں سے مزین تھیں اور ان کی دیدہ زیب طباعت کروائی گئی۔ انہوں نے ان لوگوں کی آبادکاری اور بحالی پر سیر حاصل بحثیں کیں اور ٹیلی ویژن پر ان کی حالتِ زار پر لمبے لمبے بھاشن دیے۔ لیکن جب یہ سب لوگ ٹیلی ویژن پروگراموں میں جلوہ گر تھے اور بڑی بڑی باتیں کر رہے تھے تو اس دوران وہ لوگ جن کے دل میں اللہ کا خوف تھا' جو اس کی آیات پڑھ کر آخرت کے خوف سے کانپ اٹھتے تھے۔ وہ پہاڑوں' میدانوں' صحراؤں' دریاؤں اور وادیوں میں دیوانہ وار جا پہنچے۔ خلق خدا کو آفت سے بچانے کے لیے، کھانا، کپڑا اور چھت مہیا کرنے کے لیے ان سے پہلے کوئی ان لوگوں تک نہ پہنچ سکا۔ اس لیے کہ انہیں لوگوں کی مدد کے لیے کسی ڈونر کی ضرورت نہیں ہوتی' ان کا ایجنڈا اور ٹارگٹ گروپ سرمایہ فراہم کرنے والا نہیں ہوتا بلکہ انہیں اللہ نے حکم دے رکھا ہے کہ تمہارے سرمائے اور وسائل میں کس کا حق ہے۔ خوفِ خدا کو نکال کر ملک ایک ایسی چراگاہ بن جاتے ہیں جہاں صرف بھیڑیوں کا راج ہوتا ہے۔ مال و دولت کی ہوس میں گم...... خونخوار بھیڑیے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

خونی چاند، اسرائیل اور مسلمان

یہ صرف ایک کتاب نہیں جس کے مندرجات نیویارک ٹائمز میں چھپے تو شور بپا ہو گیا۔ کارلوٹا گیل (Carlotta Gall) نے اپنی اس کتاب میں افسانوی انداز سے پاکستان کی حکومت خصوصاً فوج کا تعلق اسامہ بن لادن کے ساتھ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے جس طرح کوئٹے کی گلیوں اور بازاروں میں طالبان کی ٹریننگ اور بھرتی کے افسانے تراشے ہیں، اس پر اسلام آباد، لاہور اور کراچی کے دانشور تو شاید یقین کر لیں لیکن بلوچستان کے قبائلی معاشرے میں بسنے والے لوگ' جہاں ذرا سی آمدورفت لوگوں کی آنکھوں سے پوشیدہ نہ رہتی ہو اور جس معاشرے کے بارے میں آج بھی لوگ اعتماد سے کہتے ہوں کہ وہاں نہ قتل چھپ سکتا ہے نہ چوری، وہاں کے رہنے والے یہ کہانی پڑھیں یا تصویریں دیکھیں تو انہیں ہنسی آئے گی۔ لیکن اس کتاب کو یقین کی طرح پھیلانے والوں کی کمی نہیں۔ پوری دنیا کا میڈیا جن لوگوں کے کنٹرول میں ہے' وہ یہ کہانی یہیں ختم نہیں کریں گے بلکہ یہ تو ان کے لیے آغاز ہے۔ آغاز کیوں ہے؟ اس کا جواب ہر اُس شخص کو آسانی سے مل سکتا ہے جو گزشتہ دو تین برسوں سے اسرائیل اور امریکہ میں موجود طاقتور ترین صیہونی لابی کی طرف سے 2014ء میں آنے والے دنوں کے خواب اور اس حوالے سے دنیا بھر میں پھیلائے جانے والے پروپیگنڈے کے بارے میں جانتا ہو۔ اسرائیلی اور امریکی میڈیا ان دنوں کی پیش گوئیوں سے بھرا پڑا ہے۔

ان پیش گوئیوں کا آغاز وہ یہودیوں کی مقدس کتاب تالمود سے کرتے ہیں۔ تالمود کے مطابق ''جب چاند گرہن لگتا ہے تو یہ بنی اسرائیل کے لیے بُرا شگون ہوتا ہے، لیکن اگر چاند کا چہرہ ایسے سرخ ہو جائے جیسے خون تو سمجھو دنیا پر تلوار آ رہی ہے''۔ دنیا بھر کے یہودی گزشتہ دو ہزار سال سے ان چاند گرہنوں کا مطالعہ کرتے چلے آ رہے ہیں۔ یہودیوں میں تصوف کی بہت بڑی تحریک ہزاروں سال سے چلی آ رہی ہے جسے وہ 'قبالہ' کہتے ہیں۔ ان کے ہاں پہلے تصوف کا علم زبانی طور پر منتقل کیا جاتا رہا لیکن پھر تصوف پر مبنی لٹریچر نے جنم لیا۔ تین کتابیں 'باہیر' 'سفر راذیل حمالخ' اور 'ظہر' لکھی گئیں۔ آج بھی یہ سلسلۂ تصوف 'قبالہ' کی رہنما تصانیف مانی جاتی ہیں۔ حروفِ ابجد اور الفاظ کے اعداد نکالنے کا سلسلہ ان کے ہاں رائج ہے۔ ہمارے ہاں بھی حروفِ ابجد وہی ہیں جو ان کے ہاں ہیں۔ یہودی علم نجوم سے دور رہتے ہیں لیکن چاند اور سورج کے گرہنوں کے دوران زمین پر ہونے والی تبدیلیوں کا مطالعہ اپنی مقدس کتابوں کی روشنی میں ضرور کرتے ہیں۔

ان کے نزدیک تاریخ میں جب کبھی چار خونی چاند گرہن ایک ترتیب میں آئے تو بنی اسرائیل کے لیے ایسی آفت کا آغاز ہوا جس میں یقینی فتح پوشیدہ ہوتی ہے اور آخر فتح ہو ہی جاتی ہے، ایسا تاریخ میں بار بار ہوا۔ اس سارے عمل کو وہ 'ایلی' یعنی اللہ کی نشانیوں میں سے ایک واضح نشانی جانتے ہیں۔ خونی چاند گرہن، مکمل چاند گرہن کو کہا جاتا ہے یعنی جب چاند زمین کے سائے میں چھپ جانے کی وجہ سے بالکل سرخ رُو ہو جاتا ہے۔ یہ چار مسلسل چاند گرہن گزشتہ پانچ سو سال میں صرف تین مرتبہ لگے۔ ان کی اہمیت کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ اس بات کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ یہ خونی چاند کسی نہ کسی یہودی مذہبی دن کے دوران ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ گزشتہ صدیوں میں یہ چاند گرہن دو یہودی مذہبی دنوں میں مسلسل رونما ہوتے رہے اور اب 2014ء میں دو دفعہ اور 2015ء میں پھر دو دفعہ مسلسل انہی دنوں میں رونما ہوں گے۔ گزشتہ پانچ سو سال کی تاریخ میں پہلی دفعہ 1492-93ء میں ایسا ہوا اور بنی اسرائیل پر آفت آئی۔ سپین کو ازابیلا اور فرڈیننڈ نے فتح کیا اور یہودیوں پر افتاد ٹوٹ پڑی۔ وہ قتل کیے گئے، غلام بنا لیے گئے، ان سے زبردستی عیسائی مذہب اس طرح قبول کروایا گیا کہ سود کھانا لازمی قرار دیا گیا اور ہفتے کے دن کاروبار کرنا بھی۔ لیکن اسی دوران کولمبس نے امریکہ دریافت کر لیا جسے یہودی اپنے لیے 'ایلی' یعنی اللہ کی طرف سے ایک فتح کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ یہودی وہاں جا کر آباد ہوئے اور آج وہ اس کی سیاست، معیشت اور میڈیا پر قابض ہیں۔ دوسری دفعہ ایسے چار خونی چاند گرہن 1949-50ء میں ظہور پذیر ہوئے تو اسرائیل وجود میں آ چکا تھا اور ڈیوڈ بن گوریان کی حکومت بن چکی تھی۔ اس حکومت کے خلاف سات عرب ممالک کی افواج متحد ہو کر حملہ آور ہوئیں۔ اس وقت اسرائیل ایک نوزائیدہ ملک تھا اور مغرب میں یہودیوں کے خلاف نفرت اور قتلِ عام سے بھاگے ہوئے یہودی یہاں آباد تھے۔ اسرائیل کے پاس صرف ایک ٹینک تھا لیکن قوم پرست عربوں کے پاس دو سو ٹینک تھے۔ اسرائیلی یہ سمجھتے ہیں کہ 'ایلی' نے انہیں قوم پرست، روس نواز عربوں پر فتح دی۔ تیسری دفعہ یہ چار خونی چاند 1967-68ء میں طلوع ہوئے۔ اس دوران مشہور عرب اسرائیل معرکہ ہوا۔ ایک جانب قوم پرست اور کمیونسٹ نواز عرب تھے جنہیں روس کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اسرائیل کی آبادی 8 لاکھ تھی اور عرب 5 کروڑ تھے۔ چار ملک مصر، شام، لبنان اور اردن نے حملہ کیا۔ روس نے دو ارب ڈالر کا اسلحہ فراہم کیا۔ یہ وہ جنگ تھی جس میں مصر کے سیکولر حکمران جمال عبدالناصر نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا: ''اے فرعون کے بیٹو! آج تمہارا موسیٰ کے بیٹوں سے مقابلہ ہے۔ اپنی تاریخی شکست کا بدلہ چکا لو''۔ ان نام نہاد مسلمان اور سیکولر عربوں نے دراصل اللہ کے دشمن کا نام لیا جو مناسب بات نہ تھی۔ دوسری جانب امریکہ اسرائیل کی مدد کو آیا اور دو ہزار سال بعد یروشلم کا مقدس شہر یہودیوں کے قبضے میں چلا گیا۔

گزشتہ دو سال سے یہودی آنے والے چار خونی چاند گرہنوں کا انتظار کر رہے ہیں اور پورے اسرائیل کے معبدوں میں مستقل دعائیں اور دیوار گریہ پر عبادت ہو رہی ہے۔ ان میں پہلا خونی چاند گرہن 15 اپریل 2014ء کو لگے گا۔ اس دوران یہودیوں کا مشہور تہوار 'پیدش' جسے انگریزی میں Passover کہتے ہیں، ہو گا۔ یہ سات دن تک چلتا ہے۔ اس دوران یہودی مخصوص روٹی پکاتے اور معبد کے سامنے قربانی کرتے ہیں۔ دوسرا خونی چاند گرہن 8 اکتوبر 2014ء کو لگے گا اور اس دوران یہودیوں کا مشہور مذہبی دن سکوٹ ہو گا جسے انگریزی میں Feast of Tabernacle کہا جاتا ہے۔ اس تہوار کے آخر میں یوم کپور آتا ہے۔ یہ یہودیوں کی مصر سے صحرائے سینائی کی طرف روانگی اور پھر چالیس سال تک وہاں اللہ کے عذاب میں بھٹکنے کی یاد میں ہے۔ تیسرا خونی چاند 4 اپریل 2015ء کو طلوع ہو گا اور یہ 'پیدش' کے دنوں میں ہو گا اور چوتھا خونی چاند 28 ستمبر 2015ء کو ہو گا اور یہ سکوٹ کے دنوں میں ہو گا۔ پوری عالمی یہودی برادری یہ تصور کر رہی ہے کہ یہ اسرائیل کے لیے کسی جنگ کا آغاز ہو گا' جس کے آخر میں فتح ہو گی۔ ان کے اخبارات، رسائل اور میڈیا میں اس سارے عمل کو Tragedy and then Triumph کہتے ہیں۔ یعنی ''غم واندوہ کے بعد کامیابی''۔ اس سارے پس منظر میں دنیا بھر کا یہودی میڈیا بلکہ مغربی میڈیا' جو ان کے قبضے میں ہے، تمام عرب ممالک میں آنے والی عرب بہار کو مسلم امہ کے لیے خوفناک قرار دے رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ اب عرب دنیا پورے عالم کے لیے ایک خطرہ بن چکی ہے۔ اس دوران وہ یہ بھی پروپیگنڈا کر رہے ہیں کہ امریکہ اب دنیا میں امن قائم کرنے کے قابل نہیں رہا اور اسرائیل کو خود آگے بڑھ کر عالمی دہشت گردی کو روکنا ہو گا۔ مسلمانوں سے جنگ کے راستے میں سب سے زیادہ کھٹکنے والی چیز پاکستان کا ایٹمی پروگرام ہے۔ اس کے خلاف ایک منظم مہم کا آغاز بہت پہلے سے ہو چکا ہے لیکن اب اس میں شدت لائی جائے گی۔ عربوں کی بے چینی سے فائدہ اٹھا کر حملوں کی تیاریاں کی جا رہی ہیں کیونکہ یہودیوں کی اکثریت یہ یقین رکھتی ہے کہ اب ان کی عالمی حکومت قائم ہونے کے دن آ گئے۔ یہ وہی حکومت ہے جسے سیّد الانبیاء ﷺ نے مسیح دجال کے ظہور سے تعبیر کیا ہے۔ خطرہ سر پر منڈلا رہا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''دجال کا ظہور اس وقت ہو گا جب مساجد میں اس کا ذکر ختم ہو جائے گا''۔ کیا ہم پھر اس خطرے کا مقابلہ فرعون کی اولاد، قریش کی قوم، سائرس اعظم کی نسل اور موئن جودڑو کے وارثوں کی حیثیت سے کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر شکست ہمارا مقدر ہے، اس لیے کہ میرے اللہ کا وعدہ صرف اپنے بندوں کے ساتھ ہے رنگ، نسل، زبان اور علاقے کے بندوں کے ساتھ نہیں۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں

جس دن سے اس ملک میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ کے مطابق قوانین شرعیہ کے نفاذ کے مطالبے اور گفتگو کا آغاز ہوا ہے' دو طبقات ایسے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور خلفائے راشدین کے دور سے ایسی مثالیں ڈھونڈ کر سامنے لاتے ہیں جس سے یہ جواز پیدا کیا جا سکے کہ اللہ کی بتائی گئی سزائیں یا احکامات وقت اور حالات کے تحت تبدیل کی جا سکتی ہیں۔ ان میں ایک تو وہ سیکولر طبقہ ہے جس کا مقصد قرآن و سنت کو ناقابل عمل اور سزاؤں کو وحشیانہ ثابت کرنا ہوتا ہے' دوسرے وہ دانشور اور علماء ہیں جو مغرب کی تہذیب و ثقافت سے اس قدر متاثر ہیں کہ اسلام میں جو چیز مغرب کے قانون' تہذیب یا اخلاق پر پوری نہیں اترتی اسے اول تو توجیہات سے اسلام سے خارج کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اگر ایسا ممکن نہ ہو سکے تو اس کی تبدیلی کا اختیار حکمران' عوام یا پھر پارلیمنٹ کو دینے کے لیے تاریخی حوالے ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ اس معاملے میں سب سے زیادہ سیدنا عمرؓ کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ کوئی ان کے فیصلوں کو بغیر سیاق و سباق ایسے پیش کرتا ہے جیسے مجتہد عصر ہو۔ یہ مجتہدین ٹیلی ویژن پروگراموں اور بحثوں میں ایک دلیل ٹھونک بجا کر دیتے ہیں اور وہ یہ کہ حضرت عمرؓ نے چوری کی سزا میں ہاتھ کاٹنے کا صریح حکم قحط کے زمانے میں معطل کر دیا تھا۔

اس سے پہلے کہ اس حکم کی شرعی باریکیوں کی جانب آؤں مجھے ان ماہرین علم دین و دنیا سے ایک سوال کرنا ہے: اگر سیدنا عمرؓ کے اس حکم پر اتنا زور دیتے ہو تو کیا ان کے باقی تمام احکام بھی اسی طرح نافذ کرنا چاہو گے؟ ایسے لگتا ہے کہ ملک میں مکمل شریعت نافذ ہو چکی ہے، زانی کو سنگسار کیا جا رہا ہے، سود کا خاتمہ ہو چکا ہے، پردے کے احکامات نافذ ہیں، ذخیرہ اندوزی پر سزا اور جھوٹے الزام (قذف) پر کوڑے لگ رہے ہیں، بس اچانک قحط آ گیا ہے اور اب قرآن کا حکم معطل کر دینا چاہیے کیونکہ سیدنا عمرؓ ابن خطاب نے ایسا کیا تھا۔ کیا سیدنا عمرؓ نے صرف یہی حکم جاری کیا تھا کہ ہاتھ کاٹنے کی سزا پر عمل نہ ہو؟ کیا عمرؓ ابن خطاب کے سوئس بنکوں میں اربوں ڈالر اور بیرون ملک کاروبار کے باوجود قحط آیا تھا؟ کیا اربوں روپے ذاتی تعیش پر اڑانے' عالیشان محلات میں رہنے' وسائل اور سرمائے پر چند افراد کے قابض ہونے اور لاکھوں ٹن غلہ ذخیرہ ہونے کے باوجود قحط آیا تھا؟ سیدنا عمرؓ کا طرز عمل دیکھیں، حضرت عمرؓ کی رنگت انتہائی سفید تھی' آپ گھی اور دودھ استعمال کرتے تھے' لیکن جب لوگ قحط میں مبتلا ہوئے تو دونوں چیزیں اپنے اوپر حرام کر لیں' جس کی وجہ سے ان کی رنگت سیاہ پڑ گئی (علی بن حسن، تاریخ مدینہ' دمشق) ان کے غلام اسلم کے بقول ''ہمیں اندیشہ تھا کہ اگر قحط کا خاتمہ نہ ہوا تو حضرت عمرؓ شدت غم سے انتقال کر جائیں گے'' (المصرفۃ التاریخ) یہ رویہ صرف حضرت عمرؓ نے اپنی ذات تک لازم قرار نہ دیا بلکہ ''حضرت عمرؓ نے کھاتے پیتے گھرانوں کو فقراء اور مساکین کے کھانے کے انتظام کرنے کا حکم دیا (ابن رجب، فتح الباری) ''مسلمانوں کے گھروں میں جتنے لوگ موجود ہوتے حضرت عمرؓ اتنے ہی اور بھیج دیتے اور فرماتے کہ انسان آدھی غذا سے ہلاک نہیں ہوتا'' (فتح الباری) اور وہ اس کا استدلال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے لیتے: ''ایک فرد کا کھانا دو کے لیے' دو کا چار اور چار کا کھانا آٹھ کے لیے کافی ہوتا ہے''۔ (مسلم) یہ قحط 17 ہجری کے آخر میں اور 18 ہجری کے آغاز میں آیا تھا، اسے ''عام امرمادہ'' کہتے ہیں۔ یہ قحط اس قدر شدید تھا کہ بہت سے لوگ لقمہ اجل بن گئے' یہاں تک کہ وحشی درندے بھی گھبرا کر انسانوں کے پاس پناہ لیتے تھے۔ (العینی) چوری کی سزا کے موقوف کرنے کا استدلال بھی سیدنا عمرؓ نے قرآن پاک کی سورۃ المائدہ کی اس آیت سے لیا: ''پس جو شخص شدت کی بھوک میں بے قرار ہو جائے بشرطیکہ کسی گناہ کی طرف اس کا میلان نہ ہو تو یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا اور مہربان ہے'' (3:5) حضرت عمرؓ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ تھے اور انہیں علم تھا کہ اضطرار کی حالت میں آپؐ کا کیا طرز عمل تھا۔ وہ طرز عمل ملاحظہ ہو۔

حضرت عبادہؓ بن شرجیل کہتے ہیں: ''ہمارے علاقے میں قحط پڑ گیا تو میں بھوک سے مجبور ہو کر مدینہ کے ایک باغ میں گھس گیا اور وہاں سے کچھ خوشے توڑ کر کھا لیے اور کچھ اپنے کپڑے میں باندھ لیے۔ اتنے میں باغ کا مالک آ نکلا، اس نے مجھے مارا اور میرا کپڑا بھی چھین لیا۔ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور سارا قصہ ذکر کیا۔ آپؐ نے باغ کے مالک سے فرمایا: اگر یہ بھوکا تھا تو تُو نے اسے کھانا نہیں کھلایا اور اگر یہ نادان تھا تو تُو نے اسے تعلیم نہیں دی، پھر اس کو کپڑا واپس کرنے کا حکم دیا اور حضرت عبادہ کو ایک نصف وسق غلہ دینے کا حکم دیا'' (سنن ابن ماجہ) یہ تھا رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل، وہ جو شارع قرآن ہیں۔ یہ قرآن ان پر نازل ہوا تھا، اس ملک کے کسی ماڈرن مولوی یا جدید دانشور پر نہیں اترا تھا۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک قحط زدہ شخص پر حد نافذ نہیں کرتے تو وہ شہر جس پر بحیثیت مجموعی قحط ہو' وہاں حد کو موقوف کرنے پر حضرت عمرؓ کو نئی شریعت کا بانی کیسے کہا جا سکتا ہے؟ جہاں تک زمینوں کے بارے میں حضرت عمرؓ کا فیصلہ تھا وہ قرآنی تعلیمات اور رسول اکرم ﷺ کے طرزِ عمل کے عین مطابق ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اس ساری بحث کو سمیٹتے ہوئے لکھا ہے: ''نبی اکرم ﷺ نے یہ فیصلہ نہیں فرمایا کہ مفتوحہ زمینیں ہمیشہ مجاہدین میں تقسیم کی جاتی ہیں۔ اگر ایسا کوئی حکم حضورؐ نے دیا ہوتا اور حضرت عمرؓ نے اس کے خلاف عمل کیا ہوتا تو آپ کہہ سکتے تھے کہ انہوں نے حضور ﷺ کا فیصلہ بدل دیا یا پھر یہ دعویٰ اس صورت میں کیا جا سکتا تھا جبکہ حضرت عمرؓ نے اپنی زمینوں کو مجاہدین سے واپس لے لیا ہوتا جنہیں حضور ﷺ نے اپنے عہد میں تقسیم کیا تھا' لیکن ان دونوں میں سے کوئی بھی بات پیش نہیں آئی تھی۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ منقولہ زمینوں کو لازماً مجاہدین میں تقسیم کر دینا سرے سے کوئی اسلامی قانون تھا ہی نہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے مفتوحہ اراضی کے معاملے میں حسب موقع و ضرورت مختلف موقعوں پر مختلف فیصلے فرمائے تھے' بنو نضیر، بنی قریظہ، خیبر' فدک' وادی القریٰ' مکہ' طائف کی مفتوحہ اراضی میں سے ہر ایک کا بندوبست عہدِ رسالتؐ میں الگ الگ طریقوں سے کیا گیا تھا اور ایسا کوئی ضابطہ نہیں بنایا گیا تھا کہ آئندہ ایسی اراضی کا بندوبست لازماً فلاں طریقے یا طریقوں سے کیا جائے۔ اس لیے حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں صحابہؓ کے مشورہ سے اراضی مفتوحہ کا جو بندوبست کیا' اسے حضور ﷺ کے فیصلوں میں ردوبدل کی مثال قرار نہیں دیا جا سکتا'' (سنت کی آئینی حیثیت)

میرے محدود مطالعہ کے مطابق حضرت عمرؓ کا کوئی فیصلہ ایسا نہیں جو کتاب اللہ' سنتِ رسول ﷺ کے مطابق نہ تھا اور اگر دونوں کسی سلسلے میں خاموش ہوتے تو وہاں بھی حضرت عمرؓ رسول اکرم ﷺ کی ان ہدایات پر عمل کرتے جو آپؐ نے معاذ بن جبلؓ کو گورنر بناتے وقت کی تھی' یعنی اہلِ الرائے سے مشورہ کر کے عمل کرنا۔ اگر یہ صرف ایک علمی بحث ہوتی تو شاید میں اس بحث میں نہ پڑتا، لیکن کم از کم پانچ ''عظیم'' دانشوروں نے اپنی تحریروں سے ایسے نتیجے اخذ کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت عمرؓ کے مقامِ اجتہاد پر موجودہ حکمرانوں کو بٹھا دیا جائے۔ علمی بحث بھی گزشتہ چودہ سو سالوں میں اس امت نے کبھی نہیں کی بلکہ حضرت عمرؓ کے اقدامات سے اس طرح کے نتائج سب سے پہلے ڈاکٹر صبحی محمصانی نے اپنی کتاب ''فلسفہ تشریع الاسلامی'' میں اخذ کیے۔ اس عرب سکالر کی کتاب 1945ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد مولوی تقی امین کی ''احکام شریعہ میں حالات و زمانہ کی رعایت'' محمد حنیف ندوی کی ''مسئلہ اجتہاد'' اور غلام احمد پرویز شامل ہیں۔ ان لکھے گئے کالموں میں یہ چند نکات انہی کتابوں میں پہلی دفعہ پیش کیے گئے جنہیں ان لوگوں نے اپنے مقاصد کے لیے درج کر دیا۔ ان نکات کا مختلف علماء نے اپنی کتابوں میں سیر حاصل جواب دیا ہے، لیکن اس ملک کا سیکولر طبقہ' کارپوریٹ جمہوریت کے علمبردار اور اسلام کو کھینچ تان کر مغربی اقدار کے تابع کرنے والے اور اینگلو سیکسن قانون کے عشاق وکلاء انہیں بار بار پیش کرتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ اس ملک میں شریعت مکمل طور پر نافذ ہو چکی ہے اور تمام حکمران امیر المومنین ہیں' پارسا ہیں اور بس صرف انہی چند تعبیروں کا مسئلہ باقی رہ گیا ہے۔ جو لوگ شریعت کے قانون کو فرسودہ' وحشیانہ اور دقیانوسی کہتے نہیں تھکتے ان کے قلم سے سیدنا عمرؓ کو ایک نئی شریعت کے بانی کی حیثیت سے پیش کرنے کی مقاصد پوشیدہ نہیں۔ مقصد ایک ہی ہے کہ پارلیمنٹ کے کرپٹ اور بے علم ارکان کو فقیہ بنایا جائے اور بھٹو' بے نظیر' نواز شریف کو امیر المومنین۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

کھل گئے یاجوج اور ماجوج کے لشکر تمام

علامہ محمد اقبالؒ کو اللہ نے جو بصیرت عطا فرمائی تھی اس کا ماخذ صرف اور صرف قرآن حکیم تھا جس کا تذکرہ انہوں نے اپنے اس فارسی شعر میں کیا ہے۔

گر دلم آئینۂ بے جوہر است
گر بحرفم غیرِ قرآں مضمر است

''اگر میرے دل کے آئینے میں کوئی خوبی نہیں ہے، اگر اس میں قرآن کے سوا کوئی حرف بھی چھپا ہوا ہے''، اس دعوے کے بعد وہ اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ میری عزت و ناموس کا پردہ چاک کر دے اور مجھے روزِ محشر رسوا کر دے۔ یہ دعویٰ یقیناً اقبال کے کلام میں غوطہ زن ہونے کے بعد ہی سچا دکھائی دیتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اقبال نے مغربی تہذیب اور موجودہ دور کے سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی نظام کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھا اور پھر اسے کھوٹا، جعلی اور انسانیت کے لیے زہرِ قاتل قرار دیا۔ اقبال جس زمانے میں امت مسلمہ کو بیدار کر رہے تھے اس دور میں یہ نظام اپنی جڑیں پکڑ رہا تھا۔ مسلمانوں کی مرکزیت کی علامت 'خلافت' منہدم کی جا چکی تھی اور اس کی جگہ پوری دنیا کو سیکولر قومی ریاستوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ سود' جو کبھی ایک انفرادی معاملہ ہوتا تھا' کو بینکوں کے ایک وسیع تر نظام، جعلی کاغذ کے نوٹ اور حکومتی قرضوں کے ذریعے مستحکم کر دیا گیا تھا۔ پوری دنیا میں خواتین کے حقوق کے نام پر عورتوں کی ایک عالمگیر تحریک نے جنم لے لیا تھا۔ اللہ کی حاکمیت کی جگہ عوام اور پارلیمنٹ کی حاکمیت پر مبنی جمہوری نظام ایک میٹھے زہر کی طرح پھیل چکا تھا۔ اقبال کی نگاہِ تیز سمجھتی تھی کہ یہ سب کچھ اچانک نہیں ہو رہا بلکہ یہ ایک مکمل نظام کے نفاذ کی مربوط شکلیں ہیں۔ یہ پورا نظام جو سود کی لعنت اور مصنوعی کرنسی سے حاصل کی گئی دولت کے گرد گھومتا ہے، اسے اقبال نے جب قرآن کی کسوٹی پر پرکھا تو انہوں نے اس نظام کے ہر تصور یعنی جمہوریت، بینکاری، قومی ریاستیں، اور نسوانی نمائش کے مکروہ جال کا رد کیا۔ یہ نظام کس کا ہے۔ اقبال جب قرآن کی سورت الانبیاء کی آیات نمبر 96,95 میں بیان کردہ حقیقت کو دیکھتے ہیں تو یہ شعر تخلیق کرتے ہیں۔

کھل گئے یاجوج اور ماجوج کے لشکر تمام
چشمِ مسلم دیکھ لے تفسیرِ حرفِ ''ینسلون''

یہ آیات یوں ہیں ''اور ممکن نہیں ہے کہ جس بستی کو ہم نے ہلاک کر دیا ہو پھر وہ وہاں پلٹ آئیں، یہاں تک کہ جب یاجوج اور ماجوج کھول دیے جائیں اور ہر بلندی سے وہ نکل پڑیں۔'' یہ یاجوج اور ماجوج کون ہیں؟ پوری امت مسلمہ اس سوال پر گنگ ہے۔ لیکن قرآن تو واضح ہے۔ ان کی نشانی بتاتے ہوئے اللہ سورہ کہف میں فرماتا ہے۔ ''اے ذوالقرنین! یاجوج اور ماجوج اس زمین میں فساد پھیلانے والے لوگ ہیں (کہف۔94)۔ چونکہ یاجوج اور ماجوج نے زمانۂ آخر میں فساد پھیلانا تھا اس لیے ذوالقرنین نے ان پر ''آرمی ایکشن'' نہیں کیا بلکہ دو پہاڑوں کے درمیان درے میں تانبے اور لوہے کی ایک دیوار بنا دی اور فرمایا کہ یہ اسے اس وقت تک عبور نہیں کر سکتے جب تک اللہ اس کا اذن نہ دے۔ اب قرآن پاک کی سورۃ الانبیاء کی آیات میں دی گئی قوم کو تاریخ کے حوالوں سے دیکھیں کہ یہ کون سی قوم ہے جو اپنے علاقے میں واپس آ چکی ہے۔ بنی اسرائیل پر اللہ اپنے عذاب کا ذکر بہت تفصیل سے فرماتا ہے اور واضح کرتا ہے۔ ''اور ہم نے دنیا میں ان کو مختلف جماعتوں میں بانٹ دیا''۔ یہ وہ واحد قوم ہے جن کی بستی ایسے تباہ نہیں کی گئی کہ کوئی بھی زندہ نہ بچے' جیسے عاد و ثمود، بلکہ انہیں بخت نصر نے حملہ کر کے تباہ و برباد کر دیا اور یہ پوری دنیا میں پھیل گئے اور دو ہزار سال تک مختلف ملکوں کی خاک چھانتے رہے۔ یہ بستی مقدس یروشلم ہے' جس کے اردگرد یہودی پہلی جنگ عظیم کے بعد 1920ء کے آس پاس واپس آ کر آباد ہونا شروع ہوئے۔ اس آباد کاری میں ان کے ساتھ عالمی طاقتوں نے بالفور معاہدہ کیا تھا۔ یہ قرآن کی بتائی گئی بستی میں واپس آ گئے ہیں تو پھر یاجوج اور ماجوج کو تو پوری دنیا پر چھا جانا چاہیے تھا۔ بلندیوں سے انہیں دنیا میں گھس آنا چاہیے تھا۔ یہ یاجوج اور ماجوج کون ہیں؟ یہ ہے وہ سوال جسے اقبال نے اپنے اس شعر میں حل کیا ہے اور چشمِ مسلم کو کہا ہے کہ قرآن کے لفظ ''ینسلون'' کی' تفسیر دیکھ لے۔ یہ کون ہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''اللہ نے بنی آدم کو دس حصوں میں تقسیم کیا۔ ان میں نو حصے یاجوج ماجوج بنائے اور ایک حصہ باقی سارے لوگ'' (مستدرکِ حاکم)۔ یعنی یہ بنی آدم میں سے ہیں، پھر فرمایا ''اگر انہیں کھلا چھوڑ دیا جائے تو وہ لوگوں پر ان کے معاش میں فساد پھیلائیں (طبرانی)' یعنی اس دنیا کا سودی نظام، کارپوریٹ کلچر اور کمیونسٹ معیشت سب ان کے فساد کی علامتیں ہیں۔ یہ کب سے آزاد ہونا شروع ہوئے؟ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی متفق علیہ روایت کے مطابق سیدہ زینبؓ بنت جحش فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ان کے پاس گھبرائے ہوئے آئے اور فرمایا ''عربوں کی خرابی ہے اس شر سے جو قریب آ گیا ہے''۔ پھر انگلی اور انگوٹھے کا اشارہ کرتے فرمایا ''آج اس کے برابر یاجوج اور ماجوج نے دیوار میں سوراخ کر لیا ہے''۔ تاریخ یہاں ایک واقعے کا ذکر کرتی ہے کہ کوہ قاف کے دامن' جہاں ذوالقرنین نے دیوار بنائی تھی' میں آباد ایک قبیلے نے انہی دنوں یہودیت کو مذہب کے طور پر اختیار کر لیا۔ آج ان یورپی یہودیوں کی نسل اس قدر بڑھ چکی ہے کہ تمام دنیا کے یہودیوں میں اصل بنی اسرائیل ایک فیصد ہیں اور یہ ننانوے فیصد۔ یہی وہ یہودی ہیں جنہوں نے 1896ء میں صیہونیت کی بنیاد رکھی اور مشہورِ عالم پروٹوکول (Protocols) تحریر کیے جس کے بعد انہوں نے تین معاملات میں ترقی کرنے اور ان پر قبضہ کرنے کا عزم کیا۔ (1) معاشی ادارے (2) سائنس اور ٹیکنالوجی اور (3) میڈیا۔ اس کے بعد دنیا بھر کے مفکرین، سائنسدان، میڈیا کے مالکان' بینکوں کے ماہر اور کارپوریٹ کلچر کے کرتا دھرتا، سب کے سب انہیں میں سے آئے۔ صرف نوبل انعامات کی فہرست، میڈیا مالکان کے نام، بینکوں کے کرتا دھرتا اور کارپوریٹ کمپنیوں کے مالکان کی فہرستیں اٹھا لیں' آپ کو ثبوت مل جائے گا۔ انہوں نے وہی کیا جو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا'' اگر انہیں کھلا چھوڑ دیا جائے تو وہ لوگوں کے معاش میں فساد پھیلائیں گے۔'' قرآن بھی انہیں فساد پھیلانے والے یعنی مفسدین کے نام سے یاد کرتا ہے۔ فساد پھیلانے والوں کی تعریف اللہ کریم نے سورۃ البقرہ کی ابتدائی آیات میں کھول کر فرما دی۔ ''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم زمین میں فساد نہ مچاؤ تو وہ کہتے ہیں ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں'' (البقرہ۔11) جنگ عظیم اول، دوم بھی امن قائم کرنے اور فسطائی نظریات کے لیے ہوئیں' ویت نام، جنوبی امریکہ کے دو درجن ممالک، عراق، افغانستان ہر جگہ یہ لوگ امن قائم کرنے کے نام پر چڑھ دوڑے۔ یہ لوگ صرف چند لاکھ یہودی نہیں بلکہ وہ پورا عالمی نظام ہے جو اس پوری دنیا میں اپنی جڑیں مضبوط کر چکا ہے۔ چونکہ یاجوج اور ماجوج دجال کی آمد سے پہلے اس کے پورے نظام کو مضبوط کرنے کے لیے نکالے گئے ہیں' اس لیے انہوں نے پوری دنیا کو اپنے نظام کا اسی طرح غلام بنا لیا ہے جیسے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا'' آدمی صبح کافر ہوگا اور شام کو مسلمان۔'' (مسند احمد) صبح وہ سود کے بینکاری نظام کو سجدہ کرتا ہے اور رات کو اللہ کے حضور۔ رات کو ٹیکنالوجی کو خدا مانتا ہے اور صبح اللہ کو۔ پارلیمنٹ میں بیٹھتا ہے تو اسے سپریم اور بالاتر سمجھتا ہے، اسے قانون کا ماخذ بتاتا ہے اور قرآن پڑھتے ہوئے اللہ کو سپریم کہتا ہے اور قرآن کو قانون کا ماخذ بتاتا ہے۔ ریاست اقتدارِ اعلیٰ کی علامت ہے جبکہ اللہ نے اقتدارِ اعلیٰ کو اپنے لیے خاص کرتے ہوئے اپنے آپ کو ''الملک'' کہا ہے۔ یاجوج اور ماجوج سے ہلاکت کی سب سے بڑی وجہ رسول اللہ ﷺ نے یہ بتائی۔ بخاری اور مسلم کی سیدہ زینبؓ والی حدیث کے آخر میں انہوں نے پوچھا ''یارسول اللہ کیا ہم ہلاک ہو جائیں گے؟ حالانکہ ہم میں نیک لوگ بھی ہیں''، آپؐ نے فرمایا، ''اس وقت جب فسق و فجور کی زیادتی ہوگی۔'' اس پورے نظام کی تان فحاشی و عریانی پر ٹوٹتی ہے جسے اس پورے نظام کے استحکام کی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ فیشن انڈسٹری سے لے کر عریانیت' تک ایک سیلاب ہے اور دنیا کی سیاحت کے کسی بھی کتابچے کو نکال لیں آپ کو ''نائٹ لائف'' کے نام پر ترغیبات ملیں گی۔ سب سے اہم بات قرآن کی آیت میں لفظ ''حدب'' یعنی بلندیوں سے حملہ آور ہوں گے۔ یہ اس فضائی برتری یا خلا سے سٹیلائٹ کے ذریعے جنگ کرنے کی صلاحیت ہے جیسے ڈرون اور دیگر آلاتِ حرب۔

ہماری بدقسمتی دیکھیں کہ ہم یاجوج ماجوج کے دجالی نظام میں اپنی عافیت تصور کرتے ہیں۔ امت کو اکٹھا کر کے خلافت قائم کرنے کی آواز بلند کرنے والے کو غدار کہا جاتا ہے اور قومی ریاست کے تحفظ کی قسم اٹھاتے ہیں۔ ہمارے علمائے کرام سود کے عالمی بینکاری نظام میں اپنا مصلیٰ بچھا کر اسے حلال قرار دیتے ہیں۔ کلچر، ثقافت، حقوقِ نسواں، سیاحت کی ترقی اور آزادیٔ اظہار کے نام پر فحاشی کو عام کرتے ہیں۔ ہمیں خبر تک نہیں کہ وہ وقت کتنا قریب آن پہنچا ہے۔ ہم جو قرآن کو اس کے عالمی اور ابدی تناظر کی بجائے عرب کے مخصوص حالات اور علامتوں سے سمجھتے رہے۔ خطرہ ہمارے سروں پر منڈلانے لگا ہے اور شاید یہی میرے اللہ کی منشا بھی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ دجال کا خروج اس وقت ہوگا جب مساجد میں اس کا ذکر ختم ہو جائے گا۔ (رواہ عبداللہ بن الامام احمد۔ قال الہیثمی) وہ گھڑی جس سے رسول اللہ ﷺ پوری امت کو ڈراتے رہے' وہ فتنہ جس سے پناہ کی دعا اکثر تشہد میں کرتے رہے' ہم اس سے کس قدر غافل اور بے پروا ہیں!!

allurdupdfnovels.blogspot.com

کُھل گئے یاجوج اور ماجوج کے لشکر تمام......(2)

یاجوج اور ماجوج کی سب سے بڑی علامت جو سیّد الانبیاء ﷺ نے بتلائی وہ یہ ہے کہ "اگر انہیں کھلا چھوڑ دیا جائے تو وہ لوگوں پر ان کی معاش میں فساد پھیلائیں گے۔ (طبرانی) اسی طرح ان کی طاقت اور ناقابل تسخیر قوت کا ذکر صحیح مسلم کی ایک حدیثِ قدسی میں ہوا ہے: "ہم نے اپنے بندوں سے (یاجوج ماجوج) ایسے تخلیق کیے ہیں کہ کوئی ان کو شکست نہیں دے سکتا حتیٰ کہ میں ان سے جنگ کروں"۔ بنی آدم کی نسل سے پیدا ہونے والے یہ یاجوج اور ماجوج وہ ہیں جنہیں قرآن پاک کی سورہ کہف میں فساد پھیلانے والے کہا گیا ہے اور جنہیں اللہ خود جنگ کے ذریعے ختم کرے گا۔ قرآن پاک سے ایک دلیل اس گروہ کو واضح کرتی ہے۔ سورہ فاتحہ سے لے کر سورۃ الناس تک اللہ نے کسی گروہ کے خلاف جنگ کا اعلان نہیں کیا سوائے سود کھانے والوں کے۔ اللہ فرماتا ہے: "اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اگر تم واقعی مومن ہو تو سود کا جو حصہ بھی باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو۔ پھر اگر تم ایسا نہ کرو گے تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ سن لو۔ (البقرہ: 278-279) اللہ نے قاتلوں، زانیوں، مشرکوں، چوروں، غیبت کرنے والوں حتیٰ کہ کسی بڑے سے بڑے گناہ کا ارتکاب کرنے والوں کے خلاف اعلان جنگ نہیں کیا' لیکن سود کھانے والوں کے خلاف کیا ہے۔ اللہ حکیم و دانا ہے، عالم الغیب ہے۔ وہ جانتا تھا کہ یاجوج اور ماجوج جب اس دنیا پر اپنے فتنے سے غالب آئیں گے تو ان کی پشت پر ایک مضبوط سودی نظام ہوگا۔ یہی معاش میں وہ بگاڑ ہے جس کی جانب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ کیا ہے۔ یاجوج اور ماجوج کے اس فتنے کے بارے میں عموماً یہ تصور کر لیا گیا ہے کہ یہ دجال کے خروج کے ہمرکاب ہوں گے' لیکن قرآنِ پاک چونکہ اسے یروشلم میں یہودیوں کی واپسی کے ساتھ منسلک کرتا ہے، بلکہ دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ہم زمانہ بتاتا ہے تو اس اعتبار سے آج ہم اسی یاجوج اور ماجوج کے ورلڈ آرڈر میں زندہ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنوں کی ایک ترتیب اس حدیث میں بتائی ہے جو مسند احمد، ابوداؤد، مستدرکِ حاکم اور نعیم بن حماد کی الفتن میں درج ہے۔ ان فتنوں کا علیحدہ علیحدہ ذکر باقی حدیث کی کتابوں میں بھی موجود ہے' لیکن ترتیب زمانی یہاں ہے: "حضرت عمیر بن ہانی نے فرمایا' میں نے عبداللہ بن عمر کو فرماتے سنا کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنوں کو بیان فرمایا یہاں تک کہ احلاس کے فتنے کو بیان کیا۔ کسی نے پوچھا احلاس کا فتنہ کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہ فتنہ فرار، گھربار اور مال کے لٹ جانے کا ہوگا۔ پھر خوشحالی اور آسودگی کا فتنہ ہوگا۔ اس کا دھواں ایسے شخص کے قدموں کے نیچے سے نکلے گا جو یہ گمان کرتا ہوگا کہ وہ مجھ سے ہے حالانکہ وہ مجھ سے نہیں' میرے اولیا تو متقین ہیں۔ پھر لوگ ایک نااہل شخص پر متفق ہو جائیں گے۔ پھر تاریک فتنہ ہوگا' یہ فتنہ ایسا ہوگا کہ امت کا کوئی فرد نہیں بچے گا جس کو اس کے تھپیڑے نہ لگیں۔ جب بھی کہا جائے گا کہ یہ فتنہ ختم ہو گیا تو وہ لمبا ہو جائے گا۔ ان فتنوں میں آدمی صبح کو مومن ہوگا اور شام کو کافر۔ لوگ اسی حالت میں رہیں گے یہاں تک کہ دو خیموں میں بٹ جائیں گے۔ ایک ایمان والوں کا خیمہ جس میں بالکل نفاق نہیں ہوگا۔ دوسرا نفاق والوں کا خیمہ جس میں ایمان نہیں ہوگا۔ تو جب تم اس طرح تقسیم ہو جاؤ تو بس تم دجال کا انتظار کرنا کہ آج آئے یا کل آئے"۔ اس حدیث میں جس تاریک فتنے کا ذکر کیا گیا ہے اس کی ایک اور حدیث سے مطابقت ملتی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا سود اس قدر عام ہو جائے گا کہ ہر کسی تک اس کا غبار ضرور پہنچے گا۔ یعنی یہ فتنہ پوری بنی نوع انسان کو گھیرے میں لے لے گا۔ حرم کی چاردیواری اور مدینۃ النبیؐ کے اردگرد، بغداد کی گلیوں، مشہد کے بازاروں، سیّد علی ہجویری کی نگری، غرض کوئی جگہ اور مقام دیکھ لیں آپ کو سودی نظام معیشت کی کارفرمائیاں نظر آئیں گی۔ کرنسی نوٹوں سے اے ٹی ایم مشینوں اور بینکوں کی عمارات تک سب کی سب اس دجالی ورلڈ آرڈر کی گواہی دیتی ہیں جسے یاجوج اور ماجوج نے اس دنیا پر نافذ کر رکھا ہے اور جس کا بظاہر کوئی توڑ اس دنیا کو نہیں سوجھ رہا' اس لیے کہ اس کے پیچھے وہ پورا نظام ہے جو ٹیکنالوجی، فوجی طاقت اور ریاستی جبر کے ساتھ سیکولر تعلیم اور اخلاقیات کے ساتھ پنجے گاڑے ہوئے ہے۔ یہی وہ نظام ہے جس میں صبح کا کفر اور رات کا ایمان بتایا گیا ہے۔ ہم اس پورے نظام کے کل پرزے بن چکے ہیں۔ ہم دن بھر اسے قائم رکھنے کی "عبادت" میں مصروف رہتے ہیں اور رات کو اپنے اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو کر مومن ہونے کا اقرار کرتے ہیں۔ اس نظام کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے یاجوج اور ماجوج دو مخصوص عربی الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ یاجوج عربی زبان کا فاعل (Active) لفظ ہے اور ماجوج مفعول (Passive) یعنی یہ دو چہروں والے لوگ ہوں گے۔ ظلم کریں گے اور کہیں گے ہم امن کے پیامبر ہیں۔ اپنے آپ کو مذہب کے علمبردار کہیں گے' لیکن مذہب سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہ ہوگا۔ غرض یاجوج اور ماجوج بنی آدم میں سے ایسی قوم، قبیلہ یا گروہ ہے جو اس قدر طاقتور ہے جسے صرف اللہ ہی اپنی طرف سے اعلانِ جنگ سے ختم کرے گا جو معیشت میں فساد پھیلائیں گے اور قرآن کے مطابق یہی مفسدین ہیں۔ یہ طاقتور مفسدین وہ ہیں جو انسانوں کے ہر مروجہ نظام میں فساد پھیلانے کے قابل ہیں۔ سیاسی نظام، عدالتی نظام اور معاشی نظام کا فساد تو امورِ مملکت کے حوالے سے واضح ہے۔ ہر وہ حکم جو اللہ نے ان معاملات میں دیا ہے، اس کے مقابلے میں انہوں نے ایک مربوط تصور کے ساتھ نظام وضع کیا، سودی معیشت، عوام کی حاکمیت، زنا، چوری اور قتل کی سزاؤں کی مخالفت' زنا اور بے حیائی و فحاشی کو معاشرتی رویہ قرار دینا، چوروں کو دارالاصلاح کی راہ دکھانا اور قصاص کا قانون جس میں اللہ نے زندگی رکھی ہے' اسے ختم کرنا۔ یہ ایک پورا ورلڈ آرڈر ہے جس کی بقا سود کے معاشی نظام پر ہے۔ ان کا یہ فساد صرف اور صرف حکمرانی کے معاملات میں ہی نہیں بلکہ زندگی کے ہر معاملے میں نظر آتا ہے۔ خاندانی نظام کا فساد جس کی وجہ سے اب بعض معاشروں میں حرامی اور حلالی بچے کی تمیز ختم ہو گئی ہے' جنسی تعلقات کا فساد کہ اب بعض سماج ہم جنس پرستی اور ہم جنس پرستوں کے حقوق کی جدوجہد کر رہے ہوتے ہیں۔ زراعت کے نظام میں فساد کہ اب جس طرح کیمیکل اور جینیاتی انجینئرنگ کے ذریعے بیج تیار ہو رہے اور ان میں قوموں کو تباہ کرنے کے لیے زہر تک شامل کیا جا رہا ہے۔ نسلی فساد ایسا کہ ایک خاص منصوبے سے پوری کی پوری قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے۔ مذہبی تصورات میں فساد ایسا کہ ہر مذہب کی ایک نئی صورت دنیا کے سامنے پیش کی جاتی ہے اور پھر اپنے پروردہ مذہبی علماء کو اس نظام کا ایسا گرویدہ بنایا جاتا ہے کہ وہ انہی کے نظام کو اسلامی جمہوریت، اسلامی سوشلزم، اسلامی بینکنگ، اسلامی کلچر وغیرہ جیسی اصطلاحات دے کر اس دین کا حلیہ بگاڑتے ہیں۔ اسلام ایسا دین ہے جو اپنی اصطلاحات اور اپنی طرز زندگی لے کر مبعوث ہوا تھا۔ صرف ایک مثال دیکھئے کہ بڑے سے بڑا اسلامی مفکر بھی انسانی حقوق کی اصطلاح استعمال کرتا ہے' حقوق العباد نہیں کہتا کیونکہ یہ لفظ بولنے سے اللہ کا تصور سامنے آ جاتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ حقوق العباد انسانی رشتوں کے حوالے سے ہیں جب کہ یاجوج ماجوج کے دجالی نظام میں یہ تصور ہی بے معنی ہے۔ اسلام میں والدین، اولاد، پڑوسی، بیوہ، یتیم، نادار، مسکین، بیوی اور خاوند کے حقوق ہیں' لیکن انسانی حقوق کے چارٹر میں کہیں ان کا ذکر نہیں' بس لفظ انسان رکھا گیا ہے۔ بوڑھا ہے تو اولڈ ایج ہوم میں بھیج دو اور بے نیاز ہو جاؤ۔ خاندانی نظام سے ماورا بچے پیدا کرو اور ریاست کو ذمہ دار بنا دو۔

یاجوج اور ماجوج کے بارے میں بہت سی ضعیف اور گھڑی ہوئی احادیث کے عام ہونے کی وجہ سے انہیں کوئی مافوق الفطرت مخلوق سمجھ لیا گیا ہے حالانکہ قرآن حکیم اور احادیثِ صحیحہ بالکل مختلف تصور پیش کرتی ہیں۔ آخر میں ایک حسن حدیث لکھ رہا ہوں کہ ان فتنوں سے بچنے کا راستہ کیا ہے۔ حضرت حذیفہؓ بن یمان نے فرمایا، لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خیر کے بارے میں سوال کرتے اور میں شر کے بارے میں سوال پوچھتا، اس خوف سے کہیں شر مجھے پکڑ نہ لے (بخاری مسلم) انہی حذیفہ بن یمان کا قول نعیم بن حماد نے کتاب الفتن میں درج کیا ہے: "یہ فتنے ایسے لمبے ہو جائیں گے جیسے گائے کی زبان لمبی ہوتی ہے۔ ان فتنوں میں اکثر لوگ تباہ ہو جائیں گے البتہ وہ رہیں گے جو پہلے سے ان فتنوں کو پہچانتے ہوں گے"۔ پہچانو' یہ پورا دجالی نظام یاجوج و ماجوج کی سودی معیشت کے راستے ہمارے سروں پر مسلّط ہے اور ہمیں خبر تک نہیں کہ ہم تباہی کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے تباہی اور خوشحالی کو دنیا تک محدود کر لیا ہے جب کہ ہمارا انجام اس سودی نظام کے کارندوں اور اللہ کے خلاف جنگ کرنے والوں میں ہوتا جا رہا ہے۔ کیا ہم روزِ محشر اللہ کے حضور ایسا اٹھنا پسند کریں گے؟ یہ ہے اصل تباہی۔ جلد دنیا دو خیموں میں تقسیم ہو جائے گی' کفر اور ایمان کے خیمے۔ ڈرو اس وقت سے جب ہم اس نظام کی چکا چوند سے اندھے ہو کر کفر کے خیمے میں کھڑے ہوں گے۔ (ختم)

allurdupdfnovels.blogspot.com

کسی کو اندازہ ہے!

اس سال کے آغاز میں جب میں نے اس درویش خدامست کی بات لکھی تھی تو اس مملکت خداداد پاکستان کے کتنے لوگ ایسے ہوں گے جن کے وہم وگمان میں بھی نہ ہوگا کہ حالات اسقدر بدل جائیں گے۔ یہ آج سے بیس سال پرانی بات ہے، جب طبیعت میں نہ اسقدر تحمل تھا اور نہ ہی مزاج میں صبر کا یارا۔ صاحبانِ نظر کی خدمت میں حاضر ہوتا تو ایک ہی سوال زبان پر لرزاں رہتا۔ کب حالات بدلیں گے؟ ظلم بڑھتا جارہا ہے، اللہ اپنا فیصلہ صادر کیوں نہیں کرتا؟ میری حالت عدیم ہاشمی کے شعر جیسی تھی۔

میں سربسجدہ ہوں اے شمر مجھ کو قتل بھی کر
رہائی دے بھی اب اس عہد کربلا سے مجھے

وقت کا دھارا کس تیز رفتاری سے بہتا ہے۔ حالات بدلنے تو کیا تھے دن بدن ابتر ہی ہوتے گئے۔ عالم الغیب تو اللہ کی ذات ہے۔ وہی جانتا کہ کسی شخص، ملک اور قوم کی تقدیر میں کیا لکھا ہے۔ لیکن اس نے اپنے غضب اور رحمت کی نشانیاں کھول کھول کر قرآنِ حکیم میں بتادی ہیں۔ وہ کیسی قوموں پر مہربان ہوتا ہے اور کن پر اس کا غضب نازل ہوتا ہے۔ وہ بستیوں سے ظالموں کا خاتمہ کیسے کرتا ہے اور مظلوموں کی مدد اور دادرسی کے لیے اس کا نظامِ کار کس طرح حرکت میں آتا ہے۔ دنیا بھر میں اس مالک کائنات کے عذاب کے کوڑوں اور رحمت کی بارشوں کی نشانیاں بکھری ہوئی ہیں اور اللہ قرآن میں بار بار لوگوں کو ان بستیوں کی جانب اشارہ کرکے ان کے معدوم ہونے کی داستانیں سناتا ہے تاکہ لوگ عبرت پکڑیں۔ پھر جو سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی اپنی جانب بڑھتے ہوئے طوفان کو نہ سمجھ سکیں تو اللہ فرماتا "کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ ان کے دل سمجھنے والے اور کان سننے والے ہوتے؟ حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر وہ دل اندھے ہوجاتے ہیں جو سینوں میں ہوتے ہیں۔ الحج 46)۔ لیکن ان کے مقابلے میں وہ ہیں جن کے سینے چراغِ ہدایت سے روشن ہوتے ہیں اور جن کے بارے میں سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مومن کی فراست سے ڈرو، اس لیے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھ رہا ہوتا ہے"۔ یہی مومن صاحبِ نظر ہوتا ہے۔ اس کی بصیرت اور بصارت کی پرواز اللہ کے نور کے کرم سے ہوتی ہے۔ جس کو جتنا نور عطا ہوا، اتنی ہی اس کی پرواز میں وسعت آتی گئی۔ اسی لیے مدتوں اپنی بے بسی، مایوسی، جھنجھلاہٹ اور قوم کی حالت پر غصے سے بھرے سوالات لے کر میں ان صاحبانِ نظر سے راستہ تلاش کرتا رہا۔ ہر کوئی تسلی کے حرف بولتا اور ایک اطمینان ضرور دلاتا کہ وہ دن دور نہیں جب اس ملک اور قوم کے حالات بدلیں گے۔ حالات بگڑتے گئے، زوال بڑھتا گیا۔ پھر ان لوگوں کا لہجہ بھی بدلنے لگا۔ فرماتے رہے لوگوں سے کہو اپنے آپ میں تبدیل ہونے کی امنگ اور خواہش تو پیدا کریں، اللہ حالات بدل دے گا۔ اس قوم میں امنگ اور خواہش کہاں پیدا ہونا تھی، لوگ اپنے اپنے گروہ، نظریے، مفاد اور مسلک پر ایسے سخت ہوتے گئے کہ جھوٹ سچ، ایمانداری بے ایمانی، قاتل مقتول اور غاصب مغضوب میں فرق کرنا مشکل ہوگیا۔ ایک گروہ کا بے ایمان، جھوٹا اور ظالم دوسرے گروہ کا ایمان دار، سچا اور معصوم بن گیا۔ ایک گروہ کا مقتول دوسرے گروہ کا جہنم رسید اور دوسرے گروہ کا مقتول پہلے گروہ کا شہید ہوگیا۔ یہ وہ لمحہ تھا جب یہ مردانِ باصفا جو اللہ کے نور کی عطا کردہ بصیرت سے دیکھ رہے تھے پریشان ہوگئے۔ ان کی راتیں اللہ کے حضور اس قوم کی معافی کے لیے اشک آلود ہوتی گئیں۔ فرماتے رہے لوگوں سے کہو بدل جائیں ورنہ اگر اللہ نے خود حالات درست کرنے کا فیصلہ کرلیا تو بہت نقصان ہوجائے گا۔ وہ تو فرماتا ہے "اور ڈرو اس وبال سے جو تم میں سے صرف ظالموں ہی کو لاحق نہیں ہوگا (الانفال 25)۔ لوگ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ لوٹنے والے اپنی دھن میں لگے رہے کہ یہی دنیا ہے، جو کمانا ہے کمالو۔ ظلم کرنے والوں کے دل پتھر کے بنتے گئے۔ منبرو محراب کے امین بھی امت کو تقسیم کرنے کا فریضہ اس خوبی سے ادا کرتے رہے کہ مسجدیں خون سے رنگین ہوگئیں۔ حکمران ایسے فرعون صفت بن گئے کہ انہیں اس بات کا ادراک تک نہ ہوسکا کہ ان کے زیرِ نگیں لوگوں کے خون، بھوک، افلاس اور پریشانی کا روزِ آخر ان سے حساب لیا جائے گا۔ وہ لوگ جنہیں اللہ نے دولت دی تھی، نعمتیں عطا کی تھیں وہ اسے اپنے زورِ بازو سے حاصل کی گئی متاع سمجھتے رہے اور ان کے دل بھوکے، ننگے، بیمار اور نادار لوگوں کے معاملے میں سخت ہوتے گئے۔ ایک خوفناک اور کربناک منظر تھا۔ اہل نظر کیوں نہ کانپ اٹھتے۔ ان کے دلوں پر اللہ کے کلام کی یہ آیات نقش تھیں۔ اللہ فرماتا ہے "جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے خوشحال لوگوں کو حکم دیتے ہیں اور وہ اس میں نافرمانیاں کرنے لگتے ہیں۔ تب عذاب کا فیصلہ اس بستی پر چسپاں ہوجاتا ہے اور ہم اسے برباد کرکے رکھ دیتے ہیں۔ (الاسراء 16)۔ یہ سب اتنا اچانک نہیں ہوتا۔ اللہ پوری مہلت دیتا ہے کسی بستی کے کارپردازوں کو، اہلِ اقتدار اور اہلِ ثروت کو۔ جب وہ اللہ کی ہدایت اور نصیحت کو بھلادیتے ہیں اور اس پر کان نہیں دھرتے تو اللہ ان پر مزید دولت کی بارش کردیتا ہے، نعمتوں میں اضافہ کرتا ہے۔ وہ فرماتا ہے "پھر جب وہ لوگ ان چیزوں کو بھولے رہے جن کی انہیں نصیحت کی جاتی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کشادہ کردیئے۔ یہاں تک کہ جب ان چیزوں سے جو ان کو دی گئیں تھیں خوب خوش ہوگئے تو ہم نے ان کو ناگہاں پکڑ لیا اور وہ اس وقت مایوس ہوکر رہ گئے۔ تب ظلم کرنے والوں کی جڑ کاٹ دی گئی۔ (الانعام 44) یہ تھا گزشتہ پندرہ بیس سالوں میں اہلِ اقتدار، اہلِ ثروت اور صاحبانِ طاقت کے ساتھ اللہ کا رویہ۔ وہ جو اس بات پر پھولے سماتے رہے کہ ہم نے اس ملک کا اقتدار حاصل کیا ہے تو ہم دنیا بھر میں امیر ترین لوگوں میں بھی کہلائے جائیں۔ ہماری دھاک ایسی ہو کہ مخالف اور کمزور ہم سے تھر تھر کانپیں، کسی کی بیٹی، بیوی اور بہو کی عزت ہمارے لیے گھاس کے تنکے سے بھی کم ہو۔ وہ جنہیں دولت دی گئی ان کی سلطنتیں وسعت اختیار کرتی گئیں اور ان کے زیردست فاقے سے خودکشیاں کرتے رہے۔ جنہیں طاقت عطا ہوئی انہوں نے ذاتی جائیدادوں، زمینوں اور سرمائے میں اضافے کو اپنا شعار بنالیا۔ اس کے ساتھ انہوں نے اللہ کے ساتھ ایک ظلم روا رکھا۔ اللہ شرک کو ظلم عظیم کہتا ہے۔ انہیں نعمتیں اللہ نے دی تھیں۔ ان کے دل میں خوف اور شکر گزاری تو صرف اللہ کی ہونا چاہیے تھی۔ لیکن یہ کبھی امریکہ سے ڈرتے رہے اور کبھی اپنی برادری سے، کبھی سرمائے کا خوف ان کو لاحق رہا اور کبھی ووٹر کے بدل جانے کا ڈر۔ لیکن اللہ ان پر پھر مزید اپنی نعمتیں نچھاور کرتا رہا۔ اس لیے کہ اس کا دستورِ عذاب یہ ہے کہ وہ نافرمان لوگوں کو مزید نعمتیں دے کر آزماتا ہے۔ وہ یہ تصور کرنے لگتے ہیں کہ اللہ کے ڈرانے والے یہ صاحبانِ بصیرت فراڈ ہیں، لوگوں کو بے عمل بناتے ہیں، غیر سائنسی لوگ ہیں، ترقی کے دشمن ہیں۔ دیکھا کیا ہوا اب تک۔ دس سال سے ڈرا رہے تھے، کچھ ہوا۔ ایک حکمران آیا، لوٹ کر عیش کررہا ہے، دوسرا آیا، وہ بھی لوٹ کر چلا جائے گا۔ کچھ نہیں بدلے گا۔ سب ڈھکوسلا ہے۔

یہی کیفیت تھی جو میرے اندر اضطرار پیدا کرتی تو میں سوال کرتا کہ کب اللہ اپنا فیصلہ صادر فرمائے گا۔ اہلِ نظر کہتے انتظار کرو۔ صفائی کا موسم تو آنا ہی ہے۔ لیکن ساری عمر قبرستان میں قبروں کے لیے سل بیں بنا کر خلق خدا میں مفت بانٹنے والے ایک درویش، نے آج سے 15 سال پہلے اچانک حالتِ غضب میں کہہ دیا "2014ء تک تو انتظار کرو"۔ پھر جیسے وہ خود سکتے میں آگیا کہ یہ لفظ کیسے اس کے منہ سے ادا ہوگئے۔ اس سال یعنی 2014ء کے آغاز میں جب اس درویش خدامست کی یہ بات میں نے تحریر کی تھی تو کوئی اندازہ کرسکتا تھا کہ صرف چار ماہ میں حالات ایسے ہوجائیں گے کہ ہر کوئی خوفزدہ ہے کہ کچھ ہونے والا ہے۔ ان لوگوں کو اگر اندازہ ہوجائے کہ کیا ہونے والا ہے تو ان کی راتوں کی نیندیں حرام ہوجائیں۔ وہ صاحبِ وقت جنہیں میں نے پچیس سال میں بہت کم ایسی گفتگو کرتے سنا ہے اور جن کے بارے میں اکثر میں اپنے کالموں میں تحریر کرتا رہا ہوں۔ چند دن پہلے تشریف لائے اور کہنے لگے گردنوں میں سریا بہت سخت ہوگیا ہے۔ سریے کی خاصیت ہے کہ اسے کاٹ کر آدھ انچ کے ٹکڑوں میں بھی تقسیم کردیا جائے تو اکڑا ہی رہتا ہے۔ وہ یہ بات کرکے خاموش ہوئے اور میں نے تھر تھراتے ہوئے سوال کیا۔ اگر بھٹی میں ڈال دیا جائے، پگھل جائے تو کیا اس میں سے کوئی خیر نکلے گی۔ بس اتنا سوال کیا تو فرمانے لگے اس کے بعد ایسی خیر ہے، ایسا سکون ہے، ایسی خوشحالی ہے کہ جس کے لیے اب تک لوگ ترس رہے ہیں۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

کتاب کو حکومت سے الگ کرنے والے

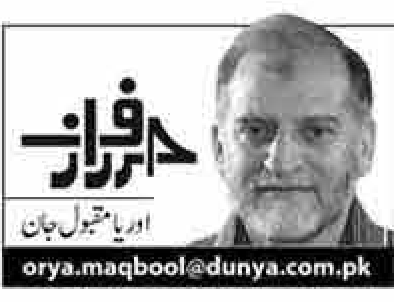

حرفِ راز
اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

ریاست کو مذہب سے الگ کرنے کی بحث تو اپنے اپنے وقت کے "بقراط" صرف چند صدیوں سے پیش کر رہے ہیں لیکن میرے آقا سیّدالانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے آنے والے زمانوں کی خبر دیتے ہوئے کتنی وضاحت سے مسلمانوں کے درمیان پیدا ہونے والے اس فتنے کی نشاندہی کر دی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یاد رکھو اسلام کی چکی چل چکی ہے، اب تم (اللہ کی) کتاب کے ساتھ چلو، وہ جہاں بھی لے جائے، یاد رکھو، ایسا وقت آئے گا جب کتاب اور حکومت جدا ہو جائیں گے، اس موقع پر تم کتاب سے جدا نہ ہونا۔ یاد رکھو، تم پر ایسے امیر آئیں گے جو اپنے لیے ایسے فیصلے کریں گے جو وہ تمہارے لیے نہیں کریں گے، اگر تم ان کی نافرمانی کرو گے تو وہ تمہیں قتل کر ڈالیں گے اور اگر ان کی اطاعت کرو گے تو وہ تمہیں گمراہ کر دیں گے"۔ صحابہ نے عرض کیا! "ایسے میں ہم کیا کریں؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "ویسا ہی کرو جیسا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے کیا تھا، انہیں آریوں سے چیر دیا گیا اور لکڑی کی سولی پہ لٹکایا گیا، اللہ کی اطاعت میں جان دینا اس کی نافرمانی سے بہتر ہے" (مجمع الزوائد، کتاب الخلافہ، حدیث 9153)۔ حکومت سے کتاب کی علیحدگی کا تصور اس سیکولر جمہوری ریاست کا شاخسانہ ہے جو جنگِ عظیم اوّل کے بعد مسلم دنیا کو طاقت کے زور پر پچاس سے زائد قومی ریاستوں میں تقسیم کر کے مستحکم کیا گیا۔ خلافت عثمانیہ اور اس کے نافذ کردہ اسلامی قوانین جنہیں "مجلۂ احکام العدلیہ" کہتے ہیں، دونوں کا خاتمہ اتاترک کے ہاتھوں ہوا اور پھر اس کے بعد یہ امت جتنی بھی قومی ریاستوں میں تقسیم ہوئی اس پر سیکولر ڈکٹیٹروں اور مطلق العنان آمروں کا اقتدار ایسی افواج کے ذریعے قائم کیا گیا جن کی تربیت صرف اور صرف مادرِ وطن کے دفاع کے لیے اور اس کے تحفظ کے نظریے کے ساتھ کی جاتی تھی۔ جس امت میں صدیوں سے یہ تصور راسخ تھا کہ جان صرف اور صرف اللہ کی راہ میں دی جاتی ہے اور اس کا اجر بھی صرف اور صرف اللہ ہی کے ہاں سے ملتا ہے، اس کی قومی ریاستوں میں ایسے تصورات مغربی افواج کی طرح راسخ کیے گئے کہ زمین کا دفاع اور پھر اس کے نتیجے میں وکٹوریہ کراس کی صورت میں دنیا میں ہی اجر، نیک نامی، سرفرازی اور شہرت! پوری مسلم تاریخ میں اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والوں کو بے غرض اور جہاد کو خالصتاً اللہ کے ہاں قبولیت کے لیے خالص رکھا گیا تھا۔ اس تصور کو اقبال نے کس خوبصورتی سے بیان کیا "نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی"۔

یہی تصور تھا کہ جب ایران فتح ہوا اور دجلہ و فرات کی زرخیز زمینیں قبضے میں آئیں تو کچھ اصحاب نے سیّدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ سے درخواست کی ان زمینوں کو مالِ غنیمت تصور کرتے ہوئے جنگ جیتنے والے غازیوں میں تقسیم کیا جائے۔ یہ بحث طویل ہوئی تو ایسے میں تاریخ سیّدنا عمرؓ کی ایک دعا کی گواہی دیتی ہے۔ آپ نے اللہ سے دعا کی کہ اے اللہ! اگر میں سچا ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ یہ زمین اللہ کی ملکیت ہے اور ان لوگوں میں تقسیم نہیں ہو سکتی تو انہیں موت دے اور اگر یہ لوگ سچے ہیں تو مجھے موت عطا فرما دے۔ تاریخ شاہد ہے کہ کچھ ہی عرصے کے بعد وہ تمام اصحاب' جو جہاد جیتنے کی سرفرازی میں زمین و جائداد کو غنیمت کے طور پر اپنا انعام سمجھتے تھے' سب کے سب انتقال کر گئے۔ لیکن موجودہ سیکولر جمہوری ریاست نے تصورِ آخرت کو دنیا سے نکال کر تمام انعام و اکرام اسی دنیا میں عطا کرنے کا ایسا تصور قائم کیا کہ حکومت، علاقہ، اقتدار اور غلبہ ہی ان افواج کا قبلہ و کعبہ بن گیا۔ اس کے بعد دنیا میں کوئی بھی ملک لے لیں' جہاں مسلمان بستے تھے' وہاں ان سیکولر افواج نے سیکولر ڈکٹیٹروں کے لیے راہ ہموار کی اور ان کو مسند اقتدار پر بٹھایا۔ مصر میں جمال عبدالناصر، انوار السادات اور حسنی مبارک، شام میں حافظ الاسد اور بشار الاسد، ایران میں رضا شاہ پہلوی، عراق میں احمد حسن البکر اور صدام حسین، لیبیا میں معمر قذافی، تیونس میں زین العابدین علی، یہ سب وہ تھے جو کتاب کو حکومت سے دور رکھنے کے قائل تھے اور انہوں نے اپنے اقتدار کے دوران کتاب کو درس گاہوں، تفسیروں اور فقہ کے ماہر علما تک محدود کر دیا۔ دوسری قسم ان قبائل پر مشتمل تھی جو اپنے قبیلے کی حکومت چاہتے تھے، اپنی نسل کی بالاتری سے باقی قوم پر اقتدار چاہتے تھے۔ ان میں جزیرہ نمائے عرب کی تمام چھوٹی چھوٹی ریاستیں اور خود آلِ سعود شامل تھے۔ ان افراد اور قبیلوں نے بھی ایک قبیلے اور ایک نسل کی بادشاہتیں قطر، متحدہ عرب امارات، مسقط، کویت، بحرین میں قائم کیں۔ یہاں بھی کتاب کو امورِ مملکت سے دور رکھا گیا۔ ایک دو ممالک میں صرف سزاؤں اور تعزیرات کا کچھ حصہ کسی نے نافذ کر کے دنیا کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ ہم نے کتاب کو سیاست اور حکومت کا رہنما بنایا ہوا ہے۔ ایسے تمام سیکولر ڈکٹیٹر میرے ملک پاکستان میں بھی آئے... ایوب خان، یحییٰ خان، ضیاالحق اور پرویز مشرف... ان میں ضیاالحق کو لوگ اسلام سے نتھی کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن وہ تاریخ میں عالمی طاقتوں کا ایک جال تھا جو روس کے خلاف جنگ کے لیے ضروری تھا۔ اگر پرویز مشرف 1977ء میں اقتدار سنبھالتا تو وہ ایک مسلمان جہادی ہوتا اور اگر ضیاالحق 1999ء میں اقتدار پر قبضہ کرتا تو وہ ایک سیکولر اور جہاد دشمن حکمران ہوتا، دونوں کا کتاب سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا، دونوں علاقائی برتری، زمینی تحفظ اور عالمی برادری میں اپنے مقام اور اس سرزمین کی سرفرازی کے لیے وہ سب کچھ کرتے رہے جو عالمی برادری بہتر سمجھتی تھی، لیکن ہمارے دانشوروں اور میڈیا کا کمال یہ ہے کہ ان تمام ڈکٹیٹروں، مطلق العنان آمروں اور ظالم سربراہوں کو مسلمان ڈکٹیٹر کہا جاتا ہے۔ کوئی ہٹلر، مسولینی اور جنرل فرانکو کو عیسائی ڈکٹیٹر نہیں کہتا۔ کوئی فلپائن کے ظالم اور کرپٹ مارکوس کو رومن کیتھولک ڈکٹیٹر نہیں پکارتا، کوئی چلی کے پنوشے کا مذہب نہیں بتاتا، کوئی چین کے چیانگ کائی شیک اور ویت نام کے پال پوٹ کو اس کے مذہب کے نام سے نہیں یاد کرتا۔ دنیا کے ہر ڈکٹیٹر نے' خواہ وہ کسی مذہب کا ہو، اپنے مذہب کی کتاب کو اقتدار سے دور رکھا، یہ سب کے سب سیکولر تھے لیکن کوئی اس بنیاد پر انہیں یا سیکولرازم کے پورے نظریے کو قابل نفرت نہیں بتاتا۔

سیکولرازم کا کمال یہ ہے کہ یہ اپنے اردگرد ایسے صاحبانِ علم و دانش پیدا کر لیتا ہے جو پکارتے پھرتے ہیں کہ مذہب تو صرف اخلاقیات بہتر بنانے کا نام ہے، اس کے لیے قوت نافذہ کی کیا ضرورت ہے۔ میرے ملک کی مثال اکثر زور شور سے دی جاتی ہے، کہا جاتا ہے ہم چور ہیں، بددیانت ہیں، ان پڑھ اور جاہل ہیں، لوگوں کے حق غصب کرتے ہیں، فحش مواد دیکھنے میں ہمارا پہلا نمبر ہے، ہم پر اسلام کا قانون کیسے لاگو ہو سکتا ہے؟ پہلے معاشرہ ٹھیک کرو پھر قوانین نافذ کرو۔ یہ منطق صرف اسلام کے قوانین پر کیوں لاگو کی جاتی ہے، دنیا کے کسی اور قانون پر کیوں لاگو نہیں ہوتی؟ ان کی بات مان لی جائے تو پھر دنیا میں سب قوانین اور ریاست کی مشینری ختم کر دی جائے۔ پہلے بددیانتی اور کرپشن کے خاتمے کے لیے لوگوں کو قائل کیا جائے پھر قانون نافذ کیا جائے، پہلے ڈاکوؤں' غنڈوں، لٹیروں کا اخلاق درست کیا جائے پھر تعزیرات پاکستان نافذ کی جائیں۔ پہلے لوگوں کو یہ ترغیب دی جائے کہ فحش مواد دیکھنے سے نفسیاتی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں، آدمی میں ہیجان بڑھتا ہے، وہ جنسی جرائم کا شکار ہوتا ہے اور اس وقت تک تمام فحش مواد پھیلنے دیا جائے، پھر جب لوگ اس بات کے قائل ہو جائیں کہ فحش برائی ہے تو پھر ان تمام سائٹس اور مواد پر پابندی لگا دی جائے۔ جب لوگوں کو ٹریفک کے قوانین یاد ہو جائیں اور وہ اس بات پر راضی ہو جائیں کہ اب اشارہ نہیں توڑنا، تیز رفتاری نہیں کرنی تو پھر ٹریفک کے قانون لاگو کیے جائیں۔ ان کی یہ ساری منطق سیکولر قوانین کے لیے نہیں۔ مغربی سیکولر قوانین کے لیے تو وہ قانون کی حکمرانی کے خوبصورت تصور کی بات کرتے ہیں لیکن جب میرا اللہ کہتا ہے کہ جو کچھ کتاب میں ہے اسے نافذ کرو تو ان کو لوگوں کی تربیت یاد آ جاتی ہے، معاشرہ تیار کرنے کی باتیں کرتے ہیں۔ سچ کہا تھا میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ میرے بعد ایسے حاکم آئیں گے جو میری ہدایات پر نہیں چلیں گے اور میری سنت پر کاربند نہیں ہوں گے اور ان میں ایسے لوگ ہوں گے جن کے دل انسانوں کے بدن میں شیطان کے دل ہوں گے" (صحیح مسلم، کتاب الامارہ) یہی ہیں وہ لوگ جو کتاب کو حکومت سے الگ کرتے ہیں، سیکولر ڈکٹیٹر یا جمہوری حکمران۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

روزنامہ دنیا

کیا یہ عذاب نہیں؟

حرفِ راز
اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

وہ جنات جنہیں ہم نے عقیدوں، مسلکوں، نسلوں، زبانوں اور علاقوئی تعصب کی چُوریاں کھلا کھلا کر پالا تھا، جنہیں ایک دوسرے سے نفرت کے گیت سنا کر موت کے رقص کے لیے مجبور کیا تھا اور جن کی تنی ہوئی بندوقوں کے سائے میں ہمارے شعلہ بیان مقرروں کے حق میں نعرے بلند ہوتے تھے، سب کے سب اب اپنی بوتلیں توڑ کر باہر آ چکے ہیں۔ ایسے جنات جب بوتلوں سے باہر آتے ہیں تو سب سے پہلے اپنے ہی آقا کی گردن پر سوار ہو جاتے ہیں اور پھر اس کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ ایک دوسرے کے خون سے اپنے اندر پلنے والے نفرت کے الاؤ کو ٹھنڈا کرنے والے یہ لوگ جب اپنے گھروں سے جنازے اٹھاتے ہیں تو پھر ان کے نزدیک موت اور زندگی کا فرق ختم ہو جاتا ہے۔ پوری شخصیت پر ایک ہی جذبے کی حکمرانی ہوتی ہے... نفرت بھرا انتقام! یہ ہے اس وقت میرے ملک کی حالت جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی سیّدالانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کے مصداق ہے: ''لترفعن رایۃ الفساد فوق کل بیت'' یعنی ہر گھر کی چھت پر فساد کا جھنڈا لہرا رہا ہوگا۔ یہ علامت اس دورِ فتن کی ہے جو قیامت کے قریب کا ہے اور جس میں ہم داخل ہو چکے ہیں۔ اس کا عرصہ کتنا ہے اور کب یہ اپنے آخری مراحل میں داخل ہوگا؟ اس کا علم صرف اور صرف اللہ کی ذات کو ہے۔ ہماری ذمہ داری تو اس دور میں ان تمام فتنوں سے بچنے کی ہے جو ہمارے گھروں، محلوں اور شہروں میں داخل ہو چکے ہیں۔ یاجوج اور ماجوج کے لشکر ہم پر تمام بلندیوں سے حملہ آور ہیں اور ہمیں اس کا ادراک تک نہیں۔ قرآن مجید کی آیات کی تفسیر پڑھنے اور پڑھانے والے، سیّدالانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث وردِ زبان کرنے والے، اہلِ بیت اور خانوادۂ رسول سے علم کی روشنی لینے والے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کی محبت میں زندگیاں وقف کرنے والے، سب کے سب اس احساس سے عاری ہوتے جا رہے ہیں کہ اس امت میں گروہوں میں تقسیم ہو کر گردنیں کاٹنا، کسی مسلک کے مولویوں کی تقریروں، عالموں کی کتابوں کا نتیجہ نہیں بلکہ خالصتاً اللہ کا عذاب ہے جو ہم پر مسلط ہو چکا ہے۔ یہ عذاب جب مسلط ہوتا ہے تو عقل و ہوش جاتے رہتے ہیں اور صلح و آشتی کا تصور خواب ہو جاتا ہے۔ ان تمام علماء نے سورۃ الانعام کی 65 ویں آیت یقیناً پڑھی ہوگی جس میں اللہ تبارک و تعالیٰ کسی قوم پر عذاب نازل کرنے کے تین راستے بتاتا ہے: ''کہہ دو وہ اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ تم پر عذاب بھیجے تمہارے اوپر سے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے یا تمہیں مختلف گروہوں میں بانٹ کر ایک دوسرے سے لڑا دے اور ایک دوسرے کی طاقت کا مزا چکھا دے''۔ کیا آج ہم گروہوں میں بٹ کر، ایک دوسرے سے لڑ کر ایک دوسرے کی طاقت کا مزہ نہیں چکھ رہے۔ وہ صورتِ حال، وہ کیفیت، وہ المیہ جسے اللہ اپنے عذاب کی ایک قسم کے طور پر بیان کرتا ہے اور جس کے بارے میں صریحاً حکم دیا جاتا ہے کہ جب مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دیا کرو، اس کے بارے میں ہمارے علماء کی منطقیں نرالی ہیں۔ کوئی اسے عقیدے کی جنگ کہہ رہا ہے، کوئی فساد فی الارض کے فتوے لے کر آ رہا ہے، کوئی خوارج کی علامتیں ڈھونڈ رہا ہے اور کسی کو روافض سے مذہب کو پاک کرنے کا شوق ہے۔ میں ان علمائے کرام کی گفتگو سنتا ہوں تو حیرت میں گم ہو جاتا ہوں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی منکرینِ زکوٰۃ کے خلاف جنگ کی مثالیں وہ علماء دیتے ہیں' جو اپنے خطبوں میں ان کی خلافت کو حق پر نہیں مانتے اور حضرت امام حسینؓ کے نقشِ قدم پر چل کر جہاد کا اعلان وہ کر رہے ہیں' جو کربلا میں ان کی مظلوم شہادت کو جہاد نہیں مانتے۔ یہ ہے ہماری حالتِ عذاب جس کا ہمارے علماء تک کو بھی ادراک نہیں۔ ہر کسی کی شدید خواہش ہے کہ اس کے مخالف کو کافر، ظالم، دہشت گرد، ڈاکو یا لیٹرا ثابت کیا جائے اور ریاست اسے کچل دے۔ کس قدر منافقت ہے... ہمیں ادراک ہے اور ہمارے علماء کو بھی علم ہے، ان کی نپی تلی گفتگو عام آدمی کے سامنے ایسی ہوتی ہے جیسے وہ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے مخلص ہیں، لیکن اپنے گروہوں میں ان کا جذباتی، اشتعال انگیز اور حیران کر دینے والا اندازِ خطابت لوگوں کو مرنے مارنے پر تیار کرتا ہے۔ کہیں لوگوں کو اُخروی نجات کی خوشخبریاں دی جاتی ہیں اور کہیں دنیا میں کامیابی اور غلبے کی نوید سنائی جاتی ہے۔ یہ سارے گروہ، یہ سارے جوشیلے لٹھ مار اور یہ جذباتی فضا انہوں نے کئی سال کی محنت سے تیار کی ہے۔ اس فضا میں جب انسانوں کی گردنیں کٹنے لگیں، لوگ ایک دوسرے کو مسلک اور عقیدے کی بنیاد پر قتل کرنے لگے تو خوف کی فضا نے ان علماء کو بھی گھیر لیا۔ گولیوں کی تڑاخ ان کی گردنوں تک بھی جا پہنچی، لیکن اب یہ واپس جانا بھی چاہیں تو مجبور ہیں۔ وہ جنات' جو انہوں نے بوتل میں بند کر کے رکھے ہوئے تھے' اب انہیں واپس نہیں جانے دیں گے۔ یہ جن ان کی گردنوں پر سوار ہو چکے ہیں۔ اب ان سب کا ایک ہی رویہ ہے کہ دوسرے کو فساد فی الارض کا ذمہ دار ٹھہرا کر حکومت، ریاست یا فوج کو کہا جائے کہ ان کا خاتمہ کر دے تاکہ نہ ان کے ہاتھ اپنے مخالفین کے خون سے رنگین ہوں اور نہ انہیں زور آزمائی کرنا پڑے۔ ان کے شریک وہ تمام لوگ ہیں جن کی ازلی اور ابدی خواہش یہ ہے کہ پاکستان کی ریاست اور سکیورٹی ادارے الجھے رہیں، ان کا خون رستا رہے، یہ سب لوگ پوری دنیا میں موجود ہیں۔ ان میں حکومتیں بھی شامل ہیں اور وہ دانشور، ادیب، عالمی تجزیہ نگار اور دنیا کے بڑے بڑے تھنک ٹینک بھی، جن کی ساری توانائیاں اس ایک مقصد پر صرف ہو رہی ہیں کہ کسی طرح مسلمانوں کے گروہ آپس میں لڑتے رہیں، ان کا خون بہتا رہے۔ یہ مسلکی اختلاف میں لڑیں یا ریاست اور اس کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے۔ کہیں یہ اقلیت کی حکومت قائم کر کے لڑوا رہے ہیں اور کہیں یہ دو برابر متحارب گروہوں میں سے ایک کو حکومت دے کر خون خرابہ کرواتے ہیں۔ مصر' شام اور عراق ان کی بدترین منصوبہ بندی اس حکمتِ عملی کے مظہر ہیں۔ کہیں کربلا میں خون بہتا ہے تو کہیں فلوجہ میں لاشوں کے انبار لگائے جاتے ہیں۔ دونوں جانب اسلحہ کی ترسیل کرنے والے ممالک موجود ہیں۔ شام میں امریکہ سے لے کر روس تک مل کر دس فیصد اقلیت والے بشارالاسد کی حکمرانی کو قائم رکھتے ہیں اور مسلمانوں کو ایسے قتل اور بے گھر کیا جاتا ہے کہ علماء کو فتویٰ جاری کرنا پڑتا ہے کہ بھوکے پیاسے حالتِ مجبوری میں کتے اور بلیاں بھی کھا سکتے ہیں۔ مصر میں فوج کو اقتدار پر قابض کروایا جاتا ہے اور اکثریت کی جمہوری حکومت کے حامیوں کو پرندوں کی طرح گولیوں سے بھون دیا جاتا ہے۔ کیا ان سب واقعات اور حالات کا ذکر علمائے کرام نے احادیث کی کتابوں میں نہیں پڑھا۔ کیا سنّیوں کی صحاح ستہ اور شیعوں کی کتب اربعہ میں ان کا ذکر نہیں ہے؟ انہیں سب معلوم ہے لیکن پھر بھی یہ اس حالت سے باہر نہیں نکلنا چاہتے، یہ اپنی نفرت کی بندوق خود بھی چلاتے ہیں اور دوسرے کے کندھے پر بھی رکھتے ہیں، لیکن میرے اللہ نے تو سورۃ الحجرات کی 8 ویں آیت میں وہ راستہ دکھا دیا ہے جو اس صورت حال کو حل کرنے کی حکمتِ عملی کو واضح کرتا ہے۔ اللہ فرماتا ہے: ''اور اگر دو گروہ اہل ایمان میں سے آپس میں لڑ پڑیں تو صلح کرا دو ان دونوں کے درمیان، پھر اگر کوئی زیادتی کرے ان میں سے ایک دوسرے گروہ پر تو جنگ کرو اس سے جس نے زیادتی کی ہے یہاں تک کہ وہ پلٹ آئے اللہ کے حکم کی طرف۔ پھر اگر وہ پلٹ آئے تو صلح کرا دو ان دونوں گروہوں کے درمیان عدل کے مطابق اور انصاف کرو، بلاشبہ اللہ پسند کرتا ہے انصاف کرنے والوں کو''۔ ایسی واضح حکمتِ عملی کے بعد کیا کسی اور پالیسی کی ضرورت باقی رہتی ہے؟ کسی اے پی سی یا کیبنٹ میٹنگ میں کسی قسم کی پلاننگ چاہیے؟ لیکن اصل مسئلہ یہی ہے کہ ہم سب قرآن پڑھتے ہیں لیکن اسے زندگی میں اپنا رہنما نہیں مانتے۔ یہی اللہ کا عذاب ہے جو ہم پر مسلط ہے۔ وہ ہمیں ایک دوسرے سے لڑا کر ایک دوسرے کی طاقت کا مزا چکھا رہا ہے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

کون ہے؟ کوئی ہے؟ کوئی تو ہو!

یونانی دیو مالا کے ایک کردار سوفوکلیس کو دیوتاؤں نے یہ سزا دی تھی کہ وہ ایک بھاری پتھر اٹھا کر پہاڑ کی چوٹی تک لے جائے اور وہاں پر کھڑا ہو۔ دیوتا اسے واپس لڑھکا دیتا اور سوفوکلیس کو پھر سے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچانے کے لئے کہتا۔ وہ پھر اسی مشقت سے گزرتا اور یہ سلسلہ جاری رہتا۔ اس لاحاصل محنت کے عمل پر دنیا جہان کے معاشروں میں ضرب الامثال اور محاورے موجود ہیں جن میں انگریزی زبان کا محاورہ ''Reinventing the wheel' 'اپنے اندر معانی کا سمندر سموئے ہوئے ہے۔ اس کا لفظی مطلب ہے ''پہیے کو دوبارہ ایجاد کرنا''۔ پہیہ انسان کی سب سے قدیم ایجاد سمجھا جاتا ہے، اسی کی بنیاد پر دنیا کی تمام مشینی زندگی نے ترقی کی۔ تانگے ریڑھے سے جہاز اور عام سے چرخے سے بڑی بڑی ملوں کی مشینری تک میں پہیے کی کارفرمائیاں موجود ہوتی ہیں۔ یہ محاورہ کسی کیے ہوئے کام کو دوبارہ کرنے کے بارے میں کہتا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہے، جیسے پہیے کو از سرِ نو ایجاد کیا جائے۔ یہ وہ شغل ہے جو یا تو بے کاری میں کیا جاتا ہے یا پھر ایک مخصوص بدنیتی کے ساتھ کسی کام کو تکمیل سے روکنے کے لئے پہلے لوگوں کو اس میں مصروف کیا جاتا ہے اور پھر جب وہ اس کام کی تکمیل کے قریب ہو جاتے ہیں، اور جب ان کی آنکھوں میں کامیابی کے ستارے چمکنے لگیں تو پوری عمارت کسی نہ کسی بہانے دھڑام سے گرا دی جائے اور کہا جائے کہ اب اسے دوبارہ سے تعمیر کرو۔ یہ بدنیتی کی بدترین مثال ہے اور اگر اسے عملی شکل میں دیکھنا ہو تو حکومتِ پاکستان کی وہ روش ایک مثال کی حیثیت رکھتی ہے جو اس نے سود کے خاتمے کے لئے گزشتہ 68 سال سے اختیار کر رکھی ہے۔ ملک کے بانی اور بابائے قوم حضرت قائداعظم نے یکم جولائی 1948ء کو سٹیٹ بنک کے افتتاح پر سود کے خلاف جہاد کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"I shall watch with keenness, the work of your research organization in evolving banking practices compatible with Islamic ideas of social and economic life".

''میں انتہائی دلچسپی سے ذاتی طور پر آپ کے تحقیق کے ادارے کے کام کا جائزہ لیتا رہوں گا جو وہ ایسے بنکاری نظام کو ترتیب دینے میں سرانجام دے گا جو اسلام کے معاشرتی اور معاشی اصولوں پر مبنی ہو''۔ بابائے قوم کا یہ آخری خطاب تھا اور یوں لگتا ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کا خطاب تھا جو مغرب کے سودی نظام اور سرمایہ دارانہ غلاظت کو بھی سمجھتا ہے اور اسلام کے معاشی نظام کی برکات سے بھی واقف ہے۔ تقریر میں آگے چل کر قائداعظمؒ نے جس طرح مغرب کے معاشی نظام کو تنقید کا نشانہ بنایا وہ ایک سچے اور راسخ العقیدہ مسلمان کا خاصہ ہے۔ آج اگر ایسی گفتگو کی جائے تو آپ کو رجعت پسند، بنیاد پرست اور فرسودہ سوچ کا طعنہ دیا جاتا ہے۔ جو قوم قائداعظم کو آج تک سیکولر ثابت کرنے کی جدوجہد میں لگی ہو وہ اس حکم نامے پر کیسے عمل کرتی۔ سود سے محبت کرنے والی بیوروکریسی اور سیاسی قیادت نے یہ کام تحقیق کے ادارے کے سپرد کر کے سکون کی چادر تان لی۔

اکیس سال بعد 1969ء میں اسلامی مشاورتی کونسل نے ڈھاکہ کے اجلاس میں بنک کے قرضوں، پرائز بانڈوں، انشورنس اور دوسرے ایسے تمام کاروبار کو حرام قرار دے دیا، اس کے بعد خاموشی۔ الیکشن ہوا، جمہوری حکومت کا قیام عمل میں آیا، آئین ترتیب دیا گیا اور اس کے آرٹیکل 37 نے حکومت پر ذمہ داری عائد کی کہ وہ جلد از جلد سود کا خاتمہ کرے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے پانچ سال خاموشی سے گزرے۔ ضیاء الحق نے 29 ستمبر 1977ء کو اسلامی نظریاتی کونسل کو یہ ذمہ داری سونپی کہ کوئی متبادل نظام ترتیب دے جو اسلام کے اصولوں پر مبنی ہو۔ 25 جون 1980ء کو انہوں نے ایک جامع متبادل نظام ترتیب دے کر رپورٹ حکومت کو جمع کروا دی۔ خاموشی پھر بھی قائم رہی۔ 1981ء میں شریعت کورٹ بنی لیکن بدنیتی کے اس عالم میں کہ اس پر دس سال کے لئے مالیاتی معاملات زیرِ غور لانے پر پابندی لگا دی گئی۔ دس سال ختم ہوئے، لوگ شریعت کورٹ چلے گئے اور 14 نومبر 1991ء کو اس نے طویل بحث کے بعد بنک کے سود کو حرام قرار دے دیا۔ اس کے بعد کی کہانی عدالتی جدوجہد کی کہانی ہے۔ ایک جانب حکومت ہے، خواہ نواز شریف کی ہو، بے نظیر یا پرویز مشرف کی اور دوسری جانب وہ چند پاگل اور دیوانے ہیں جو عدالت میں جا کر اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکامات کے مطابق جنگ لڑتے ہیں۔ 23 دسمبر 1999ء کو ملک کی اعلیٰ ترین عدالت نے تاریخی فیصلہ دے کر بنک کے سود اور دیگر متعلقہ کاروبار وغیرہ کو حرام قرار دے دیا۔ 6 جون 2002ء کو سپریم کورٹ نے نظرِ ثانی کی اپیل کی سماعت کی اور شریعت کورٹ کو از سرِ نو سماعت کے لئے کہہ دیا۔ پرویز مشرف اور آصف زرداری کے بارہ سال شرعی عدالت میں ان فائلوں پر گرد پڑتی رہی۔ لیکن معلوم نہیں کیوں اب گرد جھاڑ کر ان تمام افراد کو نوٹس دیئے گئے ہیں جو 1991ء سے اس سود کے خلاف جنگ میں صف آراء تھے۔ ان میں مرحوم عبدالودود خان صاحب کو بھی نوٹس بھیجا گیا ہے جو مرتے دم تک یہ جدوجہد کرتے رہے اور آخر میں اپنی تمام متاع جو چند کاغذات اور نوٹس تھے مجھے سونپ گئے۔ اب دوبارہ سے بحث کا آغاز ہوگا' پھر سے معاشیات کی کتابیں کھلیں گی' حکومتی مجبوریاں بتائی جائیں گی اور کئی سال اسی میں بیت جائیں گے۔ اس منصوبے کا اندازہ ان چودہ سوالوں سے ہوتا ہے جو ان تمام افراد کو دیے گئے جو اس پٹیشن میں فریق ہیں۔ ان تمام سوالوں پر ایک طویل بحث کئی سال پہلے سپریم کورٹ میں ہو چکی اور سپریم کورٹ نے 1999ء کے فیصلے میں ان کا جواب بھی دے دیا ہے۔ یہ سوال اس قوم کے سامنے ہیں اور ساتھ یہ سوال بھی کہ کیا سود کی جنگ ان چند دیوانوں کی ذاتی جنگ ہے، کیا ان کا کوئی قتل کا مقدمہ ہے یا جائیداد کا جھگڑا کہ جس کے لیے یہ دیوانہ وار عدالتوں میں گھومتے پھریں اور بار بار دلائل دیں۔ یہ تو آئین پاکستان کے تحت اس حکومت کی ذمہ داری ہے جسے اٹھارہ کروڑ عوام نے منتخب کیا ہے۔ سوال ملاحظہ کیجئے۔

(1) تفاسیر کی روشنی میں ''ربا'' کی مستند تعریف کیا ہے۔ کیا ربا، سود (USURY) اور انٹرسٹ میں کوئی فرق ہے۔ کیا ربا کا اطلاق اس انٹرسٹ پر بھی ہوتا ہے جو بینک اور مالیاتی ادارے تجارتی اور پیداواری مقاصد کے لیے دیے گئے قرضوں پر وصول کرتے ہیں؟ (2) قرض کی تعریف کیا ہے۔ کیا قرض اور اُدھار (Loan) مترادف اصطلاحات ہیں۔ قرآن میں قرض کن معنوں میں استعمال ہوا ہے؟ (3) کیا بیع جس کو قرآن نے حلال قرار دیا ہے اس کا تعلق بینکوں کے سود پر ہے؟ (4) ربا الفضل کیا ہے اور موجودہ زمانے کے بینکوں پر اس کا اطلاق کیسے ہو؟ (5) ربا کی حرمت کی علت کیا ہے اور مختلف علماء کی قرآن سنت کی حوالے سے تعبیر کیا ہے اور اس کے اخلاقی اور قانونی مضمرات کیا ہیں؟ (6) آئین پاکستان کے مطابق شرعی عدالت قرآن وسنت کے مطابق کسی قانون کو اسلامی یا غیر اسلامی قرار دیتی ہے۔ قرآن وسنت کے صریح احکام کی موجودگی میں علماء کی رائے کی اہمیت کیا ہے؟ (7) کیا سود کی حرمت کا اطلاق غیر مسلم شہریوں پر بھی ہوتا ہے اور کیا غیر مسلم حکومتوں سے لیے گئے قرضوں پر بھی اس کا اطلاق ہوگا؟ (8) قرض کے معاملے میں کرنسی کی قیمت کم ہونے' افراطِ زر یا انڈکشن کے معاملے میں جائز و ناجائز کے متعلق علماء کی رائے کیا ہے؟ (9) قرآن میں مذکور ''راس المال'' کی تعریف میں اگر کاغذی نوٹ کی قیمت کم ہو جائے اور وہ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اصل رقم سے زیادہ ادا کرے تو کیا وہ ربا ہوگا؟ (10) کیا مضاربہ اور مشارکہ صحیح اسلامی متبادل ہیں؟ (11) مطالباتِ زر پر چھوٹ یعنی بلوں پر ڈسکاؤنٹ دینے کا شرعی متبادل کیا ہے؟ (12) اسلامی تحویل کے مقاصد کیا ہیں؟ (13) بینک کرنٹ اکاؤنٹ جس طرح متعین کرتا ہے کیا وہ شریعت کے مطابق ہے؟ اور (14) اگر سود ختم کر دیا جائے تو ماضی میں بیرونی ممالک سے جو قرض لیے ہیں جن میں غیر مسلم ممالک بھی شامل ہیں ان کے بارے میں کیا طریقہ کار ہوگا؟

یہ تمام سوالات 1999ء کے گیارہ سو صفحات کے فیصلے میں تفصیل سے زیرِ بحث لائے جا چکے ہیں اور ان پر فیصلہ بھی دیا جا چکا ہے۔ لیکن اب 5 نومبر 2013ء کو وفاقی شرعی عدالت میں ان پر پھر بحث کا آغاز ہوگا۔ لیکن میں قوم کے سامنے ایک سوال چھوڑے جا رہا ہوں۔ وہ لوگ جو بجلی' گیس' پانی بند ہونے پر حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں' جو ناجائز قتل پر بازار بند کر دیتے ہیں۔ کیا قیامت کے دن اللہ کے اس سوال کا جواب دے سکیں گے کہ میں اور میرا رسولؐ ربا کے خلاف جنگ کا اعلان کر چکے تھے اور تم ایک آواز بھی بلند نہ کر سکے۔ اس خاموشی کا روزِ محشر ہمارے پاس کیا جواب ہوگا۔ وہ تمام علماء' سیاسی جماعتیں جو اسلام اور آئین کی بالادستی پر تحریکیں چلاتی ہیں' جیلیں بھرتی ہیں' ماریں کھاتی ہیں اور کہتی ہیں ہم ایک جنگ لڑ رہی ہیں' کیا ان کے نزدیک اللہ کی شروع کی گئی جنگ اس قابل بھی نہیں کہ ان کے ماتھے پر پسینہ آ جائے' ان کے دل بے چین ہو جائیں' ان کی زبانیں اس جنگ کے حق میں گفتگو کرنے لگیں؟ لوگ کہتے ہیں یہ کارِ لاحاصل ہے' لیکن آخرت پر یقین ہو تو اس کا حاصل تو عظیم تر ہے۔ کون ہے جو اس معرکے میں اللہ کے لیے دشمنی اور اللہ کے لیے دوستی کا اعلان کرے؟ کون ہے؟ کوئی ہے؟ کوئی تو ہو!

allurdupdfnovels.blogspot.com

کچھ نہیں سیکھتے تماشے سے

پانچ سے چھ لاکھ آبادی کے شہر بنوں میں کوئی یہ اندازہ تک نہیں لگا سکتا کہ یہاں صرف چند دنوں میں شمالی وزیرستان سے سات لاکھ لوگ آکر آباد ہوئے ہیں۔ خانماں برباد، اپنے ہی وطن میں مہاجر اور اپنے ہی علاقے میں اجنبی۔ یہ وہ شہر ہے جہاں یہ لوگ کبھی کسی ضروری کام سے آتے اور جلد اپنی خوبصورت وادیوں میں لوٹ جاتے۔ قبائلی رسم ورواج میں گندھے ہوئے ان لوگوں نے کبھی ہجرت کا سوچا بھی نہیں ہوگا۔ ان کے آباؤاجداد تو اپنا علاقہ اور وطن اس وقت چھوڑتے جب ان کے لئے وہاں رہنا ناممکن ہو جاتا۔ جب زمین جانوروں کو چارہ اور انسانوں کو پانی دینے سے انکار کر دیتی یا پھر کوئی مضبوط گروہ، قبیلہ یا فاتح انہیں علاقہ بدر کر دیتا۔ وہ نئے علاقوں کو اپنا مسکن اور وطن بنا لیتے اور صدیوں وہیں رہتے۔ لیکن یہ کیسی ہجرت ہے کہ جس میں واپس لوٹنے کی آس بھی موجود ہے اور دربدر ہونے کا درد بھی۔ اس درد کو بنوں شہر کے لوگوں نے جس طرح سنبھالا ہے ایسی مثال تاریخ میں بہت کم ملتی ہے۔ یہی سات لاکھ اگر لاہور یا کراچی آجاتے تو لوگ خوف سے دروازے بند کر لیتے۔ بڑے بڑے سٹیڈیم، کھلے میدان اور بوسیدہ سرکاری عمارتیں ان کی پناہ گاہیں ہوتیں، تبصرے شروع ہوتے، شہر کا امن و امان خراب کرنے کی باتیں ہوتیں، ماحولیات کے ماہرین اٹھ کھڑے ہو جاتے۔ کسی کو سہولیات پر اضافی بوجھ کا قلق ہوتا اور کوئی ماحول کی خرابی کا رونا روتا۔ یہ سات لاکھ ان بڑے شہروں میں اگر عارضی پناہ گاہوں سے اپنی حیثیت کے مطابق کچی بستیوں میں منتقل ہونا شروع ہوتے، روزگار کے لئے نکلتے، شہر کے لوگوں کو بحث کا ایک اور موضوع میسر آجاتا۔ لیکن سلام ہے بنوں شہر کے عوام کو کہ انہوں نے ان سات لاکھ لوگوں کے لئے اپنے دروازے ایسے وا کئے جیسے کوئی ان کا عزیز ترین رشتہ دار مدتوں بعد ملنے آگیا ہو۔ اس لئے کہ ان چھ لاکھ لوگوں میں جو بنوں کے شہری ہیں، کوئی سیاسی لیڈر نہیں جو قومی یکجہتی کے نام پر ریلی تو کرتا ہے لیکن اس کے کارکنان انہی مہاجرین کے خون کے درپے ہوتے ہیں۔ کوئی تجزیہ نگار، دانشور نہیں جو آپریشن کی حمایت میں کئی سال شور مچاتا ہے لیکن اسے ان مہاجرین کی صورت میں دہشت گردی کے فروغ کا خطرہ نظر آتا ہے۔

جس قوم میں منافقت رچ بس گئی ہو اس کا کیا رونا۔ ان کو میرے آقا سیدالانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کے حال پہ چھوڑ دیا تھا۔ غزوۂ احد کی وہ تلوار "عضب" بھی کفار کے خلاف اٹھی تھی لیکن عبداللہ بن ابی کی سرپرستی میں جو تین سو کلمہ گو منافقین تھے انہیں ان کے حال پہ چھوڑ دیا گیا تھا۔ یہ ہو بھی کیسے سکتا تھا کہ وہ آقا جو صرف کلمہ پڑھنے پر جنت کی بشارت دے اس کی تلوار کسی بظاہر مسلمان کلمہ گو منافق پر اٹھتی۔ لیکن جب ہر طرف نظریات فروشی کا دور ہو تو کوئی بھی کسی کے نام پر دکان سجا دے۔ دکانیں ہی تو ہیں جو چاروں جانب سجی ہیں۔ مسلک کی دکان، عقیدے کا خوانچہ جہاد کا سٹال، آزادی اور سیکولرازم کی ریڑھی، ریاست کا سپر سٹور، ہر کوئی اپنا مال بیچ رہا ہے۔ جس کو جس شخصیت کے پوسٹر سے منافع ہوتا ہے وہ اسے آویزاں کر دیتا ہے۔ ایسی منافقت میں بنوں شہر کا سچ حیران کن لگتا ہے انہوں نے جس طرح اسلامی اخوت کا مظاہرہ کیا وہ ایک مثال ہے لیکن اس ہجرت نے جن داستانوں کو جنم دیا ہے اس کے خوف سے دل کیا، روح تک کانپ رہی ہے۔ سیلاب یا طوفان آنے سے پہلے لوگ تاروں پر لٹکتے کپڑوں کو بھی سائے میں لے آتے ہیں، جانور باندھ دیتے ہیں، لیکن یہاں تو بس ایک ان کا وقفہ کرفیو کے درمیان اور پھر تیس تیس گھنٹے کی پیدل مسافت طے کرتے بچے، عورتیں اور بوڑھے۔ چیک پوسٹ پر کم از کم چھ گھنٹے لمبی قطار میں پوچھ پڑتال کا انتظار۔ کتنوں کی وہیں پر موت۔ جانور ساتھ لے کر آنے والوں نے سبزہ دیکھا تو انہیں وہیں چھوڑ دیا کہ انہیں تو رزق مل گیا، ہمارا اللہ حافظ وناصر ہے۔ دو بچوں کو ہاتھوں پہ ڈالے ایک خاندان اندر داخل ہوا۔ ڈاکٹر کو اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ بچے زندہ یا مردہ۔ تھوڑی زندگی کی رمق محسوس ہوئی تو کمرے میں لے جانے لگا تو باپ نے کہا ڈاکٹر صاحب ہمارے نزدیک یہ بچے مر چکے تھے۔ اگر یہ زندہ بچ گئے تو آپ کے ہوئے۔ مجھے تو اپنی بیٹیوں کے لئے سر چھپانے کی جگہ کا انتظام کرنا ہے۔ ڈاکٹر یہ کہانی الخدمت کے سربراہ عبدالوحید خان کو سناتے ہچکیوں سے رونے لگا۔ کون ہے وہاں جو ان کی دیکھ بھال کر رہا ہے، شدت پسندی کے نام پر گالیاں کھانے والی جماعت اسلامی کی تنظیم، فلاح انسانیت، جس کو امریکہ سے لے کر پاکستان کے شام کی ترنگ میں جھولتے دانشور تک سب بھارت کے ساتھ امن تباہ کرنے پر گالیاں دیتے ہیں۔ لیکن ریلیاں نکالنے والے، چوراہوں پر موم بتیاں جلانے والے، بیوٹی پارلر سے تیار ہو کر انسانوں کے دکھ میں رونے والے کہیں نظر نہیں آتے۔ کیوں آئیں۔ یہ لوگ تو آفت و مصیبت میں ہجرت کر رہے ہیں یہ کوئی عشق کے جنون میں ماں باپ کا گھر چھوڑنے والی "خوش قسمت" لڑکی تو نہیں۔ کیسے ہو سکتے ہیں جس کے لئے گھروں کے دروازے بھی کھلیں اور آنکھ میں آنسو بھی آئیں۔

لیکن اس معاملے میں پوری قوم کی سرد مہری اور خاموشی سے ایک خطرناک کیفیت ضرور نظر آتی ہے۔ ایسی گفتگو کبھی بھی گزشتہ ساٹھ سالوں میں وزیرستان یا قبائلی علاقہ جات کے عوام میں نظر نہیں آئی۔ اب وہ سوال کرنے لگے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہماری سرزمین پر یہ بارہواں آپریشن ہے۔ ہم بارہ دفعہ گھر سے بے گھر ہوئے، کبھی سوات سے تو کبھی باجوڑ اور کبھی اورکزئی سے۔ ہمیں دربدر کر کے کیا آپ کے شہر پر سکون ہو گئے۔ کیا ازبک، تاجک، چیچن اور طالبان لاہور کراچی اور راولپنڈی میں نہیں۔ کیا وہاں وہ لوگوں کے درمیان عدالتیں نہیں لگاتے۔ اغوا برائے تاوان نہیں ہوتا۔ ایک تو پھٹ پڑا، گریبان ایسے پکڑا کہ پھاڑ دے گا۔ کہنے لگا میں اس دن کا انتظار کر رہا ہوں جب لاہور کے ماڈل ٹاؤن، کراچی کے ڈیفنس اور راولپنڈی کے راجہ بازار والوں کو صرف ایک دن کی مہلت دی جائے گی کہ نکلو ہم آپریشن کرنا چاہتے ہیں۔

پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں یہ تیرہواں آپریشن ہے، ہر آپریشن کے بعد یہ اعلان ہوتا ہے کہ ہم نے امن بحال کر دیا۔ ہم نے دہشت گردی کی کمر توڑ دی لیکن مجھے نہ اس آپریشن کی افادیت اور امن کے قیام پر بحث کرنا ہے کہ ایسا کرنا تو غداری کے مترادف ہے۔ مجھے ان بارہ آپریشنوں سے ہجرت زدہ خاندانوں کے المیے سے ہے۔ اس ملک کے ساتھ جو جس نے کرنا ہے کر گزرے کہ یہی مہلت کے دن ہیں بلکہ مہلت کے آخری دن ہیں۔ کیا وہ لوگ جو اپنے گھروں میں چین سے بیٹھ کر ان ہجرت کرنے والوں کی قطاروں کو ایسے دیکھ رہے ہوتے ہیں جیسے جنگ عظیم دوم کی فلم چل رہی ہو، وہ چین سے رہ پائیں گے۔ یہ پہلی دفعہ ہوا ہے کہ ہجرت کی گنگا الٹی بہی ہے۔ 1979ء سے مہاجرین افغانستان سے پاکستان آرہے تھے۔ گزشتہ 35 سال سے، لیکن اس دفعہ افغانستان کے صوبہ خوست میں شمالی وزیرستان کے عام لوگ اپنی غیرت وحمیت کے جنازے کے ساتھ وہاں پہنچے ہیں۔ آج سے تین سال قبل شام کی سرحد پر کھڑے جب میں مہاجرین کے لٹے پٹے قافلوں کو دیکھ رہا تھا تو میرے ساتھ میرے لبنانی دوست نے کہا تھا پتہ نہیں یہ کب واپس جائیں گے لیکن جب بھی گئے نفرت اور غصے میں بھرے ہوئے جائیں گے۔ عراق میں امریکی غلام نوری المالکی کی حکومت نے بھی جب امن کے نام پر اپنے مخالف گروہوں کو القاعدہ اور دہشت گرد کہہ کر مارنا شروع کر دیا تو یہ مظلوم عراقی، شام، اردن، لبنان، مصر حتیٰ کہ یورپ تک جا پہنچے۔ ہجرت کرنے والوں کے پاس گنوانے کے لئے کچھ نہیں ہوتا۔ نہ گھربار، نہ مال و دولت، نہ نوکری اور نہ کاروبار۔ بس ایک جان ہوتی ہے جو ویسے ہی دکھوں کی ماری ہوئی۔ اس وقت دنیا بھر کے مہاجرین میں سے 90 فیصد مسلمان ہیں اور ساٹھ فیصد کے قریب پاکستان سے لے کر مصر تک کے علاقے تک محدود ہیں۔ ان کی نفرتیں یکساں ہیں اور ان کے نزدیک دشمن بھی یکساں ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ کس نے ان کے دشمن کا ساتھ دیا، ان کی غلامی کی اور اس کے خوف اور ذاتی ایجنڈے کے تحت امن کے نام پر انہیں دربدر کیا۔ کسی کو اندازہ ہے کہ داعش ان عراقی مہاجرین کی کوکھ سے نکلی جو شام میں پناہ گزین ہوئے تھے۔ سرحدیں پامال ہو چکیں، پہلے حکومتوں نے کیں پھر ان کو حکومتوں کے خلاف لڑنے والوں نے کیا۔ لیکن اب حکومتوں کے خلاف لڑنے والوں اور مہاجرین کا جو اتحاد بنتا جا رہا ہے یہ خوفناک ہے۔ حکومتیں ایک دوسرے کو فوجی ساز و سامان اور تنخواہ دار سپاہی بھیجا کرتی ہیں لیکن مقابل میں لوگ بے سروسامان ہوتے ہیں ان کے پاس گنوانے کو جان کے سوا کچھ نہیں بچا ہوتا ہے۔ یہی وہ خطرناک مرحلہ ہوتا ہے جب آدمی یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ ڈرون، ہوائی جہاز کے بم، توپ کے گولے یا مشین گن کی گولی سے مرنے سے بہتر ہے کہ چار لوگوں کو ساتھ لے کر مرے اور اگر ایسے لوگوں کے نزدیک سرحدیں بھی بے معنی ہو جائیں تو پھر...... سوچتا ہوں تو کانپ اٹھتا ہوں:

ہے تعجب کہ ہم تماشائی
کچھ نہیں سیکھتے تماشے سے

allurdupdfnovels.blogspot.com

لاپتہ افراد کا ’’فیشن‘‘

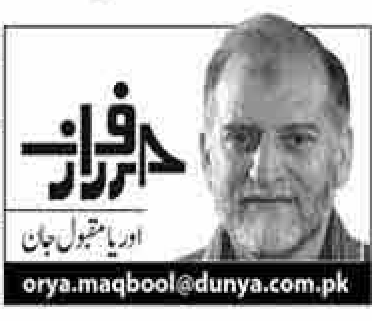

اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

’عالمی ضمیر‘ ایسا مضحکہ خیز لفظ ہے جو روئے ارض پر بسنے والے کمزور انسانوں کا تمسخر اڑانے، ان کے زخموں پر نمک چھڑکنے اور ان کی تضحیک کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ لاپتہ افراد کے حوالے سے اسی عالمی ضمیر کے ٹھیکیدار عالمی ادارے اقوام متحدہ اور انسانی حقوق کے نام پر قائم اور دنیا بھر کے ابلاغ عامہ پر چھائی ہوئی تنظیموں کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو مہذب ترین اور اشرف المخلوقات...انسان...کے اجتماعی وجود سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ اقوامِ متحدہ کا ضمیر پہلی دفعہ لاپتہ افراد کے حوالے سے 1992ء میں جاگا جب اس نے اپنی قرارداد کے آرٹیکل 21 میں افراد کے لاپتہ ہونے کو انسانی حقوق کے خلاف قرار دیا۔ اس کے بعد چودہ سال تک یہ ضمیر گہری نیند سویا رہا۔ پھر 20 دسمبر 2006ء کو اقوامِ متحدہ نے ایک عالمی کنونشن کا مسودہ منظور کیا جس کا عنوان تھا:

International Convention for Protection of All Persons from Enforced Disappearance (ICCPED)

اس کنونشن پر اب تک 93 ممالک نے دستخط کیے ہیں اور سو سے زیادہ ممالک اس عالمی ضمیر کے کاغذی اظہار کا بھی حصہ نہیں۔ اس عالمی ضمیر کے تحت ایک عالمی عدالت بھی ہے جس کے روم قوانین (Rome Statute) نے یکم جولائی 2006ء کو زبردستی لاپتہ کرنے کو انسانیت کے خلاف جرم قرار دیا۔ لاپتہ افراد کا عالمی دن ہر سال 30 اگست کو منایا جاتا ہے۔ لاپتہ افراد سے متعلق تمام قوانین اور کنونشن عالمی منظرنامے پر اس وقت وجود میں آئے جب دوسری جنگِ عظیم کی ہولناکیوں اور کروڑوں انسانوں کے خون سے اپنی پیاس بجھانے کے عمل سے سیر ہو کر عالمی طاقتوں نے سرد جنگ کا آغاز کیا جو کمیونسٹ روس کے ٹوٹنے تک جاری رہی۔ جیسے ہی روس کی کمیونسٹ حکومت اپنے انجام کو پہنچی، اقوام متحدہ میں لاپتہ افراد کا ذکر ایک قرارداد میں آ گیا۔ پینتالیس برس سے زیادہ عرصے پر محیط سرد جنگ کے دوران دنیا کے طول و عرض میں امریکہ نے کمیونزم کا طوفان روکنے کے لیے بے شمار ممالک میں کٹھ پتلی آمر حکومتیں قائم کیں۔ انہیں اسلحہ، سرمایہ اور عوام کو کچلنے کی ٹریننگ دی اور ان کے ذریعے دنیا بھر میں لاپتہ افراد کا ’’فیشن‘‘ متعارف کروایا۔ اس سے پہلے صرف جنگوں میں افراد لاپتہ ہوا کرتے تھے۔ مشرق بعید میں فلپائن، انڈونیشیا، ویت نام، کوریا، تھائی لینڈ، لاؤس اور کمبوڈیا جیسے ممالک میں زبردستی لاپتہ کئے گئے افراد کی کثیر تعداد تھی۔ جنوبی امریکہ پر تو یہ ’’فیشن‘‘ ظلم کی آندھی کی طرح مسلط تھا۔ چلی، ارجنٹائن، ایلسلواڈور، کولمبیا، میکسیکو، برازیل غرض کون سا ملک ہے جہاں ہزاروں گھرانے آج بھی اپنے پیاروں کو یاد کر کے آنسو نہیں بہاتے ہیں۔ برسوں گزرنے کے بعد بھی انہیں علم نہیں کہ ان کے پیارے زندہ ہیں یا مر گئے۔ یہ ’’فیشن‘‘ امریکی گماشتے رضا شاہ کے زمانے میں ایران میں عام تھا

جس کی خفیہ ایجنسی ساواک یہ کام کرتی تھی۔ کمیونسٹ روس ٹوٹا تو انسانی بھیڑیے خون کی پیاس بجھانے کے لیے مسلم ممالک پر چڑھ دوڑے۔ افغانستان اور عراق میں تو جنگ ہو رہی تھی لیکن پاکستان اس جنگ کی تپش سے سب سے زیادہ جھلسنے والا ملک بن گیا۔ بدقسمتی سے اس پرویزی حکومت تھی جیسی حکومتیں جنوبی امریکہ اور مشرقِ بعید کے ممالک میں سرد جنگ کے زمانے میں ہوا کرتی تھیں۔ امریکہ کی غلام، آمر اور ممکنہ حد تک فوجی۔ تمام عالمی قوانین اور انصاف کے معیارات کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے گوانتاناموبے کا جیل خانہ ان لوگوں سے آباد کیا گیا جنہیں پرویز مشرف نے پاکستان سے پکڑ پکڑ کر امریکہ کے حوالے کیا تھا۔ ان کے خلاف مقدمہ درج کیا گیا اور نہ ہی کوئی عدالت بنی۔ جس کے دروازے پر جی چاہے چند لوگ ٹھڈے مارتے ہوئے داخل ہوں، گرفتار کریں اور پھر جہاں چاہیں بیچتے پھریں۔ مدتوں ان لوگوں کا کوئی اتا پتا معلوم نہ ہو سکا۔ یہ لوگ گوانتاناموبے پہنچ گئے لیکن ہمارے قانون نافذ کرنے کے ذمہ دار اداروں کو ایک ’’فیشن‘‘ سے آشنا کر گئے... ’’لاپتہ افراد‘‘ کا ’’فیشن‘‘... پھر ملک کے طول و عرض میں جس نے جو چاہا کیا، جس کو چاہا اٹھایا، غائب کیا اور پھر سینہ ٹھونک کر کہا کہ یہ دہشت گرد ہیں، ملک دشمن ہیں، ہم انہیں کیسے چھوڑ دیں، انہوں نے ہمارے گلے کاٹے ہیں، ہماری تنصیبات پر حملہ کیا ہے اور ہمیں تاک کر نشانہ بنایا ہے۔ ادھر یہ لوگ زبردستی اٹھا کر لاپتہ کیے جاتے رہے اور ادھر اس ملک کے کونے کونے میں ان کی ماؤں، بیویوں، بیٹوں اور بھائیوں کے کرب، بے چینی اور اضطراب میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہ لوگ صرف اپنے پیاروں کی خیریت دریافت کرنے کے لیے کس کس کے دروازے پر نہیں گئے ہوں گے۔ ماؤں نے آنسوؤں سے بھیگی آنکھیں آسمانوں کی جانب لگائے رکھیں اور بیٹیوں نے اپنے بابا کے انتظار میں ہر دروازے کی خاک چھانی لیکن یہ ’’فیشن‘‘ تو بڑے مزے کا تھا جو ان کے ہاتھ آیا تھا۔ جس کو چاہو مجرم کہو، اٹھاؤ، غائب کرو اور پھر رونے والی آنکھ کے سامنے سینہ پھلا کر آنکھیں سرخ کرتے ہوئے اعلان کرو: غداروں، ملک دشمنوں، قاتلوں اور دہشت گردوں کا مطالبہ کرتے ہو؟ ہم حالتِ جنگ میں ہیں اور جنگ میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

مملکتِ خداداد پاکستان میں روزانہ تھانوں میں ایسے ہزاروں مقدمے درج ہوتے ہیں جن میں کسی نے قتل کیا ہوتا ہے، جائیداد کو آگ لگائی ہوتی ہے، منہ پر تیزاب پھینکا ہوتا ہے، گلے کاٹے ہوتے ہیں، زیادتی کے بعد گلا گھونٹ کر مارا ہوتا ہے۔ ان بدترین جرائم کے ملزموں کو پولیس پکڑتی ہے۔ ان میں جو اثر و رسوخ والے ہوتے ہیں وہ اچھے وکیل کرتے ہیں، گواہوں پر دباؤ ڈالتے ہیں، کسی کو روپے پیسے کا لالچ دے کر گواہی سے روکتے ہیں، روزانہ ایسے ہزاروں مقدمے عدالتوں میں پیش ہوتے ہیں۔ ان میں سے کتنے ہی واقعتاً قاتل، چور، ڈاکو اور عزت لوٹنے والے ہوتے ہوں گے لیکن تفتیش کی کمزوری، گواہ کے بیٹھنے، وکیلوں کی محنت، رشوت اور سفارش کے زور پر بری ہو جاتے ہیں۔ یہ تمام لوگ ہمارے معاشرے میں دندناتے پھرتے ہیں، مظلوموں کی چھاتی پر مونگ دلتے ہیں، کیا صرف اس لیے کہ انہوں نے ’عام‘ انسانوں کے گلے کاٹے، ’عام‘ لوگوں کی جائیدادیں نذرِ آتش کیں؟ لیکن وہ جو کسی فورس سے تعلق رکھنے والے شخص کے ساتھ یہی سلوک کرے تو اسے غائب کر دیا جاتا ہے۔ یہ ہے وہ ’’فیشن‘‘ جو اس دنیا میں سرد جنگ کے بعد سے امریکہ اور اس کے حواریوں نے طاقت کے نشے میں ایجاد کیا اور اس کے پروردہ ڈکٹیٹروں نے اسے اپنی طاقت کا مظہر قرار دیا۔

کیسی کیسی کہانیاں ہیں۔ بے گناہوں اور بے قصور لاپتہ افراد کے والدین اور بیوی بچے صرف یہ سوال کرتے پھرتے ہیں کہ ہمیں ہمارا قصور بتا دو، اگر قصور نہیں بتانا تو بچے کی آواز ہی سنا دو، لیکن جابر اور بااختیار لوگوں کے سامنے یہ آوازیں صدا بصحرا ثابت ہوتی ہیں۔ مجھے صرف ایک خوف ہے کہ دنیا کے باقی ممالک نے تو امریکہ کو الوداع کہہ کر اپنا یہ مسئلہ حل کر لیا لیکن ہمیں امریکہ کو الوداع کہنے کا تصور کرتے ہوئے بھی اتنی اذیت ہوتی ہے جتنی نئی نویلی دلہن کو طلاق سے ہوتی ہے۔ اگر یہی ’’فیشن‘‘ عام ہو گیا تو پھر ہر پولیس والا، کسٹم والا یا عام سکیورٹی ایجنسی والا بھی اپنے مطلوبہ افراد کا یہی حشر کرنا شروع کر سکتا ہے۔ ایک عام آدمی بھی کسی کو شخص کو اٹھا کر جنگلوں میں لے جائے گا اور انتقام کی آگ سرد کر لے گا۔ لوگ ایک جتھہ بھی بنا سکتے ہیں جو اسی ’’فیشن‘‘ کے مطابق ظالموں، ڈاکوؤں اور قاتلوں کو خود کیفرِ کردار تک پہنچانے لگے۔ اگر خود ہی ملزم بنانا، خود ہی گرفتار کرنا، خود ہی غائب کرنا اور پھر خود ہی لاش ویرانے میں پھینک دینا اصولِ انصاف کے مطابق ہے تو پھر طالبان اور بلوچستان کے جنگجو کون سی انوکھی بات کر رہے ہیں۔ ریاست پانچ یا سات لاکھ سکیورٹی فورسز یا جدید اسلحہ و بارود کے ذخیرے سے نہیں قانون کی حکمرانی سے چلتی ہے۔ اگر ریاست بھی ایسے ہی انتقام پر اتر آئے تو پھر کچھ باقی نہیں رہتا۔ سیّدالانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارے میں فرمایا: ’’اقضٰی کم علی‘‘ یعنی عدل کرنے میں علیؓ بہترین ہیں۔ انہی کا قول ہے: ’’اگر سو گناہگار چھوڑے جانے کا خطرہ ہو تو پھر بھی ایک بے گناہ کو سزا نہیں دی جا سکتی‘‘۔ لیکن ہم کتنے ہی بے گناہوں کی آہوں اور سسکیوں پر ریاست کی عمارت تعمیر کر رہے ہیں۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

لو وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ بے ننگ و نام ہے

کاش اس ملک کے رہنماؤں' حکمرانوں' دانشوروں اور صاحبانِ علم میں سے کوئی ہوتا جو اقوام متحدہ کے خصوصی ایلچی اور برطانیہ کے سابق وزیر اعظم گورڈن براؤن کو آئینہ دکھاتا۔ اسے یاد دلاتا کہ تم لوگوں نے اپنے گھر تو تباہ کر لیے' اپنے معاشروں میں شادی کو ایک معاشرتی اور معاشی بوجھ بنا کر پیش کیا' اس مقدس ادارے کی بنیادوں اور ہیئتِ ترکیبی کو مذاق بنایا' عورت کو گھر سے محبت چھڑا کر کیریئر کی سیڑھیوں پر چڑھایا' جنسی تلذذ کو پورے تعلقات کا محور بنا کر اولاد کی پرورش کو ثانوی بلکہ ادنیٰ حیثیت پر پہنچایا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مفکرین' نفسیات دانوں اور ماہرینِ معاشرت نے شادی کو معاشی طور پر مستحکم' معاشرتی طور پر ذمہ دار اور ذہنی طور پر بلوغت کی معراج پر پہنچنے سے منسلک کر دیا۔ ہر کسی نے دیر سے شادی کو کامیابی کی ضمانت قرار دیا: برٹرینڈ رسل جیسے فلسفی نے پینتیس سال سے قبل شادی کرنے کے نقصانات پر دلائل کے انبار لگا دیے۔ شادی کی تیاریوں میں ایک دوسرے کو جاننے' قربتوں کے سفر پر نکلنے اور ہو سکے تو جسمانی تعلق سے بھی ایک دوسرے کی چاہت کو پرکھنے کو لازمی قرار دیا گیا بلکہ شادی کے لیے لکھی جانے والی رہنما کتابوں میں اس دور کو ایک سنہرا دور قرار دیا گیا ہے جسے وہ ''Courtship'' کہتے ہیں۔ اس کی یادوں کو ایسا افسانہ بنایا گیا جو شادی کے تلخ ایام میں بھی رہ رہ کر یاد آئے۔ اس سارے ماحول میں عین عالمِ شباب میں شادی کو ایک احمقانہ فعل بنا کر رکھ دیا گیا۔ آدمی کو معاشی جدوجہد اور معاشرتی مقام کے جھنجھٹ میں الجھا کر ایک انفرادی دوڑ میں لگا دیا۔ مرد ہو یا عورت' ہر کوئی پہلے کیریئر کی بلندیوں پر پہنچے' معاشی طور پر مضبوط ہو اور اپنے مستقبل کو محفوظ کرنے پر توجہ مرکوز کرے اور جب یہ منزلیں طے ہو جائیں تو شادی کی طرف آئے۔ اس دوران اس کی جسمانی ضروریات کے لیے وہ تمام اخلاقی معیارات ختم کر دیے گئے جو انسانی تہذیب نے صدیوں سے اپنائے ہوئے تھے۔ کم سنی یا نوجوانی کی شادی تو ختم ہو گئی بلکہ بہت حد تک شادی ایک معمولی سا تعلق بن کر رہ گئی مگر اس طرح ان معاشروں کے ساتھ جو بیتی' وہ ایک تاریخی انسانی المیہ ہے۔ انسان کی جبلی خواہشات پر پابندی کا نتیجہ یہ نکلا کہ پورا مغرب ایسی ماؤں سے آباد ہو گیا جو کم سن تھیں' انہوں نے شادی نہیں کی تھی مگر ان کی گود میں بچے تھے۔

امریکہ کے شہر نیویارک میں اقوام متحدہ کا ہیڈ کوارٹر ہے اور اس ادارے کا خصوصی ایلچی گورڈن براؤن یہ اعلان کرتا ہے کہ ہم پاکستان میں ایسے علاقے مخصوص کریں گے جہاں کم عمری کی شادیاں نہ ہوں۔ اسی امریکہ میں ان کم سن ماؤں کے اعداد و شمار پر نظر دوڑائیں تو روح کانپ اٹھتی ہے۔ صرف ایک سال کے اعداد و شمار ہی پورے معاشرے کی کیفیت کا احاطہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔ یہ سرکاری طور پر اکٹھے کیے جاتے ہیں اور The Alan guttmacher institute اسے ہر سال اپ ڈیٹ کرتا ہے۔ اس وقت 2002ء کے اعداد و شمار میسر ہیں۔ اس سال امریکہ میں سات لاکھ پچاس ہزار بچیاں یعنی جن کی عمر 18 سال سے کم تھی' حاملہ ہوئیں۔ ان میں سے چار لاکھ 25 ہزار بچیوں نے اولاد کو جنم دیا۔ دو لاکھ پندرہ ہزار نے اسقاطِ حمل کروایا اور ایک لاکھ دس ہزار کے حمل ضائع ہو گئے۔ ان کم عمر کی بچیوں میں سے 20 فیصد ایسی تھیں جو اس سے پہلے ایک بچے کی ماں بن چکی تھیں اور 25 فیصد ایسی تھیں جو اس عمر سے پہلے دو بچے جنم دے چکی تھیں اور یہ تیسرا تھا۔ ان میں سے 90 فیصد بچیاں وہ تھیں جن کے ہاں اولاد شادی کے مقدس بندھن میں بندھے بغیر ہوئی اور غیر شادی مائیں سب 17 سال سے کم تھیں۔ ان میں سے 75 فیصد ماؤں کے عشاق نے انہیں پانچ سال سے کم عرصے میں چھوڑ دیا۔ بچہ پیدا کرنے کی وجہ سے یہ تعلیم چھوڑ کر گھر آ بیٹھی تھیں' اس لیے ان کو ریاست کی رفاہی امداد کا سہارا لینا پڑا۔ ان کم سن ماؤں کے خاوند عموماً ناکام عاشق' بے کار یا بہت کم کمانے والے ہوتے ہیں۔ صرف ایک ریاست کیلیفورنیا کا ان کم سن ماؤں کو مستقل مدد دینے پر سالانہ ڈیڑھ ارب ڈالر خرچ آتا ہے۔ پوری ریاست میں ان ماؤں اور بچوں کے پیدائش کے خرچے' ہسپتال کے اخراجات اکٹھے کیے جائیں' جن میں ان ماؤں کی نوکری چھوٹنا بھی شامل ہے تو کل سالانہ خرچہ ساڑھے تین ارب ڈالر بنتا ہے۔ صرف ایک چھوٹے سے شہر اورنج کاؤنٹی کا بوجھ دو کروڑ 23 لاکھ ہے۔ میں اعداد و شمار سے تحریر کو بوجھل نہیں کرنا چاہتا' ورنہ یورپ کے کسی بھی ''مہذب'' اور ترقی یافتہ کہلانے والے ملک کے سرکاری ذرائع سے حاصل کی گئی معلومات اٹھا لیں تو نقشہ امریکہ سے مختلف نہ ہو گا۔ خود گورڈن براؤن کا اپنا ملک برطانیہ کم سن ماؤں اور خصوصاً غیر شادی شدہ ماؤں کے معاملے میں پورے یورپ میں سرفہرست ہے۔

آپ نے قانون بنا دیے' آپ کے ہاں قانون پر سختی سے عمل بھی کروایا جاتا ہے لیکن انسان کی جبلی ضروریات نے تو راستہ نکالنا تھا۔ اس نوجوان نسل نے شادی کے مقدس' اہم اور معاشرتی طور پر تسلیم شدہ ادارے پر لعنت بھیجی اور بغیر شادی بچے پیدا کرنا شروع کر دیے۔ کیا ان سے اخراجات میں کمی آ گئی؟ کیا ان سے صحت کے معیارات بلند ہو گئے؟ کیا اس سے انسانوں میں معاشرتی ذمہ داری بڑھ گئی؟ نہیں جناب نہیں' بلکہ ہوا یہ کہ وہ سب کچھ ہوا جو شادی سے وابستہ تھا لیکن بقول مغربی دانشوروں کے ''وہ شادی کے نفسیاتی' معاشی اور معاشرتی ذمہ داریوں کے بوجھ سے آزاد رہا' کیونکہ وہ اسے اٹھانے کے قابل نہ تھا'' لیکن حیرت ہے ان مسلمان معاشروں کے معاشی' طبی اور معاشرتی ماہرین پر جو اسلام کا بنیادی فلسفہ نہیں سمجھ پائے۔ اسلام اس معاشرے میں ایک احساسِ ذمہ داری کے تصور کو اجاگر کرتا ہے اور پورے معاشرے کو اس کا پابند بناتا ہے۔ اس کے نزدیک ہر جنسی تعلق شادی کے رشتے سے وابستہ ہے تاکہ پوری دنیا کو علم ہو کہ سب تمہاری ذمہ داری ہے۔ اسلام اگر عدل کے ساتھ دوسری شادی کی اجازت دیتا ہے تو معاشرے میں چوری چھپے آشنائیوں' طوائفوں اور رکھیلوں سے خفیہ تعلقات سے منع کرتا ہے اور پھر مرد کو ذمہ داری کے طوفان میں لا کھڑا کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اتنے مرد بنتے ہو تو لاؤ اپنی معشوقہ کو اپنے گھر' شادی کرو اور پھر انصاف بھی کرو اور ''اگر تم نے انصاف نہ کیا تو قیامت کے دن تمہیں آدھے دھڑ سے اٹھایا جائے گا'' (مفہومِ حدیث)۔ اسلام نے اگر جنگ میں لونڈی رکھنے کی اجازت دی تو وہ بھی اس لیے کہ جس اللہ نے مرد کو پیدا کیا ہے وہ جانتا ہے کہ اس کی جبلت کیا ہے۔ دنیا کی کون سی ایسی جنگ ہے جس میں لاکھوں کروڑوں عورتیں جنسی تشدد کا نشانہ نہ بنی ہوں اور پھر دنیا بھر میں طوائفوں کی طرح بیچی نہ گئی ہوں۔ صرف جنگِ عظیم دوم کے بعد کی تعداد گن لی جائے تو انسانیت کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ جنگ میں جو عورت تمہارے ہاتھ آئے' نہ تم اس سے جنسی زیادتی کر سکتے ہو اور نہ ہی اسے طوائف کی زندگی گزارنے پر مجبور کر سکتے ہو۔ اتنا شوق ہے تو لاؤ اسے اپنے گھر اور پھر شرائط دیکھو: جو خود کھاتے ہو' وہ اسے کھلاؤ' جو خود پہنتے ہو' اسے پہناؤ۔ لیکن اس کے باوجود بھی ہم کس قدر ظالم ہیں کہ والدین کم سن بچوں کی بے راہ روی برداشت کرتے ہیں لیکن شادی نہیں کرتے' بیویاں اپنے خاوند کی گرل فرینڈ اور رکھیل برداشت کرتی ہیں' سوکن نہیں اور جنگوں کی تباہی سے جنس کے بازار سجاتے ہیں' گھر لا کر اسے پناہ نہیں دیتے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

ملالہ اور عبیر قاسم حمزہ الجنابی

جب تک ملالہ نوبل انعام کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی، اس ملک کے میڈیا میں ایک شور برپا تھا۔ "ہمارا سر فخر سے بلند ہے، پاکستان کو عزت مل رہی ہے، ایک بچی جس کی جدوجہد علم کے لیے تھی، جو خواتین کے حقوق کی پاسداری کے لیے نکلی تھی اور آج پوری دنیا میں ہمارے ملک کا نام روشن کر رہی ہے۔ پوری دنیا اس کی جرأت کو سلام کر رہی ہے، اس کے مشن کو جاری رکھنے اور تعلیم کو عام کرنے کے لیے سرمایہ دے رہی ہے"۔ اس ملک کے "عظیم" اور "باشعور" دانشوروں کے یہ نعرے میرے کانوں میں گونجتے تھے اور میں سوچتا تھا کہ وہ امن کا نوبل انعام' جسے یہ قوم عزت کا تاج سمجھ رہی ہے' کیسے کیسے ظالموں، قاتلوں اور انسانیت کے دشمنوں کے سر پر سجتا رہا ہے۔ ملالہ کا سب سے بڑا وکیل گورڈن براؤن وہی ہے جس نے عراق پر حملہ کرنے کے لیے برطانوی پارلیمنٹ میں نہ صرف ووٹ دیا تھا بلکہ دھواں دار تقریر بھی کی تھی۔ عراق پر وہ جنگ مسلط کی گئی جس نے لاکھوں لوگوں سے صرف تعلیم کا نہیں بلکہ زندگی کا حق بھی چھین لیا۔ عورتوں کے حقوق کے یہ عالمی چیمپئن وہ ہیں جن کے ہاتھ مظلوم عورتوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں اور سروں میں عورتوں کی عزتوں سے کھیلنے کی ہوس رچی ہوئی ہے۔ 12 مارچ 2006ء کو ملالہ کی ہم عمر چودہ سالہ عبیر قاسم حمزہ جو عراق کے چھوٹے سے قصبے المحمدیہ میں رہتی تھی' اس پر کیا بیتی؟ دل تھام کر پڑھیے:

عبیر کا والد قاسم حمزہ رحیم اور ماں فخریہ طٰہٰ محسن اپنی اسی بیٹی عبیر، 6 سالہ بیٹی حدیل، 9 سالہ احمد اور 11 سالہ محمد کے ساتھ اپنے گھر میں خوش و خرم رہ رہے تھے۔ عبیر کو اس کے والدین بہت کم گھر سے باہر جانے دیتے کہ سامنے گورڈن براؤن کے جمہوری ووٹ سے شروع ہونے والی عراق جنگ کے سپاہیوں کی چیک پوسٹ تھی جس پر چھ سپاہی پاؤل کورٹز، جیمز بارکر، جیسی سپل مین، برائن ہاورڈ، سٹیون گرین اور انتھونی پرایب موجود تھے۔ جب کبھی یہ بچی باہر نکلتی تو وہ اسے چھیڑتے اور وہ گھبرا کر اندر بھاگ جاتی۔ ایک دن یہ ان کے گھر گھسے، تلاشی لی اور عبیر کی گال پر سٹیون گرین نے انگلی پھیری جس نے سارے گھر کو خوفزدہ کر دیا۔ جب کبھی وہ اپنے والدین کے ساتھ باہر نکلتی' وہ اس کی طرف دیکھ کر غلیظ اشارہ کرتے ہوئے ویری گڈ کہتے۔ 12 مارچ 2006 کی صبح وہ شراب پینے میں مشغول تھے کہ عبیر کے دونوں بھائی سکول کے لیے روانہ ہوئے۔ عبیر کو اس لیے سکول سے اٹھا لیا گیا تھا کہ والدین ان سپاہیوں سے خوفزدہ تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ مکان میں داخل ہوئے۔ انہوں نے ماں باپ اور چھوٹی بہن کو ایک کمرے میں بند کیا اور عبیر کو دوسرے کمرے میں۔ سٹیون گرین نے اس کے ماں باپ اور چھوٹی بہن کو ایک کمرے میں لے جا کر قتل کر دیا اور دوسرے کمرے میں باقی دو سپاہی اس چودہ سالہ بچی سے زیادتی کرتے رہے۔ اس کے بعد گرین کی آواز آئی' میں نے انہیں قتل کر دیا اور پھر وہ بھی عبیر پر پل پڑا۔ اس کے بعد ان سپاہیوں نے اس کے سر پر گولی مار کر قتل کر دیا۔ جاتے ہوئے ایک سپاہی نے اُس کے زیر جامے کو لائٹر سے آگ دکھائی اور کمرے میں پھینک دیا۔ گھر سے دھواں نکلا تو پڑوسی دوڑے ہوئے آئے اور انہوں نے جس حالت میں اس مظلوم چودہ سالہ بچی کو دیکھا وہ ناقابل بیان ہے۔ میں نے جب یہ واقعہ پڑھا اور چودہ سالہ عبیر قاسم حمزہ الجنابی کی تصویر دیکھی تو کئی راتیں بے چینی اور اضطراب سے سو نہ سکا تھا۔

نوبل پرائز دینے والوں اور ملالہ یوسف زئی کی وکالت کرنے والوں کے ہاتھ عبیر جیسی بے شمار معصوم لڑکیوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں جو ان کے خوف سے گھروں سے نہیں نکلتی تھیں۔ جنہوں نے ان کی بدمعاش اور غلیظ نظروں کے خوف سے سکول جانا چھوڑ دیا تھا۔ عبیر تو ان کے خلاف کوئی ڈائری بھی تحریر نہیں کر رہی تھی جو دنیا کا کوئی بڑا چینل نشر کرتا۔ اس نے تو انہیں ظالم، تعلیم کے دشمن اور انسانیت کے قاتل بھی نہیں کہا تھا۔ اس کا والد کسی این جی او کا سربراہ یا کارپرداز نہیں تھا کہ اپنی بیٹی کو ان سپاہیوں کے خلاف اکساتا، اس کی ایک فرضی نام سے ڈائری لکھنے میں مدد کرتا اور پھر دنیا بھر میں داد سمیٹتا۔ عبیر تو اس ظلم کی وجہ سے سہم سی گئی تھی۔ اس کے زندہ بچ جانے والے بھائیوں نے بتایا کہ جس دن سٹیون گرین نے اس کے گال پر انگلی پھیری' ہمارے والد نے اسی دن اسے سکول سے اٹھا لیا تھا۔ وہ اس دن بہت روئی۔ اسے گھر کے باہر لگی ہوئی سبزیوں کو پانی دینے، دیکھ بھال کرنے کا بہت شوق تھا، لیکن اس دن کے بعد سے وہ بس کھڑکی سے انہیں دیکھتی رہتی۔

اس عالمی یا مقامی میڈیا میں کوئی ایسا شخص ہے جس کے سینے میں دل ہو، جس کے دل میں بیٹی کی محبت جاگتی ہو، جس کی آنکھ سے ظلم پر آنسو نکل آتے ہوں؟ وہ اٹھے اور کہے' آؤ ہم مل کر ایک اور امن انعام کا آغاز کرتے ہیں، ان بچوں کے لیے جو صابرہ و شطیلہ میں مارے گئے، ان مظلوموں کے لیے جو ٹینکوں تلے کچل دیے گئے، ان قیدیوں کے لیے جن پر کتے چھوڑے گئے، ان بہنوں کے لیے جو ان درندوں کے ہاتھوں اس وقت تک درندگی کا شکار ہوتی رہیں جب تک ان کا سانس باقی تھا' عبیر کے لیے جس سے اس کا سکول چھوٹ گیا، جس کے لیے گھر سے نکلنا عذاب ہو گیا۔

لیکن ہم بے حس ہیں۔ نوبل انعام کی چکاچوند نے ہماری غیرت کے بچے کھچے گھروندے کو بھی ملیامیٹ کر دیا ہے۔ اٹھارہ کروڑ کی قوم نے ایک مغربی چینل کے پروگرام میں اپنی اس ہونہار بیٹی کا یہ فقرہ کیسے سن لیا کہ ہم عورتیں وہاں قیدیوں کی طرح ہیں، ہم مارکیٹ نہیں جا سکتیں۔ کراچی سے پشاور اور گوادر سے گلگت تک کیا پاکستان یہ ہے جس کی تصویر ملالہ نے اس پروگرام میں پیش کی؟ اس نے کہا' ایسے لگتا تھا ہم جیل میں ہیں۔ میں نے بلوچستان کے دور دراز گاؤں سے لے کر لاہور، کراچی، پشاور اور چھوٹے چھوٹے قصبوں تک عورتوں کو ہر موڑ اور ہر مقام پر دیکھا ہے۔ کھیتوں اور کھلیانوں میں، دفتروں اور فیکٹریوں میں، بازاروں اور ہوٹلوں میں۔ کیا یہ ہے ملالہ کا قید خانہ؟ کیا یہ کالک ہے جو وہ اس قوم کے منہ پر مل کر نوبل انعام کی سیڑھی پر چڑھنا چاہتی ہے؟ اس قوم کا ہر 'دانشور'، 'مفکر' اور اینکر پرسن عوام کو خوشخبری سناتا ہے، اسے پاکستان کا وقار بلند ہونے کی نوید قرار دیتا ہے۔ ملالہ نوبل امن انعام حاصل کرنے والوں کی صف میں ہی ٹھیک تھی جس میں اسرائیل کے تین قاتل وزرائے اعظم بیگن، اسحٰق رابین اور شمعون پیرس بھی کھڑے ہیں۔ نوبل انعام لیتے ہوئے ان کے ہاتھ ہزاروں معصوم فلسطینیوں کے خون سے رنگے ہوئے تھے۔ اس فہرست میں ڈورن حملوں سے معصوموں کی جانیں لینے والا بارک اوباما اور مسلم امہ کا سب سے بڑا دشمن ہنری کسنجر بھی کھڑا ہے۔ یہ غیرت کے سودے ہوتے ہیں جو غیرت مند قوموں کے غیرت مند افراد کیا کرتے ہیں کہ ایسے امن انعامات پر لعنت بھیج دیتے ہیں۔ ویت نام کا لیڈر لوڈیوتھو (LU DUE THO) امریکہ سے امن مذاکرات کر رہا تھا۔ جب اسے ہنری کسنجر کے ساتھ امن کا انعام دیا گیا تو اس نے انکار کر دیا۔ ژاں پال سارتر کو ادب کا نوبل انعام دیا گیا تو اس نے بھی یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مجھے اپنے نام کے ساتھ نوبل انعام یافتہ لکھ کر اپنے ساتھ گھٹیا مذاق نہیں کرنا۔ پاکستان کی ایک مسلمان بیٹی کو مغرب کے قاتل حکمران ہمارے منہ پر کالک ملنے کے لیے استعمال کرتے رہے، اس کے سر پر ایسے ہاتھ امن کا تاج پہنانا چاہتے تھے جن پر عبیر قاسم جیسی کئی مسلمان بچیوں کا خون لگا ہوا ہے۔ یہ بچیاں جنہیں ان ظالموں کے خوف سے گھروں میں قید ہونا پڑا، ان کا سکول چھوٹ گیا، وہ گھروں میں قید ہو گئیں لیکن پھر بھی وہ ان کی ہوس سے اپنی عفت بچا سکیں نہ زندگی۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

ملالہ اور اس کے پر موٹرز

اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

معین اختر مرحوم منی بیگم کے حوالے سے ایک لطیفہ سنایا کرتے تھے کہ ایک دفعہ پشاور میں منی بیگم ایک شو کرنے گئیں۔ غزل کی گائیکی اور منی بیگم کا دھیما انداز، محفل کچھ دیر تک تو چلتی رہی، لیکن موسیقی کی کوئی ایک تال بھی ایسی نہ آئی کہ وہاں بیٹھے پختون جوش میں آ کر خٹک ڈانس کرنے لگیں۔ مجمعے کی اکتاہٹ دیکھ کر ایک شخص پستول ہاتھ میں پکڑے سٹیج پر آ دھمکا۔ منی بیگم ڈر کر خاموش ہو گئیں۔ وہ ایک دم بولا ''تم گاؤ، تم تو ہمارا بہن ہے، ہم تو اس کو ڈھونڈ رہا ہے جو تمہیں لے کر آیا تھا''۔ ملالہ یوسفزئی کی کتاب ''آئی ایم ملالہ'' پڑھنے کے بعد معین اختر کا یہ لطیفہ شدت سے یاد آتا ہے اور ساتھ ہی اس امریکی کا فقرہ بھی ذہن میں ہتھوڑے کی طرح ٹکرانے لگتا ہے جو اس نے ایمل کانسی کو پکڑ کر امریکہ کے حوالے کرنے کے بعد کہا تھا کہ ''پاکستانی پیسے کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں''۔ کرسٹینا لیمب، جس نے ملالہ کی باتیں سن کر یہ کتاب تحریر کی ہے، کو میں نے بلوچستان کے شہر پشین میں 1989ء میں ایک بلوچ سردار اور اس وقت کے وزیر کے ساتھ دیکھا تھا، جو اسے ہر پارٹی میں لیے پھرتا تھا۔ ملالہ کی یہ کہانی، جو 276 صفحات پر مشتمل ہے، پڑھنے کی آپ کو شاید ضرورت نہ ہی پڑے اگر گزشتہ بیس سالوں سے اسلام، مسلمانوں اور خصوصاً پاکستان پر جو الزامات لگائے جاتے ہیں، جس طرح اسلام، مسلمان اور پاکستان کو بدنام کیا جاتا ہے، وہ سب آپ کے علم میں ہو۔ یہ تمام الزامات اور پھر کتاب سے سولہ سالہ ملالہ کی کہانی کے اقتباسات سامنے رکھیں تو آپ کے ذہن میں یہ سوال ابھرے گا کہ اس کمسن بچی کے منہ میں میرے دین، مسلمان اور پاکستان کے لوگوں کے بارے میں یہ ذلت آمیز لفظ کس نے ڈالے اور کس مقصد کے لیے ڈالے گئے؟ سب سے پہلے جس شخص کا تذکرہ ہے وہ سید الانبیاء ﷺ، امہات المومنین اور اہلِ بیت کے خلاف غلیظ الفاظ استعمال کرنے والا سلمان رشدی ہے، جو مغرب کی آنکھوں کا تارا ہے۔ اس کے بارے میں ملالہ لکھتی ہے: ''پاکستان میں اس کتاب کے خلاف مضامین سب سے پہلے ایک ایسے مولوی نے لکھنے شروع کیے جو ایجنسیوں کے بہت نزدیک تھا'' (صفحہ 30)۔ تاریخ کا یہ بدترین جھوٹ اس کے منہ میں کس نے ڈالا؟ اسے کس نے یہ لکھنے پر مجبور کیا کہ سلمان رشدی کو ''آزادیِ اظہار'' کے تحت یہ پورا حق تھا؟ تاریخ کے یہ اندھے کیا اس قدر لاعلم ہیں کہ انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ سلمان رشدی کی کتاب کے خلاف مظاہرے سب سے پہلے لندن اور یورپ کے شہروں میں شروع ہوئے تھے اور ایران کے روحانی پیشوا آیت اللہ خمینی نے تو اس کے قتل کا فتویٰ تک دے دیا تھا۔ لیکن ایجنسیوں کے ساتھ سید الانبیاء ﷺ کے عشق کو جوڑنے کی جسارت صرف ملالہ جیسی ''سولہ سالہ معصوم'' بچی ہی کر سکتی ہے۔ اس کے بعد ضیاء الحق کا ایک مضحکہ خیز قسم کا حلیہ بیان کیا گیا ہے اور ساتھ ہی وہ شور جو اس ملک میں مچایا جاتا ہے کہ ''عورتوں کی زندگی ضیاء الحق کے زمانے میں بہت زیادہ محدود ہو گئی تھی'' (صفحہ 24)۔ کوئی 1977ء سے 1988ء کے درمیانی عرصے میں ٹیلی کاسٹ ہونے والے پاکستان ٹیلی ویژن کے ڈراموں کی فہرست اٹھا لے تو اسے پتہ چلے گا کہ یہ پی ٹی وی اور ڈرامے کا سنہری ترین دور تھا۔ حسینہ معین، فاطمہ ثریا بجیا اور نور الہدیٰ شاہ اسی دور کی علامتیں ہیں۔ ایسے لگتا ہے کہ ان فقروں میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے جیسے تمام سکول، یونیورسٹیاں، کالج بند کر دیے گئے تھے اور عورتیں پس دیوار قید ہو گئی تھیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ بیکن ہاؤس، سٹی سکول، امریکن سکول، گرامر سکول وغیرہ سب ضیاء الحق کے دور میں کھلے اور اس ملک کے طول و عرض میں ان کی شاخیں کھولی گئیں۔ لیکن مغرب کو گالی دینے کے لیے ایسا آدمی چاہیے ہوتا ہے جو نماز پڑھتا ہو یا اللہ کا نام لیتا ہو۔ مغل سارے ظالم تھے لیکن گالی اورنگ زیب کو ہی دی جاتی ہے۔ یہ تصور اس پوری کتاب کے سبھی صفحات میں ملتا ہے اور یہ تصور اس سولہ سالہ معصوم ملالہ کے ''عظیم'' دماغ کا مرہون منت ہے۔ پاکستان سے محبت کا عالم یہ ہے کہ ملالہ پاکستان کی پچاسویں سالگرہ کے دن چودہ اگست کی خوشی منانے سے اپنے والد کے انکار کو فخر سے بیان کرتی اور بتاتی ہے کہ اس کے والد اور اس کے دوستوں نے اس دن بازوؤں پر سیاہ پٹیاں باندھی تھیں (صفحہ 45)۔ پردے اور برقعے تو ایک معمول ہے، اس کا مذاق اڑاتے ہوئے ملالہ کہتی ہے کہ برقعہ ''گرمیوں میں ایک کیتلی کی طرح ہوتا ہے (صفحہ 51)۔ ملا محمد عمر کا ذکر کرتے ہوئے اسے انتہائی تمسخر کے ساتھ (One eyed Mullah) کہا گیا ہے۔ میں یہاں اس کا ترجمہ نہیں لکھنا چاہتا کہ میرے آباؤ اجداد، میرے مذہب اور میری اخلاقیات نے مجھے اس طرح کے تمسخر کی تعلیم ہی نہیں دی۔

اس کے بعد امریکہ کے صدر بش کی زبان اس لڑکی کے منہ میں ڈال دی گئی اور وہ صفحہ 71 پر لکھتی ہے ''ہر کوئی سمجھتا ہے کہ مشرف ڈبل کراس کر رہے تھے، امریکہ سے پیسے لیتے تھے اور جہادی لوگوں کی مدد بھی کرتے تھے۔ آئی ایس آئی انہیں سٹریٹیجک اثاثہ سمجھتی تھی''۔ امریکہ کی زبان بولتے ہوئے ملالہ کو ذرا بھی شرم نہیں آئی کہ یہ وہی فوج ہے جس نے اس کے سوات کو بقول اس کے طالبان کے ''ظالمانہ شکنجے'' سے نکالا تھا، لیکن کیا کیا جائے اس ''سولہ سالہ معصوم'' ملالہ سے وہ سب کچھ کہلوانا مقصود تھا جو امریکہ اور اس کے حواری کہلوانا چاہتے ہیں۔ پاکستان اور اسلام کے ساتھ تمسخر کا وہی انداز ہے جو پوری مغربی دنیا اور اس کے سیکولر حواری اپنی گفتگو میں اپناتے ہیں۔ ملالہ نے اسلام کی ساری تعلیمات کو، جو ہماری نصابی کتب میں پڑھائی جاتی ہیں، ضیاء الحق کی اختراع قرار دیا ہے۔ صفحہ 24 پر اس نے لکھا ہے کہ یہ سارا نصاب ضیاء الحق کے دور میں ہمیں یہ بتانے کے لیے ترتیب دیا گیا کہ پاکستان اسلام کا قلعہ ہے۔ ملالہ کو قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کا دکھ بھی بہت ہے کہ اس کے نزدیک یہ کام تو پارلیمنٹ کا تھا ہی نہیں۔ اس کے نزدیک بچوں کو یہ پڑھانا بھی غلط ہے کہ ہم ایک مضبوط قوم ہیں اور بھارت سے جنگ جیتنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس کے مطابق انہیں اصل حقائق بتائے جانے چاہئیں کہ ہم جنگ ہارے بھی تھے۔ یہ تاریخی طور پر صحیح ہو گا لیکن کیا دنیا کے کسی ملک میں بچوں کو ایسا پڑھایا جاتا ہے؟ کیا امریکی بچے پڑھتے ہیں کہ ان کے آباؤ اجداد نے ریڈ انڈین کا قتل عام کیا تھا اور ان سے پچاس ہزار دفعہ معاہدہ کیے اور توڑے تھے؟ ملالہ نے اپنے بچپن کا ہیرو سکندر اعظم بتایا ہے (صفحہ 20)۔ اس لیے کہ اس ''معصوم'' نے سکندر کا جو چہرہ انگریزی نصابی کتب میں پڑھا، وہ ایسا ہے کہ بچے مرعوب ہو جاتے ہیں۔ پورے مغرب میں بچوں کو کوئی نہیں پڑھاتا کہ سکندر وہ ظالم تھا جس نے تھیبس شہر کے تمام شہریوں حتیٰ کہ معصوم بچوں کو صرف اس لیے قتل کر دیا تھا کہ انہوں نے دیواروں پر اس کے خلاف نعرے لکھے تھے۔ اس نے دنیا میں پہلی دفعہ سفارت کاروں کو قتل کرنے کی رسم ڈالی تھی۔ اس نے ایران کے مشہور پارسی عبادت خانے پرسی پولس کو اس لیے تباہ کیا تھا کہ اس میں موجود خزانہ لوٹ سکے۔ لیکن ملالہ نے اپنے والد کے قائم کردہ سکول میں بچپن میں جو نصاب پڑھا تھا اس کے مطابق سکندر ایک ہیرو ہے۔

اپنے آباؤ اجداد کا تمسخر اڑانے کا درس صرف مسلمانوں کو دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اپنے بچوں کو حقائق بتاؤ، لیکن کوئی اس اصول کو اپنے ملک میں نافذ نہیں کرتا۔ یہ کتاب اب یورپ کی ہر دکان پر موجود ہے، امریکہ کے بازاروں میں اور پاکستان کے ہر انگریزی پڑھنے والے قاری کی دسترس میں ہے۔ لوگ یہ یقین کیے بیٹھے ہیں کہ ایک سولہ سالہ معصوم بچی کیسی عالمی سوچ اور خیالات رکھتی ہے۔ وہ تو وہی کہتی ہے جو پورا مغرب کہتا ہے۔ اسے بھی پاکستان، اسلام اور مسلمانوں میں وہی خرابیاں نظر آتی ہیں جو پورے مغرب کو نظر آتی ہیں۔ ایک معصوم بچی حالات و واقعات کا کس قدر ادراک رکھتی ہے۔ ایسی بچی کو تو آنکھوں کا تارا ہونا چاہیے۔ خاندان کے منہ پر کالک ملنے والی بچی قابلِ عزت اور گھر کے عیب کی پردہ پوشی کرنے والی فرسودہ، دقیانوس اور جاہل۔ یہ ہے میڈیا پر روز چیخنے چلانے اور اس ملک کی توہین کرنے والے لوگوں کا معیار۔ لیکن کیا کریں، یہ سب ہمارے اپنے ہیں۔ ''ہم تو ان کو ڈھونڈتا ہے جو ان کو کھلاتے، پلاتے، اوڑھاتے اور زندگی کی آسائشیں فراہم کرتے ہیں''۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

مرگ برامریکہ، مرگ براسرائیل، مرگ برضدِ ولایتِ فقیہ

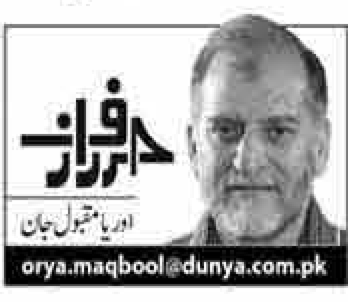

امریکہ کو ''شیطان بزرگ'' یعنی بہت بڑا شیطان کہنے والے ایران کے اسلامی انقلاب کے بانی آیت اللہ سید روح اللہ الموسوی الخمینی کے افکار ان کے اپنے دیس میں ایسے انجام کو جا پہنچے ہیں جس کا انہوں نے تصور بھی نہ کیا ہوگا۔ اس انقلاب نے آغاز ہی میں پوری مسلم امہ میں امید کی کرن پیدا کردی تھی۔ وہ امت جو گزشتہ ایک صدی سے اس مایوسی کا شکار تھی کہ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد مغرب کی پشت پناہی سے جن حکمرانوں کو اقتدار کے سنگھاسن پر بٹھا کر ان پر مسلط کیا گیا تھا' انہیں عوامی طاقت سے نہیں اتارا جا سکتا۔ اگر کہیں ان حکمرانوں کا بوریا بستر گول ہوا بھی تو کمیونسٹ روس کی آشیرباد سے فوجی بغاوتوں کے ذریعے ہوا۔ مصر، شام اور عراق اس کی مثالیں ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ ان ملکوں میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے قدم جمانے شروع کر دیے۔ ایران کی سرزمین تو 1953ء میں اپنے جمہوری طور پر منتخب وزیر اعظم مصدق کی حکومت فوج کے ذریعے ختم کیے جانے کا تماشہ دیکھ چکی تھی۔ اس فوجی بغاوت کی ساٹھویں سالگرہ پر سی آئی اے نے اپنے خفیہ رازوں پر مشتمل کاغذات شائع کیے' جن میں اس کی منصوبہ بندی کی تفصیل درج ہے۔ پہلی دفعہ سی آئی اے نے قبول کیا کہ اس نے برطانوی خفیہ ایجنسی ایم آئی سکس کے ساتھ مل کر مصدق کی حکومت کا فوج کے ذریعے تختہ الٹا تھا۔ 1951ء میں برسر اقتدار آنے والے مصدق کے خلاف پہلے عالمی اور ایرانی میڈیا میں نفرت انگیز مہم چلائی گئی، پھر فوج نے دونوں خفیہ ایجنسیوں کی مکمل نگرانی میں مصدق حکومت ختم کر دی اور مشرق وسطیٰ میں امریکہ کے چوکیدار کی حیثیت سے شاہ ایران نے دوبارہ تخت سنبھال لیا۔ 19 اگست 1953ء کو ایران پر قابض ہونے والے شاہ کے بارے میں شاید کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اسے ایک بھرپور عوامی انقلابی تحریک کے ذریعے تخت چھوڑنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے لیکن 16 جنوری 1979ء کو وہ کبھی نہ لوٹنے کے لیے تہران کے مہرآباد ہوائی اڈے سے فرار ہو گیا۔ یہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے بڑی خوش کن خبر تھی، انہیں حوصلہ ملا کہ امریکہ اور مغرب کے پٹھو حکمرانوں کو عوامی طاقت سے بھی اتارا جا سکتا ہے۔ خلافت عثمانیہ کے ختم ہونے کے بعد سے مسلم امہ میں یہ مایوسی بھی پائی جاتی تھی کہ جدید دور میں اسلام کے قوانین نافذ العمل نہیں رہے' لیکن ایران کے انقلاب نے اس تاثر کا بھی خاتمہ کر دیا۔ ایک مایوسی یہ تھی کہ ہم پوری دنیا سے لڑائی مول لے کر زندہ نہیں رہ سکتے لیکن آیت اللہ روح اللہ خمینی کی قیادت نے اس تصور کو بھی باطل کر کے رکھ دیا۔

ایرانی قوم انقلاب کے دن سے آج تک تین نعرے بلند کرتی رہی: ''مرگ برامریکہ، مرگ براسرائیل اور مرگ برضدِ ولایتِ فقیہ''۔ یہ تینوں نعرے لوگوں کے جذبات کی نمائندگی کرتے تھے۔ امریکہ اور اسرائیل سے دشمنی تو پوری امتِ مسلمہ میں مشترک ہے اور ولایت فقیہ ایرانی معاشرے میں ان کے مسلک کے مطابق اسلامی قوانین کے نفاذ کا نعرہ تھا جو شاہ ایران کے سیکولر اور مغرب زدہ معاشرے کی نفی کرتا تھا۔ تینوں نعرے بیک وقت بلند کیے جاتے تھے۔

اس انقلاب کی بنیاد میں ڈاکٹر علی شریعتی کا علمی کام اور علامہ اقبال کی انقلاب آفرین شاعری کا بہت دخل تھا۔ ڈاکٹر علی شریعتی نے پہلی دفعہ تشیُّعِ علوی اور تشیُّعِ صفوی کا تصور دیا۔ ان کے نزدیک تشیُّعِ علوی کا رنگ سرخ ہے اور یہ باطل کے خلاف جنگ اور انقلاب کا علمبردار ہے جبکہ تشیُّعِ صفوی کا رنگ سیاہ ہے اور اس میں گریہ کے سوا کچھ نہیں۔ شریعتی دو دفعہ قید کی صعوبتوں سے گزرے لیکن ان کی تحریروں نے ایران میں انقلاب کے سفر کی داغ بیل ڈال دی۔ علامہ اقبال کی شاعری انقلاب ایران کی روح و رواں تھی.... ازخوابِ گراں خیز (گہری نیند سے جاگو) اور ''می رسد مردیکہ زنجیرِ غلاماں بشکند (وہ شخص آ گیا ہے جو غلاموں کی زنجیریں توڑ دے گا) ایران کی انقلابی تحریک کے نعروں میں شامل تھے۔ آیت اللہ روح اللہ خمینی کے دس سالہ دورِ اقتدار میں ایران میں اسلام کے تمام قوانین بہت حد تک نافذ کر دیے گئے تھے، ان میں حجاب سے لے کر اسلامی تعزیرات تک سب کچھ شامل تھا۔ ایرانی انقلاب کا المیہ وہی ہوا جو مسلم امہ کا عالمگیر المیہ ہے۔ خمینی کے ولایتِ فقیہ کے تصور کو ایران کے مروّجہ مسلک تشیُّع کے علماء سے بھی اختلاف کا سامنا ہوا اور ایران سے باہر بھی اس تصور کو خود اس مسلک کے علما ہی ماننے سے گریزاں تھے۔ امریکی سفارت خانے کو یرغمال بنانے سے لے کر شاتم رسول سلمان رشدی ملعون کے قتل کے فتوے تک آیت اللہ روح اللہ خمینی کا کردار امریکہ مخالف کی حیثیت سے بہت جاندار تھا۔ دوسرا المیہ اس انقلاب کو دوسرے اسلامی ملکوں تک پھیلانے سے پیدا ہوا۔ فکری طور پر تو یہ بات درست تھی کہ مسلم امہ پر مسلط حکمران مغرب اور امریکہ کے کاسہ لیس ہیں لیکن چودہ سو سال پرانے مسلکی اختلاف اور ہزاروں سال پرانے عرب اور عجم کے جھگڑے نے اس کوشش کے ردِعمل میں پھر سے سر اٹھا لیا۔ گرد آلود کتابیں پرانے کتب خانوں سے باہر آ گئیں اور اس اختلاف نے ایک خونی تصادم کی شکل اختیار کر لی۔ کئی محاذوں پر لڑی جانے والی اس لڑائی کا نشانہ ایرانی انقلاب تھا۔ عرب اور عجم کی چپقلش نے آٹھ سالہ ایران عراق جنگ کی شکل اختیار کر لی جبکہ دوسرے مسلمان ممالک میں شیعہ سنی فسادات خاص مقصد کے لیے ابھارے گئے۔ اب انقلاب اپنے سفر کی رجعت اور پسپائی کا شکار ہونے لگا۔ سیاسی، فوجی اور مسلکی مفادات نے انقلاب کی روح کو زخمی کر دیا۔ ڈاکٹر علی شریعتی کی کتب ایران کی سرزمین سے ناپید کر دی گئیں۔ خود بانیِ انقلاب آیت اللہ روح اللہ خمینی کی چند کتابیں بھی ایران میں منظرِ عام پر نظر نہ آتی تھیں۔ جس انقلاب کو ایرانی کبھی مغربی استعمار اور ''شیطان بزرگ'' امریکہ کے مقابلے میں پوری امت مسلمہ کا نمائندہ سمجھتے تھے، مسلک کی بھول بھلیوں میں قید ہوتا چلا گیا، تمام فیصلے اور تمام عالمی رابطے وہیں تک محدود ہو گئے۔ افغانستان میں طالبان برسرِ اقتدار آئے تو ان کے مقابلے میں پانچ فیصد علاقے پر قابض شمالی اتحاد اور ان کے ساتھی حزبِ وحدت کے افراد ایران کی مالی، سیاسی یہاں تک کہ افرادی مدد تک حاصل کرتے رہے۔ وہ ایران جو کبھی روس کے خلاف لڑنے والے مجاہدین کے لیے چشم براہ رہتا تھا اور حکمت یار سے لے کر برہان الدین ربانی اور احمد شاہ مسعود تک ایرانی سرزمین سے تعلق استوار کیے ہوئے تھا، اب طالبان کی حکومت مسلکی اختلاف کی بنیاد پر ان کے لیے دشمنوں کی فہرست میں شامل ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ایران کے صدارتی امیدوار اور پاسداران کے کمانڈر محسن رضائی نے یو ایس ٹوڈے کو 6 ستمبر 2005ء کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ ہم تاجک، ازبک اور ہزارہ اقلیتوں کے شانہ بشانہ افغانستان میں لڑتے رہے ہیں اور امریکی افواج ہماری اس مدد کے بغیر افغانستان میں داخل ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ محسن رضائی نے اس انٹرویو میں امریکہ کو ایک بے وفا عالمی طاقت کہا جو کسی کے احسان کا بدلہ نہیں دینا جانتی۔ اس کا نمونہ یہ ہے کہ امریکہ کے افغانستان میں آنے کے بعد جہاں پاکستان کی سرزمین کے اس کے خلاف استعمال ہونے کے الزام لگتے رہے وہیں افغانستان میں امریکی سفیر ولیم وڈ نے 2007ء میں ایران پر افغانستان کے باغیوں کو ٹریننگ دینے کا کھلم کھلا الزام لگایا۔ عراق میں امریکیوں کی فتح، صدام کا خاتمہ سیاسی، علاقائی اور مسلکی مصلحتوں کی اسیری کی وجہ سے ہی ممکن ہو سکا۔ دوسری جانب امریکہ نے ایران کو برائی کا مرکز ''Axis of evil'' قرار دے رکھا تھا اور ایران کے اسی خوف کو ہتھیار بنا کر مشرق وسطیٰ کے عرب ممالک کو ساٹھ ارب ڈالر کا اسلحہ فروخت کیا۔ ادھر عرب کے شہزادگان اور مغرب کی پشت پناہی سے اقتدار پر قابض حکمران اس علاقائی، سیاسی اور مسلکی محاذ پر ایران کے مقابل آ کھڑے ہوئے اور ایسی تمام قوتوں پر سرمائے کی بارش کر دی جو ان محاذوں پر ایران کے مخالف تھے۔ لیکن اب وقت کی گردش نے اپنی واپسی کے سفر کا آغاز کر دیا ہے۔ روس اور امریکہ کی سرد جنگ کے زمانے میں ایران امریکہ کا چوکیدار تھا۔ امریکہ کے تنہا سپر پاور ہونے کے تصور کو روس نے چند ماہ قبل شام میں چکنا چور کر دیا۔ اب دنیا ایک بار پھر دو طاقتوں کے تصادم کی زد میں ہے۔ اب نئی صف بندی کا آغاز ہو گیا ہے اور اس کا پہلا قدم ایران امریکہ معاہدہ ہے۔ اس معاہدے پر ہر سیکولر اور لبرل شخص کی خوشی دیدنی ہے لیکن میں اس ایرانی قوم کا سوچ رہا ہوں جو پینتیس برسوں سے مرگ برامریکہ، مرگ براسرائیل اور مرگ برضدِ ولایتِ فقیہ کے نعرے لگاتی رہی ہے۔ ان سے پہلا نعرہ چھین لیا گیا ہے، ایران نے شیطانِ بزرگ سے دوستی کر لی۔ اس دوستی کے بعد اسرائیل کے خلاف نعرہ بے معنی سا ہو جائے گا۔ لیکن نعروں کا اصل مقصد ولایت فقیہ تھا یعنی ایک اسلامی معاشرے کا قیام۔ پوری مغربی دنیا اور سیکولر لبرل طاقتیں اس کے خاتمے کے انتظار میں ہوں گی۔ بنیاد تو ایران نے خود ہی ہلا دی ہے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

’’موسمِ ردِ بلا‘‘ کی خواہش میں لکھی گئی شاعری

orya.maqbool@dunya.com.pk

کبھی کبھی اداسی اس طرح گھیر لیتی ہے کہ دن بھی لمبی رات کے سناٹے کی طرح محسوس ہوتا ہے۔ پرندوں کی آوازیں‘ ہوا کی سرسراہٹ‘ جھرنوں کی نغمگی سب کے سب درد کے گیت بن جاتے ہیں۔ راہ چلتے اپنی دھن میں مگن بچہ‘ بس سٹاپ پر انتظار کرتی بوڑھی عورت‘ سائیکل پر شور زدہ ٹریفک سے بچتا بچاتا کوئی مزدور‘ ایسے لگتا ہے سب کے سب کسی کرب میں مبتلا ہیں۔ لوگ ہنس رہے ہوتے ہیں لیکن یوں محسوس ہوتا ہے یہ سب مصنوعی ہے‘ یہ لوگ اپنے اندر کے دکھ کو چھپانے کے لیے ایسا کر رہے ہیں۔ مدتوں جب کبھی ایسی بے وجہ اداسی طاری ہوتی تو کتاب اٹھا لیتا‘ کوئی بھی الل ٹپ‘ بے کار‘ ایسی جس کا سر پیر نہ ہو‘ اندر کی اداسی غصے میں بدلتی‘ مصنف کے ہر فقرے پر اسے بے نقط سناتا کہ کیا ضرورت تھی اتنا وقت اور سرمایہ ضائع کرنے کی۔ لیکن اداسی کے اندر ایک قوت چھپی ہوتی ہے‘ ایک انرجی ہوتی ہے جو راستہ مانگتی ہے۔ بے وجہ اداسی میں تو یہ انرجی خوفناک حد تک خطرناک ہوتی ہے۔ بوجھل سر اور بے مزہ طبیعت۔ ایک زمانہ تھا باہر نکل جاتے‘ کئی کئی میل پیدل چلتے‘ پورا شہر لاہور جو ستر کی دہائی میں تھا اور پورا شہر کوئٹہ جو اسی کی دہائی میں تھا‘ ان دونوں شہروں کا کونہ کونہ اس بے مقصد آوارہ گردی کی زد میں رہا۔ گھنٹوں کی آوارہ گردی‘ پاک ٹی ہاؤس کی گہما گہمی‘ چائے خانوں کا ہجوم‘ چلتی پھرتی‘ دوڑتی بھاگتی زندگی کا افسوں‘ یہ سب کچھ اس آوارہ گردی کے دوران فلم کے بدلتے منظروں کی طرح ہوتے‘ تھک ہار کر گھر لوٹتے یا ہاسٹل کے کمرے میں پڑے بے ترتیب بستر پر آ کر گرتے تو بدن کی تھکن نیند کی آغوش میں لے جاتی۔ صبح کو تیز رفتار زندگی پھر اپنی گرفت میں لے لیتی تو اداسی کا یہ موسم کچھ دیر کے لیے رخصت ہو جاتا۔ لیکن یہ موسم ایک احسان کر جاتا۔ زندگی کو ایک درد کے ساتھ دیکھنے اور محسوس کرنے کی لذت دے جاتا۔ یہی وہ لذت تھی جو شعر لکھواتی اور آج بھی لکھوا رہی ہے۔ لیکن اب دکھ اتنے بڑھ گئے ہیں‘ کرب اتنا شدید ہو گیا ہے‘ المیے اس قدر مسلسل ہو گئے ہیں کہ اداسی کے دور میں شاعری کا وقفہ ہی بہت کم ملتا ہے۔ دفتر‘ کالم‘ ٹاک شو‘ سیمینار‘ مذاکرے اور پھر ایک بے سکون نیند۔ دنیا بدل گئی‘ شہر بڑے ہو گئے‘ گھر ریڈیو کے بجائے اب ٹی وی اور انٹرنیٹ سے آراستہ ہو گیا لیکن نہ اداسی بدلی اور نہ اس کا ٹھکانہ۔ ستر کی دہائی میں جو کیفیت تھی وہ ایسی شاعری کرواتی تھی۔

شب بے اماں تو گزر بھی جا کہ یقینِ رُوئے سحر گیا
تیری تیرگی کے وجود سے میرے دیکھنے کا ہنر گیا
مرے برگ و بار امان تھے‘ سبھی پھول پھل مری جان تھے
وہ ہے قحطِ ابر کرم کہ اب سبھی اہتمامِ شجر گیا
سبھی بند تھے سرِ شام سے جو مکیں تھے خوف مکان کے
وہ ہوائے شرق کہ غرب تھی کہ ہر اک مکان کا در گیا

لیکن تیس سال گزرنے کے بعد اداسی کا کرب اور وقت کی تلخی اس قدر شدید ہو گئی ہے کہ اس تیز رفتار ترقی اور چاروں جانب میسر سہولیات کے باوجود نہ اداسی کا موسم بدلتا ہے‘ نہ شاعری کا درد۔ کیسے بدلے۔ تیس سال پہلے سڑک پر کھیلتا بچہ‘ بس سٹاپ پر کھڑی عورت اور سائیکل چلاتا مزدور شام کو لوٹ کر گھر چلا جاتا تھا۔ لیکن اب تو اس دھرتی پر کتنے ایسے ہیں جو اپنے ہی دیس‘ اپنے ہی وطن میں اجنبی ہیں‘ بے گھر ہیں‘ خانماں برباد ہیں‘ کسی کو کراچی کی پُر رونق زندگی یاد آتی ہے تو کوئی باجوڑ‘ سوات اور وزیرستان کی سرسبز وادیاں ڈھونڈتا پھرتا ہے‘ کوئی کوئٹہ کی سرد ہواؤں کو سینے میں بسائے ہوئے کسی دوسرے شہر میں سخت گرمی کے موسم گزار رہا ہے تو کسی کے دل میں مستونگ اور خضدار میں اپنے آباؤ اجداد کے گھر اور قبروں کی یاد بسی ہے۔ اپنے ہی وطن میں ہجرت‘ یہ ہمارا المیہ ہے۔ اس المیے میں جو کرب ہے وہ کسی اور دکھ میں نہیں۔ دیکھنے والی آنکھ اور محسوس کرنے والا دل ہو تو سڑکوں پر چلتا ہر شخص افسردہ‘ اداس اور غمزدہ نظر آئے گا۔ یہی اداسی ہے کہ تیس سال بعد بھی شاعری‘ جو میری تنہائی کا واحد سہارا ہے‘ ایسی نظم تخلیق کرواتی ہے کہ جس کا عنوان ہی ’’نوحۂ ہجرت‘‘ ہے۔

ہجرت بھی عجب اب کہ مکینوں سے ہوئی ہے
جس شہر میں رہتے تھے وہی شہر ہے اب تک
جس گھر میں بسیرا تھا وہی اب ہے ٹھکانہ
جس چھت کی دعا مانگتے رہتے تھے سبھی لوگ
اب تک ہے سروں پر اسی چھتنار کا سایہ
پھر بھی کوئی ہجرت ہے کہ چہروں پہ سجی ہے
ہر آنکھ میں گھر لوٹ کے جانے کی پڑی ہے
کل گھر جسے کہتے تھے پڑاؤ ہے کوئی اب
اک چھت جو اماں دیتی تھی اب خوف نشاں ہے
یاروں کا ٹھکانہ نہیں ملتا ہے کسی کو
باتیں سبھی اغیار کی یاروں کی زباں ہیں
آنکھیں سبھی اپنوں کی مگر شعلہ فشاں ہیں
دل یوں تو دھڑکتے ہیں‘ سنائی نہیں دیتے
اس شہر کو اب اشک دکھائی نہیں دیتے
اک قافلۂ دربدراں اپنے ہی گھر میں
ہجرت کا سماں چاروں طرف خوف نگر میں
بے گھر ہیں غریب الوطنی سب پہ پڑی ہے
بے سمت مسافت کی گھڑی آن کھڑی ہے
چہرے کہیں اپنوں کے دکھائی نہیں دیتے
دیوار و در اپنے تھے سجھائی نہیں دیتے
کیا لوگ ہیں اس دکھ کی دہائی نہیں دیتے

کس قدر خاموشی ہے‘ آنسو ہیں کہ لوگوں کی آنکھوں میں چھلکتے ہیں‘ بہنے کو بے قرار ہیں‘ لیکن بہہ نہیں پاتے۔ تلخیٔ ایام ایسی ہے کہ چہروں پر مسکراہٹ خواب ہو چکی ہے۔ لوگوں پر حالات کی سیاہ چادر ایسی تنی ہوئی ہے کہ ہر صبح کسی نئے سورج کی تلاش میں اٹھتے ہیں اس سورج سے امید وابستہ کرتے ہیں‘ لیکن اس کی حدت اور تپش اس قدر جلاتی ہے کہ ان کی آنکھوں میں پھر مایوسی کا اندھیرا چھا جاتا ہے۔ کتنے سالوں سے یہ اداسی قائم ہے‘ کتنے موسموں سے دل کرب کا شکار اور دماغ مایوس سا ہو جاتا ہے۔ کیا کروں کالم میں لوگوں کو مایوس نہیں کرنا چاہتا۔ اپنی تنہائی میں بس شاعری ہی میرا سہارا بنتی ہے۔

رُت بدلتی ہی نہیں‘ موسم بدل جانے کے بعد
رات ڈھلتی ہی نہیں ہے دن نکل آنے کے بعد
موسمِ بے خواب میں‘ شہرِ شکستہ خواب میں
کچھ نہیں بدلا‘ مکینوں کے بدل جانے کے بعد
کون در کھولے گا اب ہجرت نصیبوں کے لیے
کس کے گھر جائیں گے اب گھر سے نکل جانے کے بعد
اک عذاب حبسِ حرفِ حق ہے سینے پر گراں
دم کہاں آئے کسی دم‘ دم نکل جانے کے بعد

یہ حبس کا موسم ہے‘ روشنی کی کوئی کرن نہیں‘ خواب ٹوٹ چکے‘ اداسی ایک عفریت کی طرح چھائی ہوئی ہے لیکن اہلِ نظر تو اسی موسم کو امید سے جوڑتے ہیں۔ امید اس دروازے سے جو دلوں کو جوڑتا ہے‘ موسموں کو بدلتا ہے‘ ظالموں کو نشانِ عبرت بناتا ہے‘ جو حیّی و قیّوم ہے۔ گناہوں‘ خطاؤں‘ لغزشوں سے درگزر کرتا ہے۔ رات کے مہیب سناٹے میں‘ کھلے آسمان پر تاروں کی گردش‘ چاند کے سحر اور ہواؤں کی سرسراہٹ میں اداس ہوتا ہوں تو کوئی کان میں کوئی سرگوشی کرتا ہے کہ مانگو اس رحمٰن و رحیم سے‘ وہ جس کا دعویٰ ہے ’’کون ہے جو مضطرب دلوں کی دعائیں سنتا ہے‘‘ ان دنوں سے زیادہ مضطرب دل اور کب ہو گا۔ مانگو‘ التجا کرو‘ گڑگڑا کر التجا کرو‘ وہی ہے جو حالات بدلنے پر قادر ہے۔ مانگو‘ شاعری دعا میں ڈھل جاتی ہے:

یہ حبسِ مستقل ٹوٹے کسی صورت ہوا آئے
کہیں سے گنگ بستی میں کوئی سنگِ ندا آئے
غبارِ ابتلا اس شہر کے چہرے پہ چھایا ہے
کوئی دستِ دعا اٹھے‘ کسی جانب گھٹا آئے
اتار اک اسم ہونٹوں پر کہ جو شافی ہو‘ کافی ہو
دعا ایسی کہ جس سے موسمِ ردِّ بلا آئے

allurdupdfnovels.blogspot.com

موت کو یاد رکھ کر زندہ رہنے والے

انٹرویو لینے والے کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ اس ترقی یافتہ دور میں کوئی قوم دنیا سے اس قدر بے رغبتی کا اظہار بھی کر سکتی ہے۔ سیّدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس قول کے مصداق کہ اے دنیا میں نے تمہیں طلاقیں دیں، یہ پہاڑوں اور صحراؤں کے باسی آسائشِ دنیا سے بے پروا اور دنیا کے لالچ سے بے نیاز اپنی آزادی اور حریت پر نازاں کیسے ہیں؟ اس نے ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بات آگے بڑھائی کہ ''ایسے لوگوں کا کیا علاج ہو سکتا ہے''۔ مدتوں بعد اسامہ بن لادن کا تذکرہ چھڑا تھا۔ پاکستان کے مشہور سفارت کار ایاز وزیر تحمل اور بردباری سے جواب دے رہے تھے۔ وہ ان تمام مذاکرات میں شریک تھے جو گیارہ ستمبر کے واقعے کے بعد امریکی حکام اور طالبان کے درمیان ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا' جب پاکستان کے بہت سے دانشور یہ راگ الاپ رہے تھے کہ طالبان بے وقوف اور ضدّی ہیں۔ اگر اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالے کر دیں تو ایک عذاب سے بچ سکتے ہیں' لیکن وہاں تو سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سامنے تھی کہ جب امان دے دی جائے تو پھر اس شخص کا تحفظ بھی ذمہ داری ہے اور اس کے ساتھ ساتھ پشتون روایات بھی آڑے آ رہی تھیں کہ مہمان کی جان کی حفاظت تو میزبان کے ذمے ہوتی ہے۔ طالبان نے امریکہ سے کہا کہ آپ اسامہ بن لادن کے خلاف' ہمیں ثبوت لا دیں ہم اسے خود سزا دے دیں گے۔ بمشکل تمام انہوں نے ایک ویڈیو ایاز وزیر کے حوالے کی کہ اسے طالبان کو دے دیا جائے۔ ایاز وزیر نے کہا' آپ خود کیوں نہیں دیتے؟ ویڈیو پہنچا دی گئی۔ اس کے بعد امریکیوں اور طالبان کے درمیان پھر گفتگو شروع ہوئی۔ طالبان نے سوال کیا کہ کیا اس کی بنیاد پر امریکہ کی کوئی عدالت اسامہ بن لادن کو سزا سنا سکتی ہے؟ امریکی سناٹے میں آ گئے اور کافی وقفے کے بعد بولے...... نہیں...... طالبان نے کہا، تو پھر ہم سے کیسے توقع رکھتے ہو کہ ہم انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیں گے؟

اس کے بعد پاکستان کے حکام، علما، افغان معاملات کے ماہر اور دیگر لوگ انہیں سمجھانے میں لگ گئے۔ طالبان نے کہا کہ آپ تین اسلامی ممالک (سعودی عرب' پاکستان اور ایک کوئی تیسرا ملک) کے تین علماء کو بلا لیں۔ سعودی عرب اس لیے کہ اسامہ بن لادن کا ملک ہے۔ پاکستان ہمارا دوست ہے اور تیسرا ملک آپ کی مرضی کا۔ اگر یہ علماء فیصلہ دے دیں تو ہم اسامہ بن لادن کو آپ کے حوالے کر دیں گے۔ امریکیوں نے یہ مطالبہ مسترد کر دیا اور زبردستی حوالگی کا مطالبہ کرنے لگے۔ اب انہیں امریکی طاقت، عالمی تنہائی اور ممکنہ تباہی سے ڈرایا جانے لگا' لیکن انہوں نے وہی جواب دیا جو ایک مومن کی شان ہوتی ہے۔ طالبان نے کہا: ''ہم مٹی کے گھر میں رہتے ہیں، مٹی پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں اور ایک دن ہمیں مٹی میں چلے جانا ہے''۔ ٹیلی ویژن کے مشہور انٹرویو لینے والے کے سامنے جب ایاز وزیر نے ان کا یہ فقرہ دہرایا تو اس کی حیرت اور تمسخر دیکھنے والا تھا۔ دنیا کے عیش و آرام سے محبت کے دلدادہ لوگوں کے دلوں میں یہ بات اس وقت بھی نہیں اترتی تھی' جب میرے آقا سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: ''دنیا میں ایسے رہو جیسے ایک مسافر ہو'' (مفہوم) اور نہ آج کے دنیا پرست لوگوں کے مزاج کو یہ بات بھلی معلوم ہوتی ہے۔ یہ اسی دور کا تذکرہ ہے جب پاکستان میں افغانستان پر امریکی حملے کے بارے میں طویل بحث چھڑی ہوئی تھی۔ دنیا کے معاملات کے ماہر اور عالمی تنہائی سے خوفزدہ پرویز مشرف امریکہ کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس زمانے کے ''عظیم'' دانشور یہ دلیل دیتے ہوئے نہیں تھکتے تھے کہ اگر ہم امریکہ کا ساتھ نہ دیتے تو ہمارا تورا بورا بنا دیا جاتا۔

آج بارہ سال گزرنے کے بعد دنیاوی جمع تفریق کرنے بیٹھیں تو خسارے کا سودا انہوں نے ہی کیا جو عالمی تنہائی سے ڈر گئے اور جنہیں اللہ سے زیادہ امریکہ کی طاقت کا خوف مارڈالے جا رہا تھا۔ اتنا خون طالبان کا نہیں بہا، جتنا اس سرزمین پر بہا۔ ہم جس خوفناک جنگ اور فساد کا شکار ہوئے اس میں ہماری دنیا تو برباد ہوئی لیکن آخرت کے بارے میں ہم جس بے اطمینانی کا شکار ہیں اس کا کیا علاج؟ مٹی کے گھر میں رہنے، مٹی پر بیٹھ کر کھانا کھانے اور مٹی میں چلے جانے والے طالبان کو یہ یقین تو میسر ہے کہ وہ جس سے لڑ رہے ہیں وہ کفر پر ہے، وہ ان کی سرزمین پر قابض ہے۔ اسلام کی رو سے بھی اور دنیا کی اخلاقیات کے حوالے سے بھی اس سے لڑائی حق ہے۔ لیکن ہم کس عذاب میں ہیں؟ دونوں جانب نعرۂ تکبیر کی صدائیں ہیں۔ دونوں جانب کے لوگ اپنے مرنے والوں کو شہید پکارتے اور ان کی اسی طرح عزت و تکریم کرتے ہیں۔ دنیا کے معیارات پر فیصلہ کرنے والے اس ملک کے حکمرانوں اور ان کے فیصلوں پر خاموش رہنے والوں کے مقدر میں کیا آیا؟ صرف اسلام اور کفر کی لڑائی نہیں بلکہ ہر گھر میں فساد، ہر بستی میں قتل و غارت، رنگ، نسل، زبان اور علاقے کے نام پر، شیعہ سنی، دیوبندی بریلوی کے نام پر۔ کاش اٹھارہ کروڑ لوگوں کو اللہ کے اس دعوے پر یقین ہوتا جو اس نے سورہ قریش میں کیا کہ وہ بھوک میں کھانا اور خوف میں امن دیتا ہے۔ لیکن ہم ہیں کہ بھوک اور خوف دونوں کے عذاب میں مبتلا ہیں۔ اس لیے کہ ہم بھوک میں بھیک کی تلاش عالمی طاقتوں اور عالمی معاشی اداروں سے مانگتے ہیں اور امن قائم کرنے کے لیے بھروسہ قوتِ بازو اور تدبیرِ محض پر کرتے ہیں۔ خیر چھوڑیں یہ توکل کی باتیں ہیں۔ کسی نے جنید بغدادیؒ سے پوچھا تصوف کیا ہے؟ فرمانے لگے توکل ہی تصوف ہے۔ اقبالؒ نے اس معرکۂ خیر و شر میں توکل کے تصور کو جس طرح واضح کیا ہے وہ اللہ کا مقصودِ عین ہے۔

اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسہ
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

یہ معرکۂ حق و باطل' جو برپا ہے' اس میں اللہ کے راستوں پر چلنے والوں کو بھروسہ اللہ کی ذات پر اور ابلیس کو موجودہ ٹیکنالوجی پر ہے کہ یہی اس کے لشکروں کی کل اساس ہے۔ پوری دنیا اس ٹیکنالوجی سے خوفزدہ ہے۔ سب سہمے ہوئے ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد جب اس دنیا پر موجودہ مغربی تہذیب نے اپنی گرفت کو مضبوط کیا تو وہ سب کے سب سہم کر رہ گئے جو دلوں میں اللہ کے خوف کے سوا دوسروں کا خوف بھی بسائے ہوئے تھے' لیکن میرا اللہ اپنی نشانیوں کو ظاہر کرتا ہے۔ مٹی کے گھر میں رہنے والوں، مٹی پر بیٹھ کر کھانا کھانے والوں اور مٹی میں دفن ہونے پر یقین رکھنے والوں نے گزشتہ ایک سو سالوں میں تین عالمی طاقتوں کی ٹیکنالوجی کا غرور خاک میں ملا دیا۔ برطانیہ' جس کی سلطنت میں سورج غروب نہ ہوتا تھا' کمیونسٹ روس' جو اپنے آپ کو استعمار کے مقابلے میں سب سے بڑی طاقت تصور کرتا تھا اور اب خود کو واحد سپر طاقت سمجھنے والا امریکہ۔ لیکن جسے اللہ ایمان کی دولت سے نہ نوازنا چاہے وہ دلیلیں گھڑ کے لاتا رہتا ہے کہ انگریزوں کے مقابلے میں ایک جیسے ہتھیار تھے، روس کے خلاف امریکہ نے مدد کی اور امریکہ کے مقابلے میں پاکستانی اداروں نے دوغلا کردار ادا کیا۔ کیسی دلیلیں ہیں، جو اللہ کی طاقت اور فیصلے کی واحد حیثیت کے خلاف دی جاتی ہیں۔ برطانیہ کو اسی اسلحے کے ساتھ کیا کسی اور قوم نے شکست دی؟ تاریخ جواب نفی میں دیتی ہے۔ امریکہ نے پچاس سے زیادہ ممالک میں روس کے خلاف جنگ میں مدد کی، ویت نام سے جنوبی امریکہ تک۔ کیا افغانستان کے علاوہ کسی اور ملک کو یہ توفیق حاصل ہوئی؟ تاریخ کا جواب پھر نفی میں ہے۔ آخری دلیل تو ایسی دی جاتی ہے کہ ہنسی آتی ہے۔ جس ملک میں روز قتل و غارت ہو رہی ہو، کئی ہزار ایسے چھوٹے علاقے ہوں جہاں حکومت نام کی کوئی چیز نظر نہ آئے، ایسا ملک اڑتالیس ملکوں کی فوج اور امریکہ کی ٹیکنالوجی کو شکست دینے میں طالبان کی مدد کرے گا اور وہ جیت بھی جائیں گے؟

یہ توکل کی دنیا ہے اور اللہ اپنی نشانیاں روز اس دنیا پر ظاہر کر رہا ہے۔ جوں جوں وقت قریب آئے گا؟ امریکہ اور مغرب سے امیدیں وابستہ کرنے والوں کا گروہ بھی واضح ہوتا جائے گا اور اللہ پر توکل کرنے والوں کی دنیا بھی روشن تر۔ زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

مردہ عالمی ضمیر اور منافقت

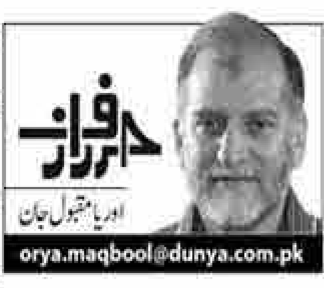

حرف راز
اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

یہ لوگ تو جمہوری جدوجہد پر ایمان رکھتے ہیں۔ انہیں شاید یہ یقین تھا کہ مغربی دنیا' جو اس وقت عالمی ضمیر کی ٹھیکیدار ہے، کے نزدیک دنیا میں جمہوریت اور جمہوری اقدار کا فروغ ہی وقت کی آواز ہے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ مغربی دنیا اور عالمی ضمیر منہ زور گھوڑے کی طرح ایک نعرہ بلند کرتی ہے، کہ عراق اور افغانستان میں چونکہ آمریت مسلط ہے، انسانی حقوق کی پامالی ہو رہی ہے، اس لیے وہاں پر حکمران ٹولوں کو بزور طاقت اتار کر جمہوریت قائم کی جائے۔ پھر اس کے بعد یہ عالمی برادری دندناتی، بم برساتی، قتل و غارت کرتی ان ملکوں میں داخل ہوتی ہے، لاکھوں لوگوں کو تہہ تیغ کرتی ہے، اپنی نگرانی میں ایک آئین تحریر کرتی ہے، جس طرح کا چاہیں' منظور نظر لیڈر عوام کے ووٹوں سے جتواتی ہے اور پھر وہاں کے کروڑوں عوام کو طاقت کے زور پر بتاتی ہے کہ اے جاہلو! تہذیب سے نا آشنا گنوارو! یوں ملک چلائے جاتے ہیں اور ایسے جمہوریت اور عوام کی بالادستی قائم کی جاتی ہے' ایسے زندہ رہا جاتا ہے۔ مصر کے آٹھ کروڑ تیس لاکھ عوام بھی شاید اسی فریب میں مبتلا تھے کہ اس دنیا کا سیکولر، جمہوریت پسند اور انسانی حقوق کا علمبردار کہلانے والا طبقہ' جس میں صرف حکومتیں ہی نہیں، میڈیا، دانشور، تجزیہ کار، تاریخ دان اور بڑے بڑے فلسفی بھی شامل ہیں، وہ جو دنیا میں ہونے والے چھوٹے سے واقعہ پر سراپا احتجاج بن جاتے ہیں، ملالہ یوسف زئی کو امن کی علامت بنا کر اقوام متحدہ کے سٹیج سے خطاب کرواتے ہیں، انسانی حقوق کی پامالی پر بڑے بڑے جلوس نکالتے ہیں، اقوام متحدہ سے قراردادیں منظور کرواتے ہیں' یہاں بھی ان کا ساتھ دیں گے۔ مصر کے عوام کو کس قدر غلط فہمی تھی۔ عالمی ضمیر نام کی چیز تو مفادات اور منافقت کا ایک گورکھ دھندا ہے۔

مصری قوم کی فوج نے انہیں تین ڈکٹیٹر تحفے میں دیے: جمال عبدالناصر، انوار السادات اور حسنی مبارک۔ فرعون کی سرزمین پر حکومت کرنے والے ان فرعونوں کو ہمیشہ کسی نہ کسی طور پر عالمی پشت پناہی حاصل رہی۔ جمال عبدالناصر کو کمیونسٹ روس کی اور انوار السادات اور حسنی مبارک کو امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی بے پناہ حمایت حاصل رہی' لیکن ان تینوں ڈکٹیٹروں کے مقابلے میں سرفروشوں کی ایک جماعت ہے جو 1928ء سے سرگرم عمل رہی ہے۔ اخوان المسلمین' جسے ایک سکول کے استاد اور مذہبی سکالر حسن البنا نے قائم کیا۔ یہ تنظیم یوں تو مصر میں قائم ہوئی لیکن یہ سیّد الانبیاء ﷺ کے ارشاد کے مطابق پوری امتِ مسلمہ کو ایک جسدِ واحد سمجھتی ہے۔ اخوان نے اپنا کام رفاہِ عامہ کی سرگرمیوں سے شروع کیا اور تھوڑی ہی مدت میں پوری عرب دنیا میں اپنی جدوجہد سے ایک مقام بنا لیا۔ اخوان کا فلسفہ قرآن اور سنت کی عمل داری ہے اور یہ اقبال کے اس شعر کی ہو بہو تفسیر ہے۔

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اخوان کی تحریک میں اس وقت نیا جوش اور ولولہ پیدا ہوا جب پوری مغربی دنیا نے بالفور ڈیکلریشن پر عملدرآمد کرتے ہوئے عرب سرزمین کے ایک ٹکڑے پر اسرائیل کی ناجائز حکومت قائم کی۔ وہ اسرائیل جس نے اپنے قیام کے پہلے دن ہی یہ اعلان کیا تھا کہ پوری دنیا میں بسنے والے یہودی ایک قوم ہیں۔ یوں تو اخوان نے 1936ء ہی سے مصر پر برطانوی قبضے کے خلاف جدوجہد کا آغاز کر دیا تھا، لیکن اسرائیل کے قیام سے جو غم و غصہ پوری مسلم دنیا میں پھیلا تھا' اس کا اظہار اخوان کے کارکنان میں بھی نظر آنے لگا۔ اسرائیل کے بارے میں تو قائداعظم جیسے محتاط رہنما نے بھی یہ لفظ استعمال کیے تھے کہ ''یہ مغرب کا ایک حرامی بچہ ہے''۔ 1948ء میں عربوں کو اسرائیل کے مقابلے میں ذلت آمیز شکست کا سامنا ہوا تو مصری حکومت نے خود کو عالمی امن کا علمبردار ثابت کرنے کے لیے اخوان المسلمین پر پابندی لگا دی اور اس کے ہزاروں کارکنوں کو گرفتار کر لیا۔ اس وقت تک اخوان کے مصر میں پانچ لاکھ ارکان تھے۔ 1952ء میں اخوان نے برطانوی سرپرستی میں قائم شاہ فاروق کی حکومت الٹنے کی تحریک میں حصہ لیا۔ یہ تحریک ان آزاد فوجی افسروں نے چلائی تھی جنہوں نے عرب اسرائیل جنگ میں حصہ لیا تھا۔ محمد نجیب برسرِ اقتدار آیا، لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد جمال عبدالناصر نے تختہ الٹ کر اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ اس نے اس فرعونی تخت پر بیٹھتے ہی اخوان پر پابندی لگائی۔ لاکھوں افراد کو قید خانوں میں اذیت ناک تشدد سے ہلاک کیا گیا اور اخوان کے سربراہ سید قطب کو پھانسی دے دی گئی۔ سید قطب ان مذہبی عالموں میں سے ایک تھے جن کا اثر و نفوذ پوری مسلم دنیا پر تھا۔ ان کی کتب اسلامی ممالک کی ہر زبان میں ترجمہ ہوئیں تھیں۔ 29 اگست 1966ء کو انہیں چھ ساتھیوں سمیت پھانسی دے دی گئی اور اگلے سال جمال عبدالناصر نے اسرائیل سے اس نعرے کے ساتھ جنگ میں حصہ لیا کہ ہم فرعون کی نسل ہیں اور ہمیں موسیٰ کی نسل سے مقابلہ کرنا ہے۔ ذلت آمیز شکست کھائی۔ اخوان سیاست سے مصلحتاً دور ہو گئی۔ اس کے بہت سے کارکنان یا تو ہلاک کر دیے گئے تھے یا تشدد سے معذور۔ جمال عبدالناصر اپنے اعمال لے کر اللہ کے حضور جا پہنچا تو انوار السادات کی آمریت کا آغاز ہوا۔ امریکی سرپرستی نے اسے اسرائیل کو تسلیم کرنے پر مجبور کیا۔ 1979ء میں کیمپ ڈیوڈ معاہدہ ہوا اور 6 اکتوبر 1981ء کو ایک فوجی پریڈ کے دوران اسے ہلاک کر دیا گیا۔ اب ایک اور ڈکٹیٹر حسنی مبارک تھا اور اخوان کی جدوجہد۔ 2005ء کو اخوان کو نہ جانے کہاں سے یقین ہو گیا کہ دنیا یا عالمی ضمیر جمہوریت کا علمبردار ہے۔ اس سال انہوں نے جمہوریت کے حق میں مظاہرے شروع کیے اور الیکشن میں آزاد امیدواروں کی حیثیت سے حصہ لیا۔ ان کے 88 ارکان الیکشن جیت گئے۔ اِس الیکشن پر دنیا بھر کے آزاد مبصرین نے بدترین دھاندلی کے الزامات لگائے۔ الیکشن آزاد ہوتے تو اخوان کی فتح یقینی تھی۔ اخوان نے شاید یہ خیال کر لیا تھا کہ یہ مبصرین جمہوریت کے خیر خواہ ہیں۔ یہ ان کی ایک اور غلط فہمی تھی۔

اخوان کا یہ یقین کہ پُرامن جدوجہد سے انقلاب کی راہ ہموار کی جا سکتی ہے، عوام کی رائے عامہ سے برسرِ اقتدار آ کر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی شریعت نافذ کی جا سکتی ہے، انہیں 2011ء میں سڑکوں پر لے آیا۔ یہ پوری دنیا کے لیے حیران کن بات تھی۔ صدیوں سے بادشاہت اور آمریت میں پسی ہوئی قوم ایک دم کیسے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ حسنی مبارک چلا گیا۔ پورا مغربی میڈیا اس انقلاب کو ایک سیکولر' انسانی حقوق اور جمہوریت کی جدوجہد بتاتا رہا لیکن الیکشن کی کوکھ سے اخوان واضح اکثریت سے نمودار ہوئی' تو اس انقلاب کو ختم کرنے کیلئے، فوج اور عدلیہ مقابل آ گئی' لیکن جیتنے والے صدر مرسی کو عوام کی حمایت حاصل تھی۔ وہ مضبوط رہے اور انہوں نے اسلامی شریعت پر مبنی آئین پر ریفرنڈم کروایا اور 63 فیصد ووٹوں کی اکثریت سے اسے نافذ کر دیا۔ اب پوری مغربی دنیا، سیکولر میڈیا اور انسانی حقوق کے علمبرداروں کا اصل چہرہ سامنے آ گیا۔ چند ہزار لوگوں کو تحریر اسکوائر میں جمع کروایا گیا اور اسے عالمی میڈیا پر یوں پیش کیا گیا جیسے پورا مصر سڑکوں پر نکل آیا ہو۔ تین جولائی 2013ء کو فوج کے سربراہ عبدالفتح السیسی نے مصر پر پھر ایک دفعہ آمریت قائم کر دی اور سارے کے سارے انسانی حقوق کے علمبردار خاموش رہے۔ لیکن مصر کے عوام اس جمہوریت کے قتل پر سڑکوں پر نکل آئے۔ آٹھ ہزار لوگ اس احتجاج کے دوران اب تک شہید کر دیے گئے ہیں۔ ہزاروں گرفتار کر لیے گئے۔ فوجی نوعیت کی عدالتیں لگیں۔ نہ مدعی، نہ گواہ اور نہ وکیل اور اب اخوان کے 529 افراد کو پھانسی کی سزا سنا دی گئی ہے۔ اتنی بڑی تعداد میں پھانسی کی سزائیں تو دوسری جنگ عظیم کے بعد قائم ٹربیونل نے بھی نہیں دی تھیں۔ عالمی ضمیر اور میڈیا آج بھی خاموش ہے اور اگلے کئی سالوں تک خاموش ہی رہے گا۔ ہاں یہ اس وقت ضرور جاگے گا جب اس ظلم و بربریت اور وحشت سے کوئی القاعدہ جنم لے گی، کوئی لٹھ مار گروہ پیدا ہو جائے گا۔ کوئی انتقام کا نعرہ بلند کرے گا۔ پھر ان کی ڈاکومینٹریاں دیکھیں، بریکنگ نیوز دیکھیں، ٹاک شوز کی گرم جوشیاں ملاحظہ کریں۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

مرغے لڑانے والے

حرف راز
اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

یہ کوئٹہ کی تاریخ کا سب سے بڑا جنازہ تھا۔ یوں لگتا تھا سارے راستے ایوب سٹیڈیم کی طرف جا رہے ہیں۔ نہ وہ کوئی سیاسی رہنما تھا اور نہ مذہبی شخصیت۔ میں نے اسے ایک عام سے کھلنڈرے نوجوان کی حیثیت سے کئی بار جناح روڈ پر دیکھا تھا۔ لیکن اس کے جنازے کو کندھا دینے، اس کے تابوت کو تھامنے اور اس کے لیے دعائے مغفرت کرنے میں ہر کوئی ایسے حصہ لے رہا تھا جیسے وہ ان کا کوئی قریبی عزیز ہو یا کوئی بہت ہی قابلِ احترام شخصیت۔ اسے 4 فروری 1998ء کو امریکی عدالت سے سزائے موت سنائی گئی تھی۔ ابھی گیارہ ستمبر نہیں ہوا تھا لیکن امریکہ سے نفرت اس قوم کی رگوں میں بسی ہوئی تھی۔ سوائے چند مفاد پرست تجزیہ نگاروں کے کوئی بھی ایسا نہ تھا جو اس سزا کے خلاف نہ بولتا ہو، بلکہ لوگوں کی نفرت تو ان کے ساتھ بھی عیاں تھی۔ جنہوں نے اپنے وطن کے اس بیٹے کو امریکیوں کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ لیکن جب 14 نومبر 2002ء کو ورجینیا کی جیل میں اسے سزائے موت دی گئی تو دنیا بہت بدل چکی تھی۔ امریکہ افغانستان پر حملہ آور ہو چکا تھا اور پرویز مشرف پاکستان کی سرزمین افغانستان میں مسلمان بھائیوں سے خون کی ہولی کھیلنے کی غرض سے استعمال کرنے کے لیے امریکہ کو دے چکا تھا۔ اس وقت تک پاکستان کے ہوائی اڈوں سے امریکی جہاز 57 ہزار دفعہ اڑ کر افغانستان پر حملے کر چکے تھے۔ امریکہ سے نفرت تھی جس نے ایمل کانسی کو ہیرو بنا دیا اور اسے ایک ایسا جنازہ نصیب ہوا جو اس شہر میں کسی اور کا مقدر نہ بن سکا۔ جو لوگ اس دن اس ملک میں واقعی ''زندہ'' تھے اور جن کا ضمیر گروی نہیں ہوا تھا، وہ آج بھی گواہی دیں گے کہ جس صبح اسے پھانسی دینے کی خبر نشر ہوئی تھی، پورے ملک میں موت کا سناٹا چھا گیا تھا۔ یہ ہے اس ملک کی زمینی حقیقت جسے ٹیڑھا منہ کر کے انگریزی بولنے والے دانشور ''گراؤنڈ ریلیٹی'' کہتے ہیں۔ یہی زمینی حقیقت ہے کہ گزشتہ بارہ سال سے متعدد ٹیلی ویژن چینل اور مخصوص سیاسی رہنما مسلسل چلاتے رہے ہیں کہ یہ ہماری جنگ ہے، لیکن یہ قوم ماننے کو تیار ہی نہیں ہوتی۔ اس قوم نے چالیس ہزار جانوں کا نذرانہ دیا، ہر شہر بے اطمینان اور بے سکون ہو گیا، خوف نے ہر بستی کا گھیراؤ کر لیا لیکن پھر بھی کوئی اسے اپنی جنگ نہیں کہتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہزاروں لوگ، بلکہ ہزاروں سپاہی اور سکیورٹی فورسز کے افراد نے جانیں دیں لیکن ان میں سے کسی ایک کو بھی ایمل کانسی جیسی شہرت نہ ملی۔ ہم نے ان کے ساتھ یہ ظلم کیوں کیا؟ ایک سپاہی بھی بھارت کی فوج کے ہاتھوں شہید ہوتا تھا تو لوگ پاگلوں کی طرح جنازہ پڑھنے کے لیے اُمڈ آتے تھے۔ آج بھی یہی کیفیت ہے۔ آج بھی بڑے سے بڑا لیڈر اور عظیم سے عظیم دانشور اگر بھارت سے دوستی کی خواہش کرتا ہے اور خواب دیکھتا ہے تو اس خواہش کو سینے میں دبائے رکھتا ہے اور دبی زبان میں گفتگو کرتا ہے۔ وہ اٹھارہ کروڑ عوام کے خوف سے سرِ عام بھارت کو اپنا دوست نہیں کہہ سکتا۔ وہ لوگ جن کے آباؤ اجداد اور اسلاف کانگریس کے شانہ بشانہ لڑے تھے، وہ بھی یہ ہمت نہیں کر پاتے کہ دبے لفظوں میں ہی کہہ دیں کہ بھارت ہمارا دوست ہے۔ یہ ہوتی ہے ''ہماری جنگ'' اور یہ ہوتا ہے قوموں کا اجتماعی شعور۔ یہ اجتماعی شعور صدیوں میں پروان چڑھتا ہے۔ یہی حال بھارت کا ہے۔ کوئی بڑے سے بڑا اور مقبول ترین رہنما بھی بھارت کے عوام کے سامنے پاکستان کو اپنا دوست کہنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر میں مرنے والے فوجیوں کی ارتھیاں خاموشی سے جلا دی جاتی ہیں اور فوجی اعزاز کے ساتھ دفن ہونا صرف ان مرنے والوں کے حصے میں آتا ہے جو پاکستان کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں۔ تازہ ترین کارگل جنگ میں مرنے والوں کی ارتھیوں کا ہجوم دیکھنے کے قابل تھا۔ یہ ہوتا ہے کسی قوم کا کسی جنگ کو دل و جان سے تسلیم کرنا اور اسے اپنی جنگ سمجھنا۔

روز نیا حادثہ ہوتا ہے، روز لاشوں کو دفن کرتے ہیں، روز گھر اُجڑتے ہیں اور شام کو اس ملک کے 80 کے قریب ٹی وی چینلز پر بیٹھے اس ملک کے عظیم، نابغۂ روزگار اور بزعم خود ماہرینِ امن عامہ ہر مہمان سے ایک ہی سوال کرتے ہیں ''بتاؤ کیا یہ اب بھی ہماری جنگ نہیں ہے؟'' پھر پورے زور سے اپنا نقطۂ نظر ٹھونستے ہوئے کہتے ہیں۔ ''اگر اب بھی یہ ہماری جنگ نہیں تو پھر کب ہو گی؟'' ان اینکر پرسنوں کا غصہ سیاسی قیادت پر دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ یہ بزدل ہیں۔ یہ عوام کو کیوں اس جنگ کے لیے تیار نہیں کرتے۔ یہ مفاد زدہ ہیں۔ ان کی سیاسی مصلحتیں ہیں۔ انہیں اندازہ نہیں کہ سیاسی لیڈروں کو عوام میں رہنا، جینا اور مرنا ہوتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ قوم امریکہ سے کتنی نفرت کرتی ہے اور انہیں یہ بھی علم ہے کہ اس قوم کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ یہ جنگ کب' کیوں اور کیسے شروع ہوئی۔ اس لیے یہ سیاسی رہنما ان اینکر پرسنوں اور دانشوروں کے جھانسے میں نہیں آتے۔ جب ان کے چنگل میں سیاسی لیڈر بھی نہیں آتے تو ان کا غصہ سکیورٹی فورسز پر نکلتا ہے۔ بہت سے دانشور دور کی کوڑی لاتے ہوئے کہتے ہیں ''انہوں نے جنگ پورے دل کے ساتھ لڑی ہی نہیں'' یہ اندر سے طالبان کی مدد کرتے ہیں۔ کیسی کیسی تجزیہ نگاریاں اور شعلہ بیانیاں ہوتی ہیں اور پھر گفتگو کا رخ اس طرف موڑ دیا جاتا ہے کہ ہم اس قوم کو دہشت گردی کے خلاف متحد ہی نہیں کر پاتے۔ یہ سیاسی رہنما، یہ مذہبی لیڈر، یہ فوجی جرنیل سب کے سب ایک نقطے پر اکٹھے ہو کر قوم کو ان دہشت گردوں کے خلاف کھڑا کیوں نہیں کرتے۔ لیکن گزشتہ بارہ سالوں سے عوامی رویے کا اندازہ کوئی نہیں کرتا۔ ان دانشوروں کی باتوں سے یوں لگتا ہے اس پورے ملک کی سیاسی قیادت، مذہبی رہنما اور فوجی جرنیل جاہل اور ان پڑھ ہیں، انہیں نہ سیاست کرنا آتی ہے اور نہ ہی جنگ لڑنا۔ ان کے مقابلے میں یہ مٹھی بھر دانشور، سیاست بھی کرنا جانتے ہیں، حکومت بھی ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے اور دہشت گردوں پر تو یہ چٹکی بجا کر قابو پا سکتے ہیں۔ یہ ہیں وہ لوگ جو پوری قوم سے مختلف ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے خوف سے نہ سیاسی لیڈر کھل کر بولتا ہے اور نہ مذہبی رہنما۔ لیکن گذشتہ ایک ماہ سے جب پوری سیاسی قیادت، مذہبی سیادت اور فوج کے رہنما اکٹھے ہوئے، انہوں نے ایک سوچ پیدا کی۔ ان کو زمینی حقائق یا ''گراؤنڈ ریلیٹی'' کا اندازہ ہوا اور ان کو اس بات کا بھی ادراک ہوا کہ یہ جنگ ہم پر اس لیے مسلط کی گئی تھی کہ ہم مستقل لہولہان ہوتے رہیں۔ اس جنگ کے کتنے ایسے اداکار ہیں جو سامنے ہیں اور کتنے ہی پس پردہ۔ صرف لڑنے والے کو پتہ ہوتا ہے کہ سازش کہاں سے ہو رہی ہے۔ میدانِ جنگ میں اُترنے والوں کو معلوم پڑتا ہے کہ کون کس کے تیروں سے وار کر رہا ہے۔ ایسے میں سب کے سب مذاکرات پر متفق ہو گئے ہیں۔ جیسے ہی یہ لمحہ آیا۔ اس کے بعد یہ کسی دہشت گردی یا کسی سانحے کے انتظار میں تھے تو ان دانشوروں کو سانپ سونگھ گیا۔ پھر جیسے ہی کوئی سانحہ ہوا انہوں نے اپنے تیر ترکش سے نکال لیے۔ ''ان لوگوں سے مذاکرات کرتے ہو جو لوگوں کو مذاکرات شروع ہونے کے بعد بھی خون میں نہلاتے ہیں؟ ایکشن کرو' یہ ایکشن گزشتہ بارہ سال سے ہو رہا ہے۔ دونوں طرف لاشوں کا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ لیکن ان عظیم دانشوروں، اینکر پرسنوں اور تجزیہ نگاروں کی پیاس ہی ختم نہیں ہوتی۔ مرغے لڑانے والے اگر دیکھتے ہیں کہ مرغے ذرا تھک گئے ہیں تو انہیں گود میں لے کر اچکاتے ہیں اور تیار کر کے واپس میدان میں اتارتے ہیں۔ انہیں امن راس نہیں آ سکتا۔ سوچیے امن کے عالم میں کیا ہو گا؟ نہ بریکنگ نیوز، نہ لائیو کوریج، نہ چیختے چنگھاڑتے ٹاک شوز۔ یہ ملک تو قبرستان بن جائے گا۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

مسلمان گروہوں کی جنگ میں قرآن کی حکمت عملی

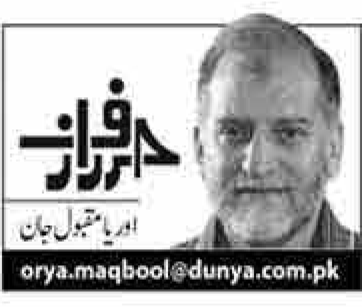

حرف راز

اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

یہ تیسری دفعہ ہے کہ آنے والے دنوں کی خوفناک تصویر کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا ہے۔ میڈیا ایک ایسا جادوگر ہے جس کی کھڑکی سے جنگوں کے لیے فضا ہموار کی جاتی ہے، دشمن کا خوفناک چہرہ پیش کیا جاتا ہے، جنگ میں برتری کے افسانے بیان ہوتے ہیں، میڈیا پر ہاری ہوئی جنگ جیتی اور جیتی ہوئی جنگ ہاری جاتی ہے۔ مخصوص دانشوروں کے ذریعے ایسی گائیڈ لائن فراہم کی جاتی ہے جس سے ایک بحث کو منطقی انجام تک پہنچانا مقصود ہوتا ہے۔ کوئی دانشور ایک پھلجھڑی چھوڑتا ہے جسے شروع میں ایک معمولی سا واقعہ یا عام سی بات سمجھا جاتا ہے، لیکن آہستہ آہستہ اس پھلجھڑی کے دائرے میں پورا میڈیا آتا ہے اور اس کی چنگاریوں سے سلگنے لگتا ہے اور پھر یہ پورے معاشرے کو اپنی آگ کی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

آج سے چار دن پہلے یہ مجھے ایک پھلجھڑی ہی لگی تھی، جب اسے ایک سیکولر دانشور نے، جو ایک پروفیسر بھی ہیں، ایک ٹیلی ویژن ٹاک شو میں میرے ساتھ بیٹھے ہوئے چھوڑا تھا۔ انہوں نے دہشت گردی کے خلاف جنگ سے نمٹنے کے لیے دُور کی کوڑی لاتے ہوئے کہا کہ عالمی برادری کو مل کر پاکستان میں موجود دہشت گردوں کے خلاف جنگ میں حصہ لینا چاہیے تاکہ ان کا مکمل خاتمہ ہو سکے۔ میں نے ان کے جواب میں کہا کہ یہ عالمی برادری افغانستان میں کس بری طرح ناکام ہو کر بستر بوریا لپیٹ رہی ہے۔ اس پر انہوں نے وہ حیرت ناک تصور پیش کیا جس سے مجھے ایک لمحے کے لیے خوف محسوس ہوا، لیکن میں اسے دیوانے کی بڑ سمجھا۔ انہوں نے کہا کہ افغانستان میں صرف یورپی برادری لڑ رہی ہے، عالمی برادری کا مطلب یہ ہے کہ امریکہ کے ساتھ بھارت، چین اور روس مل کر پاکستان سے دہشت گردی کا صفایا کریں۔ میں چند دن تک اسے ان کا ایک خواب یا ان کی ایک خواہش سمجھتا رہا لیکن کل ایک خود ساختہ دفاعی سیکولر تجزیہ نگار نے اس تھیوری کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ پاکستان کے اردگرد گھیرا تنگ ہو رہا ہے، امریکہ، بھارت، چین اور روس یہ سمجھ رہے ہیں کہ پاکستان ان کے مجرموں کی پناہ گاہ بن چکا ہے اور پوری عالمی برادری کو مل کر یہاں سے ان دہشت گردوں کا صفایا کرنا ہوگا۔ یہ دانشوریوں تو اس عالمی منظر نامے کو اس لیے پیش کر رہے تھے کہ حکومت کو ایک سخت ترین آپریشن کے لیے تیار کیا جائے لیکن چونکہ میں گزشتہ دو ایسے ہی واقعات اور اس طرح کی دانشورانہ پھلجھڑیوں کے عالمی تانوں بانوں سے بنے جال کو جانتا تھا اس لیے مجھے آنے والے دنوں کے منظر نامے سے خوف آنے لگا۔

پہلی دانشورانہ پھلجھڑی بھی اسی طرح اس وقت چھوڑی گئی تھی جب سوات میں امن معاہدے کے لیے گفتگو جاری تھی اور سارا میڈیا چیخ رہا تھا کہ حکومت ان لوگوں سے مذاکرات کرنے جا رہی ہے جو اپنی مرضی کی شریعت نافذ کرنا چاہتے ہیں، یہ ظالم ہیں۔ اس دوران ایک ٹیلی ویژن پروگرام میں ایک بہت بڑے وکیل کی بیگم اور ایک این جی او کی سرگرم کارکن نے انکشاف کیا کہ چند دنوں کے بعد ایک ویڈیو منظر عام پر آنے والی ہے، جو اس سارے امن کے کھیل کا پانسہ پلٹ دے گی اور آپ کو علم ہو جائے گا کہ آپ کن سے مذاکرات کر رہے ہیں۔ وہی ہوا، چند دن بعد سوات کی کوڑوں والی ویڈیو سامنے آ گئی جو تکنیک کے ہر معیار کے مطابق ایک جعلی ویڈیو تھی۔ اس ویڈیو کے ایک ایک فریم پر تفصیل کے ساتھ بحث کرتے ہوئے میں نے کالم بھی تحریر کیا، لیکن میڈیا نے چوبیس گھنٹے اس ویڈیو کو بیچ بنا کر بار بار اس طرح پیش کیا کہ سوات میں آپریشن کی راہ ہموار ہو گئی۔ آج برسوں گزرنے کے بعد جنرل شاہد عزیز یہ اعتراف کرتے ہیں کہ امن معاہدہ طالبان نے نہیں حکومت نے توڑا تھا۔

دوسری پھلجھڑی بھی ایک اور عظیم اور سینئر صحافی نے ایک ٹیلی ویژن پروگرام میں چھوڑی۔ انہوں نے کہا کہ اگر بریلویوں کو طالبان کے خلاف متحد کر دیا جائے تو وہ خود ان سے نمٹ لیں گے کیونکہ دوسری جانب طالبان میں اکثریت دیوبندیوں کی ہے۔ میں نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا کہ ابھی تک تو آپ ان طالبان کو دہشت گرد کہہ کر ان سے جنگ کر رہے ہیں لیکن اگر آپ نے اسے مسلکی جنگ میں تبدیل کر دیا تو پورا ملک اس آگ میں جلنے لگے گا۔ یہ پھلجھڑی اچانک نہ تھی۔ اس سے پہلے گزشتہ کئی برسوں سے امریکی سفارت خانہ مزاروں کی تزئین و آرائش کے نام پر ڈالروں کی بارش کر چکا تھا۔ لاہور میں امریکہ کا قونصلیٹ جنرل برائن ڈی ہنٹ اس مشن پر انتھک کام کر چکا تھا۔ پھر ایسا ہی ہوا، ایک مسلک کو دوسرے مسلک کے خلاف استعمال کیا گیا، لیکن ان عقل کے اندھوں کو اندازہ نہیں تھا کہ اس امت کا کوئی بھی مسلک ہو اسلام کے بنیادی اصولوں پر وہ ان کے سیکولر نظریات کا ساتھی نہیں ہو سکتا۔

اسی ترنگ میں آ کر ان سیکولر قوتوں نے توہین رسالت قانون سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ بریلوی مکتبہ فکر کے سرفروشان تو عشق رسول سے سرشار ہوتے ہیں۔ امریکی انہیں اپنا ہمنوا سمجھتے تھے لیکن وہاں غازی علم الدین کی یاد پھر تازہ ہو گئی۔ گورنر سلمان تاثیر جان سے گئے اور وہ ساری پھلجھڑیاں سرد پڑ گئیں جو ان دانشوروں نے چھوڑی تھیں۔

یہ ہے وہ منظر نامہ جو مجھے خوف کا شکار کر رہا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ کشمیر کا مجاہد میجر مست گل ایف سی اہل کاروں کی ظالمانہ موت میں شامل تھا۔ خوف کے راستے دکھائے جا رہے ہیں کہ اگر علاقائی ملک بھارت، ایران، چین اور روس امریکہ کے ساتھ مل کر اقوام متحدہ چلے گئے تو انہیں ان دہشت گردوں کے خاتمے کے لیے پاکستان میں کارروائی کا لائسنس دے دیا جائے گا۔ حکومت کے لیے ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے کہ وہ آپریشن کر کے خود اس دہشت گردی کو ختم کر دے۔ ایسی صورت حال ہوئی تو امریکہ، مغرب اور بھارت کی زبان بولنے والے دانشور چیخنے لگیں گے کہ فوج پوری تندہی اور خلوص سے آپریشن نہیں کر رہی۔ یہ اپنے اثاثوں (Assets) پر ہاتھ نہیں ڈالتی۔ ان کے نزدیک آج بھی ''گڈ'' اور ''بیڈ'' طالبان کے تصورات زندہ ہیں؛ حالانکہ ان برسوں میں فوجی اور سیکورٹی اداروں نے ہزاروں جانوں کی قربانی دی لیکن ان دانشوروں اور دفاعی تجزیہ نگاروں کو تو وہی کہنا ہے جو ان کے آقا کے زیر تسلط مغربی اخباروں میں تجزیاتی طور پر لکھا جاتا ہے۔ انہوں نے ہر آپریشن کے آغاز میں اس کا ساتھ دیا اور پھر جب فوج اس میں الجھ گئی تو اس پر انگلیاں اٹھائیں۔ بلوچستان سے لے کر سوات تک ہر جگہ انہیں انسانی حقوق کی پامالی اور لاپتہ افراد کی کہانیاں یاد آنے لگیں۔

اگر اس دفعہ بھی ایسا ہوا تو وہ منصوبہ جو ان کے ذہنوں میں پک رہا ہے، جس میں علاقائی طاقتوں... بھارت، چین اور ایران کو امریکہ کے ساتھ ملا کر پاکستان میں کارروائی کا آغاز کرنا ہے، یہ سب اس کے لیے راہ ہموار کریں گے۔ یہ بڑی بڑی رپورٹیں شائع کریں گے، دونوں طرف سے انسانی حقوق کی پامالی کا ذکر کریں گے، فوج کو نیم دلانہ کارروائی کا طعنہ دیں گے اور ٹاک شوز میں شور مچے گا۔ یہ ہے وہ دلدل جس میں دھکیلنے کے لیے وہ ساری قوتیں جمع ہو چکی ہیں جو کراچی سے گلگت تک اور 1947ء سے آج تک فوج کو لعن طعن کرتی رہی ہیں اور جو آج بھی مشرقی پاکستان کی جھوٹی کہانیوں سے لوگوں کے دل فوج سے متنفر کرتی ہیں۔

راستہ کیا ہے؟ یہ بہت بڑا سوال ہے۔ دونوں جانب انتقام کی آگ ہے۔ شریعت میں کسی صورت میں قیدی کو قتل کرنے کی اجازت نہیں لیکن طالبان کے کچھ گروہ یہ کر گزرے ہیں۔ ادھر ریاست اگر انتقام پر اتر آئے تو آگ بھڑکتی ہے، اس آگ میں وہ لوگ بھی جھلستے ہیں جو امن چاہتے ہیں۔ ان کی امن کی خواہش اسی وقت سامنے آ سکتی ہے اگر وہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے گفتگو کی میز پر آتے ہیں۔ جو امن پر راضی ہو اسے ساتھ ملاؤ اور پھر جو مخالفت کرے اسے کچل کر رکھ دو۔ یہی قرآن کا حکم ہے۔ اللہ فرماتے ہیں: ''اور اگر دو گروہ اہل ایمان میں آپس میں لڑ پڑیں تو صلح کرا دو ان دونوں کے درمیان۔ پھر اگر کوئی زیادتی کرے ان میں سے ایک دوسرے گروہ پر تو جنگ کرو اس سے جس نے زیادتی کی یہاں تک کہ وہ پلٹ آئے اللہ کے حکم کی طرف۔ پھر اگر وہ پلٹ آئے تو صلح کرا دو ان دونوں گروہوں میں عدل کے مطابق اور انصاف کرو۔ بے شک اللہ پسند کرتا ہے انصاف کرنے والوں کو'' (الحجرات:8) اللہ نے جنگ کا راستہ ایک دفعہ اور صلح کا راستہ دو دفعہ دکھایا ہے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

مسلم آئیں ہوا کافر' تو ملے حور و قصور

حرف راز
اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

جاپان ہر روز مجھے حیرت کے ایک نئے جہان میں لے جا رہا ہے۔ اس قدر مغرب کی یلغار، اس قدر وسیع کارپوریٹ کلچر اور سرمائے کی بہتات لیکن معاشرے کی تمام اقدار ایک صالح اور نیک فطرت سانچے میں ڈھلی ہوئیں! کون سی ایسی خوبی ہے جو ایک صالح اور نیک معاشرے کی علامت ہو اور اس قوم میں بحیثیت مجموعی نہ پائی جاتی ہو... سچ بولنا' ایمانداری' عہد کا پاس' نرم خوئی' دکھاوے اور تکبر سے نفرت اور بے جا اسراف سے اجتناب۔ خاندانی نظام اس قدر مضبوط اور مستحکم ہے کہ سو سال کے بوڑھے دادا اور نانا بھی اولاد کی محبتوں اور دیکھ بھال کا لطف اٹھا رہے ہوتے ہیں۔ نرم گفتاری اور شستہ زبانی اس بلا کی ہے کہ پوری بول چال میں صرف دو گالیاں ہیں اور وہ بھی ایسی کہ پاکستانی معاشرے کے اعتبار سے گالیاں نہیں لگتیں۔ ایک ''بے غیرو'' ہے جو ہمارے ہاں کے بے غیرت کے ہم پلہ ہے لیکن معانی میں اس سے بھی نرم' دوسری ''کونو ہیرو'' یعنی جو خاندانی نہ ہو۔ سب سے زیادہ یہ کہ بناوٹ سے یہ معاشرہ نفرت کرتا ہے، اس میں دو خوبیوں کو اعلیٰ اور ارفع مقام حاصل ہے اور انہیں ہر جاپانی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ ایک ''گاما'' جس کا مطلب صبر ہے اور دوسری ''شمبو'' جس کے معنی برداشت کے ہیں۔ صبر یہاں اس کیفیت کو کہتے ہیں کہ آدمی بھوک' پیاس' بیروزگاری' ناکامی اور کسی اہم ضرورت کے نہ ملنے پر صبر اختیار کرے جبکہ ''شمبو'' یعنی برداشت ناحق تکلیف پہنچنے پر اُف تک نہ کرنے کو کہتے ہیں۔ مائیں اپنے بچوں کو پہلے دن سے ہی ان دونوں اقدار کی تربیت دیتی ہیں۔ پوری مہذب اور غیر مہذب دنیا سے الگ تھلگ اس قوم کا اُجرت دینے کا معیار نرالا ہے۔ جس شخص کا کام جس قدر مشکل' محنت طلب اور معذوری یا جان کے زیاں کے خطرے والا ہوگا' اس کی تنخواہ اتنی زیادہ ہوگی اور جس کا کام جتنا آسان ہوگا اس کی تنخواہ اسی حساب سے کم ہوگی۔ کان کنی کے مزدور اور بلند بالا عمارتوں کی تعمیر کے وقت بلندیوں پر کام کرنے والے مزدوروں کی اُجرت زمین پر کام کرنے والے مستریوں اور پلمبروں سے کئی گنا زیادہ ہے۔ کام میں جس قدر جان کا خطرہ زیادہ ہوگا، اسی حساب سے تنخواہ بڑھتی جائے گی۔ یہ تصور دنیا کی ظالم، بدترین کارپوریٹ کلچر اور نام نہاد ''مہذب'' سوسائٹی کے منہ پر زوردار طمانچہ ہے۔ عزت نفس کا عالم یہ ہے کہ پورے جاپان میں کوئی بھیک مانگنے والا نظر نہیں آتا، کوئی دست سوال دراز نہیں کرتا، بس خاموشی سے کمرہ بند کر کے خودکشی کر لیتا ہے۔ ان میں اکثر خودکشیاں غربت کی وجہ سے نہیں ہوتیں۔ اگر کوئی ایسا کام کر بیٹھے یا غلطی سرزد ہو جائے جس کی وجہ سے خاندان' محلے یا معاشرے میں عزت جانے کا خطرہ ہو تو پھر یہ لوگ لوگوں کا سامنا نہیں کرتے' بس خاموشی سے موت کو گلے لگا لیتے ہیں۔ ایسے لگتا ہے اس قوم کو صرف اللہ کے پیغام سے آشنا کرنے کی ضرورت ہے' پوری قوم ایک صالح اور اسلامی معاشرے میں چند سیکنڈوں میں ڈھل جائے گی۔

سب سے بڑی حیرت مجھے اس وقت ہوئی جب پوری دنیا میں آکٹوپس کی طرح جڑیں پھیلائے سودی نظام کے مقابلے میں نہ صرف جاپان کی سب سے بڑی بلکہ کار سازی میں دنیا کی سب سے بڑی کمپنی ٹویوٹا کے بارے میں معلوم ہوا کہ یہ اپنا سارا کاروبار بغیر سود کے کرتی ہے اور کسی بینک سے کوئی قرضہ نہیں لیتی۔ یہ لوگوں کو قسطوں پر گاڑیاں دیتی ہے لیکن قیمتوں میں اضافہ نہیں کرتی۔ اس نے اسلامی بینکاری کی طرح سود کو حلال کرتے ہوئے اقساط والی گاڑیوں کی قیمتوں میں اضافہ نہیں کیا۔ ٹویوٹا کی گاڑی قسطوں میں بھی اسی قیمت میں ملتی ہے اور نقد ادائیگی پر بھی اسی قیمت پر۔ یہ کمپنی کسی بینک سے سود پر قرض نہیں لیتی۔ ایسا کیونکر ہوا؟ 1950ء کی کساد بازاری نے ٹویوٹا کمپنی کو بینکوں سے قرض لینے پر مجبور کیا۔ اپریل 1950ء میں اسے قرض تو مل گیا لیکن بینکوں نے یہ شرط عائد کر دی کہ وہ سولہ سو مزدوروں کو فارغ کر دیں' لیکن قرض لینے سے پہلے کمپنی کا مالک اور بانی ''کی اچی رو'' یہ وعدہ کر چکا تھا کہ وہ کسی کو ملازمت سے نہیں نکالے گا۔ جاپان میں وعدہ خلافی سب سے بڑا جرم سمجھا جاتا ہے۔ ادھر قرض لیا جا چکا تھا اور بینکوں کی ناجائز شرائط ماننا لازمی تھیں، ''کی اچی رو'' کمپنی کو ختم ہوتے بھی دیکھ نہیں سکتا تھا۔ کمپنی کو قرض کی پہلی قسط جون 1950ء میں ملی تو اس نے ساتھ ہی استعفیٰ دے دیا اور اسی صدمے سے صرف دو سال کے اندر انتقال کر گیا' لیکن وصیت کے طور پر کمپنی کے لیے ضابطہ چھوڑ گیا کہ وہ کبھی بینکوں سے سود پر قرض نہیں لے گی۔ آج ساٹھ سال ہو چکے، کمپنی اپنے اس اصول پر کاربند ہے اور اس وقت دنیا کی کار بنانے والی سب بڑی کمپنی ہے۔ یہ کمپنی 80 لاکھ کے قریب گاڑیاں سالانہ فروخت کرتی ہے۔ جاپان کی باقی کمپنیاں سود، کاغذی کرنسی اور دوسرے معاشی ہچکولوں کی وجہ سے ڈولتی رہتی ہیں جبکہ ٹویوٹا کمپنی اپنے وسیع نقد سرمائے کی وجہ سے مسلسل مستحکم ہے۔ اس کمپنی کے 27 ممالک میں 53 اسمبلنگ پلانٹ لگے ہوئے ہیں۔ 2009ء میں اس کمپنی کی گاڑیوں میں کوئی نقص معلوم ہوا جس پر امریکی حکومت نے اس پر ایک کروڑ چھ لاکھ ڈالر جرمانہ عائد کیا اور کمپنی کو پوری دنیا سے مختلف ماڈلز کی نوے لاکھ گاڑیاں منگوا کر ٹھیک کروانا پڑیں۔ یہ سب آسان نہ تھا' کوئی اور کمپنی ہوتی تو اس کا دیوالیہ نکل جاتا، لیکن بلاسود کاروبار کرنے والی ٹویوٹا کمپنی یہ سب برداشت کر گئی اور آج بھی سب سے اہم اور بڑی کمپنی ہے۔ دنیا میں جسے بھی ایک صالح معاشرے کی علامتیں دیکھنا ہوں' بلاسود کاروبار کی برکت کا اندازہ کرنا ہو اسے جاپان ضرور دیکھنا چاہیے۔ اس سرزمین کے باسیوں میں وہ سب کچھ ہے جس کا تقاضا اسلام کرتا ہے' لیکن شاید ہم مسلمان اس قابل ہی نہیں کہ جنہیں دیکھ کر جاپانی بھی پکار اٹھیں کہ یہ ہیں وہ لوگ جو ہم سے بھی زیادہ سچے' وعدے کے پابند' قول کے کھرے' حیادار اور نرم خو ہیں، اس لیے ان کا دین ضرور سچا ہوگا۔ ہم نے رسول اللہ ﷺ کی اس سنت پر عمل ہی نہیں کیا۔ آپؐ نے مکہ والوں کو اللہ کی طرف دعوت کے لیے بلایا تو یہ نہیں فرمایا کہ مانو اللہ ایک ہے اور میں اس کا رسول ہوں۔ بلکہ صفا کی پہاڑی پر کھڑے ہو کر پہلا فقرہ یہ سوال تھا: ''اے قریش! میں نے تمہارے درمیان عمر گزاری ہے، بتاؤ میں کیسا ہوں؟'' کاش ہم بحیثیت امت اپنے آپ کو پیش کر سکتے، اگر لوگوں کا جواب ویسا ہی ہوتا کہ یہ امت سچی اور امانت دار ہے تو پھر جاپان جیسے معاشرے چشم زدن میں مسلمان ہو چکے ہوتے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

متبادل کے خواہشمند

حرف راز
اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

موجودہ عالمی معاشی نظام غلط ہے‘ جمہوریت دراصل ایک فرعون کے اختیار کو سینکڑوں فرعونوں میں تقسیم کرنا ہے۔ انسانی حقوق اور حقوق نسواں کا نعرہ دراصل معاشرہ‘ خاندان اور معاشرتی نظام میں فساد پھیلاتا ہے۔ سود‘ بینکاری اور کاغذ کے نوٹوں کے گرد موجودہ نظام کی ساری عمارت تعمیر ہے جو نہ اپنی بنیادیں مضبوط رکھتی ہے اور نہ دنیا میں رہنے والوں کو سکون بخشتی ہے۔

میں گزشتہ چند سالوں سے ان موضوعات پر مسلسل لکھ رہا ہوں اور مسلسل کچھ لوگ ایسے ہیں جو سوال کرتے رہتے ہیں کہ اگر یہ سب غلط ہے تو متبادل کیا ہے؟ اگرچہ ان کالموں اور تحریروں کے بین السطور میں نے متبادل کا اشارہ بھی کیا لیکن اگر کہیں طویل گفتگو ہو جائے اور متبادل کے خدوخال اور طریق کار بتا بھی دیا جائے تو الٹا یہ سوال کر دیا جاتا ہے کہ ایسا کون کرے گا؟ کس طرح سے ہوگا؟ یہ کیسے ممکن ہے؟ پوری دنیا ایک طرف چل رہی ہے اور ہم اس کے بالکل الٹ دوسری سمت اپنا سفر شروع کر دیں۔ بہت سے احباب تنگ آ کر کہتے ہیں‘ تم اس سسٹم کے اندر ہی کوئی حل بتاؤ۔ یہ لوگ دین دار بھی ہوتے ہیں‘ نمازِ پنجگانہ کے پابند بھی‘ روزے بھی مسلسل اہتمام کے ساتھ رکھتے ہیں‘ ان کی اسلام سے محبت بھی شک وشبہ سے بالاتر ہے لیکن اس پورے موجودہ دجالی نظام کے شکنجے نے ان کے ذہنوں پر ایک ایسی جہالت مسلط کر دی ہے جس کے پیچھے طاقتور دلیل جیتی جاگتی کامیاب دنیا کی رونقیں ہیں۔ اسی لیے ان کا سوال اپنے طور پر صحیح ہے کہ تاریخ کا پہیہ الٹا گھمانے کی بجائے اس عمارت کو ایسے ہی ٹھیک کر کے اسلام کے چند اصولوں کو تصویروں اور ڈیکوریشن کے دیگر فنون سے آراستہ کر کے اسے ہی اسلامی بنا دیا جائے۔

ان سے اگر یہ سوال کیا جائے کہ کیا آپ غلاظت کے ڈھیر پر بغیر مصلّی بچھائے اس جگہ کو پاک صاف سمجھ کر نماز پڑھ لیں گے تو غصے سے ان کی آنکھیں باہر آ جاتی ہیں۔ کوئی پوچھے کہ آپ روح افزا کی جگہ وسکی یا وائن سے روزہ کھول لیں گے تو وہ ایک دم کہیں گے کہ تم نے اسلام کو مذاق سمجھا ہوا ہے۔ ان میں سے کسی بڑے کاروباری شخص کو کہیں کہ ٹھیک ہے تم شراب کا کاروبار کرنے پر مجبور ہو لیکن دکان کا نام اپنے مسلمان ہونے کی وجہ سے مسلم وائن شاپ ہی رکھ لو تو وہ بولے گا کہ یہ تو میرا گناہ ہے میں پوری امت کو بدنام کیوں کروں‘ لیکن اس پوری امت کو کسی کمرشل بینک کے ساتھ مسلم یا اسلامی جیسے حروف پر کوئی حیرت نہیں ہوتی‘ اس لیے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ایک عالمی سیاسی اور اقتصادی سسٹم کا حصہ ہے جس سے جان نہیں چھڑائی جا سکتی۔ اسی لیے ان لوگوں کے نزدیک ہر چیز کا متبادل وہی ہے جو اس مروجہ سودی معاشی اور اس کی بنیاد پر استوار جمہوری نظام کی حدود وقیود کے اندر رہ کر بنایا جائے۔

دو انتہائی شاندار الفاظ ہیں جو متبادل کی اس تلاش میں یہ لوگ بولتے ہیں‘ ”آئین اور قانون“۔ یعنی تبدیلی کا کوئی ایسا راستہ بتا دو جو آئینی اور قانونی ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ اس پورے مروجہ نظام کی عمارت میں اسلامی کیلی گرافی کر دو‘ ایک عبادت گاہ یعنی Prayer Corner بنا دو‘ اس کا مینار بلند اور گنبد نمایاں کر دو تو دنیا بھر کی تمام آئینی اور قانونی طور پر بنی ہوئی عمارتوں کے سامنے یہ ایک اسلامی عمارت لگنے لگے گی۔ ایسا ہی متبادل ابوجہل کی سرکردگی میں کفارِ مکہ نے سید الانبیاء ﷺ کو پیش کیا تھا۔ بلکہ وہ تو تمام سردارانِ مکہ کی سرداری تک آپ ﷺ کو دینے کو تیار تھے۔ ویسی ہی جمہوری طور پر منتخب صدارت جس کے ہاتھ بندھے ہوں جیسے ہمارے آج کے صدور اور وزرائے اعظم کے بندھے ہوتے ہیں۔ یہ تھی اسلام کی ابتدا...... مروجہ سسٹم کے مقابلے میں بالکل اجنبی اور آج بھی ہم جب اس مروجہ سسٹم کے سامنے اسلام کے تصور حاکمیت وحکومت کو پیش کرتے ہیں تو یہ ایک ناقابل عمل اور اجنبی سا تصور محسوس ہوتا ہے۔ اس پوری صورت حال کو سید الانبیاء ﷺ نے واضح کیا ہے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے اور بخاری اور مسلم دونوں میں درج ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ”اسلام کی ابتدا بھی اجنبیت سے ہوئی اور آخری زمانے میں یہ اجنبیت کی طرف پلٹ جائے گا۔ پس اجنبی (مسلمانوں) کے لیے خوشخبری ہے“۔ یہ اجنبیت وہ انوکھا پن ہے جو آج کے مروجہ آئین‘ قانون‘ طرز معاش ومعاشرت اور طرز حکومت میں ضم نہیں ہوتا۔ اس کی بنیاد بھی علیحدہ ہے اور اس عمارت کی ایک ایک اینٹ مختلف ہے۔ وہ آئین جو دنیا کے دو سو کے قریب ممالک کے آئینوں کی نقل ہے اور اس میں چند اسلامی شقیں ڈال کر ہم نے اسے اسلامی بنایا ہے۔ اس کی کوکھ سے متبادل جنم نہیں لے سکتا۔ وہ جمہوریت جس کا پودا کارپوریشن اور سودی بینکاری کے سرمائے سے جنم لیتا ہے‘ اس کی روح سے اسلام کا طرز حکومت اور حاکمیت بالکل متصادم ہے۔ حیرت یہ ہے کہ جمہوریت کو آخری سچائی سمجھنے والے لوگ اپنا کوئی بھی اہم کام جمہوری اصولوں کے مطابق نہیں کرتے بلکہ اسلام کے اس اصول پر کرتے ہیں جو اس نے انسانی فطرت کے عین مطابق بتایا کہ اہل الرائے سے مشورہ کرو۔ انہیں پلاٹ خریدنا ہو‘ مکان بنانا ہو‘ کسی کاروبار کا آغاز کرنا ہو‘ حتیٰ کہ اولاد کی شادی کرنا ہو تو ان لوگوں سے مشورہ کرتے ہیں جو ان معاملات میں اہل الرائے ہوتے ہیں۔ کبھی کسی نے محلے میں الیکشن کروا کر یہ نہیں کہا کہ میں اپنے بیٹے کی شادی فلاں جگہ کروں یا نہ کروں۔ ان کا اگلا سوال یہ ہوتا ہے کہ کون بتائے گا کہ اہل الرائے کون ہیں؟ لیکن جب خود کوئی اہم کام سرانجام دینا ہو تو ان کو ڈھونڈنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ لیکن کارِحکومت وحکمرانی کے بارے میں یہ تصور پیش کرتے ہیں کہ ہر شخص‘ خواہ اسے کسی معاملے کا علم تک نہ ہو‘ حکمران منتخب کرنے میں اپنی رائے دے۔ پوری دنیا میں ایک صدی سے زیادہ عرصہ سے یہ جمہوری نظام چل رہا ہے لیکن آج تک اس کے نتیجے میں کسی ایک ملک میں بھی صاف ستھری اور عوام کی صحیح نمائندہ حکومت منتخب نہیں ہو سکی۔ سب کی سب کارپوریٹ کلچر کے سرمایہ اور پارٹی فنڈز کی مرہونِ منت ہیں۔ سب کی سب انہی کے اشاروں پر رقص کرتی ہیں۔ ہر ملک میں مختلف قسم کے قبضہ گروپ ہیں جو ووٹوں پر قابض ہوتے ہیں۔ ان کا معاشروں پر غلبہ ہوتا ہے۔ میرے ملک میں یہ قبضہ گروپ چھوٹی چھوٹی بستیوں اور دیہاتوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کی بدمعاشی‘ دھونس اور اجارہ داری کے سائے میں ووٹ دیے جاتے ہیں۔ اسلام سب سے پہلے اس غلبے کو ختم کرنے کا حکم دیتا ہے اور پھر ان کی جگہ شرفاء اور متقی لوگوں کے غلبے کو قائم کرنے کے لیے کہتا ہے۔ اس کے بعد رائے‘ ووٹ اور اسلام کی جمہوری اقتدار کی باری آتی ہے۔ کنوئیں سے کتا نکال کر پانی کے ڈول نکالو تو پانی پاک ہوتا ہے۔ جب یہ بات ہوتی ہے تو پھر سوال ہوتا ہے یہ سب کون کرے گا؟ حیرت کی بات یہ ہے کہ جو لوگ ایک سو سال تک دنیا میں کمیونسٹ انقلاب لانے کی کوشش کرتے رہے اور پھر روس‘ چین اور دیگر پچاس کے قریب ملکوں میں یہ انقلاب لے آئے‘ انہوں نے کبھی اپنے لیڈروں سے سوال نہ کیا کہ یہ کیسے ہوگا‘ بس دھن میں لگ گئے اور منزل پالی۔ کہا جاتا ہے کہ آخر 75 سال بعد وہ فیل ہو گئے لیکن کیا آج دنیا بھر میں مغربی جمہوریت اور سودی بینکاری کا نظام اسی دہانے پر نہیں جس پر آج سے بیس سال پہلے اشتراکی نظام تھا۔ اسلام کا نظام چھوٹی سی ریاستِ مدینہ سے پورے جزیرہ نمائے عرب تک پھیلتا ہے۔ پورے جزیرہ نمائے عرب میں ووٹ کی طاقت سے نہیں آتا۔ آپ کسی ایک شہر‘ گاؤں یا قصبے میں وہ تمام طریقِ کار نافذ کر کے دیکھیں‘ وہ تمام قوانین جو اللہ نے نافذ کرنے کا حکم دیا ہے انہیں لاگو کر کے دیکھیں‘ لوگ خود اس کی جانب راغب ہوں گے۔ وہ اسلام جو عہدے کی خواہش کو حرام قرار دیتا ہے وہاں صاحبِ منبرومحراب بھی اپنی کنویسنگ کر رہا ہوتا ہے۔ کیا کسی محلے میں خفیہ رائے دہی سے یہ نہیں پوچھا جا سکتا کہ تم میں قابل اور متقی کون ہے؟ یہ وہ محلے ہوں جنہیں Primaries کہا جائے‘ ان میں سے ایک لاکھ کے قریب متقی لوگ بغیر ان کی خواہش کے اکٹھے کیے جا سکتے ہیں‘ جہاں سے شہر اور علاقوں کے بہترین اور اقتدار کی خواہش سے دُور افراد اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کسی ایک شخص کی بیعت پر متفق ہو سکتے ہیں۔ ایسا شخص جو قابل ہو لیکن اللہ کے خوف سے حکومت کی ذمہ داریوں سے دور بھاگتا ہو۔ لیکن اس کے لیے آپ کو آئین از سرِنو بنانا پڑے گا۔ ایسی جمہوریت کا خاکہ بنانا ہوگا جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے اصولوں کی تابع ہو۔ لیکن ہم تو ابھی تک یہ تصور کیے بیٹھے ہیں کہ پوری دنیا سے کٹ کر کیسے زندہ رہیں گے۔ یہی سوال اگر مکے میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھی سوچنا شروع کر دیتے تو سب کچھ ختم ہو جاتا۔ جیسے وہ اس سسٹم میں اجنبی تھے ایسے آج ہم اس سسٹم میں اجنبی ہیں۔ بے وقوف‘ جاہل‘ فرسودہ‘ دقیانوس‘ دنیا کی دوڑ سے پیچھے رہ جانے والے۔ کامیاب تو وہ ہیں جو وسکی کے گلاس سے روزہ نہیں کھولتے کہ حرام ہے لیکن اس شربت سے روزہ کھولنے میں انہیں کوئی کراہت نہیں ہوتی جس کی فیکٹری کی بنیادوں میں سود پر لیے گئے قرضے کی رقم ہوتی ہے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

نواب خیر بخش مری۔ایک باب تمام ہوا

نواب خیر بخش مری کو میں نے پہلی دفعہ حکومت پاکستان کے فوجی طیارے سی 130 سے کوئٹہ ایئرپورٹ پر اترتے دیکھا۔ضیاءالحق کی عام معافی کے اعلان بعد تمام بلوچ اور پشتون جلاوطنی ختم کر کے افغانستان سے پاکستان واپس لوٹ رہے تھے اور نواب مری نے اپنے قبیلے کو حکم دیا تھا کہ وہ سب کچھ چھوڑ کر افغانستان ہجرت کر جائیں۔ قبائلی زندگی کی بھی کیا مجبوریاں ہوتی ہیں۔سردار جہاز میں سوار ہے اور قبیلے کے لوگ پاپیادہ 'چھپتے چھپاتے' غیر معروف راستوں سے ہوتے اس کے حکم کو قبائلی مجبوری کے طور پر بجالاتے ہیں۔مریوں کے افغانستان جانے کے کچھ ہی دیر بعد روسی افواج افغانستان میں داخل ہو گئیں اور افغان عوام نے اسی بیرونی جارحیت کے خلاف جدوجہد کا آغاز کر دیا۔خیر بخش مری نظریاتی طور پر کیمونسٹ تھے لیکن اپنے آپ کو سٹالن کا پرستار سمجھتے تھے۔ یوں انہوں نے جس سرزمین میں پناہ لی' اسی کے عوام کے خلاف روس کے ہمنوا بنے رہے۔ان کا بیٹا گزین مری میرا دوست ہے۔وہ روس میں زیر تعلیم تھا۔اسے وہاں جس قدر خرچہ ملتا' وہ اس سے ایک شاہانہ زندگی گزارتا۔ بولان میڈیکل کالج کے ساتھ بنے ہوئے اس کے انتہائی شاندار گھر میں جب بھی اس سے ملنے گیا وہ روس میں گزری عیش کی داستانوں میں سے ایک قصہ ضرور سناتا۔یہ اس زمانے میں بلوچستان کا وزیر داخلہ تھا اور اس کی گاڑیاں اور گارڈوں کی فوج ظفر موج نواب مری کے تصرف میں ہوتی۔نواب مری کے تمام بیٹوں پر روس کی نوازشات تھیں جبکہ افغانستان جہاں وہ پناہ لیے ہوئے تھے اس پر روس کے بموں کی بارشیں۔نواب مری نے زندگی بھر کبھی خود مسلح جدوجہد نہ کی لیکن اپنے پورے قبیلے کو گوریلا جنگ کی تربیت دی۔ان کے قبیلے کی گوریلا جنگ کا سربراہ شیر محمد مری عرف جنرل شیروف تھا۔وہ نواب مری کا اسقدر تابع فرمان تھا کہ سردار چاکر خان ڈومکی نے بتایا کہ ایک دفعہ وہ کوئٹہ جا رہے تھے کہ راستے میں شیروف کی گاڑی حادثے کا شکار ہوئی' انہوں نے زخمی شیروف کو گاڑی میں ڈالا اور کوئٹہ کی طرف روانہ ہوئے تاکہ کسی ہسپتال لے جائیں لیکن شیروف نے کہا مجھے پہلے نواب کے پاس لے جاؤ' میں اس سے پوچھ کر ہسپتال جاؤں گا۔ارباب کرم خان روڈ پر نواب کے گھر پہنچے' وہ اس وقت ورزش کرنے میں مصروف تھے، زخمی شیروف اور سردار چاکر خان انتظار کرنے لگے۔دو گھنٹے کے بعد اندر سے پیغام آیا' جہاں جانا چاہتا ہے اسے لے جاؤ۔ لیکن اسی وفادار شیروف مری کے ساتھیوں کی زابل' افغانستان میں نواب مری کے لوگوں سے لڑائی ہو گئی۔مجھے شیروف کے بھائی نے بتایا کہ بھارت سے آنے والی امداد یہ لوگ خود اپنے پاس رکھے ہوئے تھے۔دربدر اور خاک بسر بجارانی مریوں نے احتجاج کیا تو شدید لڑائی ہو گئی ۔جس کا بدلہ نواب مری کے لوگوں نے کوہلو میں بجارانی لیویز کے سپاہیوں کو قتل کر کے لیا۔شیروف کا یہی بھائی اس وقت میرے ساتھ تھا جب میں سبی میں ڈپٹی کمشنر کے طور پر 114 سال سے بند سبی ہرنائی روڈ تعمیر کروا رہا تھا ۔جہاں جہاں روڈ کھلتی مری قبائل کے لوگ افغانستان میں گزرے ایام پر تلخ ہو جاتے۔یہ سڑک بجارانی مری علاقے سے گزرتی تھی۔صرف تین کلومیٹر نواب مری کے اپنے قبیلے سے تھی۔روڈ جب وہاں پہنچی تو نواب مری کے افراد نے روکنے کی کوشش کی لیکن بجارانیوں اور شیروف کے بھائی کی صرف تلخ کلامی سے واپس چلے گئے ۔

افغانستان میں نجیب اللہ کی حکومت ختم ہوئی تو نواب مری کو وہاں اپنا وجود خطرے میں محسوس ہوا۔دوسری جانب بلوچستان میں جمالی قبیلہ نواب اکبر بگٹی سے خوفزدہ تھا۔تاج محمد جمالی وزیراعلیٰ تھے۔نواب اکبر بگٹی کو ایک شک تھا کہ ان کے بیٹے سلال بگٹی کے قاتلوں نے جمالیوں کے ہاں پناہ لی ہے۔یہ وہ زمانہ تھا جب ظفراللہ جمالی گھر میں محصور ہو کر رہ گئے تھے۔دوسری جانب نواب مری کے بیٹے افغانستان میں اپنی زندگیوں کو خطرے میں دیکھ کر پاکستان آ چکے تھے اور باپ کو پاکستان لانے کی جدوجہد کر رہے تھے۔یہی وہ زمانہ تھا جب مریوں کی آبادکاری کے لئے ایک خطیر رقم حکومت نے دی۔یہ رقم چونکہ چیک کی بجائے کیش میں دی گئی' اس لیے اس زمانے کے فنانس سیکرٹری نیازی کو نیب کا کیس بھگتنا پڑا' ملازمت گئی اور آج تک دربدر ہیں۔تاج محمد جمالی نواب مری کو پاکستان لانا چاہتے تھے تاکہ وہ نواب بگٹی کے غیظ و غضب کا مقابلہ کر سکیں۔افغان مجاہدین نواب مری کو اپنا دشمن گردانتے تھے ۔آئی ایس آئی حرکت میں آئی۔مجاہدین کو راضی کیا گیا۔فوج کا سی 130 طیارہ کوئٹہ سے اڑا جس میں نواب اسلم رئیسانی اس وفد کی قیادت کر رہے تھے۔جب یہ سب معاملات چل رہے تھے تو میں نے ایک دن نواب اکبر بگٹی سے سوال کیا کہ کیا نواب خیر بخش مری واپس آ جائیں گے تو ان کا جواب تھا وہ جس قسم کی قسمیں کھا کر یہاں سے گیا ہے' اگر وہ بلوچ ہے تو واپس نہیں آئے گا۔لیکن نواب مری کابل میں اپنے ساتھ ستر مرغوں سمیت جہاز میں بیٹھ گئے۔تاج محمد جمالی نے استقبال کرنے والوں کو ایئرپورٹ پر کھل کر کھیلنے کی اجازت دے رکھی تھی۔پولیس کو تحمل کا ثبوت دینے کے لئے کہا گیا تھا۔جیسے ہی پاکستان کا فوجی سی 130 طیارہ کوئٹہ ایئرپورٹ پر اترا چند نوجوان ایئرپورٹ کی چھت پر چڑھے اور انہوں نے پاکستان کا جھنڈا اتار کر بی ایس او کا پرچم لہرا دیا۔نواب مری پاکستان کی سرحد پر قدم رکھتے ہی جیسے خاموش سے ہو گئے۔گم سم بس اپنی لاٹھی گھماتے رہتے۔

خوبصورت' سرخ و سفید نواب مری کا بچپن انگریز ڈپٹی کمشنر سبی کی کفالت میں گزرا۔میں نے آرتھ ٹگٹن ڈبوں کی ان کے استادوں کے ساتھ خط و کتابت دیکھی ہے جنہوں نے لکھا تھا کہ یہ بچہ ہر مضمون شوق سے پڑھتا ہے سوائے حساب کے۔اس کے بعد وہ ایچی سن کالج میں سرکاری خرچ پر داخل کیے گئے۔کالج کی مسجد ان کا ٹھکانہ تھا جسے وہ اپنے ہاتھ سے جھاڑو دے کر صاف کرتے۔ایچیسن کالج سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے نیوی میں ملازمت اختیار کر لی۔ڈسپلن راس نہ آیا اور ایک دن منوڑہ کے قریب سمندر میں چھلانگ لگائی اور تیرتے ہوئے ایک بلوچ گاؤں جا نکلے۔وہاں سے واپس اپنے علاقے میں آ گئے۔سبی کے ڈپٹی کمشنر کی فائلوں میں نواب مری کی فائل بہت دلچسپ ہے۔اس میں ان دونوں کے ایک مکالمے کو ڈپٹی کمشنر نے رپورٹ کیا ہے۔اس نے لکھا' نواب مری میرے پاس آئے اور کہا مجھے سردار بنا دو' جواب دیا' تمہاری عمر کم ہے' کہا اکبر بگٹی کو کیوں بنایا' کہا اس نے وہاں لیویز تھانہ بنانے کی اجازت دی' نواب مری نے کہا اچھا میری سندھ کی زمین مجھے دے دو' جیسے اکبر بگٹی کو ملی ہیں' جواب دیا وہ تو انہیں اس لیے دی گئیں کہ انہوں نے حروں کے خلاف انگریز کا ساتھ دیا' آپ کی زمینیں بھاگ ٹیل کی نہر کے ساتھ موجود ہیں۔نواب مری غصے میں آ گئے اور کہا تم لوگوں نے میری زمینیں ہڑپ کی ہیں اور اب کٹھن میں موجود تیل کے چشموں پر قبضہ کرنا چاہتے ہو لیکن اپنی زندگی میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔

نواب مری کی زندگی کا چراغ گل ہو گیا ہے لیکن پاکستان واپسی کے بعد انہوں نے اپنے نظریات کی پسپائی کا جو حشر دیکھا وہ ایک داستان ہے۔انہوں نے ''حق توار'' نامی تنظیم بنائی جس نے سریاب پھاٹک کے پاس بھوک ہڑتالی کیمپ لگایا۔میں نے خود جائنٹ روڈ پر پچیس تیس لوگوں کے مختصر ہجوم سے نواب مری کو انقلاب پر تقریر کرتے دیکھا۔وہ سیلاچی قبیلہ جو نواب مری پر جان چھڑکتا تھا' انہوں نے مری فراری کیمپ کے سربراہ توکل اور اس کے ساتھیوں کو پکڑ کر سبی انتظامیہ کے حوالے کیا کہ یہ لوگ کرنل علمدار کے قاتل ہیں لیکن شاید نواب مری کی جدوجہد کو عزت ملنا تھی کہ 1999ء میں پرویز مشرف جیسے شخص کو اللہ نے اقتدار دے دیا۔وہ بلوچستان جو بھول چکا تھا کہ پنجابی استعمار بھی کوئی چیز ہے۔جہاں تفتان سے لے کر ڈیرہ بگٹی تک آدمی تنہا سفر کر سکتا تھا۔اس بلوچستان کو پرویز مشرف نے نجانے کس کے ایجنڈے پر تباہی کے رستے پر ڈالا۔مری جو افغانستان سے واپسی کے وقت افغانستان میں ہونے والے مظالم کی داستانیں سنا کر رو پڑتے تھے۔انہوں نے بندوق اٹھا لی' جو امن سے رہنے کا گر سیکھ چکے تھے انہیں اس لیے آرمی ایکشن کی زد میں لے لیا گیا کہ مشرف کے ہیلی کاپٹر پر فائرنگ ہوئی تھی۔وہی مری سوال کرتے تھے کہ جھنڈا چیچی پل پر مشرف کے قافلے پر حملہ ہوا تھا۔کیا ویسا ہی سلوک راولپنڈی میں کیا گیا۔نواب مری کے لیے جمہوری ہو یا فوجی تمام ادوار میں ایک جیسا سلوک کیا گیا۔بے نظیر نواب مری سے ان کے بیٹے بالاچ مری کی موت کا افسوس کرنے گئیں تو کہنے لگیں آمریتوں میں ایسا ہوتا ہے تو اس خاموش رہنے والے سردار نے کہا تمہارے باپ ذوالفقار علی بھٹو نے بھی ہمارے ساتھ ایسا ہی کیا تھا۔خوش نصیب ہے نواب خیر بخش مری جسے اپنے وطن کی مٹی نصیب ہوئی ورنہ وہ باچا خان کی طرح جلال آباد میں دفن ہونے کی وصیت بھی کر سکتے تھے لیکن وہ کہاں دفن ہوتے' ایرانی بلوچستان میں' جہاں بلوچ بدترین زندگی گزار رہے ہیں' نہ سرکاری ملازمت' نہ عزت۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

پارلیمنٹ اور میڈیا کی ویڈیو گیمز

موجودہ جمہوری ریاستی نظام کا کمال یہ ہے کہ سب یہ تصور کیے بیٹھے ہیں کہ قومی اتفاق رائے کا اظہار دو طریقوں سے ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ پارلیمنٹ کے منتخب ارکان اگر متفقہ طور پر ایک فیصلہ کر لیں تو اسے عوام کی امنگوں کا ترجمان سمجھا جاتا ہے اور دوسرا یہ کہ اگر میڈیا اپنے چند تجزیہ نگاروں کی گفتگو یک طرفہ رپورٹوں اور مخصوص ایجنڈے کے تحت کسی کو مجرم' دہشت گرد اور امن کیلئے خطرہ قرار دے کر اس کے خلاف اس بات کا بار بار اعلان کرے کہ پوری دنیا اس بات پر متفق ہے کہ ان کے وجود سے دنیا کو پاک کیا جائے تو اسے عالمی' یا قومی اتفاق رائے سمجھ لیا جاتا ہے۔ الیکٹرانک میڈیا کے آنے کے بعد اس سارے کھیل میں ایک اور غیر انسانی عنصر شامل ہو چکا ہے جس نے میڈیا دیکھنے والوں کو بے حس اور انسانی ہمدردی کے جذبات سے عاری بنا دیا ہے۔ اس کا پہلا اظہار عراق کی پہلی جنگ تھی جسے دنیا بھر میں ڈش انٹینا کے ذریعے دکھایا گیا تھا۔ یہ جنگ نہیں' بلکہ دیکھنے والوں کے لئے ایک ویڈیو گیم نظر آتی تھی۔ ایک ایسی ویڈیو گیم جس میں ایک ہنستے بستے شہر پر فضاؤں میں لہراتے' بل کھاتے اور تیز رفتاریاں دکھاتے جہاز آگ کے گولے برساتے تھے اور کئی منزلہ عمارتیں شعلوں کی لپیٹ میں آجاتی تھیں۔

دیکھنے والوں کی ساری توجہ ان جہازوں کے ٹھیک ٹھیک نشانوں پر ہوتی ہے اور ان کو اندازہ تک نہیں ہوتا کہ ان عمارتوں میں سانس لیتے' جیتے جاگتے' سہمے ہوئے انسان بھی ہوں گے۔ خوف سے اپنے والدین کی گود میں سمٹے ہوئے بچے اور موت کو اپنی جانب بڑھتے مرد اور عورتیں بھی۔ جنگ کی اس ویڈیو گیم کا کمال یہ ہوتا ہے کہ اس میں جہازوں کی گڑگڑاہٹ' بموں کا شور اور میزائلوں کی سنسناہٹ اسقدر ہوتی ہے کہ نہ زخمی ہونے والوں کی چیخیں سنائی دیتی ہیں اور نہ ہی موت کی آغوش میں جانے والے لوگ۔ دنیا بھر کے میڈیا کی کیا عجیب اخلاقیات ہے کہ وہ حملہ آوروں کو دکھاتا ہے' جہاز' ٹینک' توپیں اور بندوقیں تو آگ برساتی دکھائی جاتی ہیں لیکن ان کے نتیجے میں مرنے والوں کی لاشیں نہیں دکھائی جاتی۔ ایسا کرنے کو میڈیا کی اخلاقیات کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے یہ MORBID یعنی دل دہلا دینے والے اور لوگوں کا سکون برباد کرنے والے مناظر ہیں۔ ان کا دکھایا جانا میڈیا اخلاقیات کے منافی ہے۔ اس کا بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس ساری کارروائی کو ایک شاندار ہالی ووڈ فلم کی طرح دیکھیں اور پھر مزے کی نیند سو جائیں۔ عراق کی اس پہلی جنگ کے بعد جہاں کہیں بھی ایسی کارروائی کی گئی' اسے اسی طرح ویڈیو گیم کی طرح دکھایا گیا اور دنیا پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ چند طاقتور ریاستیں چھوٹی ریاستوں کو کیسے تہہ وبالا کرتی ہیں اور چھوٹی ریاستیں کیسے عوام کے گھر' بستیاں اور شہر کھنڈر بنا دیتی ہیں۔

لیکن اس سارے کھیل میں سب سے مضحکہ خیز لفظ عالمی یا قومی اتفاق رائے ہے۔ عالمی اتفاق رائے یہ ہے کہ اقوام متحدہ' یورپی یونین' نیٹو یا چند اور ممالک مل کر کسی ایک ملک کو امن کیلئے خطرہ قرار دیں' اسے دہشتگرد کہیں اور پھر یہ کہہ کر اس پر چڑھ دوڑیں کہ اس دنیا میں بسنے والے سات ارب عوام کا عالمی ضمیر اس کی حمایت میں متفق ہے اور یہ عالمی برادری کا فیصلہ ہے۔ یہ ایسی بربریت تھی کہ جس پر ان ظالم اقوام کے اپنے لوگ بھی متفق نہیں تھے۔ جب برطانیہ چرچل کے زمانے میں جرمنی سے جنگ کر رہا تھا تو پورے ملک میں شاید ہی کوئی شہری ہو جو اس جنگ کے خلاف ہو لیکن عراق پر حملے کے خلاف تو صرف برطانیہ نہیں بلکہ پورا یورپ سڑکوں پر نکل آیا تھا۔ لیکن پھر بھی عالمی رائے عامہ' عالمی ضمیر اور عالمی برادری نے کہا کہ یہ پوری دنیا کا متفقہ فیصلہ ہے کہ دنیا کو دہشت گردوں اور امن کے دشمنوں سے پاک کیا جائے۔ یہ سب کے سب دنیا کو دہشت گردوں سے پاک کرنے چلے تھے اور آج پوری دنیا کی جو حالت ہے' اس نے خوف کے سائے اور لمبے کر دیئے ہیں۔ عالمی برادری کے اتفاق رائے اور میڈیا کے بھروسے پر جنم لینے والے اس تصور کا یہ طریقہ ان تمام ریاستوں نے بھی آزمایا جو اس عالمی غنڈہ گردی کا شکار ہوئیں۔ ان عالمی غنڈوں نے سرحدوں کو پامال کرتے ہوئے ظلم و بربریت سے ایک طرف تو اپنے خلاف جدوجہد کرنے والے اور لڑنے والے پیدا کیے جنہوں نے اسی طرح سرحدوں کو روند ڈالا جیسے ان عالمی غنڈوں نے کیا تھا لیکن دوسری جانب انہوں نے ریاستوں کو یہ حکم صادر کیا کہ تم ان لوگوں کا اسی طرح قلع قمع کرو جیسے ہم نے کیا تھا۔ یہ سب ریاستیں اس نام نہاد ”عالمی ضمیر“ اور ”عالمی اتفاق رائے“ کا حصہ بن گئیں۔ انہوں نے ایک لمحے کیلئے بھی نہ سوچا کہ یہ خونی پودا تو اسی بیج سے تناور درخت بنا ہے۔ وہ جنگ جسے ان طاقتوں نے ایک عالمی جنگ کہا تھا ان ریاستوں نے کسقدر خوشی سے اسے اپنے گلے کا ہار بنا لیا۔ اس کو اسی طرح ”عوامی اتفاق رائے اور میڈیا کے زور پر ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ یہ آگ اب ہماری ہے اور ہم نے ہی اس سے کھیلنا ہے۔ یہ ہماری ریاست میں لگی ہوئی آگ ہے اور اسے بجھانا ہے۔ لیکن ان کو اندازہ تک نہ تھا کہ ریاست کی سرحدیں تو کب کی پامال ہو چکیں۔ دوسری جانب لڑنے والے بھی جانتے تھے کہ یہ جنگ کس کی ہے اور ان تمام ملکوں اور ریاستوں کا آپس میں کیا گٹھ جوڑ ہے۔ تمام تکنیکی مدد' سٹلائٹ کی سہولت' اسلحے کی ترسیل' جنگ لڑنے والوں کی تربیت' یہاں تک کہ ماہرین تک کی موجودگی کسی کی آنکھ سے چھپی ہوئی نہ تھی۔ یہ سب لوگ عراق' افغانستان' یمن' مصر' شام' پاکستان اور دیگر ملکوں کے خیر خواہ نہ تھے یہ تو اس جنگ میں اپنے اہداف لے کر آئے تھے۔

انہوں نے گزشتہ تیس سال چیچنیا' ازبکستان' تاجکستان' فلسطین' بوسنیا' یمن' صومالیہ' افغانستان اور عراق جیسے ممالک میں خون کی ہولی کھیلی تھی۔ یہ سب ایک بات پر متفق تھے کہ دنیا میں جہاں کہیں کوئی ایسا مسلمان نظر آئے جو ان کے ”لائف سٹائل“ اور ان کی بنائی ہوئی دنیا کے اصولوں سے متفق نہ ہو اسے بدنام بھی کرنا ہے اور پھر بدنام کرنے کے بعد نیست و نابود بھی کرنا۔ جب یہ سب ریاستیں اسلحہ تکنیکی و مالی مدد اور تربیت کے حوالے سے متفق ہو گئیں تو ان کے مقابل لڑنے والوں کا متفق ہونا بھی لازم تھا۔ ان کے لئے جہاں میدان جنگ میسر آیا وہ لڑنے لگے۔ ازبکستان والے پاکستان اور پاکستان والے عراق۔ افغانستان والے یمن اور یمن والے شام۔ لیکن ان ریاستوں نے جب علیحدہ علیحدہ اپنے ملکوں میں جنگ کا اعلان کیا تو طریقہ کار وہی اپنایا۔ تمام سیاسی لیڈر شپ متفق ہے' اس لیے قومی اتفاق رائے پیدا ہو گیا ہے۔ اب ہم نے اس جنگ میں کودنا ہے۔ عراق' افغانستان' شام اور پاکستان' سب جگہ یہی تو پیمانہ تھا۔ اس کے بعد میڈیا کی ویڈیو گیمز شروع ہوئیں۔ آپ کسی بھی ملک کے ٹی وی چینل اٹھا کر دیکھ لیں آپ کو سنسناتے ہوئے جہاز' گولے برساتے ٹینک اور عمارتوں پر گرتے ہوئے ٹینک نظر آئیں گے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ ریاست کی طاقت کس طرح دشمنوں کو ملیامیٹ کر سکتی ہے۔ لیکن اس کے نتیجے میں مرنے والے کسی شخص کی لاش دکھانا میڈیا کے نزدیک جرم ہے کہ یہ ایک Morbid میچ ہے۔ کس قدر خوش فہم ہیں یہ سب لوگ کہ ایک عالمی سطح کی چھیڑی گئی جنگ کو ریاستوں کے باہمی اتحاد سے ختم کر سکتے ہیں۔ ایسی جنگیں 50 لوگوں کو قتل کرتی ہیں لیکن پچاس لاکھ لوگوں کو دربدر۔ یہ دربدر لوگ اپنے اندر ایک کہانی لیے پھرتے ہیں اور اس کہانی سے پچاس لوگ اور مرنے کو تیار ہوتے ہیں۔

چرچل جب دوسری جنگ عظیم لڑ رہا تھا تو برطانیہ کے چائے خانوں سے لے کر گھروں کی محفلوں تک ہر کوئی اسی جنگ کا تذکرہ کرتا تھا اور اسے جیتنے کی دعائیں بھی' لیکن جب ٹونی بلیئر عراق پر حملہ آور تھا تو برطانوی عوام نے اس کے خلاف ایک مظاہرہ کیا اور پھر جب یہ محسوس کیا کہ ان کی حکومت ان کی نہیں مان رہی تو وہ خاموش ہو گئے۔ صرف دو جگہ اس کا تذکرہ ہوتا رہا' پارلیمنٹ اور میڈیا۔ پاکستان جب 65ء میں جنگ لڑ رہا تھا تو اس کے لئے کسی قومی اتفاق رائے کے لیے پارلیمنٹ کی قرارداد کی یا آل پارٹی کانفرنس کی ضرورت نہ پڑی۔ گلی محلے میں ہر کوئی یہ کہتا پھرتا تھا کہ ہم حالت جنگ میں ہیں۔ اس لئے کہ لوگوں کو ایمان کی حد تک یقین تھا کہ یہ ہماری جنگ ہے۔ آج کراچی سے خیبر تک کیا کسی گلی محلے' چائے خانے یا عام محفل میں دہشت گردی کے خلاف اس کا تذکرہ ہوتا ہے نہیں۔ سب کسی اور دھن میں مگن ہیں۔ سب کو اپنی پڑی ہے۔ لیکن دو جگہ ایسی ہیں جہاں اسی قومی اتفاق رائے کا چرچا ہے' پارلیمنٹ اور میڈیا کی ویڈیو گیمز۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

پارٹ ٹائم سیکولرازم، پارٹ ٹائم اسلام

کس قدر سادہ لوح ہیں وہ لوگ جو یہ گمان کیے بیٹھے ہیں کہ اس مملکت خداداد پاکستان کے حکمران، دانشور، اہلِ سیاست، مذہبی رہنما اور میڈیا عالمی طاقتوں کے اس کھیل سے آزاد ہے جو مسلم امہ کے ساتھ کھیلا جارہا ہے۔ حکمرانوں کی مجبوریاں ان کے اقتدار کی طوالت سے وابستہ ہیں، دانشوروں کا علم ان کی سوچ متعین کرتا ہے اور یہ علم مغربی تجزیہ نگاروں کی رپورٹوں، مقالوں اور کتابوں سے روشنی حاصل کرتا ہے۔ اہلِ سیاست نے یہ تصور کرلیا ہے کہ انہیں اقتدار کی مسند پر بٹھانے اور ان کے مخالفین کی حکومتیں الٹنے والی طاقتیں اگر ان سے خوش ہیں تو وہ کامیاب، مذہبی رہنماؤں کے ق طب نما کی سوئیوں کا رخ اپنے اپنے مسالک کے ملکوں کی سیاست میں الجھا ہوا ہے اور میڈیا تو چلتا ہی اس سرمائے سے ہے جو کارپوریٹ انڈسٹری مہیا کرتی ہے تاکہ پوری دنیا میں ایک جیسا طرزِ زندگی یا لائف سٹائل متعارف ہو، جس کے نتیجے میں ان کا مال بک سکے۔ یہ سب کے سب اس عالمی ایجنڈے کے مہرے ہیں اور انہیں کب، کیسے اور کہاں استعمال کرنا ہے وہ طاقتیں خوب جانتی ہیں۔ اس کھیل میں سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ مہروں کی واضح اکثریت کو اس کا علم تک نہیں ہوتا کہ وہ استعمال ہو رہے ہیں، وہ تو انتہائی اخلاص کے ساتھ ایک سمت رواں دواں رہتے ہیں۔ ہر کوئی اپنی جنگ جیتنا چاہتا ہے۔ کوئی ریاست بچانے کیلئے جدو جہد کر رہا ہے تو کوئی اپنے مسلک کی برتری چاہتا ہے، کسی کو انقلاب کی جلدی ہے تو کوئی ترقی کے خوابوں کو تعبیر دینا چاہتا ہے۔ کوئی سیکولر، لبرل اور جمہوری اقتدار کا تسلط چاہتا ہے تو کسی کو اسلام کے عادلانہ نظام کی بالادستی کیلئے ہتھیار اٹھانا اچھا لگتا ہے۔ یہ سب کے سب کیوں اس قدر مختلف ہیں اور کیا یہ ایسے ہی ایک دوسرے سے دست وگریبان رہیں گے۔ شاید ابھی کچھ دیر اور لیکن زیادہ دیر نہیں۔

ہم جس دور میں زندہ ہیں اس کے بارے میں سید الانبیاء ﷺ کی ایک حدیث صادق آتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا ”اسلام کی ابتدا اجنبیت سے ہوئی تھی اور یہ ایک بار پھر اجنبی ہو جائے گا“۔ یہ اجنبیت کیا ہے۔ آج اسلام بالکل ویسے ہی اجنبی ہے جیسے مکہ میں سرکارِ دو عالم ﷺ کی دعوت کے آغاز میں تھا۔ ثقافت، طرزِ معاشرت، معاشی نظام اور سیاسی زندگی کے مقابلے میں اسلام کی پیش کردہ دعوت اجنبی اور انوکھی لگتی تھی۔ آج بھی بالکل وہی کیفیت ہے جو چودہ سو سال پہلے تھی۔ اسلام موجودہ عالمی معاشی نظام، عالمی لائف سٹائل، عالمی طرزِ سیاست اور عالمی طرزِ معاشرت میں بالکل انوکھا اور اجنبی ہو چکا ہے۔ پوری دنیا اس وقت لائف سٹائل کی جنگ کا شکار ہے۔ ایک مدت ایک عالمی معاشی، سیاسی، معاشرتی اور خاندانی نظام کو نصابِ تعلیم، میڈیا اور زیرِ اثر حکومتوں کے ذریعے نافذ کرنے کی کوشش کی گئی۔ جہاں ذرا شک ہوا کہ یہ لوگ اس عالمی لائف سٹائل کا حصہ نہیں بنیں گے۔ وہاں بدترین آمریتوں کے ذریعے اس سیکولر عالمی لائف سٹائل کا نفاذ کیا گیا۔ تیونس سے لے کر پاکستان اور بنگلہ دیش سے ملائشیاء تک ہر کسی کو کبھی ڈکٹیٹروں اور کبھی من پسند جمہوری حکمرانوں کے ذریعے ایسے عالمی لائف سٹائل کا طابع کیا گیا، جس میں سودی بینکاری سے لے کر حقوقِ نسواں اور آزادیٔ اظہار کے نام پر فحاشی وعریانی تک سب زندگی کے معمولات کا حصہ ہیں۔ اس لائف سٹائل اور طرزِ زندگی کے مخالف جو بھی آواز اٹھی اسے سب سے پہلے میڈیا میں ایک مہم کے ذریعے بدنام کیا گیا اور اگر ممکن ہو سکا تو ایسے ملک جہاں اسلام کا یہ اجنبی اور انوکھا لائف سٹائل جڑیں پکڑ رہا تھا وہاں فوجیں تک اتار دی گئیں۔ افغانستان اس کی بدترین مثال ہے اور مصر میں اسی حکومت کی برطرفی اس کا دوسرا طریقۂ اظہار۔ ایک بات کا فیصلہ کر لیا گیا کہ اس دنیا کے نقشے پر کوئی ایسی حکومت قائم نہیں ہونے دیں گے، جو اس عالمی سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی لائف سٹائل سے مختلف ہو۔ لیکن ہر کسی کو ”پارٹ ٹائم“ اسلام کی اجازت ہے، اذان کے وقت دوپٹہ سر پر لینا اور مہندی کے ڈانس کے وقت اتار دینا۔ سود کے پیسوں سے مسجدیں اور مدرسے بھی بنانا اور اس کے خلاف تحقیقی کام بھی کرنا۔ نماز، روزہ، حج، زکواۃ سب پر ایمان رکھنا لیکن جہاد سے نفرت کرنا۔ ایک ایسا اسلام تو موجود عالمی لائف سٹائل میں اجنبی نہ لگے۔ ریاستیں تو اس ”پارٹ ٹائم اسلام“ کی قائل ہو گئیں کہ ان کے حکمرانوں کے مفادات تھے مگر افراد نے دنیا بھر میں اس سے بغاوت کر دی۔ یہ لوگ امریکہ کے ساحلوں سے آسٹریلیا کے پہاڑوں تک ہر جگہ موجود تھے۔ گیارہ ستمبر نے اس لائف سٹائل کی جنگ کو واضح کیا تو آج 12 سال کے بعد خوف کے سائے اسلامی دنیا سے مغربی دنیا تک جا پہنچے۔ برطانیہ کا شہر برمنگھم جہاں ہر پانچواں شخص مسلمان ہے، وہاں پچھلے دنوں پارک ویو سکول میں حکومت کے تین انسپکٹر داخل ہوئے، یہ دیکھنے کے لیے کہ کتنی لڑکیاں حجاب پہنتی ہیں اور کتنے مردوں نے داڑھیاں رکھی ہیں۔ یہ مسلمانوں کے علاقے کا سکول ہے جو اپنے دس طلبہ میں سے آٹھ طلبہ کو یونیورسٹیوں میں بھیجتا ہے۔ یہ کامیابی بہت کم سکولوں کو میسر ہے۔ لیکن یہ سب کے سب اس لائف سٹائل سے مختلف ہوتے ہیں جو عالمی طرزِ زندگی ہے، اسی لیے انسپکٹروں نے چھوٹی چھوٹی بچیوں سے پوچھا کہ تم کو حجاب پہننے پر کوئی زبردستی تو نہیں کرتا، اتنے زیادہ کپڑوں میں تمہیں گرمی تو نہیں لگتی۔ تمہیں ماہواری کے بارے میں کسی نے کبھی بتایا ہے۔ اس کے بعد برطانیہ کے اخباروں میں خبریں لگیں کہ مسلمانوں نے اپنے علاقے کے سکولوں پر قبضہ کر لیا ہے اور وہاں ایسا طرزِ زندگی اور طریقۂ تعلیم رائج ہے جس سے بچے برطانیہ کی زندگی کے لیے ”اجنبی“ اور ”انوکھے“ ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک رپورٹ مرتب کی گئی کہ اگر ایسا ہوا تو شدت پسندی کا خطرہ بڑھ جائے گا۔ اس کے بعد ”پارٹ ٹائم“ اسلام کو کچھ خوبصورت الفاظ کے ساتھ پیش کیا گیا۔ پارلیمنٹ اور میڈیا میں یہ الفاظ گونجے ”IslamandBritishism Reconcile“ (اسلام اور برطانویت میں مفاہمت) لیکن پورا ماحول غصے اور خوف میں ہے چند دن پہلے لندن کے علاقے کول چسٹر کے ایک پارک میں ایک مسلمان عورت کو اس لیے قتل کیا گیا کہ اس نے مکمل حجاب پہنا تھا۔ ”پارٹ ٹائم“ اسلام میں ایسا لباس صرف نماز پڑھتے ہوئے پہننا چاہیے۔ اس پارٹ ٹائم اسلام یعنی مغرب اور اسلام کی مفاہمت کی بہترین علامت چند دن پہلے ایمسٹرڈیم میں نظر آئی۔ ایمسٹرڈیم کو یورپ کو جنسی ہیڈ کوارٹر SexCapital کہا جاتا ہے۔ وہاں کے ریڈ لائٹ ڈسٹرکٹ میں دنیا بھر سے عورتیں لا کر بٹھائی گئی ہیں۔ گزشتہ دنوں وہاں ایک اشتہار بانٹا جا رہا تھا کہ ہمارے پاس ” حلال طوائفیں“ میسر ہیں۔ یعنی جو شراب نہیں پیتیں، سور نہیں کھاتیں، اور دیگر معاملات میں بھی پارٹ ٹائم اسلام کی قائل ہیں۔ ایک ایسا اسلام جو عالمی سیاسی، معاشی، معاشرتی اور خاندانی نظام کے اندر ضم ہو جائے۔ اسی طرح کے اسلام کو نافذ کرنے کے لیے ملکوں میں فوجیں اتاری جاتی ہیں، آئین تحریر کیے جاتے ہیں، اپنی مرضی سے الیکشن کروا کر کرزئی اور مالکی کو جمہوری طور پر منتخب کروایا جاتا ہے، مشرف سے لیکر سیسی تک لوگوں کو اقتدار پر بٹھایا جاتا ہے۔

لیکن خوف کی خلیج واضح ہوتی جا رہی ہے۔ پارٹ ٹائم اسلام اور اس اسلام جس کے بارے میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ یہ ایک بار پھر اجنبی ہو جائے گا، ان دونوں میں جنگ تیز ہو گئی ہے۔ امریکہ سے لے کر آسٹریلیا اور یورپ کے 23 ممالک سے وہ لوگ جو اس عالمی لائف سٹائل کے مخالف تھے، ہتھیار بند ہو کر شام اور عراق میں لڑ رہے ہیں، افغانستان اور یمن میں موجود ہیں۔ دوسری جانب تمام مسلم ریاستوں کا یہ عالم ہے کہ وہاں کی حکومتیں اس عالمی لائف سٹائل کے تحفظ کے لیے متحد ہیں دوسری جانب اسلام کے اصل روپ کے پروانے بڑھتے جا رہے ہیں۔ صرف پاکستان کی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں حجاب اور داڑھی میں جس تیز رفتاری سے اضافہ ہوا ہے اس نے کاروباری کمپنیوں کو حجاب کا شیمپو تک مارکیٹ میں لانے پر مجبور کر دیا ہے۔ لیکن دوسری جانب خوف بہت زیادہ ہے پورا عالمی لائف سٹائل بینکوں کے جعلی سرمائے اور سود سے چلتا ہے، یہیں سے میڈیا ہاؤسز پروان چڑھتے ہیں اور پارٹی فنڈ سے جمہوریت کی گاڑی۔ یہ تو سب دھڑام سے گر جائے گا اگر اس لائف سٹائل کے مخالف طاقت میں آ گئے۔ ایک جنگ ہے اس میں ایک جانب ریاستیں ہیں جو اس عالمی طرزِ زندگی کے تحفظ کی جنگ لڑ رہی ہیں اپنی پوری طاقت کے ساتھ اور دوسری جانب وہ لوگ ”پارٹ ٹائم“ قابلِ قبول اسلام نہیں بلکہ اس لائف سٹائل کے تحفظ کے لیے کوشاں ہیں جو آج اجنبی ہو چکا ہے۔ ریاستوں کی کوئی سرحد باقی ہے اور نہ ان لوگوں کی۔ سیّد الانبیاء نے فرمایا دجّال کی آمد سے پہلے دنیا دو خیموں میں تقسیم ہو جائے گی، ایک طرف مکمل کفر ہو گا اور دوسری طرف مکمل ایمان۔ اب نہ پارٹ ٹائم سیکولرزم رہے گا اور نہ ہی پارٹ ٹائم اسلام۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

قومی جھوٹ بولنے والے

میرے سامنے اس وقت منگل 12 اگست 1947ء کا انگریزی اخبار The civil & military gazette ہے۔ اخبار میں 11 اگست 1947ء کو پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کے پہلے اجلاس کی روداد اس سرخی کے ساتھ چھپی ہے: Pakistan Constituent Assembly Opens. یہ اخبار کسی مسلم لیگی رہنما یا کسی مذہبی رجحان رکھنے والی شخصیت کی زیر ادارت نہیں تھا بلکہ یہ خالصتاً برطانوی سرپرستی میں نکلنے والا اخبار تھا جو 1872ء میں لاہور، شملہ اور کراچی سے بیک وقت شائع کیا گیا۔ یہ دراصل چار انگریزی اخبارات کو ختم کر کے نکالا گیا تھا... ایک کلکتہ کا "Mofussilite" دوسرا "Lahore Chronicle" تیسرا "Punjab Times" اور چوتھا "Indian Public Opinion" اس اخبار کی شہرت مشہور انگریز ناول نگار اور شاعر رڈیارڈ کپلنگ (Rud Yard Kipling) کی وجہ سے ہے جس کا والد لاہور کے عجائب گھر کا کیوریٹر تھا۔ کپلنگ امتحانات میں اچھے نمبر نہ لے سکا اور اسے آکسفورڈ میں داخلہ نہ ملا۔ والد نے اسے اس اخبار میں اسسٹنٹ ایڈیٹر لگوا دیا۔ اس زمانے میں سٹیفن ویلر اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ 1886ء میں کے رونبسن (Kay Robinson) ایڈیٹر بنا تو اس نے کپلنگ کو اخبار میں افسانے لکھنے کے لیے کہا۔ یہیں سے اس کی شہرت کا آغاز ہوا۔ یہ وہی کپلنگ ہے جسے برطانیہ میں بھی ایک مہذب گورے کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے اور اس کی مشہور نظم White Man's burdon اس تعصب کی علامت کے طور پیش کی جاتی ہے۔ اس اخبار کا مزاج اور اس کی ادارتی پالیسی ہمیشہ سیکولر رہی۔ اس کے ادارتی بورڈ پر ہمیشہ گوروں کا قبضہ رہا یا ان کے تربیت یافتہ مقامی انگریزی لکھنے والوں کا۔

اس طویل تمہید کا مقصد یہ ہے کہ قائداعظم کی قانون ساز اسمبلی کی گیارہ اگست 1947ء کی جس تقریر کا حوالہ دے کر پوری قوم کو الجھن میں مبتلا کیا گیا ہے کہ شاید قائداعظم ایک سیکولر قسم کا پاکستان چاہتے تھے، اس کے مندرجات کو اس اخبار میں سب سے نمایاں ہونا چاہیے تھا، لیکن میں یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ اس اخبار میں گیارہ اگست 1947ء کی آئین ساز اسمبلی کی جو روداد چھپی، وہ انتہائی مختصر ہے۔ صبح دس بجے اجلاس شروع ہوتا ہے اور جوگندر ناتھ منڈل کو سپیکر منتخب کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد لیاقت علی خان کی جانب سے مبارکباد اور جواب میں منڈل کے شکریے کے الفاظ ہیں اور ساتھ ہی ساتھ قائداعظم کی تعریف اور ان کی قیادت پر اعتماد کا اظہار ہے۔ اس کے بعد قائداعظم کے چند رسمی جملے ہیں جو اخبار میں دیے گئے ہیں۔ میں وہ فقرے ڈھونڈتا رہا جو زور و شور سے بیان کئے جاتے ہیں اور ثابت کیا جاتا ہے کہ قائداعظم جیسا عظیم لیڈر اس نوزائیدہ ملک کے سیاسی نظام کو اسلام سے دور رکھنے کا درس دے رہا تھا جو خالصتاً اسلام کے نام پر بنا تھا اور جس کی سرحد کی دونوں جانب انسان صرف اس لیے شہید کیے جا رہے تھے کہ وہ کلمہ طیبہ پڑھتے تھے۔ یہ ایک ایسا جھوٹ ہے، جس پر یقین کرنے کی کوئی دلیل نظر نہیں آتی۔ جو قائد پاکستان کے قیام کے مطالبے کے لیے اپنی تقریروں میں ایک علیحدہ قومیت اور علیحدہ ضابطہ حیات کی بات کرتا رہا ہو اور جو اپنی زندگی کی آخری تقریر یکم جولائی 1948ء کو ایک خالصتاً سرکاری تقریب یعنی سٹیٹ بنک آف پاکستان کے افتتاح پر کرے اور اس میں یہ ہدایات دے کہ ایک ایسا معاشی نظام مرتب کیا جائے جو اسلام کے سنہری اصولوں پر مبنی ہو اور پھر اسی تقریر میں مغرب کے معاشی نظام پر شدید تنقید کرتے ہوئے کہے کہ اس نظام نے ایک ایسا 'گند' (Mess) ڈال دیا ہے کہ اسے کوئی معجزہ ہی بچا سکتا ہے، وہی شخص آئین ساز اسمبلی کے افتتاح کے وقت ایک ایسی تقریر کیسے کر سکتا ہے، حالانکہ اس تقریر میں بھی کوئی ایسی بات نہیں جسے اسلام کے بنیادی اصولِ حکمرانی سے متصادم کہا جا سکے، لیکن قائداعظم جیسی محتاط شخصیت سے یہ بھی توقع نہیں کی جا سکتی تھی، جو اپنا ایک ایک لفظ ناپ تول کر بولا کرتے تھے۔

مجھے دوسری حیرت اس بات پر ہوئی کہ آئین ساز اسمبلی کا افتتاحی اجلاس ہے، آل انڈیا ریڈیو تمام تقاریب کی ریکارڈنگ کر رہا ہے اور اسے نشر بھی کر رہا ہے لیکن اس تقریر کی نہ کوئی ریکارڈنگ میسر آتی ہے اور نہ ہی تقریر کا کوئی ہینڈ آؤٹ کسی جگہ میسر ہے۔ ایک اور بے بنیاد دعویٰ کیا جاتا ہے کہ 12 اگست کے ڈان (Dawn) اخبار میں یہ تقریر چھپی تھی۔ تحقیق اور جستجو میں جاؤ تو اس دعوے پر ہنسی آتی ہے۔ ڈان اخبار کے دلی کے دفتر کو بلوائیوں نے چند ماہ پہلے آگ لگا دی تھی اور اس کے مالکان پریشان تھے کہ اخبار کہاں سے نکالا جائے۔ انہوں نے تمام بندوبست کر لیا کہ اس نوزائیدہ ملک کے دارالحکومت کراچی سے اخبار نکالا جائے۔ یوں ڈان اخبار کا پہلا شمارہ 15 اگست 1947ء کو شائع ہوا۔ اپنے جنم لینے سے تین دن پہلے اس اخبار نے قائداعظم کی یہ تقریر کیسے چھاپ دی۔ ایک اور کہانی اس تقریر کے ساتھ جوڑی گئی جو اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس زمانے کی اسٹیبلشمنٹ یعنی سول اور ملٹری بیوروکریسی نے اس تقریر کی اشاعت روکی تھی۔ وہ سول اور ملٹری بیوروکریسی جسے انگریز نے سیکولرازم کی لوریاں دے دے کر پالا تھا، جن کی سرکاری تقریبات میں شراب ایک سرکاری رسم کی طور پر پیش کی جاتی تھی، جہاں اٹھنا بیٹھنا' چلنا پھرنا اور سانس تک انگریزی زبان اور تہذیب میں ہوتا تھا، وہ سب کے سب کیسے متحد ہو گئے اور کہا کہ یہ تقریر روک دو کیونکہ ہم پاکستان کو اسلام کا قلعہ بنانا چاہتے ہیں اور یہاں اسلامی نظام نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک شخص کا نام بھی لیا جاتا ہے اور اسے پوری سول اور ملٹری بیوروکریسی پر بھاری ثابت کیا جاتا ہے۔ آدمی جھوٹ بولتا ہے لیکن دلیل کے ساتھ۔ طوائف کے کوٹھے سے گھنگھرو کی صدا تو بلند کی جا سکتی ہے آخرِ شب کی سحر گاہی میں تلاوت کی نہیں۔

قائداعظم کی گیارہ اگست 1947ء کی تقریر کے بعد سیکولر حضرات کے نزدیک سب سے مقدس دستاویز منیر رپورٹ ہے۔ پاکستان کے اس متنازعہ ترین چیف جسٹس کی رپورٹ کو بنیاد بنا کر کہا جاتا ہے کہ قائداعظم ایک سیکولر پاکستان چاہتے تھے۔ اس ضمن میں قائداعظم کا رائٹرز (Reuters) کو دیا گیا ایک انٹرویو اس رپورٹ میں درج ہے۔ فضل کریم صاحب کی بیٹی سلینہ کریم جب اپنی تعلیم کے دوران لندن گئیں تو انہیں بھی حیرت ہوئی تھی کہ ایسا انٹرویو قائداعظم کیسے دے سکتے تھے۔ انہوں نے تحقیق شروع کی۔ جھوٹا شخص اپنے بے بہا نشان چھوڑ جاتا ہے۔ جسٹس منیر نے اس انٹرویو کی تاریخ نہیں بلکہ سال 1946ء لکھا ہے۔ سلینہ کو وہ تمام فائلیں ڈھونڈنا پڑیں اور آخر پتا چلا کہ قائداعظم نے رائٹرز کو صرف ایک انٹرویو دیا جو 21 مئی 1947ء کو دیا گیا تھا۔ سلینہ کریم کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ جسٹس منیر نے قائداعظم کے انٹرویو کے پیرے کے پیرے ہی تبدیل کر دیے اور ان میں قائداعظم کے حوالے سے عوام کے اقتدارِ اعلیٰ کا سیکولر تصور ڈال دیا۔ اس کے بعد سلینہ کریم نے ایک طویل تحقیق کی اور 317 صفحات پر مشتمل کتاب لکھ ڈالی جس کا نام Secular Jinah & Pakistan: What the nation dosn't know ہے۔ یہ وہ جھوٹ ہے جو زور و شور سے اس قوم کے کانوں میں ڈالا جاتا رہا ہے اور آج سب لوگ یقین کر لیتے ہیں کہ ہو سکتا ہے، شاید' اگر' یا کسی مصلحت کے تحت قائداعظم نے ایسا کہا ہو گا، لیکن جھوٹے کو جھوٹا کوئی نہیں کہتا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس ملک کے دس لاکھ شہدا سے غداری کی' ان کے مقدس خون اور قربانیوں کا مذاق اڑانے کے لیے جھوٹ بولا۔ اس قوم کو دانستہ گمراہ کرنے کے لیے سرکاری سطح پر جھوٹ کی فیکٹری لگائی گئیں۔ میری جستجو جاری ہے کہ وہ کون تھا جس نے یہ گیارہ اگست کی تقریر تخلیق کی اور اس جھوٹ کو عام کیا۔ ایک مجرم جسٹس منیر تو موجود ہے۔ کیا کوئی اس کی قبر کے ٹرائل کا نعرہ بلند کرے گا؟

allurdupdfnovels.blogspot.com

قومی ریاستوں کی سرحدوں کا زوال

آج سے تقریباً سو سال قبل جب دنیا کو قومی ریاستوں میں تقسیم کیا جارہا تھا تو ایک پر فریب اور جعلی تصور عام کیا گیا کہ ہر ریاست خود مختار ہوگی، اس کا ایک اقتدار اعلیٰ ہوگا اور اس کی سرحدیں عالمی طور پر قابل احترام ہوں گی۔ اس پر فریب اور جعلی اقتدار اعلیٰ کی بنیاد پر سب سے پہلے لیگ آف نیشنز قائم کی گئی۔ ہر قومی ریاست کو اس بحث مباحثے کے فورم (DebatingClub) میں نمائندگی دے کر یہ ثابت کیا گیا کہ یہ آزاد خود مختار ریاستیں ہیں۔

جھنڈے، قومی ترانے، کرنسی، پاسپورٹ، ویزا ریگولیشن اور سرحدوں کی حفاظت پر مامور مسلح افواج سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی جو غیر منصفانہ تقسیم دنیا میں کی گئی ہے وہ ایک عالمی حقیقت ہے اور ہم ایک دوسرے کی سالمیت اور خود مختاری کا احترام کرتے ہیں۔ لیکن اس احترام کی دھجیاں صرف چند سالوں کے بعد جنگ عظیم دوم میں ہوا میں اڑا دی گئیں۔ نہ کسی کو عالمی سرحدیں یاد رہیں اور نہ ریاستوں کا اقتدار اعلیٰ۔ انسانی خون اس بے دردی کے ساتھ بہایا گیا کہ اس کے بدنما چھینٹے آج بھی قومی ریاستوں کے منہ پر بدنما داغ کی طرح چسپاں ہیں۔ اتنا خون بہانے، شہر برباد کرنے اور بستیاں اجاڑنے کے بعد صرف چند سال سکون کے گزرے، اقوام متحدہ بنی اور ایک بار پھر ریاستوں کو یہ فریب دیا گیا کہ تم خود مختار ہو۔ لیکن اب کی بار اس عالمی دہشت گردی اور بڑی طاقتوں کی غنڈہ گردی نے ایک نیا لبادہ اوڑھ لیا۔ اب سرحدوں کی خلاف ورزی ایک ایسے طریقے سے کی جانے لگی کہ ان قومی ریاستوں کے اندر اپنے پالتو افراد کے ذریعے خانہ جنگی، گوریلا کارروائی، دھونس اور لالچ کے ذریعے اپنے زرخرید حکمرانوں کو مسلط کیا جانے لگا۔ ہر بڑی طاقت نے اپنی ایک خفیہ ایجنسی بنائی اور اس کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ دوسرے ملکوں میں ان کے مفادات کے لیے عام آدمی سے لے کر حکمرانوں تک کو خریدے، مخالف حکومتوں کے خلاف گوریلا کارروائی کے لیے مدد فراہم کرے، ملکوں کو آپس میں لڑائے، نسل، رنگ، زبان اور مذہب کی بنیاد پر لوگوں میں تفریق پیدا کرے اور امن وامان کو تباہ کرے۔ ان خفیہ ایجنسیوں کا ایک اور کام تھا، کہ وہ نظریاتی طور پر ہونے والی جدوجہد کی مدد کریں۔ کیمونزم اور کارپوریٹ جمہوریت دونوں کی جنگ میں سرحدوں کا احترام خاکستر ہو کر رہ گیا۔ بلکہ جو کوئی کسی دوسرے ملک میں جا کر لڑا وہ ہیرو کہلانے لگا۔ چی گویرا چار سے زیادہ ملکوں میں لڑتا رہا اور آج تک اس کی تصویریں لہرائی جاتی ہیں۔ یہی حال ویت نام، انگولا، چلی، ہنڈوراس، کوریا اور نکاراگوا جیسے ممالک کا تھا جن میں دنیا بھر سے لوگ جا کر لڑتے رہے اور انہوں نے سرحدوں کا احترام خاک میں ملایا، مگر ہیرو کہلائے۔ یہی کیفیت ان عالمی طاقتوں کی تھی جو وہاں اسلحہ بھی سپلائی کرتی رہیں اور جہاں ممکن ہوا، فوجیں بھی اتارتی رہیں۔ یہ سب کچھ پچاس سال سے زیادہ عرصے تک جاری رہا۔ ہر ایک نے اپنے حمایت یافتہ لوگوں کے ایسے گروہ تخلیق کیے جو فن حرب اور خصوصاً گوریلا جنگ میں اعلیٰ ترین صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ہر ایسے ملک میں ایسے لوگوں کے منظم گروہ تخلیق کیے گئے جو حکومتوں کو ناکوں چنے چبوانے کی اہلیت رکھتے تھے۔ کسی کو علاقائی آزادی کے نام پر اور کسی کو نظریے کی بنیاد پر منظم کیا گیا۔ اب یہ گروہ اسقدر منظم اور خود مختار ہو گئے تھے کہ ان کے نزدیک قومی ریاستوں کی سرحدوں کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہی تھی۔ اس لیے کہ جب عالمی طاقتیں ہی کسی دوسرے ملک کی سرحدوں کا احترام نہ کرتی ہوں تو یہ لوگ جو نظریاتی چھتری تانے لڑ رہے تھے وہ کیسے سرحدوں کا احترام کرتے۔ افغانستان میں روس آیا تو دنیا بھر سے لوگ وہاں جا کر لڑنے لگے۔ پاکستان کے کتنے گھرانے ایسے ہیں جن کے بیٹے افغان جہاد میں شہید ہوئے اور ان کی میتیں یا تو وہیں دفن کر دی گئیں یا کسی خوش قسمت کو یہاں اپنے ملک کی مٹی نصیب ہوئی۔ ایران عراق جنگ شروع ہوئی تو ایک اور مسلک کے لوگ وہاں ایران کی جانب سے لڑنے چلے گئے۔ ایرانی اگرچہ ایک قومی جنگ لڑ رہے تھے لیکن عقیدت لوگوں کو کہاں تک لے جاتی ہے کہ پاکستان کے ایک شخص کے دو بیٹے ایران عراق جنگ میں شہید ہوئے۔ وہ اسے تہران کے قریب بہشتِ زہرا قبرستان میں دفن کرنا چاہتا تھا، لیکن اسے اجازت نہ دی گئی کہ وہ دونوں ایرانی النسل نہ تھے۔ ایسی ہی کیفیت افغانستان کے جہاد میں موجود تھی۔ قومی ریاستوں اور قومیتوں کا نشہ قائم تھا۔ باہر سے آکر لڑنے والے محترم تو تھے لیکن زمین پر حق اور احترام زمین پر صدیوں سے بسنے والوں کا ہی مقدم رہا۔

لیکن گیارہ ستمبر نے تو دنیا ہی بدل ڈالی۔ وہ اقوام متحدہ جو عالمی سرحدوں کے تقدس کی ضمانت تھی، اس نے دنیا کے اڑتالیس غنڈوں (نیٹو) کو یہ اجازت دی کہ افغانستان کی سرحدوں کو عالمی ضمیر کے نام پر پامال کر دیا جائے۔ پوری دنیا تماشہ دیکھتی رہی۔ اب کی بار اقوام متحدہ کی اجازت کی بھی ضرورت نہ محسوس کی گئی۔ امریکہ اپنے حلیف برطانیہ اور دیگر ممالک کے ہمراہ سرحدیں عبور کرتا عراق میں گھس گیا۔ یوں قومی ریاستوں کی خود مختاری، آزادی اقتدار اعلیٰ اور سرحدوں کے تقدس کا تصور ملیامیٹ ہو گیا۔ اس تصور کو ختم امریکہ کے اس اعلان نے بھی کیا کہ ہم جس ملک میں بھی ایسے لوگوں کو دیکھیں گے جو ہماری قومی سلامتی کے لیے خطرہ ہیں انہیں خود جا کر ختم کریں گے۔ ہمیں ریاستوں کی حکومتوں پر اعتبار نہیں۔ ڈرون حملے اسی تصور کی پیداوار تھے جن کا نشانہ سب سے زیادہ پاکستان بنا۔

جب خود ریاستوں نے ہی سرحدوں کے تقدس کا تصور پامال کر دیا تو وہ گروہ جو ان ریاستوں کو اپنا دشمن تصور کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ان ریاستوں کا ظلم اور مسلمانوں کے خلاف پالیسیاں پوری دنیا میں بربریت کو ہوا دیتی ہیں۔ انہوں نے ایک اور راستہ اختیار کر لیا کہ فلسطین کا بدلہ یمن اور افغانستان میں بھی لیا جا سکتا ہے اور افغانستان کا بدلہ لندن اور نیویارک میں بھی۔ پوری دنیا کی ریاستی حکومتوں اور ان کے مقابلے میں کھڑے ہونے والوں کے درمیان ایک واضح تقسیم ہو گئی۔ عراق میں عرب دنیا کے لڑنے والے جا پہنچے اور شام میں ایران نے اپنے تیار کردہ افراد کو بھیج دیا۔ حالات یہاں تک آ پہنچے کہ دنیا میں یورپ کے بائیس ممالک ایسے ہیں جہاں سے مسلمان شام میں لڑنے کیلئے گئے ہوئے ہیں۔ ان میں کئی تو نسلاً گورے ہیں۔ جس کو جس قدر زمین کا ٹکڑا ملا اس نے وہاں ایک ریاست کا اعلان کر دیا۔ امارتِ اسلامیٔ شام وعراق اور امارتِ اسلامی افغانستان۔ جہاں جہاں ریاستی دہشتگردی بڑھی وہاں سے لوگ ہجرت کر کے ان گروہوں میں شامل ہوتے گئے۔ چیچنیا، ازبکستان، تاجکستان، صومالیہ، یمن، افغانستان غرض دنیا کے ہر خطے سے لوگ ایک ایسے بڑے گروہ کی شکل اختیار کر چکے ہیں جو کسی طرح بھی عالمی سرحدوں کا احترام نہیں کرتا بالکل ویسے ہی جیسے عالمی طاقتیں کمزور ملکوں کی سرحدوں کا احترام نہیں کرتیں۔ یہ سرحدیں جو ماڈرن قومی ریاستوں کی علامت تھیں اب ان کی حیثیت صرف نقشے کی لکیروں سے زیادہ نہیں رہ گئی۔ اس کے باوجود بھی دنیا بھر میں یہ سوال کیا جاتا ہے کہ ہماری سرزمین، ہمارا علاقہ اور ہماری ریاست دہشتگردی کیلئے کیوں استعمال کی جاتی ہے۔ یہ بیج تو قومی ریاستوں نے خود بویا ہے۔ ستر سال ہم نے ریاستی سرپرستی میں دوسروں کی سرحدوں کو پامال کر کے ان کے گھروں میں آگ اور خون کا کھیل کھیلا اور اب ہم کس قدر معصوم خواہش رکھتے ہیں کہ یہ آگ اور خون کا کھیل ہماری سرحدوں میں نہ کھیلا جائے۔ اب تو جو فصل بوئی گئی ہے اسے کاٹنے کے دن ہیں۔ جو بھی ریاست جس کیمپ میں ہو گی اسے دوسرے کیمپ کی ریاستوں اور نان اسٹیٹ ایکٹرز اور یہاں تک کہ ریاستی اداروں کی دخل اندازی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ سرحدیں اور ملک وقوم کی خودداری ایک عورت کی عصمت کی طرح ہوتی ہے۔ اس کو ہر کسی سے بچانا فرض ہوتا ہے۔ اگر محلے کا غنڈہ کسی عورت کی عصمت پامال کرتا رہے تو وہ عورت دوسرے محلے کے اوباش لوگوں کی دست برد سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

رشوت لینے اور دینے والا

ایوب خان نے ملک میں مارشل لاء کے ذریعے اقتدار حاصل کرتے ہی پاکستان کی سول بیوروکریسی کی تطہیر اور تنظیم نو کے لیے دو کام کیے...... ایک بیورو آف نیشنل ری کنسٹرکشن قائم کیا جس کی سربراہی ایک بریگیڈئر کر رہے تھے اور دوسرا پاکستان کے چیف جسٹس اے آر کارنیلیس کی سربراہی میں بیوروکریسی کی تنظیمِ نو کے لیے ایک کمیشن قائم کر دیا۔ ملک کی انتظامیہ کی تطہیر، تنظیمِ نو اور اس کی صفوں سے بددیانت اور نااہل لوگوں کو نکالنا ہر فوجی حکمران کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ جمہوری حکمرانوں میں یہ شغل صرف ذوالفقار علی بھٹو نے اختیار کیا۔ سب نے اسی طرح کے ادارے قائم کیے، ایسے ہی کمیشن بٹھائے اور ان سب نے اپنی ذاتی ناپسند اور تعصب کی بنیاد پر افسران کو نوکری سے نکالا۔ سب سے بڑی تعداد چودہ سو افسران کی تھی جو ذوالفقار علی بھٹو کی جنبشِ قلم سے نوکری سے برخاست ہوئے، لیکن ان سب کا انجام یہ ہوتا رہا کہ ذوالفقار علی بھٹو ہو، ایوب خان، یحییٰ خان یا ضیاء الحق، سب کے سب اسی بیوروکریسی کے ایسے بے دام غلام بنے کہ ان کے مشورے کے بغیر گھر سے قدم بھی باہر نہ نکالتے۔ ذوالفقار علی بھٹو جیسے ذہین سیاستدان نے بھی 1977ء میں الیکشن کی ٹکٹیں بیوروکریسی کے اہم کل پرزوں یعنی اضلاع کے ڈپٹی کمشنروں سے پوچھ کر جاری کیں۔ یہ ایک ایسا تماشا ہے جو اس ملک میں 55 سال سے لگا ہوا ہے۔ ہر نیا حکمران آ کر ایک ہی اعلان کرتا ہے کہ میں کرپشن کا خاتمہ کر دوں گا۔ 1988ء کے بعد تو ہر پارٹی نے اپنے اپنے ''ایماندار'' اور ''کرپٹ'' افسران کی فہرستیں تیار کر رکھی ہیں۔ نواز شریف کے ایماندار پیپلز پارٹی کے لیے کرپٹ ہیں اور پیپلز پارٹی کے کرپٹ افسران ن لیگ کے لیے ایماندار۔ اس جمہوری وقفے میں پرویز مشرف کی بھی آمد ہوئی جس نے پوری قوم کو ایک ڈرامے کے ذریعے دھوکہ دینے کی کوشش کی اور نیب کا ادارہ قائم کیا۔ لیکن اس ادارے کی تفتیش اور تحقیق آخر کار وفاداریاں خریدنے کے کام آئی۔ ہر حکمران کے دور میں ایک ہی نعرہ بلند ہوتا ہے، ایک ہی غلغلہ رہتا ہے کہ اس ملک میں بددیانتی اور کرپشن اپنے عروج پر پہنچ چکی ہے اور اس نعرے کے جواب میں ایک ''پختہ عزم'' کا اظہار ہوتا ہے کہ ہم کرپشن کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ مسئلہ حل کیوں نہیں ہوتا؟

1956ء کی کارنیلیس رپورٹ میں ایک پیراگراف اس قوم کو حیران کر دینے کے لیے کافی تھا جس میں کہا گیا کہ ''گزر گئے وہ دن جب سی ایس پی افسران کا شمار ایماندار لوگوں میں ہوتا تھا اور لوگ ان پر اعتماد کرتے تھے۔ پورے برطانوی دور میں ان کی ایمانداری کی وجہ ہی سے حکومت مستحکم رہی لیکن اب حالت یہ ہے کہ محکمہ انسدادِ رشوت ستانی کے کیسوں میں تین نام سی ایس پی افسران کے بھی ہیں''۔ یہ آج سے تقریباً پچاس سال پہلے کی بات ہے۔ اس رپورٹ میں بہت سی سفارشات بھی پیش کی گئیں لیکن ایوب خان کی سیاسی مصلحتوں اور بیوروکریسی کی چرب زبانی نے اس رپورٹ کو سرد خانے میں ڈال دیا۔ اس کے بعد آج تک یہ معاشرہ رشوت کے معاملے میں دن بدن زوال کا شکار ہے۔ اب یہ عالم ہے کہ ایک چھوٹے سے کام کے لیے بھی عام آدمی کو رشوت کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ پاسپورٹ بنوانا ہو، بجلی یا گیس کا بل درست کروانا ہو، پیدائش یا موت کا سرٹیفکیٹ لینا ہو، ڈرائیونگ لائسنس، زمین کی فرد حتیٰ کہ عدالت میں فیصلے کی نقل اور آئندہ پیشی کی تاریخ تک لینے کے لیے رشوت درکار ہے۔ ایسا کرنے والے لوگ دونوں جانب سے اپنا اپنا رونا روتے ہیں۔ رشوت لینے والا کہتا ہے کہ میری تنخواہ اس قدر قلیل ہے کہ میں اپنے مہینے کے پہلے دس دن بھی مشکل سے گزار پاتا ہوں جبکہ رشوت دینے والا یہ کہتا ہے کہ اگر وہ پیسے نہیں دے گا تو اسے اتنے چکر لگوائے جائیں گے کہ ایک دن تنگ آ کر یا تو وہ رشوت دے دے گا یا پھر خودکشی کر لے گا۔

اس پورے مسئلے کو سمجھنے کے لیے جب میں سید الانبیاء ﷺ کے بتائے ہوئے اصولوں سے رجوع کرتا ہوں تو یوں لگتا ہے کہ ہم نے کرپشن اور رشوت کے خلاف جہاد کا سفر ہی شروع نہیں کیا۔ ہم نے اس سیڑھی پر قدم ہی نہیں رکھا جس سے کرپشن اور رشوت کا خاتمہ ہو سکے۔ آپ ﷺ نے کس وضاحت سے فرمایا: ''رشوت لینے والا اور رشوت دینے والا دونوں جہنمی ہیں''۔ ہم نے بحیثیت معاشرہ کبھی رشوت دینے والے کو اس صف میں کھڑا ہی نہیں کیا جس صف میں میرے آقاؐ نے کھڑا کیا تھا۔ کسی جگہ ہم نے اسے مجبور، بے کس اور حالات کا غلام قرار دیا اور کہیں ہم نے اسے مال دار بنایا جس کے سب کام پیسوں سے نکل سکتے ہیں۔ ہماری حکومتوں کی ساری خرمستیاں اور ڈرامے بازیاں اور ان کے نتیجے میں جنم لینے والی مقدمے بازیاں صرف سرکاری اہلکاروں تک محدود رہتی ہیں۔ ہم اس صنعت کار کو نہیں پکڑتے جو انکم ٹیکس افسر کو رشوت دیتا ہے، اس مل مالک کا کچھ نہیں بگاڑتے جو پیسے دے کر لائسنس حاصل کرتا ہے۔ وہ ڈرائیور بھی ہماری پکڑ میں نہیں آتا جو ٹیسٹ نہیں دیتا اور رشوت دے کر لائسنس بنوا لیتا ہے۔ اس ملک میں رشوت دینے والوں کی لمبی لمبی قطاریں ہیں جو دفتروں کے باہر اپنے ناجائز کام کروانے کے لیے لگی ہوئی ہیں۔ اس فن میں طاق وہ دلال ہیں جو ان دفاتر میں گھومتے پھرتے ہیں۔ اب تو یہ فن اس قدر ترقی کر گیا ہے کہ افسر کو اپنے منہ سے کہنے کی کچھ ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ ایک تو صاحب سے کام نکلوانے والے مختلف لوگ دفتروں کے آس پاس میسر آ جاتے ہیں جو ایک ''شریف'' شہری اور ''شریف'' افسر دونوں کا بھرم رکھتے ہیں۔ نہ افسر کو سائل سے پیسے لیتے ہوئے شرمندگی کا احساس ہوتا ہے اور نہ سائل اس کشمکش میں مبتلا ہوتا ہے کہ پتہ نہیں آفیسر کم یا زیادہ کے معاملے میں ناراض نہ ہو جائے۔ افسران کی ایک اور قسم ہے جنہیں آج کے دور میں کامیاب افسر کہا جاتا ہے۔ ان لوگوں نے زندگی بھر یا پھر نوکری کا پورا عرصہ ایک ہی شخص کو اپنا رازدان، دلال یا ٹاؤٹ بنایا ہوتا ہے۔ عموماً وہ صاحب کا بہت قریبی دوست معلوم ہوتا ہے۔ صاحب اس کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے۔ اس کی رات گئے کی محفلوں میں شریک ہوتا ہے۔ بعض دفعہ تو خاندانی تعلقات بھی ہوتے ہیں۔ یہ شخص صاحب کی تمام ضروریات کا خیال رکھتا ہے۔ پلاٹ خریدنا ہے، مکان بنانا ہے، بچوں کی فیسیں ہیں، شادی کے اخراجات ہیں، بیرون ملک شاپنگ ہے، یہاں تک کہ بیگم صاحب کے ناز نخرے بھی اس ''قریبی عزیز'' یا ''بھائی'' کے ذمے ہوتے ہیں۔ لیکن پورے ملک کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ صاحب سے کام کروانا ہو تو یہ شخص ایک کارگر نسخہ ہے۔ اس کارگر نسخے کی کام کے سلسلے میں ایک مناسب فیس ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کی سرمایہ کاری طویل اور صبر آزما ہوتی ہے۔ اس میں نقصان کا اندیشہ بھی ہے۔ صاحب کی آمدن کم ہو اور خرچہ زیادہ ہو جائے، لیکن ایسے لوگ صاحب کی آمدن والی جگہ پر پوسٹنگ کے لیے بھی دوڑ دھوپ کرتے ہیں کہ اس میں ان کا اپنا نفع پوشیدہ ہوتا ہے۔ ان لوگوں کا تعلق ملک کی اشرافیہ سے ہوتا ہے اور تمام لوگ جو بڑے بڑے کاروبار کرتے ہیں، انہی سے رجوع کرتے ہیں۔ معاشرے میں یہ لوگ بہت بااثر کہلاتے ہیں اور آفیسر بہت ہی ایماندار۔ یہ سارا گورکھ دھندا اس لیے ہے کہ ہم نے رسول اکرم ﷺ کی حدیث کی روح کو نہ سمجھتے ہوئے رشوت لینے اور دینے والے دونوں کو برابر کا مجرم قرار نہیں دیا۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

صبر آزما امن کی راہ

اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

وہ ایک انتہائی مقبول شاعر اور موسیقار تھا، اس کے ساتھ ساتھ وہ شوقیہ مصوری بھی کرتا تھا، لیکن اس کی شہرت کی اصل وجہ اس کی مشہور نظم "Confesión de un Soldado" (ایک فوجی کے اعترافات) تھی جو اس نے 1946ء میں صرف سترہ سال کی عمر میں لکھی۔ اس نے وائلن بجانا سیکھی اور چھ افراد کے ساتھ مل کر ایک میوزیکل گروپ "بیونس آرس" بنایا۔ لیکن وہ نکاراگوا کے گوریلوں کا ساتھی تھا جو حکومت کے خلاف جدوجہد میں مصروف تھے۔ اس کے تعلقات ایک خاتون صحافی ایمپروزیلیا (Ampero Zelaye) کے ساتھ تھے۔ 21 ستمبر 1956ء میں یہ خاتون اپنے اس محبوب شاعر اور موسیقار ریگوبرٹو "Regoberto" کو انتہائی شاندار کلب میں ایک کافی پارٹی میں لے گئی جس میں نکاراگوا کا صدر سموزا بھی موجود تھا۔ پارٹی کے دوران اس انقلابی شاعر اور موسیقار نے پستول نکالا اور صدر سموزا کے سینے میں گولیاں اتار دیں اور بھاگ نکلا۔ سموزا کو پانامہ کینال ہسپتال میں داخل کیا گیا جہاں وہ چند روز موت و حیات کی کشمکش میں رہنے کے بعد انتقال کر گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پورے جنوبی امریکہ کے ممالک میں گوریلا کارروائیاں جاری تھیں۔ گوریلے بندوق کے ذریعے اپنے ملکوں میں "کمیونسٹ شریعت" نافذ کرنا چاہتے تھے۔ ان کو کچلنے کی خاطر امریکہ نے فوجیوں کو تربیت دینے کے لیے سکول آف امریکاز کھول رکھا تھا جہاں انہیں گوریلوں کے خلاف فوجی ایکشن کرنے، انہیں صفحۂ ہستی سے مٹانے، ان پر بدترین تشدد کرنے اور انہیں مختلف غیر انسانی طریقوں سے نفسیاتی مریض بنانے کی ٹریننگ دی جاتی تھی۔ آج بھی اس سکول کے بنائے گئے مینوئل دنیا بھر میں ریاستی جبر و تشدد کی تاریخ میں اہم دستاویز سمجھے جاتے ہیں۔ دوسری جانب وہ گوریلے تھے جو فوجی قافلوں پر حملے کرتے، انہیں اغوا کرتے، بدترین طریقے سے قتل کرتے۔ ان میں یہ طریقہ عام تھا کہ وہ اپنے قیدی کے نازک اعضا کاٹ دیتے اور خون بہنے دیتے۔ گوریلے عام لوگوں کو بھی جنہیں وہ مخبر یا حکومت کا سرگرم ساتھی سمجھتے' اغوا کرتے، مار دیتے یا پھر ہاتھ پاؤں توڑ کر معذور بنا کر پھینک دیتے۔ کمیونسٹ گوریلوں کے علاوہ دائیں بازو کے سرمایہ دارانہ ذہنیت کے حامل جمہوریت پسند گوریلے بھی تھے جنہیں امریکی مدد حاصل تھی، یہ بندوق کے زور پر ملک میں سرمایہ دارانہ جمہوریت نافذ کرنا چاہتے تھے۔ ان کے بہت سے گروہ تھے جنہوں نے مل کر ایک بڑا گروپ تشکیل دیا جسے کونٹراز (Contras) کہتے تھے۔ یہ گروہ ایک سے زیادہ ملکوں میں اپنا اثر و رسوخ رکھتا اور گوریلا کارروائیاں کرتا تھا۔ امریکہ نے 1984ء سے 1987ء تک اس گروہ کو خفیہ طریقے سے چالیس ملین ڈالر کی امداد اور اسلحہ فراہم کیا۔ ان کی کارروائیاں نکاراگوا، ہنڈراس اور کوسٹاریکا جیسے ممالک میں تھیں جبکہ کمیونسٹ گوریلے السلواڈور سے لے کر چلی تک دیگر ممالک میں سرگرم عمل تھے۔ ایک گروہ طاقت کے زور پر "سرمایہ دارانہ جمہوری شریعت" کا نفاذ چاہتا تھا اور دوسرا گروہ "کمیونسٹ شریعت" کا غلبہ۔ دونوں گروہ اپنی اپنی ریاستوں کے خلاف لڑ رہے تھے۔ کمیونسٹ گروہ کو کیوبا کے ذریعے سوویت یونین کی امداد حاصل تھی۔ اس آگ نے جنگِ عظیم اوّل کے بعد سلگنا شروع کیا اور سوویت یونین کے زوال کے کئی سال بعد تک اس کی زد میں آئے کئی ملک امن و امان کی زندگی کو ترس گئے۔

امریکی اسلحے کی فروخت کے لیے بازار سجے ہوئے تھے، خرید و فروخت کے بازار کا سب سے بڑا سکینڈل ایران کونٹراز سکینڈل تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کونٹرا گوریلا ہنڈراس کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے جنگ کر رہے تھے۔ ادھر امریکہ نے دنیا کو اپنا چہرہ خوبصورت دکھانے کے لیے 1984ء میں کونٹرا گوریلا کی امداد کم کرنے کے لیے بل پاس کر دیا، لیکن ریگن انتظامیہ نے خفیہ طور پر یہ کام جاری رکھا اور کونٹراز کے ذریعے ایران کو اسلحہ فروخت کرنا شروع کر دیا تاکہ اس رقم سے کونٹرا کی امداد کی جائے۔ ایران کو عراق کے خلاف اسلحہ کی ضرورت تھی، اس کام میں اسرائیل کا وزیراعظم شمعون پیریز شامل ہوا، اس نے ایک ایرانی منوچہر قربانی فر کو جو امریکہ میں مقیم تھا، ایرانی حکومت سے معاملہ کرنے پر مجبور کیا جسے اس آڑے وقت میں اسلحے کی ضرورت تھی۔ یوں اگست 1985ء سے اکتوبر 1996ء تک ایران کو اسلحہ کی ترسیل اسرائیل کے ذریعے جاری رہی جس کے بدلے میں ایران نے لبنان میں حزب اللہ پر اپنا اثر و رسوخ ڈالا تاکہ وہ ان امریکیوں کو رہا کر دے۔ یوں حزب اللہ نے جولائی 1986ء میں دو اور اکتوبر 1986ء میں تین امریکیوں کو رہا کر دیا۔ اس کے شکرانے کے طور پر سی آئی اے کے سربراہ ولیم کیسی (William Casey) نے ایران کو اگلے دس سال تک اسلحے کی ترسیل جاری رکھی۔ اس اسلحے کے فروخت کی آمدنی جنوبی امریکہ کے ان گوریلوں پر خرچ ہوتی جو اپنے ملکوں میں ریاستوں کے خلاف جنگ جاری رکھے ہوئے تھے۔

جس دور میں ان تمام ممالک میں جنگیں جاری تھیں ایک ملک کے گوریلے دوسرے ملک میں دندناتے پھرتے تھے۔ چی گویرا جس کی تصویریں آج بھی کئی انقلابی اپنی گاڑیوں اور دفتروں میں لگاتے ہیں، ارجنٹائن میں پیدا ہوا اور بولیویا، پیرو، ایکوی ڈور، پانامہ، کوسٹاریکا، نکاراگوا، ہنڈراس اور ایلسلواڈور میں "کمیونسٹ جہاد" کرتا کیوبا میں امریکہ سے لڑنے لگا۔ آخر میں بولیویا میں 8 اکتوبر 1967ء کو پکڑا گیا۔ بولیوین فوج کے ایک سپاہی ماریو تیران نے درخواست کی کہ اسے چی گویرا کو گولی مارنے دی جائے کیونکہ اس کے تین بہترین دوستوں کو اس کے گوریلوں نے بدترین تشدد سے ہلاک کیا تھا۔ اس سے آخری سوال یہ کیا گیا کہ کیا تم نے جو غیر انسانی سلوک کیے ان کے بارے میں موت سے پہلے سوچ رہے ہو، تو اس نے کہا: "I am thinking of immorality of revolution" (میں تو انقلاب کی غیر اخلاقی نفسیات پر غور کر رہا ہوں۔) جس طرح چی گویرا آج ہیرو ہے جو کمیونسٹ شریعت کا نفاذ چاہتا تھا اسی طرح ریگوبرٹو کا مجسمہ بھی نکاراگوا میں نصب ہے جو سرمایہ دارانہ جمہوری شریعت کو طاقت سے نافذ کرنا چاہتا تھا اور ریاست کے سربراہ کا قاتل بھی تھا۔

لاکھوں لوگوں کے قتل کے بعد ان تمام ریاستوں نے فیصلہ کیا کہ ہم نے اپنے ملکوں میں امن قائم کرنا ہے۔ ادھر روس ختم ہو چکا تھا، کمیونسٹ انقلاب دم توڑ چکا تھا مگر امریکہ باقی تھا، انہوں نے امریکہ کو خیرباد کہا، اس کے مفادات سے اپنے آپ کو علیحدہ کیا اور ریاست کے دشمنوں سے مذاکرات شروع کیے۔ کونٹراز سے مذاکرات کا آغاز 28 جنوری 1988ء کو ہوا، وہی آغاز جو عموماً ہوتا ہے... ہتھیار رکھو، آئین تسلیم کرو، قیدی رہا کرو۔ لیکن امریکہ کی مداخلت بھی جاری رہی اور گوریلا کارروائیاں بھی چلتی رہیں، ایکشن ہوتے رہے اور مذاکرات بھی چلتے رہے۔ کونٹرا گوریلوں پر الزام بھی شدید تھے۔ وہ ڈاکٹروں اور نرسوں کو قتل کرتے تھے، ہسپتالوں کو آگ لگاتے تھے، عام شہریوں کے قتل اور اغوا میں ملوث تھے، جن شہروں پر قبضہ کرتے اس کی املاک جلا دیتے، عورتوں کو جنسی تشدد کے بعد قتل کرتے۔ اسی طرح کے الزامات دوسرے انقلابی گروہوں پر بھی تھے، لیکن ان تمام ممالک نے کئی سال کے مذاکرات کے بعد اپنے ملکوں میں امن قائم کر لیا۔ جب بھی مذاکرات شروع ہوتے تو امریکی میڈیا اور اس کے حواری چیختے، عالمی انسانی حقوق کی تنظیمیں شور مچاتیں۔ آج بھی ان کی رپورٹیں مظالم کی داستانوں سے بھری پڑی ہیں، لیکن وہ تمام رپورٹیں گرد آلود الماریوں کا حصہ بن چکی ہیں کیونکہ جنوبی امریکہ کے ان تمام ممالک کی حکومتوں نے سارے زخم بھلا کر امن کے سفر کا آغاز کر دیا ہے۔ جو جنگ امریکہ نے شروع کی تھی اور اسے ان ممالک کی جنگ بنا دیا تھا، انہوں نے امریکی مفادات کو اپنی سرحدوں سے باہر دھکیل دیا ہے۔ سکول آف امریکاز بند ہو گیا، گوریلا شہری زندگی کا حصہ بن گئے۔ یہ بہت صبر آزما کام ہے۔ یہ کٹھن مرحلہ ہے لیکن قومیں اگر خود فیصلہ کریں تو ممکن ہے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

سچ بولو، اسی میں نجات ہے

تاریخ کا یہ سبق ہے کہ وہ سچ ضرور سامنے لے آتی ہے۔ نہ واقعات چھپتے ہیں اور نہ لوگوں کے کردار۔ کسی کو ضمیر کا بوجھ چین نہیں لینے دیتا اور کوئی ذاتی تعصب کی بنیاد پر اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ جو لوگ یہ تصور کئے بیٹھے ہیں کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پوری قوم متفق ہے اور صرف ایک رائے رکھتی ہے انہیں فوج کے دو ریٹائرڈ جرنیلوں جنرل شاہد عزیز اور جنرل اطہر عباس کی گفتگو کے بعد ایک دفعہ پھر سوچ لینا چاہیے کہ یہ صرف چند افراد یا گروہوں کا مسئلہ نہیں بلکہ اس جنگ میں جیسے عام آدمی دو مختلف رائے رکھتے ہیں اسی تقسیم کے اثرات تمام اداروں میں کام کرنے والوں میں بھی نظر آتے ہیں۔ پاکستان کی تاریخ کی یہ واحد کڑی ایسی ہے جسے جب مورخ لکھنے پر آئے گا تو اس کے سامنے تضادات کا انبار لگا ہو گا۔ ایسا تو افغان جہاد میں بھی نہیں ہوا تھا۔ جو اس میں حصہ لے رہے تھے یا پھر جو ان کی مدد کر رہے تھے ان میں ایک یکسوئی تھی۔ چند آوازیں تھیں جو اٹھتی تھیں اور ہر کوئی ان کے تعصب، نظریے اور مخالفت کی بنیادوں کو جانتا تھا۔ ہر کسی کو معلوم تھا کہ ان سیاسی رہنماؤں اور تجزیہ نگاروں کا ماضی کمیونسٹ انقلاب، قوم پرستی اور اسلام کے نام پر اٹھنے والی کسی بھی تحریک کی مخالفت سے وابستہ ہے۔ بلوچستان اور خیبر پختونخوا وہ ایسے علاقے تھے جو ہر دوسرے دن دھماکوں سے لرزتے تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب روسی افواج کو خوش آمدید کہنے والے اپنے مضامین میں لکھتے تھے کہ انقلاب نے پاکستان کے دروازے پر دستک دے دی ہے۔ وہ دن دور نہیں جب تاجکستان اور ازبکستان جیسے مسلمان روسی علاقوں کی طرح پاکستان سے بھی مذہب کو دیس نکالا دے دیا جائے گا۔ مخالف آوازیں تو تھیں لیکن صداب صحرا۔ ایم کیو ایم نے تو جنم ہی نہیں لیا تھا اور بلوچستان کے قوم پرست ذوالفقار علی بھٹو کے دور کے مظالم سہنے کے بعد اپنے اپنے گوشۂ عافیت میں گم تھے۔ کوئی لندن تو کوئی افغانستان۔ البتہ خیبر پختونخوا سے اسی طرح کے پالیسی بیان آتے تھے جیسے اس دور میں بھارت کے تجزیہ نگار لکھا اور سیاسی رہنما بولا کرتے تھے۔ اس بظاہر یکسوئی کے باوجود بھی تاریخ وقت گزرنے کے بعد پورا سچ ضرور سامنے لائی۔ افغان جہاد کو تجزیہ نگار کتنا بھی فساد کہہ لیں، اس نے ان تمام افراد کی تمناؤں کا خون کر دیا جو یہ سوچا کرتے تھے کہ افغانستان کے بعد، پولینڈ، یوگوسلاویہ یا ایشائے کوچک کے مسلمان علاقوں کی طرح ایک دن روسی افواج پاکستان میں بھی آدھمکیں گی اور یہ ملک بھی ایک کمیونسٹ ریاست میں تبدیل ہو جائے گا۔

اس خواب کے چکنا چور ہونے کے بعد اس ملک میں پورے دس سالوں کی ایک طویل خاموشی ہے۔ حکومتیں بنتی بگڑتی رہیں، لیکن نہ دہشت گردی کا خوف تھا اور نہ شدت پسندی کا ڈر۔ بلوچستان جیسے صوبے میں بھی عصبیت اور پنجابی استعمار کے نعرے دفن ہو چکے تھے۔ لیکن اس کے بعد ہم نے کہاں غلطی کی؟ کس جگہ بھٹکے؟ کونسا راستہ اختیار کیا کہ آج ہم لہولہان ہیں، یہ افتاد ہم پر کیسے ٹوٹی ہے۔ یہ ہے وہ بنیادی سوال جس کو حل کئے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ یہی سوال ہے جو پوری قوم کو منقسم کئے ہوئے ہے۔ اسی سوال کا جواب ڈھونڈتے ہوئے جنرل شاہد عزیز ضمیر کی خلش میں یہاں تک انکشاف کر جاتے ہیں کہ سوات میں طالبان نے معاہدہ نہیں توڑا تھا۔ بلکہ حکومت نے امریکہ کے دباؤ پر معاہدہ ختم کر کے ایکشن شروع کر دیا تھا۔ دوسری جانب جنرل اطہر عباس ہیں جو طالبان کے بارے میں اپنا مخصوص نظریہ رکھتے ہیں اور وہ فیصلے کی کمزوری کو طالبان کی طاقت میں اضافے کی وجہ سمجھتے ہیں۔ یہ دونوں نقطۂ نظر ہیں جو پوری قوم کو منقسم کئے ہوئے ہیں۔ یہی دونوں نقطۂ نظر ہیں جو ہمیں سچ بولنے سے روکتے ہیں۔ یہی دونوں نقطۂ نظر ہیں جو تعصب کی عینک سے تجزئے کرواتے ہیں۔ گزشتہ بارہ سالوں میں اس ملک میں جس چیز کی موت واقع ہوئی ہے وہ سچ ہے۔ سچ کی لاش چوراہے میں لٹکی ہوئی ہے، اور تعصب کا کوڑا پورے معاشرے پر برس رہا ہے۔

اگر تجزیہ کرنے والی آنکھیں انصاف سے کام لیں تو انہیں صرف چند سیکنڈ لگتے ہیں اس بات کی تہہ تک پہنچنے میں، کہ دہشت گردی میں امریکہ کا ساتھ دینے والوں کے نظریات، بیک گراونڈ یہاں تک کہ کسی حد تک مسلک کونسا تھا اور طالبان کے خلاف کون لوگ تھے جو مسلسل ایک ماحول بناتے رہے، اور آج اس ملک کو ایسی دلدل میں لا کر پھینکا کہ جس کا کوئی حل نہ آپریشن سے نظر آتا ہے اور نہ مذاکرات سے۔ دنیا میں کسی ایسی جنگ کا کوئی منطقی نتیجہ نہیں نکل سکتا جس نے نظریات کا لبادہ اوڑھ رکھا ہو۔ کسی ایسی کارروائی کا بھی انجام ممکن نہیں جو کسی مسلک یا عقیدے کی مخالفت اور غصہ کو اپنے ساتھ لیے ہوئے ہو۔ یہ قاعدہ اور کلیہ پوری انسانی تاریخ پر محیط ہے۔ اب اس کسوٹی پر رکھ کر اپنے ملک میں دہشت گردی کے خلاف جنگ کے حامیوں اور مخالفوں کی فہرست مرتب کر لیں تو آپ پر فرق واضح ہو جائے گا۔ اس جنگ کی حمایت میں پیش پیش آپ کو وہ سیکولر طبقات نظر آئیں گے جن کا زندگی بھر کا مقصد اسلام اور مسلمانوں کو ایک شدت پسند اور خون آشام رنگ میں پیش کرنا ہے اور انہیں اس میں لطف آتا ہے۔ ایسے لوگوں کی گزشتہ پچاس سالوں کی تحریریں اٹھا لیں وہ اسلامی تاریخ سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر مثالیں لائیں گے اور جس طرح مغرب اسلام کو بدنام کرتا رہا، ایسے وہ بھی کرتے رہے ہیں۔ دوسرے وہ مسلکی گروہ ہیں جن کی چپقلش صدیوں سے واضح ہے۔ ان کا طریق کار دوسرا ہے۔ وہ دینی تصریحات اور فتوؤں سے مخالفین کو واجب القتل قرار دیں گے۔ دوسری جانب اس شدت پسندی اور دہشت گردی کے خلاف جنگ کے مخالف جو گروہ ہیں ان میں دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو اسے عالمی استعمار کی مسلط کردہ جنگ تصور کرتے ہیں اور ہر سطح پر اس کے خلاف لڑنے کو افضل قرار دیتے ہیں۔ ان میں کچھ ریاست کو قائل کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اس سے نکل جائے تاکہ مسئلہ بہتر ہو اور دوسرے وہ ہیں جو ایسی ریاست کے خلاف بھی جنگ کو واجب قرار دیتے ہیں۔ یہ ہے وہ سچ جس کو اس ملک میں ذبح کیا گیا ہے۔ کوئی اپنے اندر کا تعصب باہر نہیں لاتا۔ سب منافقت کرتے ہیں۔ ہر کوئی چاہتا ہے کہ اس کے مخالف گروہ کو ریاست اپنی طاقت سے کچل دے۔ کسقدر دیوانگی ہے کہ کسی کو اندازہ تک نہیں کہ اس سے ہم ایک آگ کو ہوا دے رہے ہیں جس میں سب کچھ جل کر خاکستر ہو جائے گا۔ یہ تو ابھی کل کی بات ہے۔ امریکہ اور عالمی استعمار کے ساتھ مل کر عراق کی ٹوڈی حکومت جسے نمائندہ حکومت بتایا جاتا ہے، اور اس نے اپنے خلاف اٹھنے والی آواز کو فسادِ فی الارض کے فتوؤں سے دبانے کی کوشش کی۔ پانچ سال میڈیا اور دانشور عراقی حکومت کی ان کارروائیوں کو دہشت گردی اور القاعدہ کے خلاف جنگ قرار دے کر فلوجہ سے تکریت اور موصل تک آبادیوں کو تہہ تیغ کرنے کو قیام امن کی کوشش گردانتے رہے۔ یہ الفاظ بھی استعمال ہوئے کہ ان دنوں عراق اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے۔ کسی نے ان شہروں سے دربدر ہونے والے مہاجرین اور مرنے والے عام شہریوں کی داستان تک نہ لکھی۔ کہا کہ جب قوم حالتِ جنگ میں ہو تو ایسی باتیں قوم کو تقسیم کرتی ہیں۔ قوم نے تو تقسیم ہونا ہی تھا، لیکن عراق کی اس حکمت عملی نے پوری امت کو بھی تقسیم کر دیا۔ امن قائم کرنے کی اس کوشش نے ایک ایسے خوفناک گروہ "داعش" کو جنم دیا جس سے آج سب خوفزدہ ہیں۔ خوف کیوں نہ ہو۔ یہ جنگ اب اصل تعصب اور اصل چہرے بے نقاب کر رہی ہے۔ بھارت سے تین ہزار رضاکار اپنے نام لکھوا چکے۔ پاکستان کا ایک نوجوان چند دن پہلے ان کے ساتھ اپنی جان دے چکا۔ دوسری جانب داعش کے ساتھ بھی ہر ملک اور پاکستان سے بھی لوگوں کی آمد جاری ہے۔ ایک ایسا گروہ اٹھ کھڑا ہوا ہے جس سے ایران اور سعودی عرب دونوں خائف ہیں۔ ایسا گروہ جس کی آنکھوں میں انصاف اور امن نہیں صرف اور صرف انتقام ہے۔ خونریزی اور قتل جن کا ہتھیار ہے۔ لیکن اب بھی کوئی سچ نہیں بول رہا۔ اب بھی کوئی نہیں کہتا کہ ان تمام ریاستوں کو ان نظریاتی اور مسلکی تعصب سے بھرے لوگوں نے اس جنگ بھی الجھایا۔ سچ بولو، صاف گوئی سے کام لو کہ ہم سب نے مل کر اپنے مسلک، عقیدے، اور نظریے کی آگ میں اس ملک اور اس امت کو جھونک دیا ہے۔ یہ آگ بہت تیز ہے، اس کی کوئی سرحد نہیں۔ اس کو جھوٹ اور فریب کی ہوا تیز کر رہی ہے۔ سچ بولو، ورنہ انجام خوفناک ہے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

سچ کی تلاش کا راہی

رؤف کلاسرا سے میری شناسائی اتنی ہی ہے جتنی کالموں کے ایک رسیا یا ٹاک شو دیکھنے کے شوقین شخص کی ہوتی ہے۔ میری اس سے ملاقاتیں بھی اتنی ہی ہیں جتنی ایک عام آدمی اپنے کسی محبوب لکھنے والے سے بہانے بہانے' زور زبردستی سے کر لیتا ہے۔ لیکن میرا اسے پسند کرنے کا عرصہ بہت طویل ہے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب صحافی اور تجزیہ نگار فلمی اداکاروں کی طرح مقبول نہیں ہوئے تھے۔ پاکستان میں ٹیلی ویژن ٹاک شو ڈبلیو ڈبلیو ایف ریسلنگ کا بہترین متبادل ثابت ہوا۔ اس کے آنے سے پہلے چھوٹے بڑے سب شوق سے ریسلنگ دیکھا کرتے تھے۔ ہر ایک کا اپنا پہلوان ہوتا اور وہ کمرے میں بیٹھے شخص کے بلڈ پریشر سے کھیلتا رہتا۔ جب سے میرے ملک میں ٹاک شو آئے ہیں، گھروں میں شاید ہی کوئی ریسلنگ کا چینل لگاتا ہو۔ جس طرح وہاں جینڈر بیلنس کے عالمی معیار نے خواتین کی ریسلنگ کو مقبول کروایا' اسی طرح ٹاک شوز میں بھی خواتین کی مناسب نمائندگی نے ہمارا سر عالمی برادری میں بلند کر دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ خواتین کی ریسلنگ سے جتنی میرے ملک کی دقیانوسی' فرسودہ اور جاہل قسم کی خواتین نفرت کرتی ہیں، روشن خیال بلکہ عموماً ایک سو سال پرانی وضع قطع رکھنے والے مرد اسے اتنا ہی شوق سے دیکھتے اور داد دیتے ہیں۔ عین اسی طرح ٹاک شوز میں خواتین کے الفاظ کے دنگل سے خواتین نفرت کرتی ہیں، لیکن مرد حضرات ان کی تحسین کے لئے تالیاں بجا رہے ہوتے ہیں۔ لیکن میں ریسلنگ کے مقبول ترین دور میں بھی اخبار میں رؤف کلاسرا کی شرلاک ہومز اور ابن صفی کے کرداروں جیسی حیران کن حقیقی داستانوں کا رسیا تھا۔ اس زمانے میں اخبارات بڑے لیڈروں اور چھوٹے ابھرتے ہوئے رہنماؤں کے بیانات سے بھرے ہوتے تھے۔ انہی میں سے سرخیاں نکالی جاتی تھیں اور ہر لیڈر کو اس کے مقام پر رکھتے ہوئے اخبار میں جگہ دینا ایک فن تصور ہوتا تھا۔ صحافیوں کی جاسوسی زیادہ تر سرعام بوس و کنار' منشیات کے اڈوں' دادِ عیش دیتے ہوئے جوڑوں' سمگلروں' چوروں اور ڈاکوؤں کے خلاف پولیس کی کامیابی اور ناکامی تک محدود تھی۔

سرکاری بددیانتی اور کرپشن عام طور پر نعرے بازی یا سیاسی بیانات کے روپ میں نظر آتی۔ کرپشن ہماری حکومتوں اور افسران میں ہمیشہ سے موجود تھی لیکن اخبارات حکومتی اشتہارات کے اتنے مرہون منت ہوا کرتے تھے کہ ایسی خبریں شجر ممنوعہ قرار پاتی تھیں۔ سیاست دانوں کے بارے میں تو کہیں نہ کہیں خبر چھپ جاتی تھی لیکن بیوروکریسی اور پولیس کے بارے میں زبان کھولنا موت کو دعوت دینے کے مترادف سمجھا جاتا اور لکھنے والے کو موقع پر ہی ''فوری انصاف'' مہیا کر دیا جاتا۔ ایسے میں جس طرح رؤف کلاسرا اندرون خانہ کرپشن کی کہانیاں لے کر آتا وہ مجھ جیسے سرکاری ملازم کے لیے دلچسپی کا سامان لاتیں، اس لیے بھی کہ وہ سب کچھ ہم جانتے ہوتے تھے۔ ہماری بیوروکریسی کا سب سے پسندیدہ مشغلہ غیبت ہے۔ محفلوں میں ایک دوسرے کے سکینڈلز کا ذکر بیوروکریسی کا بہترین ''پاس ٹائم'' ہے۔ لیکن رؤف کلاسرا کی نظر ان سب تک کیسے جا پہنچتی ہے؟ کیا اس نے کوئی سلیمانی ٹوپی پہنی ہوتی ہے؟ کیونکہ افسر شاہی تو اپنے اردگرد کسی کو پھٹکنے نہیں دیتی۔ کبھی کبھی میں سوچتا کہ رؤف کلاسرا کو دور ہی ایسا ملا ہے جو کرپشن کے سکینڈلز کا دور ہے۔ یہ درست ہے کہ دونوں پارٹیاں ایک دوسرے کو بددیانت ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھیں، لیکن اتنی تفصیل، اتنی عرق ریزی اور سکینڈل کی تہہ تک پہنچنا اس کا کمال ہے۔ میں اس کا مداح بن چکا تھا۔ میں کبھی کبھار اس سے مل بھی لیتا لیکن میں ایسی محفلوں اور ایسے شہروں سے بہت دور بلوچستان میں بیٹھا' نوکری کرتا' ٹیلی ویژن کے لیے ڈرامے لکھتا اور شاعری کرتا تھا۔ پھر معلوم نہیں کیوں، ان تینوں چیزوں سے جی اکتانے لگا۔ نوکری تو رزق کی مجبوری تھی اور ڈی ایم جی کی نوکری چھوڑنے پر خوف تھا کہ دوست اور رشتے دار مجھے کسی ماہر نفسیات کے پاس علاج کے لیے نہ لے جائیں، اس لیے لکھنے کے لیے کالم نگاری شروع کر دی کہ شاعری اور ڈرامہ نگاری میں کھل کر سچ نہیں لکھا جا سکتا تھا۔ 2001-2002ء میں جب اے پی این ایس ایوارڈ کا اعلان ہوا تو میرے لیے بڑے فخر کی بات تھی کہ میرا نام رؤف کلاسرا کے ساتھ ایوارڈ حاصل کرنے والوں میں شامل تھا۔ ایک کہنہ مشق صحافی اور ایک نو وارد کالم نگار... ویسے رؤف کلاسرا آج بھی مجھے صحافی ماننے کو تیار نہیں، اس کے نزدیک صحافی صرف وہ ہوتا ہے جو خالصتاً صحافت سے رزق کماتا ہو۔ یہ اس کی بہت پاکیزہ خواہش ہے اور اس کے لیے پورے پاکستان میں بہت مشکل سے لوگ ڈھونڈنا پڑیں گے جن کی زندگی کا دار و مدار خالصتاً صحافت کی کمائی پر ہو اور اس میں کوئی ملاوٹ نہ ہو۔ لیکن اسے خوش کرنے کے لیے بتا سکتا ہوں کہ وہ مجھے جس قبیلے یعنی بیوروکریسی کا حصہ سمجھتا ہے وہ لوگ بھی مجھے افسر نہیں سمجھتے۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والے مجھ ایسے شخص کا یہی حشر ہونا چاہیے۔

میں یہ سب کیوں لکھ رہا ہوں؟ اس لیے کہ اس سے اپنی گزشتہ اور زندگی میں سب سے طویل ملاقات کے دوران رؤف کلاسرا نے مجھے دو کتابیں پڑھنے کو دیں۔ کتاب کا ہاتھ آنا یوں بھی خوش قسمتی کی بات ہے اور پھر اس شخص کی کتابیں جسے میں گزشتہ کئی برسوں سے اس لیے شوق سے پڑھتا آیا ہوں کہ اس کی ہر کہانی کسی طلسم ہوشربا سے کم نہیں ہوتی۔ میرے ملک میں سکینڈلز کی نوعیت ہوتی ہی ایسی ہے۔ اس کی کتابوں میں حسِ جاسوسی کا تذکرہ تو ہے ہی' لیکن اس میں ایک کمال ایسا بھی ہے جو کسی ماہر نفسیات دان اور قیافہ شناس کے کمال سے کم نہیں۔ کلاسرا بڑے لوگوں کی شخصیت کی پرتوں اور جہتوں کے ساتھ ایسے کھیلتا ہے کہ ان کے اندر کا وجود اور ضمیر کاغذ پر پُتلیوں کی طرح رقص کرتا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن دوسری کتاب اس سکینڈل کے بارے میں ہے جو لاہور ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس خواجہ محمد شریف کے خلاف قتل کی جھوٹی سازش کی کہانی ہے..... ''وہ قتل جو نہ ہو سکا''۔ یہ میرے لیے تو شاید اتنی دلچسپ نہ ہو کہ میں ان تمام کرداروں کے افعال اور شخصیتوں سے واقف ہوں اور اس سکینڈل کی بازگشت بیوروکریسی میں اکثر سنائی دیتی رہی ہے۔ لیکن اس کہانی میں ملک کے ہر سوچنے' درد رکھنے والے اور محبِ وطن شخص کے لیے عبرت کا سامان ضرور ہے۔ یہ کتاب اس راز سے پردہ اٹھاتی ہے کہ کس طرح ہماری پوری بیوروکریسی اپنے ذاتی مفاد' نوکری اور مراعات کے عوض اپنے آپ کو سیاست دانوں کی چوکھٹ پر گروی رکھ چکی ہے! ہم کس حد تک گر سکتے ہیں، اس کا اندازہ اس کتاب کو پڑھ کر ہی ہوتا ہے۔

سپریم کورٹ میں جب میں بیوروکریسی کی تطہیر کے لیے اپنی پٹیشن لے کر گیا تو جہاں قانون کی کتابوں اور عدالتوں کے فیصلوں سے میرا بیگ بھرا ہوتا وہاں یہ کتاب بھی میرے ساتھ ہوتی۔ یہ کتاب ایک ایسے المیے کی نشاندہی کرتی ہے جس نے ہمارے پورے سرکاری نظام کو کھوکھلا کر دیا ہے اور اگر اس نظام کو ٹھیک نہ کیا گیا تو سو سال بھی الیکشن ہوتے رہیں یہ ملک تنزل کا شکار رہے گا۔ رؤف کلاسرا اس تنزل کا نوحہ خواں ہے۔ وہ مجھے صحافی نہیں مانتا، مجھے اس پر کوئی گلہ نہیں۔ 'سکہ بند' مدرسے کے فارغ التحصیل علماء مولانا مودودی کو عالم نہیں مانتے تھے اور خاندانی موسیقار خواجہ خورشید انور کو عطائی قرار دیتے تھے۔ ہر پیشے کے اپنے اپنے محبتوں کے دائرے ہوتے ہیں اور اپنی اپنی فخر کی وجوہ' لیکن رؤف کلاسرا جیسے صحافی کے ہوتے ہوئے مجھے اس شعبے سے دور کے تعلق پر بھی فخر کرنا چاہیے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

سعادت حسن منٹو کے عاشقِ زار کے لیے

حرف راز
اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

منصور حلاج کو جب بازاروں میں گھسیٹا جا رہا تھا تو حکم تھا کہ ہر کوئی اس زندیق پر پتھر برسائے۔ منصور خاموشی سے یہ رسمِ ستم برداشت کر رہا تھا کہ شہر میں اس کا واقف حال دوست شبلی بھی ہجوم میں آ نکلا۔ بادشاہ کا حکم بھی موجود اور منصور کی تکلیف کا بھی خیال۔ شبلی نے ایک پھول اٹھایا اور منصور کو مارا۔ پھول کا لگنا تھا کہ منصور چیخ اٹھا' درد سے بلبلانے لگا۔ لوگوں نے پوچھا' پتھروں کی بارش میں تم خاموش رہے لیکن پھول کی چوٹ سے کیوں بلبلائے؟ کہنے لگا: شبلی تو جانتا ہے کہ میں کس حال اور کس مقام پر ہوں۔ میرے محترم صحافی اور کالم نگار جو منٹو کے عشق مسلسل کا شکار ہیں ان کا کالم بھی شبلی کا پھول ہے۔ موصوف کی عزت میرے دل میں دو وجہ سے ہے' ایک ان کی ایمانداری اور دوسری یہ کہ ان میں منافقت نہیں۔ اپنی ایک رائے رکھتے ہیں اور اس رائے کی بنیاد پر ایک دلیل بھی۔ لیکن دلیل ایسی چیز ہے جو عشق کے سامنے ہمیشہ شکست کھا جاتی ہے۔ اسی لیے موصوف نے میرے پورے کالم کے سیاق وسباق کے باوجود اپنے عنفوان شباب سے اب تک کے مستقل ممدوح منٹو کے بارے میں میرے صرف ایک فقرے پر کالم کی عمارت مسمار کر دی۔ میری ان سے ملاقاتیں بہت کم رہی ہیں اس لیے ہو سکتا ہے وہ مجھے ایک کالم نگار اور بگڑے ہوئے بیوروکریٹ سے زیادہ نہ جانتے ہوں۔ لیکن اس کالم کے پس منظر میں میری عمر کے پچاس برسوں کا مختلف النوع تجربہ اور مشاہدہ شامل تھا۔ میں نے سات سال کی عمر میں شاعری شروع کی، بارہ سال کی عمر میں میری غزل ایک موقر ادبی جریدے میں چھپی، سولہ سال کی عمر میں پہلا افسانہ میں نے حلقۂ ارباب ذوق لاہور میں پڑھا۔ 1988ء میں میرا شعری مجموعہ ''قامت'' شائع ہوا۔ اس کے بعد میں نے بیس سال ٹیلی ویژن پر ڈرامے لکھے جن میں پانچ سیریل اور پچاس سے زیادہ انفرادی ڈرامے شامل ہیں۔ میری بنیادی تعلیم نفسیاتی امراض کے علاج سے متعلق ہے۔ میں یہ مضمون پانچ سال بلوچستان یونیورسٹی میں پڑھاتا رہا ہوں اور فاؤنٹین ہاؤس جیسے ادارے کے ابتدائی کارکنوں میں شامل ہوں۔ لاہور مینٹل ہسپتال جہاں سعادت حسن منٹو علاج کے لیے داخل رہے' میں نے وہاں دو سال تربیت حاصل کی ہے۔ ایک افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار کی حیثیت سے مجھے اتنا علم ضرور ہے کہ کردار کیسے تخلیق کیے جاتے ہیں۔ کیسے ایک مولوی کے اندر شیطان صفت بھیڑیے کو ڈال کر ہر نیک صفت تہجد گزار شخص کو بدنام کیا جا سکتا ہے اور کیسے ایک قاتل، چور، ڈاکو اور طوائف کے سینے میں ایک رحم دل کردار تخلیق کر کے اس قماش کے ہر فرد کو عظمت کی بلندیوں پر سرفراز کیا جا سکتا ہے۔ اس ساری شعبدہ بازی کو حقیقت نگاری کہا جاتا ہے اور ''حقیقت نگار'' کو معاشرے میں کبھی کوئی سراپا نیک اور پارسا شخص نظر نہیں آتا اور نہ ہی کوئی سراپا بدمعاش نظر آتا ہے۔ نفسیات کا علم اس کے برعکس ہے۔ مجرمانہ ذہنیت ایک مرض ہے اور سیریل کلر، جنسی تشدد کرنے والے اور پیشہ ور قاتلوں کی شخصیت میں رحم' ترس اور انسانیت جیسی اقدار مفقود ہو جاتی ہیں۔ چھوٹے بچوں یا بچیوں سے زیادتی کرنے والوں کو میڈیکل سائنس کی تحقیقات نے بھی انسانی جذبوں سے عاری قرار دیا ہے۔ ایسے قاتلوں کے ذہنوں کے خصوصی ٹیسٹ کیے گئے اور پتا چلا کہ ذہن کے سامنے والے حصے (Frontal Lobe) میں وہ علاقے جو رحم اور ہمدردی سے متعلق ہوتے ہیں ان کی ترقی (Growth) ہی نہیں ہوئی ہوتی' یعنی وہ مجسم قاتل، چور، بدمعاش، جسم فروش ہوتے ہیں۔ یوں تو ایسی تھیوری لمبروسو (Lombroso) نے پچاس سال قبل پیش کی تھی لیکن اب تو ایک سائنسی حقیقت بن گئی ہے۔ یہی ماہرین نفسیات فحش نگاری اور فحش مواد کا جنسی جرائم کے ساتھ ایک گہرا تعلق ثابت کرتے ہیں۔ دنیا کے کسی بھی بڑے ادیب کے نفسیاتی نقش ونگار (Profile) کا مطالعہ کر لیں، آپ کو اس میں جنسی ہیجان کی سرپرستی ضرور نظر آئے گی خواہ وہ آسکر وائلڈ، موپساں یا ڈی ایچ لارنس ہی کیوں نہ ہو۔ میں نے مینٹل ہسپتال میں ڈاکٹر عزیز مرحوم کے پاس منٹو کی فائل میں مشہور Inkblock ٹیسٹ کا رزلٹ بھی دیکھا ہے۔ آپ کے ممدوح کو ان تصویروں میں صرف جنسی افعال اور جنسی اعضا ہی نظر آئے تھے۔ یہ کوئی ایسی بری بات بھی نہیں۔ ہمارے جیسے کچلے ہوئے ماحول میں بہت سے کامیاب لوگوں میں بھی یہ علامات ہوتی ہیں لیکن جب ایک مصنف ایسے نفسیاتی رجحان کا مالک ہوتا ہے پھر وہ ''بلاؤز'' ''پھاہا'' ''بو'' ''بری لڑکی'' اور ''شاداں'' جیسے افسانے تحریر کرتا ہے۔ مجھے ایسے افسانے تحریر کرنے پر بھی کوئی اعتراض نہیں کہ یہ ایک ادیب کا بنیادی حق ہے کہ وہ جیسے کردار چاہے منتخب کرے اور جیسے چاہے تخلیق کرے۔ میرا تو سارا مدعا یہ تھا کہ فحاشی کی لت ہمیشہ ایسے ہی افسانوں سے آغاز کرتی ہے۔ کچھ آپ جیسے مضبوط کردار کے لوگ ہوتے ہیں جو بعد میں اور مزید کی خواہش نہیں کرتے لیکن بہت کمزور نفسیاتی میلان کے حامل بھی ہوتے ہیں جو منٹو کے بہت سے بے ضرر فقروں سے بھی ہیجان میں مبتلا ہو جاتے ہیں، خود لذتی کی منزلوں سے گزرتے ہوئے مستقل فحش مواد کے قاری اور پھر ان فلموں کے رسیا بن جاتے ہیں۔ ان سارے تجربوں سے وہ رجحان جنم لیتا ہے جو انہیں پاگل پن کی اس حد تک لے جاتا ہے جہاں نہ انہیں معصوم بچی کی چیخیں سنائی دیتی ہیں اور نہ قتل کرتے ہوئے انہیں رحم آتا ہے۔ میں یہاں منٹو کی ہزاروں ایسی لائنیں لکھ سکتا ہوں جو فحاشی سے تعلق کا پہلا زینہ بنتی ہیں اور پڑھنے والوں کی نظر میں' عورت صرف اور صرف ایک جسم بن کر رہ جاتی ہے۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر فیصلہ کیجیے' کیا ''بلاؤز'' افسانہ پڑھ کر آپ کے ذہن میں عورت کی کونسی محترم تصویر ابھرتی ہے۔

مصنف فحش لکھے یا اخلاق سے آراستہ کہانی یہ اس کا مسئلہ ہے لیکن میرا اور اس دنیا کے ہر اس شخص کا جو دنیا کو جنسی زیادتیوں اور بیماریوں سے پاک دیکھنا چاہتا ہے اس کا مسئلہ یہ ہے کہ ایسا لٹریچر اور مواد کب اور کس عمر میں پڑھنا چاہیے اور کون سا مواد ہے جو مکمل فحش ہے۔ میرے والد کی لائبریری میں تین کتابیں ایسی تھیں جو ہم بچوں کی دسترس سے اوجھل رکھی گئی تھیں۔ ایک مولانا روم کی مثنوی کا ''دفتر پنجم'' دوسری غوث علی شاہ قلندر کی ''تذکرہ غوثیہ'' اور تیسری شیخ سعدی کی ''گلستان''۔ یہ تینوں کتابیں انتہائی معزز اور محترم صوفیائے کرام کی تحریریں ہیں لیکن چند حصوں میں فحش نگاری کی وجہ سے میرے والد نے ان پر پابندی عائد کر دی تھی۔ یہ ہے وہ احتیاط جو ہر نفسیات دان اور انسانوں کا خیر خواہ ہر معاشرے، فرد اور خاندان سے چاہتا ہے۔

آپ منٹو سے عشق کریں کہ وہ ایک جاندار ادیب ہے اور آپ کا کردار بھی مضبوط ہے کہ آپ منٹو پڑھنے سے آگے کی منزلیں طے کرنے سے رک گئے لیکن اس معاشرے میں بہت سے کمزور، مجبور اور بے کس لوگ بھی ہوتے ہیں جو اگر اس راہ پر چل پڑیں تو ان کا انجام جنسی تشدد' جنسی قتل اور آبرو ریزی کی تاریک منزل ہوتی ہے۔ اصل مسئلہ فحاشی کو روکنا ہے اور اس پر اس وقت دنیا کا ہر ماہرِ جرمیات' نفسیات اور سماجیات اس امر پر متفق ہے۔ مٹھائی کتنی بھی مزیدار سہی' شوگر کے مریض کے لیے زہرِ قاتل ہے۔ فحش نگاری کس قدر دلچسپ اور رنگین سہی ہیجان زدہ معاشرے کے لیے زہرِ قاتل ہے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

صنم خانے کے مکین کا ملتِ اسلامیہ کو انتباہ

حرف راز
اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

جس ملک کا یہ سچا اور کھرا شخص 26 جون 2012ء کو مسلمانوں کے خلاف ہونے والی مغرب کی سازشوں سے پردہ اٹھا رہا تھا، اسی ملک نے جنگ عظیم اوّل کے بعد عالمی طاقتوں کے ساتھ مل کر مشرق وسطیٰ میں ایک چھوٹا سا ملک اس طرح تخلیق کیا تھا کہ اس میں ہر وقت فساد اور کشت و خون کا ہولناک سلسلہ جاری رہے۔ آزاد کرنے سے پہلے اس کا آئین مرتب کیا گیا جس میں صدارت کا حقدار انتہائی مختصر اقلیت سے تعلق رکھنے والا عیسائی، وزیر اعظم سنی مسلمان اور سپیکر کا عہدہ شیعہ مسلمان کے لیے وقف کیا گیا۔ یہ ملک لبنان ہے جس کی سرحدیں اسرائیل کے ساتھ ملتی ہیں۔ اسی ملک میں فلسطینی مہاجرین آج بھی صابرہ اور شطیلہ کے کیمپوں میں بدترین زندگی گزار رہے ہیں۔ اس ملک نے کئی دہائیاں کشت و خون اور جنگ و جدل میں گزارے۔ آج سے دو سال قبل برطانیہ کے زیر تسلط سکاٹ لینڈ کے شہر ڈنڈی میں پیدا ہونے والا جارج گیلوے اسی ملک کے شہر بیروت میں مسلم امت کو آگاہ کر رہا تھا کہ ایک طوفان تمہاری جانب بڑھ رہا ہے جسے پوری مغربی دنیا نے ایک سوچے سمجھے منصوبے سے تیار کیا ہے۔ ساٹھ سالہ جارج گیلوے یکم مئی 1987ء سے برطانوی پارلیمنٹ کا رکن چلا آ رہا ہے اور اس نے مغرب، یہودی صیہونیت، امریکی استعمار اور نام نہاد لبرل سیکولر میڈیا کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر رکھا ہے۔ لبرل سیکولر میڈیا کا یہ دستور ہے کہ جب وہ کسی شخص کے کردار میں کوئی خامی تلاش نہ کر سکے، اس کی گفتگو اور دلائل کے سامنے اس کی زبانیں گنگ ہو جائیں تو پھر وہ بے بنیاد اور جھوٹے الزامات کا آغاز کر دیتا ہے، گالی گلوچ پر اتر آتا ہے اور مخالف کو بدکردار و بددیانت ثابت کرنے کی مہم کا آغاز کر دیتا ہے۔

اس شخص نے 1991ء میں عراق پر امریکی حملے کی مخالفت سے مغرب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا شروع کی۔ جب اس جنگ کے بعد عراق پر پابندیاں لگیں تو اس نے مریم اپیل (Mariam Appeal) کے نام پر ایک مہم کا آغاز کیا جس کا مقصد عراق کے عوام کو دوائیاں، طب کا سازوسامان اور طبی امداد پہنچانا تھا۔ یہ مہم اس بچی کے نام سے منسوب کی گئی جسے جارج گیلوے عراق سے خون کے کینسر کے علاج کے لیے برطانیہ لایا تھا۔ گیارہ ستمبر کے واقعے کے بعد اس نے جنگ بند کرو اتحاد (Stop the war Coalition) کا آغاز کیا اور تقریروں، جلسوں اور جلوسوں کا سلسلہ شروع کیا۔ اس نے اپنے ایک انٹرویو میں برطانوی فوجیوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ ٹونی بلیئر کے غیر قانونی احکامات ماننے سے انکار کر دیں اور عراق پر حملہ نہ کریں۔ اسے برطانیہ کا غدار کہا گیا۔ اس کی لیبر پارٹی نے اسے پارٹی سے نکال دیا۔ جب سات جولائی 2005ء کو لندن کے مشہور دھماکے ہوئے تو اس نے کہا کہ یہ مسلمانوں کے اندر پائے جانے والے اس غصے اور نفرت کا نتیجہ ہیں جو برطانوی حکومت کی عراق اور افغانستان میں جنگ اور قتل و غارت کی پالیسی سے پیدا ہوا ہے۔ اس نے صیہونیت کو دنیا کے لیے سب سے بڑا خطرہ قرار دیا۔ اس نے کہا کہ صیہونیت کے علمبردار مغربی ممالک ہیں اور وہ یہودیوں کو استعمال کر رہے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے ملکوں سے یہودیوں کو ایک ریوڑ سمجھ کر بھگایا اور اسرائیل کی صیہونی حکومت قائم کی۔ امریکی ریڈیو کے مشہور براڈکاسٹر ایلکس جونز کو اس نے ستمبر 2005ء میں صیہونیت کے بارے میں انہی خیالات پر مبنی انٹرویو دیا تو ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔ اس کے خلاف صیہونی میڈیا متحد ہو گیا۔ جب اسرائیل نے 2008-09ء میں غزہ کا محاصرہ کیا اور وہاں کے عوام گندم کے دانے دانے کو ترسنے لگے تو وہ 120 گاڑیوں کا قافلہ لے کر غزہ پہنچ گیا۔ ان میں 12 ایمبولینسیں، خوراک، کھلوں کا سامان، دوائیں اور بچوں کے کھلونوں سے بھرے ٹرک شامل تھے۔ یہ قافلہ بلجیم، فرانس، سپین، مراکش، الجزائر، تیونس اور مصر سے ہوتا ہوا پانچ ہزار میل کا سفر طے کر کے غزہ پہنچا۔ 2009ء میں کینیڈا نے اس کے داخلے پر پابندی لگا دی اس لیے کہ کینیڈا نے فلسطین میں الیکشن جیتنے والی سیاسی پارٹی حماس کو دہشت گرد گروہ قرار دیا تھا۔

صیہونی، لبرل اور سیکولر میڈیا نے اس کے خلاف مہم کا آغاز کیا تو سب سے پہلے ڈیلی ٹیلیگراف نے 22 اپریل 2003ء کو اسے "تیل برائے خوراک" پروگرام سے تین لاکھ پچھتر ہزار پونڈ حاصل کرنے کا ملزم ٹھہرایا۔ جارج گیلوے عدالت گیا، ڈیلی ٹیلیگراف کے تمام کاغذات جعلی نکلے اور انہوں نے گیلوے کو ایک لاکھ پچاس ہزار پونڈ ہرجانہ ادا کیا۔ ڈیلی ٹیلیگراف کی خبر کے تین دن بعد 25 اپریل 2003ء کو "کرسچین سائنس مانیٹر" نے الزام لگایا کہ جارج گیلوے نے عراق کی حکومت سے ایک کروڑ ڈالر لیے ہیں۔ اس وقت تک گیلوے ٹیلیگراف کے خلاف عدالت جا چکا تھا۔ اپنی رپورٹ کے خلاف 20 جون کو کرسچین سائنس مانیٹر نے ایک خبر شائع کی کہ جو دستاویزات انہیں ملیں وہ اعلیٰ سطح کی جعل سازی تھی، لیکن گیلوے نہ مانا اور کہا کہ یہ میری عزت کو نقصان پہنچانے کی سازش ہے۔ وہ عدالت چلا گیا اور اخبار نے اس کو بیرون عدالت ہرجانہ ادا کر کے معاملہ ختم کرایا۔

جارج گیلوے سچائی کی ایک تاریخ ہے۔ اقبال کے اس مصرعے کی تفسیر کہ "پاسبان مل گئے کعبے کو صنم خانے سے"۔ اس شخص نے آج سے اٹھارہ ماہ قبل بیروت میں مسلم امہ کو خبردار کرتے ہوئے کہا تھا: "برطانوی پارلیمنٹ کے ان ارکان نے، جنہیں یہ تک علم نہیں کہ عالمی نقشے میں سعودی عرب نام کا ملک کہاں واقع ہے، گزشتہ ایک سال سے مجھ سے پوچھنا شروع کیا ہے، خصوصاً چند ہفتے پہلے زیادہ زور سے پوچھتے ہیں کہ حجاز کون سا علاقہ ہے اور نجد کون سی سرزمین؟ میں حیران ہو گیا کہ یہ نام انہیں کہاں سے پتہ چلے۔ انہوں نے اچانک یہ سب کیسے سیکھا اور کس لیے سیکھا، اس لیے کہ وہ بہت پہلے سے اس بات پر غور کر رہے تھے کہ سعودی عرب کو کیسے تقسیم کیا جائے اور اس کے مشرقی علاقوں میں بسنے والے شیعہ حضرات کو کیونکر یقین دلایا جائے کہ ہم ان کے لیے علیحدہ ملک حاصل کرنے میں مدد دے سکتے ہیں؟ انہیں کیسے باور کرایا جائے کہ ساری تیل کی دولت تمہارے علاقے میں ہے اور ہمیں مکہ اور مدینہ میں کوئی دلچسپی نہیں۔ میری بات پر یقین کیجیے کہ مغرب کو مکہ اور مدینہ عربوں اور مسلمانوں کے پاس رہنے پر کوئی اعتراض نہیں، ان کی دلچسپی صرف سعودی عرب کے تیل میں ہے اور جب وہاں بے چینی کی کیفیت پیدا ہو گی تو آپ دیکھیں گے کہ اچانک پورے مغرب کے دل میں شیعہ اقلیت کے لیے ایک نئی محبت جاگ چکی ہو گی۔ اب یہ سب شروع ہو چکا ہے اور آپ جلد سنیں گے کہ مغرب یہ پروپیگنڈا کرے گا کہ سعودی عرب کے مشرقی صوبوں میں شیعہ حضرات پر ظلم ہو رہا ہے۔ آپ کے سامنے سکینڈل منظر عام پر آئیں گے کہ ان پر شدت پسند حکمرانی کر رہے ہیں۔ یاد رکھو، اس طرح کی تقسیم میں کوئی ملک بھی محفوظ نہیں رہے گا۔ یہ ساری مسلم دنیا کو لپیٹ میں لے لے گا اور اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟ اس وقت 23 عرب ممالک کی جگہ 33، 43 یا 63 ممالک وجود میں آئیں گے۔ یہ ملک نہیں ہوں گے چھوٹی چھوٹی امارتیں ہوں گی، بالکل ویسی امارتیں جیسی لیبیا پر نیٹو حملے کے بعد بن رہی ہیں۔ یہ سب ان مغربی طاقتوں کے مفاد میں ہے کیونکہ وہ اس طرح عربوں کو تقسیم کر کے مزید سو سال ان پر حکومت کر سکتی ہیں"۔

دو سال پہلے کی گئی یہ باتیں آج حقیقت بنتی جا رہی ہیں۔ اس حقیقت کو سچ بنانے میں جو لوگ ممد و معاون ہیں وہ ہمارے مذہبی رہنما ہیں۔ ایک مسلک کے لوگ چاہتے ہیں کہ شام میں گلی گلی لڑائی ہو اور ملک تباہی کی جانب بڑھے، دوسرے وہ جو سعودی عرب، کویت اور بحرین میں یہی حالات پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ کوئی عراق میں اس جنگ کو ہوا دے رہا ہے تو کوئی ایران میں۔ یہ بات ایک حقیقت ہے کہ عرب ممالک میں غیر نمائندہ حکومتیں ہیں۔ ان کی جگہ عوام کی نمائندہ حکومت ہونی چاہیے۔ یہ جو مسجدوں، مدرسوں اور امام بارگاہوں میں چودہ سو سال سے قرآن و حدیث پڑھتے اور پڑھاتے آئے ہیں، انہوں نے یہ کہاں سے سیکھا ہے کہ پوری امت ریاستوں میں تقسیم کی جائے۔ کیا ان ملکوں کی حدود اللہ اور اس کے رسولؐ کی شریعت میں شامل ہیں؟ یہ اس امت کو ایک امت ہونے کا درس کیوں نہیں دیتے؟ جن لوگوں نے مغرب میں آج سے کئی دہائیاں پہلے ایک یورپی یونین کا خواب دیکھا تھا اس وقت دنیا اسے دیوانے کی بڑ سمجھتی تھی، آج یورپی یونین ایک حقیقت ہے۔ ہمارے علماء تو اتحاد کا خواب بھی نہیں دیکھتے۔ جہاں ایک مسلک کا ظالم حکمران ہے اس مسلک والے اُس کی حمایت کرتے ہیں اور جہاں دوسرے مسلک کا ظالم حکمران ہے وہاں اس مسلک والے اس کے حامی بن جاتے ہیں، لیکن شاید یہ نہیں جانتے کہ مسلکی منافرت کی آندھی میں جبہ و دستار ہوا میں اڑتے ہیں اور عمامے خون میں رنگین ہو جایا کرتے ہیں۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

سرکش گھوڑا

تقریباً ایک سو سترہ سال قبل پوری دنیا پر حکومت کرنے کا منصوبہ ان لوگوں کی نظر میں ایک خواب نہیں تھا بلکہ ایک حقیقت تھی' جسے ایک دن پورا ہونا تھا۔ایک ہزار سال تک دنیا بھر میں دربدر رہنے والی اس قوم کے تین سو کے قریب دانشور، مفکر، فلسفی اور ان کے مذہبی پیشوا، جنہیں ''ربّی'' کہا جاتا ہے' سوئٹزرلینڈ کے شہر ''بال'' میں جمع ہوئے۔ان دانشوروں کا ہدف صرف ایک تھا کہ اس دنیا پر محسوس اور غیر محسوس طریقے سے کیسے مکمل طور پر اختیار حاصل کرنا ہے۔ان سب نے مل کر ایک حکمتِ عملی ترتیب دی جسے آج کی دنیا ''پروٹوکولز'' "Protocols of the Elders of Zion" کے نام سے جانتی ہے۔یہ ایک خفیہ دستاویز تھی جس کا ایک نسخہ خفیہ تنظیم فری میسن کی ایک اعلیٰ عہدیدار خاتون کے گھر سے چوری ہو گیا اور 1902ء میں اس کے کچھ حصے روس کے دو اخباروں نے شائع کر دیے۔اس کے بعد 1905ء میں یہ کتابی شکل میں سامنے آ گئی۔اس سے قبل 1903ء میں اس کتاب کے مختلف زبانوں میں ترجمے بھی ہو چکے تھے۔جب یہ دستاویز منظرِ عام پر آئی تو عام طور پر لوگ اسے دیوانے کا خواب سمجھتے تھے۔کچھ بڑے بڑے عیسائی پادری اسے عیسائیت کے خلاف ایک سازش بھی گردانتے تھے۔آج تک ان پروٹوکولز کے بارے میں بحث جاری ہے۔کوئی اسے یہودیوں کے خلاف ایک سازش قرار دیتا ہے کہ اس کو بنیاد بنا کر ان کا یورپ اور خصوصاً جرمنی میں قتلِ عام کیا گیا، کیونکہ جب جرمنی کا جمہوری رہنما ''ہٹلر'' عوام کی واضح اکثریت سے جیت کر برسرِاقتدار آیا تو 1933ء میں اس نے اس دستاویز کو جرمنی کے سکولوں میں پڑھانے کے لیے لازمی قرار دے دیا،لیکن اس سے مختلف ایک رائے یہ ہے کہ یہودیوں نے ایک ہزار سال کی دربدری سے تنگ آ کر اپنے دفاع کے لیے اکٹھے ہونے اور دنیا پر حکومت کرنے کے خواب دیکھے اور ان کی تعبیر ڈھونڈی۔عموماً کہا جاتا ہے کہ یہ اجلاس 1896ء یا 1897ء میں منعقد ہوا تھا، جس میں دنیا پر محسوس اور غیر محسوس طریقے سے غلبے کا خواب یا حکمتِ عملی مرتب کی گئی تھی اور طے کیا گیا تھا کہ ایک سو سال کے اندر ہم نے اپنے ہدف کو پورا کر لینا ہے۔آج کی دنیا یعنی سو سال بعد 1996ء یا 1997ء کی دنیا ہم سب کے سامنے ہے اور تھوڑی سی سمجھ بوجھ رکھنے والا شخص بھی کتنی آسانی سے اس بات کا اندازہ لگا سکتا ہے کہ آج پوری دنیا پر ایک غیر محسوس اور محسوس دونوں طریقے سے یہود کا قبضہ مکمل ہو چکا ہے۔اس لیے وہ تصور کہ یہ دستاویز جعلی اور من گھڑت تھی اور اسے روس اور جرمنی کے یہود دشمن طبقات نے ان کے قتلِ عام کا بہانہ بنانے کے لیے تیار کیا تھا، اب دم توڑ چکا ہے اور آج کی دنیا اس بات پر تحقیق کر رہی ہے کہ یہ منصوبہ ساز ذہن کس بلا کے تھے اور انہوں نے ایک طویل مدتی حکمتِ عملی کو کیسے قابلِ عمل بنایا اور کس طرح اس پر عمل درآمد کیا۔اس دستاویز میں کل چوبیس پروٹوکول ہیں۔ہر ایک پروٹوکول ایک علیحدہ شعبے کے بارے میں علیحدہ دستاویز ہے۔پہلا پروٹوکول بنیادی نظریے کی وضاحت کرتا ہے اور دوسرا پروٹوکول اس حکمتِ عملی کی بنیادی تصویر (Outline) بتاتا ہے اور ان اداروں کا ذکر کرتا ہے جن کو ہاتھ میں لے کر دنیا کا اقتدار حاصل کرنا ہے۔اس دوسرے پروٹوکول میں سب سے زیادہ ذکر پریس اور میڈیا کا ہے۔اس کے الفاظ یہ ہیں:

''آج کے دور میں ریاستوں کے پاس ایک ایسی قوت ہے جو لوگوں کے ذہنوں میں خیالات پیدا کرتی اور انہیں آگے بڑھاتی ہے۔یہ پریس کی قوت ہے۔پریس کا اصل کردار یہ ہے کہ ناگزیر ضروریات کی نشاندہی کرتا ہے، عوام کی شکایات اور تکالیف کو سامنے لاتا ہے۔یہ بے اطمینانی اور بے چینی کی فضا بھی پیدا کرتا ہے اور اس کی تشہیر بھی کرتا ہے۔یہ پریس ہی تو ہے جس کے ذریعے آزادیٔ تقریر کا عملی اظہار ہوتا ہے۔غیر یہودی ریاستیں چونکہ اس طاقتور حربے کے استعمال سے ناآشنا اور بے بہرہ ہیں، لہٰذا یہ طاقت کلی طور پر ہمارے ہاتھ آ چکی ہے۔پریس کی وجہ سے ہم خود پسِ پردہ رہ کر غیر یہود عوام پر اثر انداز ہوتے ہیں۔اسی کے ذریعے ہم سونے جیسی قیمتی دھات پر قابض ہوئے ہیں۔یہ الگ بات ہے کہ اسے حاصل کرنے کے لیے خون اور آنسوؤں کے سمندر سے گزرنا پڑا ہے، اپنے بہت سے عزیزوں کی قربانی دی ہے، لیکن اس سے ہمیں بے بہا فائدہ بھی پہنچا ہے۔یاد رکھیے کہ ہمارا ہر فرد ظلم و ستم کا نشانہ بنا ہے۔خدا کی نظروں میں ہمارا ایک فرد ہزار غیر یہودی افراد کے برابر ہے''۔

میڈیا اور اس کے ذریعے دنیا کی تسخیر ایک ذریعہ ہے جسے پروٹوکول کے ابتدائیہ ہی میں تسلیم کر لیا گیا تھا۔لیکن بارھواں پروٹوکول مکمل طور پر پریس کی طاقت اور قوت کے استعمال کے بارے میں تحریر کیا گیا ہے۔یہاں اس باب میں درج اہم سطور دیکھیے اور حیران رہ جایئے کہ ایک صدی پہلے دیکھا جانے والا یہ خواب اب کیسے حقیقت بن چکا ہے: ''ہم میڈیا کے سرکش گھوڑے پر سوار ہو کر اس کی باگ کو اپنے قبضے میں رکھیں گے، ہم اپنے دشمنوں کے قبضے میں کوئی ایسا موثر اور طاقتور اخبار نہیں رہنے دیں گے کہ وہ اپنی رائے کو موثر ڈھنگ سے لوگوں کو بتا سکیں اور نہ ہی ہم ان کو اس قابل چھوڑیں گے کہ ہماری نگاہوں سے گزرے بغیر کوئی خبر لوگوں تک پہنچ سکے۔ہمارے قبضے میں ایسے اخبارات و رسائل ہوں گے جو مختلف گروہوں کی تائید و حمایت حاصل کریں گے۔خواہ یہ جماعتیں جمہوریت کی علمبردار ہوں یا انقلاب کی داعی۔حتیٰ کہ ہم ایسے اخبارات کی بھی سرپرستی کریں گے جو انتشار و بے راہ روی، جنسی و اخلاقی انارکی یہاں تک کہ ظالم و جابر حکومتوں اور ڈکٹیٹروں اور آمروں کا دفاع اور حمایت کرتے ہوں گے۔ہم اس انداز اور اسلوب سے خبروں کو پیش کریں گے کہ قومیں اور حکومتیں ان کو قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں گی۔ہم یہودی ایسے دانشوروں، ایڈیٹروں اور نامہ نگاروں کی حوصلہ افزائی کریں گے جو بدکردار ہوں اور خطرناک مجرمانہ ریکارڈ رکھتے ہوں۔ہم ذرائع ابلاغ کو خبر رساں ایجنسیوں کے ذریعے کنٹرول کریں گے۔ہم دنیا کو جس رنگ کی تصویر دکھانا چاہیں گے وہ پوری دنیا کو دیکھنا ہو گی''۔

ان اہداف پر غور کریں اور پھر آج دنیا بھر کے میڈیا پر ایک نظر دوڑائیں تو آپ کو یہ بات سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی کہ یہ تمام اہداف حاصل ہو چکے ہیں۔اس وقت دنیا کا 97 فیصد میڈیا تین بڑی کمپنیوں کی ملکیت ہے اور یہی میڈیا باقی چھوٹے چھوٹے میڈیا ہاؤسز کا رخ متعین کرتا ہے۔آج کا دور وہ زمانہ ہے کہ سید الانبیاء ﷺ نے جس کے بارے میں خبر دی تھی، وہ دور کہ جس کے بارے میں آپ کے فرمان کے مطابق اسلام اجنبیت میں چلا جائے گا۔صحیح مسلم کی اس حدیث حسن کے الفاظ یہ ہیں: حضرت عبداللہ ابن عمر نے نبی کریم ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہوئے فرمایا کہ ''اسلام کی ابتداء بھی اجنبیت کی حالت میں ہوئی تھی اور عنقریب دوبارہ اجنبیت کی حالت کی طرف لوٹے گا''۔یہ اجنبیت کیوں ہے؟ یہ بے نام و نشاں ڈیڑھ ارب سے زیادہ مسلمان کس لیے دربدر ہیں؟ اس لیے کہ آج کے دور کے سرکش گھوڑے کی لگامیں ان کے ہاتھ میں ہیں جو ہمیں روندنے کا عزم رکھتے تھے اور اسے پورا کر رہے ہیں۔لیکن یہ ڈیڑھ ارب سے زیادہ بے نام و نشاں مسلمان اس سرکش گھوڑے کی ٹاپوں تلے مسلے جانے کے بعد بھی اسی گھوڑے سے توقع رکھتے ہیں، اسی سے گلہ کرتے ہیں، اسی کو کہتے ہیں کہ ہمارا سچ بھی دکھاؤ۔ایسا نہیں ہو گا، ہرگز نہیں ہو گا۔یا تو اس سرکش گھوڑے کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لو یا پھر اس کے مقابل اپنا ''اسپِ تازی'' لے کر میدان میں نکلو۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

سروں کی فصل پک چکی!

حرف راز
اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

یہ قوم متحد کیوں نہیں ہوتی، اس قوم کو متحد کون نہیں ہونے دیتا۔ جس قوم کو گزشتہ ساٹھ سالوں سے اس کے دانشوروں، سیاسی رہنماؤں اور مذہبی لیڈروں نے ابہام اور کنفیوژن کے سوا کچھ نہ دیا ہو' نفرتوں کے سیلاب کی لہروں پر اپنے اقتدار اور اپنی مقبولیت کی کشتیاں چلائی ہوں' پوری قوم کو رنگ، نسل، زبان، علاقہ اور مسلک کی بھٹیوں میں جھونکا ہو' آج یہ سب کے سب اس قوم سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ یک جان ہو جائے، وہ بھی اس میڈیا کے کہنے پر' جس نے اس قوم کو گزشتہ دس سالوں میں ہیجان میں مبتلا کرنے کے سوا کوئی کام نہیں کیا' ایسے ایسے سوال اٹھائے جس پر یہ قوم مدتوں سے متفق تھی۔ ایسے تمام لوگ جو کل تک پاک فوج کے جرائم کی فہرستیں پیش کرتے تھے، ان کے خلاف چارج شیٹیں سنا کر لمبے لمبے ٹیلی ویژن پروگرام کرتے تھے، جو اسے پاکستان میں تمام خرابیوں کی جڑ گردانتے تھے' جو اس کی افغان پالیسی کو اس ملک میں خون خرابے کا ذمہ دار سمجھتے تھے' ان سب نے گزشتہ کئی سالوں سے اس قوم کے ذہنوں میں یہ زہر بڑی محنت سے انڈیلا' لیکن کس قدر سادہ ہیں وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ نفرت کا بیج بونے والے دانشور، سیاست دان اور مذہبی لیڈر اس قوم کو ایک پلیٹ فارم پر متحد کر سکیں گے؟ ایک نقطے پر جمع کر لیں گے؟ لوگ ان کی بات پر یقین کر لیں گے؟ لوگ جو مضطرب ہیں، پریشان ہیں، خوفزدہ ہیں' جن کا فشارِ خون گزشتہ دس سالوں سے مسلسل روگ بن چکا ہے۔ شام ڈھلے ٹیلی ویژن کی جو کھڑکی سکون بخشتی تھی، اب آگ اگلتی ہے۔ ہم نے آزادیِ اظہار کی فصل میں نفرتوں کے جو کانٹے بوئے اور جو کنفیوژن اور ابہام کے جنگل کھڑے کیے ہیں' ان سے اس ملک کا چہرہ کانٹوں بھرا اور تاریک ہو چکا ہے۔ لوگوں کے دماغ ماؤف ہیں اور دل پژمردہ اور افسردہ۔ جو لوگ اس سارے بحران کے ذمہ دار ہیں' ان پر عوام کا اعتماد کب کا اٹھ چکا۔ انہیں کسی پر اعتبار نہیں' نہ کسی لیڈر پر' نہ دانشور پر، نہ کسی تبصرہ نگار پر اور نہ اینکر پرسن پر۔ یہ قوم اب ان سب سے خوفزدہ ہو چکی ہے۔ وہ بادل نخواستہ سنتی ہے اور روز مایوسی کی دلدل میں ڈوب جاتی ہے۔ کیا ان لوگوں کی بات دلوں پر اثر کرے گی؟ کس قدر خام خیالی ہے، کس قدر خوش کن توقعات ہیں۔

یہ قوم کس قدر سادہ اور معصوم تھی۔ اس ملک کی تخلیق کے ہنگاموں میں قافلے جب لٹے پٹے اس سرزمین پر پہنچتے تھے تو ان میں اکثر وہ ہوتے جو اپنے پیاروں کو قربان کر کے آئے تھے، جن کے ماں باپ، بہن بھائی اور بچے ان کے سامنے ذبح کر دیے گئے تھے' لیکن وہ اس زمین پر پہنچتے ہی سجدہ ریز ہو جاتے، اللہ کا شکر ادا کرتے۔ دس لاکھ لوگ اس ایک لکیر کی خاطر قربان ہوئے جو برصغیر کو اس لیے تقسیم کر گئی کہ اس کے ایک جانب کلمہ طیبہ پڑھنے والے لوگ آباد ہوں گے' لیکن اس ملک کے دانشوروں نے سب سے پہلی بحث ہی یہ چھیڑی کہ یہ ملک اسلام کے لیے نہیں معاشی مفادات کے لیے تخلیق ہوا تھا۔ آغاز سے لے کر آج تک ان شہیدوں کے خون سے مذاق جاری ہے جنہوں نے گھر بار صرف اس لیے چھوڑے کہ وہ کلمہ طیبہ پڑھتے تھے' ورنہ ان کے دادا پڑدادا ایک تھے۔ یہ ایک جیسا لباس پہنتے تھے، ایک جیسے گیت گاتے تھے، ایک ہی مارکیٹ یا کھیت میں کام کرتے تھے، ایک جیسا رہن سہن اور خوراک تھی' لیکن اب ان کے ساتھ مدتوں سے رہنے والے ہی انہیں یا تو قتل کر رہے تھے یا پھر انہیں ایک ایسے ملک کی جانب دھکیل رہے تھے جہاں ان کے ہم مذہب رہتے ہیں۔ اس طرف رہنے والوں کے بھی خواب تھے۔ کسی نے یہ نہ سوچا تھا کہ ہم جو پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی یا بنگالی بولنے والے، اپنے اپنے کلچر اور اپنی اپنی زبان اور علاقے کی وجہ سے ایک ہو جائیں، ایک جذب و مستی کا عالم تھا کہ ہم یہ سب نہیں بلکہ ہماری پہچان ہمارا مسلمان ہونا ہے۔ اس پہچان کا مذاق اس ملک کے قیام سے لے کر آج تک اڑایا جا رہا ہے۔ جس قائداعظم کی کوششوں اور نظریے کی بنیاد پر یہ ملک وجود میں آیا، لاکھوں لوگ بے گھر ہوئے، ہزاروں عصمتیں لٹیں، لاکھوں شہید ہوئے اس شخص کو سیکولر بنا کر شہیدوں کی روحوں کا مذاق اڑایا جاتا رہا اور آج تک اڑایا جا رہا ہے۔ جب تک یہ نسل زندہ تھی ان دانشوروں کا پھیلا ہوا ابہام مؤثر نہ ہو سکا، لیکن آج کی نسل کو جس طرح تخلیقِ پاکستان کے مقاصد کے بارے میں مسلسل ابہام کا شکار کر کے تقسیم کیا جاتا رہا' کوئی ان لوگوں کے اتحاد کے نعرے پر یقین کرے گا؟ پوری قوم کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کے بعد انہیں ایک ہونے کے درس پر کون بھروسہ کرے گا؟

پوری قوم کو اپنے دوہرے معیار سے جن لوگوں نے سالوں خلجان میں مبتلا رکھا، وہ لوگ اب کہتے ہیں کہ اصولی موقف پر متحد ہو جاؤ۔ روس کے خلاف جنگ حرام، امریکہ کے حق میں مسلمان بھائیوں کے خلاف جنگ حلال۔ مشرقی پاکستان، کراچی، سندھ، بلوچستان میں آرمی ایکشن ظلم، طالبان کے خلاف ضروری ہے، دوہرے معیار کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں: صوبائی حقوق کے مطالبات اور ان کے لیے ہتھیار اٹھا کر پہاڑوں پر چڑھنا' شناختی کارڈ دیکھ کر قتل کرنا' اغواء برائے تاوان' زبان کے نام پر فسادات وغیرہ وغیرہ۔ ایم آر ڈی کے زمانے میں ہیلی کاپٹروں سے فائرنگ کی کہانیوں کو پیشِ نظر رکھ کر آج بھی جمہوریت کی سربلندی کے لیے قربانی کی داستانیں سنائی جاتی ہیں۔ آئین کی کتاب میں سب کچھ لکھا ہے، یہ چاروں صوبوں اور اٹھارہ کروڑ عوام کا متفقہ ہے۔ کیا لکھنے سے لوگوں کے مسئلے حل ہو جاتے ہیں؟ اگر ایسا ہوتا تو آئین پاس ہونے کے چند ماہ بعد بلوچستان میں صوبائی حقوق کی مسلح جدوجہد نہ شروع ہوتی۔ آئین میں تو انسانی حقوق کی ضمانت بھی دی گئی ہے۔ پھر روز انسانی حقوق کی بحالی کے لیے تحریکیں کیوں چلتی ہیں۔ روز سپریم کورٹ اس آئین کو اس کی روح کے ساتھ نافذ کرنے کے لیے کیوں کہتی ہے۔ لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ اس کی اسلامی شقیں نافذ کرو تو شام سات بجے سے رات بارہ بجے تک ٹیلی ویژن اس مطالبے کا تمسخر اڑانے لگتے ہیں۔ یہ ہے وہ ابہام جو ہم نے ساٹھ سالوں میں اس ملک میں پیدا کیا۔ تمام مکاتبِ فکر کے جید علما پاکستان بنتے ہی بائیس نکات پر متفق ہو گئے تھے اور کہا تھا کہ ان کے مطابق شریعت نافذ کرو تو کسی شیعہ، سنی، دیوبندی، بریلوی کو اعتراض نہ ہوگا' پیروکار آج سروں کی فصلیں کاٹ رہے ہیں۔ روز قرآن اور حدیث پڑھتے ہیں کہ کلمہ گو مسلمان کا خون حرام ہے' لیکن قاتل ان کی مسجدوں اور امام بارگاہوں میں دندناتے پھرتے ہیں، اپنے مقتول کو شہید اور دوسرے کے مقتول کو جہنمی کہتے ہیں۔ جس دین میں گروہ بندی، فرقہ پرستی اللہ کی صریح نافرمانی ہو، اس کے ماننے والے روز نفرت کے بیج بھی بوئیں اور قرآن کی یہ آیت بھی تلاوت کریں "اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامو اور آپس میں تفرقہ مت ڈالو" ایسے میں اس قوم کو ایک نقطے پر یہ علماء جمع کریں گے' جنہوں نے ساٹھ سال میں بڑی محنت سے اسے تقسیم کیا ہے؟

ہمارا مسئلہ بھوک ہے نہ افلاس و بیماری، ہمارا مسئلہ نہ دہشت گردی ہے اور نہ قتل و غارت۔ ہمارا مسئلہ منافقت ہے۔ منافق وہ ہوتا ہے جو زندگی کے معاملات میں عدل سے کام نہیں لیتا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: منافق کی تین نشانیاں ہیں، جب بولے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو پورا نہ کرے، اور امانت میں خیانت کرے (صحیح بخاری)، یہ ملک ایک امانت تھی اس مالکِ کائنات کی، ہم سب نے مل کر اس کے ساتھ خیانت کی، ہم نے وعدے کیے اپنے رب سے بھی اور قوم سے بھی کہ ہم اس ملک کو اللہ کے لیے بنا رہے ہیں، ہزاروں جلسوں اور درجنوں لیڈروں کی تقریریں گواہ ہیں، ہم نے قدم قدم پر جھوٹ بولے۔ اب ہم سمجھتے ہیں کہ یہ قوم ایک نقطے پر متحد ہو جائے گی۔ جس قوم پر اللہ کا غضب زمین و آسمان کی وسعتوں سے نظر آ رہا ہو، وہاں اب تک جو بویا گیا ہے اس کے کاٹنے کے دن آ گئے ہیں۔ یہ دن ہر اس قوم پر ضرور آیا جس کی حالت ہماری طرح تھی اور تاریخ اس پر شاہد ہے۔ وہ جنہیں اللہ نے چشمِ بینا دی ہے' دیکھ رہے ہیں۔ مغرور سروں کی فصل پک چکی اور کٹنے کو تیار ہے۔ اس کے بعد موسمِ بہار ہے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

سیکولر ڈکٹیٹر اور اس کے حلیف

حرف راز
اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

پاکستان کی طرزِ حکمرانی کا مزاج ازل سے ہی آمرانہ رہا ہے۔ کوئی بیرکوں سے اٹھ کر آئے یا کچی بستیوں کے مکینوں کو خواب دکھا کر ان کے ووٹوں سے مسند اقتدار پر بیٹھے' ان سب کو آمر کے لہجے اور رنگ روپ میں ڈھلتے دیر نہیں لگتی۔ سبھی کے ہاتھ عوام کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ ہر کسی کا دامن بددیانتی، بدعہدی، دھوکہ دہی اور فریب کی سیاہی سے داغدار ہے۔ لوٹ مار کے بازار میں سبھی نے جی بھر کر لوٹا اور سیاسی شعبدہ بازی کی سٹیج پر ہر کسی نے فنکاری دکھائی۔ لیکن ہمارے ''مبلغ علم'' اور ''مروجہ دانش'' کے اصول نرالے ہیں۔ یہاں ڈکٹیٹر یا آمر صرف وہی ہوتا ہے جو بندوق لے کر آئے لیکن جو ووٹ لے کر آئے اور آ کر بندوق چلائے اسے ڈکٹیٹر نہیں کہہ سکتے۔ وہ تو ایک جمہوری رہنما ہے جسے عوام نے اپنا گلا کاٹنے کے لیے خود منتخب کیا ہے۔ اب اگر عوام خود اپنا گلا کٹوانے کے لیے کسی ایسے شخص کو ووٹ دیتے ہیں جس کی آستین میں خنجر چھپا ہے تو اسے پورا حق حاصل ہے کہ وہ ''جاہل اور بے وقوف عوام'' کو ان کے اس فعل کی بدترین سزا دے۔ وہ اس سزا کے مستحق ہیں' اس لیے کہ انہوں نے ایسے ظالم کو خود اقتدار کی مسند پر بٹھایا۔ اس تعریف کو مان لیا جائے تو پاکستان میں چار ڈکٹیٹر برسر اقتدار آئے اور چاروں بندوق کے زور پر اقتدار پر قابض ہوئے۔ ان میں سے تین ڈکٹیٹر سیکولر تھے۔ اگرچہ ایوب خان اور یحییٰ خان سیکولر طرزِ حکومت کے حامی اور سیکولر طرزِ زندگی یا لائف سٹائل رکھتے تھے لیکن سیکولرازم کو مکمل طور پر اوڑھنا بچھونا بنانے والے پرویز مشرف تھے' جنہوں نے اپنے سارے دور میں ملک پر سیکولر اخلاقیات کو نافذ کرنے کے لیے پوری توانائیاں صرف کیں۔ ان کی آمد کے ہنگام انہیں کمال اتاترک کا پاکستانی ایڈیشن ثابت کیا گیا۔ کتوں کے ساتھ تصویروں سے لے کر راگ رنگ اور عیش و عشرت کے نام نہاد ''عالمی معیار'' پر پوری اترتی ہوئی ان کی زندگی کو سراہا جانے لگا۔ یہ عالمی معیار بھی ہمارے ہاں عجیب ہے۔ ہم سچ، ایمانداری، قانون کی پاسداری، انصاف، احترام انسانیت کو اپنے اوپر لاگو نہیں کرتے جو دنیا بھر میں عالمی اخلاقیات کے معیار ہیں لیکن مخلوط ماحول، رات کی محفلیں، جنسی آزادی اور شراب و شباب کو اپنانا ہی ترقی کی منزلیں طے کرنے کا معیار سمجھا جاتا ہے۔ پرویز مشرف کے دورِ اقتدار میں ان تمام اخلاقیات کو زبردستی اس ملک میں نافذ کرنے کی کوشش کی گئی۔ میراتھن دوڑ سے لے کر بسنت کے ہنگاموں اور فن اور آرٹ کے نام پر فحاشی کی سرپرستی کو عام کیا گیا۔ یہ وہ زبردستی نافذ کی جانے والی لذت پرستی ہی تھی جس نے اس ملک کی اکثریت کو ایک شدید کرب اور رنج میں مبتلا کر دیا۔ ول ڈیورانٹ نے دنیا بھر کی تاریخ کا جب تجزیہ کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ معاشرے میں شدت پسندی اس وقت جنم لیتی ہے جب کوئی آمر یا ڈکٹیٹر وہاں معاشرتی اخلاقیات کے مقابلے میں زبردستی لذت پرست اقدار کو نافذ کرنے لگتا ہے۔ وہ اپنی کتاب ''Heroes of History'' میں لکھتا ہے: ''نیرو، کوموڈس اور بعد کے شہنشاہوں کے ماتحت قدیم روم کے اخلاقی انحطاط نے عیسائیت کے لیے راستہ ہموار کیا۔ شہنشاہ قسطنطین نے عیسائیت کو سرکاری طور پر اپنایا اور تحفظ دیا اور وہ نظم و ضبط اور شائستگی کو قائم رکھنے والی قوت بن گئی۔ کرائے کے فوجیوں کا تشدد اور اطالوی نشاۃ ثانیہ کے دوران بورجیاؤں کے ماتحت کھلی لذت پرستی کا نتیجہ کلیسا کی صفائی اور اخلاقیات کی بحالی کی صورت سامنے آیا۔ ایلزبتھ کے انگلینڈ کی بے خطر تلذذ پسندی نے کروم ویل کے عہد میں پیوریطان غلبے کی راہ ہموار کی اور نتیجتاً چارلس دوم کے دور میں انگلینڈ پاگان ازم تک پہنچا۔ انقلابِ فرانس کے دس برس کے دوران حکومت، شادی اور خاندان کی ٹوٹ پھوٹ کا خاتمہ قانون، نظم و ضبط اور نپولین اول کی حاکمیت کی بحالی کے ذریعے ہوا۔ بائرن اور شیلے کے رومانوی پاگل پن اور جارج چہارم کے نشاط پرست رویے کے بعد وکٹوریائی انگلینڈ کی عوامی سماجی شائستگی آئی''۔ ول ڈیورانٹ نے اس میں پوری تاریخ کا احاطہ کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ اگر کوئی آمر معاشرے میں زبردستی نشاط پرستی، بے راہ روی اور مرد و زن کے اختلاط کو عام کرتا ہے اور اس کی فوجی طاقت کے سامنے عوام خود کو بے بس محسوس کرنے لگتے ہیں تو ایسے معاشرے میں اخلاقی اقدار کی پاسداری اور تحفظ کے لیے شدت پسند اور لٹھ بردار گروہ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ گروہ لوگوں کے جذبات کی ترجمانی کر رہے ہوتے ہیں' اس لیے ان کے لیے لوگوں کے دلوں میں نرم گوشہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ تاریخ کا یہی ردعمل پرویز مشرف کے دور میں سامنے آیا۔ لال مسجد اور جامعہ حفصہ کا المیہ ایک علامت کے طور پر ابھرا اور پھر اس جگہ پر تشدد اور بربریت نے پورے ملک کو ایک رزم گاہ میں تبدیل کر دیا۔ مشرف کے سیکولرازم کے ساتھ ایک اور رویہ بھی منتھی ہو گیا اور وہ مغرب کا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اعلان جنگ اور اس میں پاکستان کی حکومت اور افواج کا حصہ ڈالنا تھا۔ پرویز مشرف کو وہ دور نصیب ہوا جب دنیا کے اڑتالیس ممالک نے مل کر نہتے مسلمان پڑوسی افغانستان پر حملہ کیا اور جارحیت کے لیے پاکستان کی سرزمین کو استعمال کیا گیا۔ پاکستان کے ہوائی اڈوں سے ستاون ہزار دفعہ جنگی طیارے اڑے اور انہوں نے مسلمانوں کے پرخچے اڑائے۔ اس کامیابی پر اس سیکولر ڈکٹیٹر کا فاتحانہ رویہ ویسا ہی تھا جیسا دنیا کے کسی بھی مسلمان دشمن سربراہ کا ہو سکتا ہے۔ اسے امت مسلمہ سے اس غداری پر تعریف و توصیف بھی ملی اور اس کے بقول پاکستان کا اس غنڈہ گرد عالمی برادری میں وقار بھی بلند ہوا۔

آج یہ سیکولر ڈکٹیٹر مغربی تہذیب کی ایک دوسری قدر یعنی جمہوریت کے کٹہرے میں کھڑا ہے۔ سیکولرازم بھی جدید مغربی تہذیب کا شاخسانہ ہے اور سرمایہ دارانہ جمہوریت بھی۔ دونوں کے مداح ایک ہی گروہ کے دانشور ہوتے ہیں۔ ان کے خواب جمہوری طور پر پورے نہ ہوں تو یہ کسی ایسے ڈکٹیٹر کا خواب دیکھتے ہیں جو ان کی اخلاقیات زبردستی معاشرے میں نافذ کر دے۔ اللہ کے راستے پر چلنے والوں کو شدت پسند کہہ کر قتل کرے اور عالمی برادری میں وقار بلند کرے۔ لیکن جیسے ہی اس سیکولر ڈکٹیٹر کی گرفت کمزور ہونے لگتی ہے تو یہ اس درخت سے اڑ کر جمہوریت کے درخت پر آ بیٹھتے ہیں، ایسے میں وہ سیکولر ڈکٹیٹر قید تنہائی میں سوچتا ہو گا کہ یہ کس قدر بے مروت اور بے وفا لوگ ہیں۔ کل تک یہ لوگ میری پالیسیوں کے بارے میں رطب اللسان تھے۔ مجھے پاکستان کے ''سافٹ امیج کا نمائندہ'' کہتے تھے۔ جامعہ حفصہ ہو یا قبائلی علاقے، ہر جگہ میرے قتل و غارت کا دفاع کرتے تھے۔ میری سجائی محفلوں اور برپا کی گئی ثقافتی رنگا رنگی میں مست ہو کر جھومتے تھے۔ آج انہیں کیا ہو گیا ہے؟ ایسے ہی ہوتا ہے۔ یہ بندوق کے زور پر قائم آمریت یا ووٹ کے نتیجے میں قائم آمریت دونوں گھروں میں رہتے ہیں۔ چند سال ایک گھر کو آباد کرتے ہیں اور دوسرے گھر کو اجاڑتے ہیں۔ پھر دوسرے کو اجاڑ کر پہلے کو آباد کرتے ہیں۔ یہی کھیل ہے جسے اقبال نے ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں واضح کیا۔ ابلیس اپنے مشیروں سے کہتا ہے۔

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خودنگر

اور ابلیس کے حوالے سے ایک دوسری نظم میں آمریت اور جمہوریت کی آنکھ مچولی کو کیا خوب واضح کیا۔

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن، اندروں، چنگیز سے تاریک تر

allurdupdfnovels.blogspot.com

شیعہ سنی فسادات......فاتح کون؟

پوری امتِ مسلمہ میں کون ہے جو سیدنا امام حسینؓ کی ذات کو پوری امت کا مشترکہ اثاثہ نہ سمجھتا ہو۔ اقبال نے تو انہیں 'قافلہ سالارِ عشق' اور 'نکتۂ پرکارِ عشق' جیسے القابات سے یاد کیا۔ اقبال تو اس امت کی زبوں حالی پر نوحہ بھی یوں پڑھتا ہے کہ "قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں"۔ یہ الفاظ اور سیدنا امام حسینؓ کی ذات سے عشق' اقبال کے ہاں ایک تسلسل کا نام ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی جب بھی کہانی دہرائی جائے گی قافلہ سالاری سیدنا امام حسینؓ کے سر کا تاج رہے گی۔

کوفہ کی سرزمین پر کربلا کے المناک سانحے کے بعد بے وفائی کا ایک اور باب رقم ہو رہا تھا۔ حضرت علی ابن حسین زین العابدین کے فرزند حضرت زید بن علیؒ' ہشام بن عبدالملک کے دور میں کوفہ تشریف لائے تو وہاں آپ نے ایک خطبہ ارشاد کیا' جس میں کہا: "اللہ کی قسم مجھے یہ چیز سخت ناگوار ہے کہ میں محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کروں اور اس حالت میں کہ ان کی امت کو نہ میں نے معروف کا حکم دیا ہو اور نہ منکر سے منع کیا ہو"۔ کوفہ میں منصور بن المعتمر نے لوگوں سے زید بن علی کے لیے بیعت لینا شروع کی۔ اس زمانے میں اہلِ سنت کے امامِ اعظم امام ابوحنیفہ' بنی امیہ کے ظلم و تشدد کا مسلسل شکار ہو رہے تھے۔ منصور بن المعتمر اور امام ابوحنیفہ دونوں راتوں کو چھپ کر ملتے اور روتے رہتے۔ چند اور بزرگوں' مسلمہ بن کہیل اور نبیل الاعمش کی کوششوں سے کوفہ کے چالیس ہزار لوگوں نے حضرت زید بن علی کی بیعت کر لی۔ حضرت زید نے جب قیام کا ارادہ کیا تو فضیل بن زبیر کو قاصد بنا کر ابوحنیفہ کے پاس بھیجا۔ یہاں امام ابوحنیفہ کا ایک تاریخی فقرہ ہے جو تاریخ کی کتابوں میں درج ہے۔ انہوں نے کہا: "خروجه یضاهی خروج رسول الله صلی الله علیه وسلم یوم البدر" (زید کا اس وقت اٹھ کھڑا ہونا رسول اللہ ﷺ کی بدر میں تشریف آوری سے مشابہ ہے۔) اس کے بعد حضرت زید نے دعوت جہاد دی اور فرمایا: "ہم تم کو اللہ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کی طرف دعوت دیتے ہیں اور تمہیں بلاتے ہیں کہ آؤ ظالموں سے جہاد کرو"۔ اس پر چالیس ہزار لوگوں نے حضرت زید کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد کی۔

اس کے بعد بے وفائی کی ایک دلگداز داستان ہے' حیلوں اور بہانوں کا ایک سلسلہ ہے۔ ایسے سوالات کوفہ والوں نے اٹھائے جو آج بھی اس امت مسلمہ کو تقسیم کیے ہوئے ہیں۔ چال چلن بھی وہی رکھا جو کوفہ والوں کا مسلم بن عقیل اور سیدنا امام حسینؓ کے ساتھ تھا۔ صبح جب حضرت زید بن علی میدان میں نکلے تو ان کے ساتھ اتنے ہی جانثار تھے جتنے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ میدانِ بدر میں تھے یعنی 313۔ یوں امام ابوحنیفہ کے قول پر اللہ کی جانب سے مہر تصدیق ثبت ہوئی کہ ان کا خروج رسول اللہ ﷺ کی بدر میں آمد سے مشابہ ہے۔ ملتِ اسلامیہ کی تاریخ کا ایک اور خونچکاں باب رقم ہوا اور یہ جانفروش شہید کر دیے گئے۔ اس وقت شیعانِ علی بھی موجود تھے اور اہلِ سنت بھی لیکن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں کسی ایک میں بھی اختلاف موجود نہ تھا۔ یہ تھی اس امت کی روایت جو صدیوں چلتی برصغیر تک پہنچی۔

برصغیر میں مسلک شیعہ اور مسلک سنی باہم ساتھ ساتھ اپنے اپنے عقیدوں پر قائم ایک دوسرے کو برداشت کرتے ہوئے صدیوں یہاں زندگی کرتے رہے۔ برصغیر میں مسلکی طور پر پہلا شیعہ خاندان سید سالار داؤد غازی اور سید سالار مسعود غازی کا تھا' جو 1030 عیسوی میں اودھ کے علاقے میں آ کر آباد ہوا۔ ان کی اولاد میں سے سید عبداللہ زر بخش اور سید زید شہسوار نے بارہ بنکی کے قریب زید پور شہر آباد کیا۔ اسی دور میں ہندوستان کی چند ریاستوں کے سربراہ بھی شیعہ مسلک سے تعلق رکھتے تھے جن میں اودھ' سندھ اور ملتان قابل ذکر ہیں۔ اس دور سے 1857ء میں انگریزوں کے قبضے تک یہاں ہر طرح کے حکمران برسرِ اقتدار آئے۔ خاندانِ غلاماں سے لے کر مغل بادشاہوں تک' ان کی حکومتوں میں اہم عہدوں پر شیعہ بھی رہے اور سنی بھی۔ ان میں کبھی کبھار سیاسی نوعیت کا اختلاف ہو بھی جاتا لیکن وہ ان لوگوں کی ذاتی اقتدار کی جنگ ہوتی۔ یہ جنگ مسلک کی جنگ نہیں بنتی تھی۔ ہمایوں کی ایران سے واپسی کے بعد بہت سے ایرانیوں کی برصغیر آمد کے بعد اس مسلک کو فروغ ملا اور عزاداری' مرثیہ خوانی اور مرثیہ نویسی نے رواج پایا۔ پورے مغلیہ دور میں کسی ایک معمولی سے شیعہ سنی فساد یا دنگے کی کوئی خبر موجود نہیں۔ یہاں تک کہ روبنسن (Robinson) جیسا مؤرخ جس نے برصغیر کے مسلمانوں کو تقسیم کا درس دینے کے لیے "Sepratism among Indian Muslims" لکھی وہ بھی کسی ایک واقعے کا تذکرہ نہ کر سکا جس میں شیعہ سنی فساد نظر آتا ہو۔ حالانکہ التمش سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک پورے برصغیر پر فقہ حنفیہ نافذ تھی اور قاضی اسی کے مطابق فیصلے کرتے تھے' سب اس پر متفق تھے اس لیے کہ دونوں مسالک کے علماء یہ سمجھتے تھے کہ اسلام کے جو قانون نافذ کرنے کے لیے ہوتے ہیں ان میں دونوں کے درمیان ذرہ برابر بھی فرق نہیں۔ چوری' زنا' جھوٹ' غیبت' قتل میں کوئی شیعہ سنی نہیں ہوتا اور ان سب کی سزا مقرر ہے۔ زکوٰۃ اور عشر میں بھی کسی کو کوئی اختلاف نہیں۔ جو اختلافات تھے وہ فروعی نوعیت کے تھے اور جو الزامات تھے وہ بھی مجمع باز خطیبوں اور ذاکروں کے پیدا کردہ تھے یا پھر افسانہ طراز مؤرخوں نے انہیں ہوا دی۔ یہی اس امت کی اصل روح تھی کہ اختلاف کی عزت کی جائے اور نیت کو اعمال کا معیار سمجھا جائے۔ مسلمان حکمرانوں کی یہ روح مزید اڑتالیس سال قائم رہی اور پہلا شیعہ سنی فساد 1906ء میں لکھنؤ میں ہوا جو انگریز حکمرانوں کی "برکت" کا نتیجہ تھا۔ اس کے بعد 1907ء اور 1908ء میں بھی فسادات ہوئے اور معاملہ باہم افہام و تفہیم سے علماء نے طے کر لیا اور مسلم معاشرے میں رواداری قائم رہی۔

1906ء کے فسادات کیسے ہوئے؟ اب یہ کوئی راز نہیں۔ کوئی شخص بھی برطانیہ میں انڈیا آفس لائبریری میں تمام مکتوبات دیکھ سکتا ہے۔ اس کی پوری تفصیل 18 اپریل 1939ء کے اس خط میں موجود ہے جو گورنر ہیگ (Heig) نے وائسرائے لنلتھگو (Linlithgow) کو تحریر کیا۔ یہ خط اس لیے تحریر کیا گیا تھا کہ 1939ء میں پھر فسادات پھوٹ پڑے تھے۔ لکھنؤ میں جہاں محرم کے دنوں میں تعزیہ اور علم کے جلوس نکلا کرتے تھے وہیں سنی اپنی مساجد میں مدح صحابہ کے نام سے مجلس منعقد کیا کرتے تھے' لیکن یہ دونوں ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔ 1906ء میں انگریز نے ایک حکم نامہ جاری کیا کہ "مدح صحابہ" ایک نئی اختراع ہے اس لیے محرم کے دو دنوں' چہلم اور یومِ شہادتِ علی کے دن اس پر پابندی ہو گی۔ یہ اقدام دنیا کو یہ بتانے کے لیے کیا گیا کہ ہم نے یہ امن کے لیے کیا ہے' لیکن اصل میں یہ ایسی شرارت تھی جس نے آگے چل کر اس فساد کا بیج بویا۔ اس کی تفصیل Heig papers MSS.EUR.F.125.102 IOR میں موجود ہے اور انڈیا آفس لائبریری میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد پورے برصغیر میں محرم کے جلوسوں کے روٹوں کے لائسنس انگریز ڈپٹی کمشنروں نے جاری کیے۔ آپ تمام شہروں کے روٹ ملاحظہ کریں تو ان میں شرارتاً خاص طور پر ایسے مقامات شامل کیے گئے جہاں آج نہیں تو کل کسی بھی وقت فساد برپا ہو سکتا ہے یا کروایا جا سکتا ہے۔ 1935ء میں چہلم کے دن کچھ مقامات پر "مدح صحابہ" پر پابندی کو غیر قانونی سمجھ کر سنی مساجد کو توڑا گیا۔ اس کے بعد 1936ء میں ذوالحج سے صفر تک کے مہینوں میں ہر جمعہ کو مدح صحابہ کو معمول بنایا گیا' قانون کی خلاف ورزی پر انگریزوں نے ہزاروں سنیوں کو گرفتار کر لیا حالانکہ دوسری جانب سے کوئی احتجاج نہ تھا۔ آگ لگانے کے لیے یہ کافی تھا۔ فسادات شروع ہوئے۔ جھانسی ڈویژن کے کلکٹر جسٹس ایلسوپ (Allsop) کی سربراہی میں ایک کمیٹی بنائی گئی جس کا مقصد یہ تھا کہ 1909ء کے احکامات میں کیا تبدیلیاں کی جائیں۔ 28 مارچ 1938ء میں یہ رپورٹ سامنے آئی جس میں کہا گیا کہ:

"The Sunni recitation were allowable in theory, but were actually provocative and should be disallowed".

آگ بڑھانے کے لیے یہ فقرے کافی ثابت ہوئے کہ "سنی مدح صحابہ کتابی طور پر تو صحیح ہے لیکن شرانگیز ہے اس لیے اس پر پابندی لگائی جائے"۔ سنیوں نے اس پر سول نافرمانی کی ایک تحریک شروع کی۔ ادھر ملک میں انتخابات کے بعد جمہوریت آ گئی تھی۔ کانگریس کی حکومت قائم ہو گئی۔ 31 مارچ 1939ء کو کانگریس حکومت نے مدح صحابہ پر سے پابندی اٹھا دی اور سول نافرمانی کی تحریک ختم ہو گئی۔ لیکن اس دوران دونوں جانب گزشتہ پچاس سال سے نفرت کا بیج بویا جا چکا تھا۔ یوں مارچ' اپریل اور مئی 1939ء میں شیعہ مسلک کے لوگوں نے احتجاج شروع کیا اور گرفتاریاں شروع ہوئیں۔ اٹھارہ ہزار افراد گرفتار ہوئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو دونوں گروہوں نے منصف مقرر کیا لیکن چونکہ اختلافات کو اس طرح پالا گیا تھا کہ دوسری جانب سے تبرّیٰ کو بھی سرعام کرنے کی اجازت مانگ لی گئی اور اس پر از خود عمل بھی شروع ہو گیا جس پر شدید فسادات نے جنم لیا۔ یہ تمام معاملات اور کہانی گورنر ہیگ کے خطوط میں درج ہے جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد 1940ء میں تمام اضلاع کے ڈپٹی کمشنروں نے عوامی مقامات پر مدح صحابہ اور تبرّیٰ پر پابندی لگا دی۔

یہ ہے وہ تاریخ کہ آگ بھی خود بھڑکائی اور پھر اسے ایک دوسرے کے گھروں میں سلگنے کے لیے چھوڑ دیا۔ کس قدر بدنصیب ہیں ہم اور کس قدر نا سمجھ ہیں ہمارے فرقہ پرست کہ محرم کے جلوسوں کے وہ روٹ جنہیں انگریز ڈپٹی کمشنروں نے فساد کے ممکنہ امکانات کے لیے ڈیزائن کیا تھا اسے کربلا کی طرح مقدس سمجھتے ہیں اور مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ ہر سال یہ قوم دعائیں کرتی ہے فسادات سے نجات کے لیے' دنیا بھر کی انتظامیہ ان مقامات پر کھڑی ہوتی ہے' لیکن پھر بھی فساد ہو جاتا ہے اور کوئی مل بیٹھ کر ان سب کو محفوظ راستوں پر لے جانے کی کوشش نہیں کرتا۔ کس قدر بدقسمت ہیں ہم کہ انگریز جو لکیریں کھینچ گیا اسے مقدس سمجھ کر خون بہاتے ہیں۔ صوبے انگریز نے بنائے' آپ انہیں بدل کر دکھائیں' ضلعوں' تحصیلوں میں ردو بدل پر فساد' جلوس کے قدیمی روٹ پر جھگڑا۔ کوئی ہے جو عقل سیکھے۔ اس برصغیر میں نفرت کا بیج بونے والے انگریز کے قانون اور احکامات کو بدل دے۔ اس سارے فساد پر آج بھی انگریز فاتح ہے جو نفرت کا بیج بو گیا۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

روزنامہ دنیا

شیعہ سنی فسادات۔ فاتح کون؟(2)

ایک اور بہت بڑا سوال امتِ مسلمہ میں مسلکی اختلافات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی عدم برداشت اور خونریزی کے حوالے سے پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس برصغیر میں موجود تیس سے چالیس ہزار انگریز ہی اس کے واحد ذمہ دار ہیں؟ کیا ہمارے علما نفرت کی آگ میں حصے دار نہیں ہیں؟ کیا ان لوگوں نے ایک مسلسل عمل کے ذریعے سادہ لوح مسلمانوں کو ایک دوسرے سے نفرت کا سبق نہیں پڑھایا؟ برصغیر کی گزشتہ ڈیڑھ سو سال کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ ہر مکتبۂ فکر کے جید ترین علمانے مدتوں اس بات پر اپنی توانائیاں صرف کیں کہ مخالف مسلک کے عقائد اور ان کے علما کی تحریروں میں کون سے نقائص ہیں۔ زوردار اور پُر جوش رسالے لکھے اور تمام مکاتب فکر کے مدرسوں میں پڑھائے جاتے رہے۔ اس کے بعد منبر و محراب ہاتھ آئے تو اپنی شعلہ بیانیوں کا سارا زور مخالف کو کذاب، بے دین، گمراہ، اور بالآخر کافر کہنے پر صرف کیا۔ شیعہ، بریلوی، دیوبندی، اہلِ حدیث سب نے اس میں پورا پورا حصہ ڈالا۔ ردِ بریلویت، ردِ دیوبندی، ردِ شیعہ اور ردِ غیر مقلدین جیسے موضوعات پر آپ کو ایک وسیع مواد ہر مکتبۂ فکر میں مل جائے گا۔ وہ جن کے اسلاف قرآن و سنت کے ہر پہلو کو لوگوں پر روشن کیا کرتے تھے، جو کبھی پوری دنیا میں کفر و شرک کے مقابلے میں توحید کے علمبردار تھے، جو سیّد الانبیاء ﷺ سے عشق کی مشعل روشن کرنے کے نقیب ہوا کرتے تھے، ان کا سارا زورِ بیان اس بات پر صرف ہونے لگا کہ فلاں شخص یا گروہ اللہ کی وحدانیت پر یقین رکھتا ہے یا نہیں، فلاں دل میں سیّد الانبیاء ﷺ کے احترام کی مشعل روشن ہے یا بجھ چکی۔ مشرک، بدعتی، گستاخِ رسول، منکرینِ اولیاء، گستاخِ صحابہ اور منکرینِ اہلِ بیت جیسے موضوعات ہمارے مذہبی اکابرین کا پسندیدہ موضوع بن گئے۔

گزشتہ چالیس سالوں سے میں ہر مکتبہ فکر کے علما کی دھواں دار تقریروں سے فیض یاب ہو رہا ہوں۔ کانفرنس توحید کے نام پر منعقد ہوتی ہے لیکن تقریریں پڑوس کی مسجد کے امام اور اس کے اسلاف کی ہرزہ سرائی کے ذکر سے بھری ہوتی ہیں، مجلس میلادِ سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی سجائی جاتی ہے اور شعلہ بیانیاں اپنے اسلاف کی تعریف و توصیف اور دوسروں کی گستاخیوں کی داستانیں بیان کرنے پر صرف ہو جاتی ہیں۔ آلِ رسولؐ کی محفلوں کا تو غضب ناک پہلو یہ ہے کہ فقرے گھما پھرا کر ایسے بولے جاتے ہیں کہ پوری بستی جو اس محفل میں شریک نہیں' یزید کی فوج قرار دے دی جاتی ہے۔ ادھر بات شانِ صحابہؓ کی شروع ہوتی ہے مگر کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا کہ جوشِ خطابت لوگوں سے دوسرے مکتبۂ فکر کے لوگوں کے لیے کفر کے نعرے نہ لگوا دے۔ یہ تقریریں اور یہ ''علمی'' مواد اور تحقیق و تنقیص کا یہ عمل ڈیڑھ سو سال سے جاری ہے' لیکن ان ڈیڑھ سو سالوں سے ایک سو بیس سال انتہائی امن اور سکون کے ہیں۔ کوئی دنگا، فساد، سر پھٹول یا قتل و غارت نہیں۔ لیکن گزشتہ تیس سال ایسے ہیں کہ جیسے ہر لمحہ سولی پر لٹکا ہوا ہو۔

ان تیس سالوں میں ایسا کیا ہو گیا؟ اگر آج ہم نے اس پر غور نہ کیا تو اگلے سو سال ہم ایک دوسرے کی لاشیں اٹھاتے رہیں گے۔ ان تیس سالوں میں اس مسلم خطے کے سیاسی حالات میں ایسی اہم تبدیلیاں آئیں جن کا اثر یہاں کے صدیوں پرانے معاشرتی، سیاسی اور مذہبی حالات پر پڑا۔ ایک پُرسکون جھیل جیسی مسلم معاشرت میں ہلچل مچ گئی۔ افغانستان میں روسی افواج داخل ہوئیں اور ایران میں انقلاب آ گیا۔ یہ دونوں واقعات جنگِ عظیم اوّل کے بعد مسلم اُمہ کی خلافت کی مرکزیت کے ختم ہونے اور جدید سیکولر قومی ریاستوں کے بعد سب سے بڑے واقعات تھے۔ ایران میں' انقلاب نے جہاں سیکولر قومی ریاست کی بنیادیں ہلا دیں' وہیں افغانستان کا جہاد بھی خلافتِ اسلامیہ کے قیام کا نعرہ لے کر اٹھا اور طالبان کی صورت قائم حکومت نے مغرب کی سیکولر ریاستیں قائم کرنے کی جدوجہد کو غارت کر دیا۔ ان انقلابات کے نتیجے میں پورے خطے میں ایک بے یقینی کی کیفیت پیدا ہو گئی اور وہ تمام حکمران جنہیں پہلی جنگِ عظیم کے بعد مغرب نے اپنے کاسہ لیسوں کی حیثیت سے مسلط کیا تھا' اپنے ممکنہ انجام کی وجہ سے خوفزدہ ہو گئے اور یوں ایک کشمکش اور جنگ کا آغاز ہو گیا۔ لیکن اس کشمکش اور جنگ کا ایندھن وہ مواد بنا جو سو دو سال سے اس امت کے مختلف مسالک کے علماء نے وقتاً فوقتاً تحریر کیا تھا۔ ایک دوسرے کے ردّ میں لکھی گئی کتابیں اور کفر کے فتوے گرد آلود تہہ خانوں سے نکالے گئے اور پھر انہیں چاروں جانب پھیلا دیا گیا۔ اسی زمانے میں ایک اور چیز نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ پہلے ان تمام علماء اور ذاکرین کے بے محابہ خطاب صرف اپنی اپنی مساجد اور امام بارگاہوں تک محدود تھے لیکن جس طرح اس دور میں پہلے آڈیو کیسٹوں اور ویڈیو کیسٹوں نے عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی جیسے فنکاروں کو مقبولیت بخشی ویسے ہی ان علما اور ذاکرین کی آڈیو اور ویڈیو کیسٹوں نے انہیں راتوں رات ملکی اور غیر ملکی مقبولیت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ یہ کیسٹیں عام دکانوں پر دستیاب ہونے لگیں۔ شیعہ ذاکر کی کیسٹ سنی گاہک کے ہاتھ میں اور سنی مقرر کی کیسٹ شیعہ گاہک کے ہاتھ میں آ گئی۔ مدتوں ان لوگوں کو ان کے مولوی بتایا کرتے تھے کہ فلاں مسلک کا مولوی یا ذاکر ہمارے بارے میں یہ کہتا ہے اور پھر نفرت کا بیج بویا جاتا تھا۔ لیکن اب تو وہ سب کچھ ایک دلیل کے طور پر مخالف فرقے کے لوگوں کے ہاتھ میں آ گیا۔ وڈیو اور آڈیو سے سب کچھ سی ڈی اور ڈی وی ڈی پر منتقل ہوتا چلا گیا۔ ادھر گھر گھر کمپیوٹر آیا تو یہ سارا نفرت انگیز مواد عام آدمی کی دسترس میں چلا گیا۔ آڈیو، وڈیو کیسٹ یا سی ڈی اور ڈی وی ڈی خریدنے کے لیے پھر بھی زحمت اٹھانا پڑتی تھی، بازار جانا پڑتا تھا لیکن جیسے ہی انٹرنیٹ آیا تو یہ تمام مواد یوٹیوب سے ہوتا ہوا فیس بک، ٹوئٹر اور دیگر ویب سائٹس کی صورت میں ہر شخص کے گھر یہاں تک کہ موبائل تک جا پہنچا۔ اب نہ دکان پر جانے کا تردّد، نہ کیسٹ اور سی ڈی خریدنے کی زحمت، راہ چلتے موبائل پر انٹرنیٹ کھولو اور نفرت کے ثبوت کے طور پر کسی بھی مولوی یا ذاکر کی تقریر سنا کر آگ لگوا دو۔ یہاں ایک عجیب منطق پیش کی جاتی ہے کہ انٹرنیٹ یا سوشل میڈیا پر ہر طرح کا جھوٹ اور افواہ چل رہی ہوتی ہے' لیکن یہ جھوٹ اور افواہ نہیں بلکہ ہمارے اپنے مذہبی قائدین کی غیر ذمہ دارانہ گفتگو ہوتی ہے جسے ایک عام کمپیوٹر جاننے والا شخص بھی بڑی آسانی سے پہچان سکتا ہے کہ یہ جھوٹ ہے یا سچ۔ یہی وجہ ہے کہ مسجد اور امام بارگاہ میں بولی جانے والی نفرت کی زبانیں اب گھروں کے دالانوں تک جا پہنچی ہیں۔ اب کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہم ایسا نہیں کہتے یہ ہم پر الزام ہے، اس کے جواب میں سامنے والا موبائل پر کسی نہ کسی کی تقریر نکال کر سنا دیتا ہے۔ یہ وہ سب کچھ ہے جس نے اس سیاسی اور علاقائی طور پر پیچیدہ صورتحال کو ایندھن فراہم کیا، آگ لگائی اور کشت و خون کا بازار گرم کیا۔ اس سارے طوفان میں نہ دیوبندی کو فتح حاصل ہوئی نہ بریلوی کو، نہ شیعہ جیتا اور نہ اہلِ حدیث۔ مسکراہٹ ان چہروں پر ہے، رقص کناں وہ لوگ ہیں جو مدتوں سے یہ خواہش دل میں دبائے بیٹھے ہیں کہ کسی طرح لوگوں کو اللہ، اس کے رسولؐ اور عقائد سے برگشتہ کیا جائے۔ یہ لوگ ہیں جو اس مواد کو اکٹھا کرتے ہیں، کبھی کالم کی صورت پروتے ہیں اور کبھی کسی ٹاک شو میں دھینگا مشتی کرواتے ہیں۔ لوگ سوال کرتے ہیں' حل کیا ہے! جس نے درد دیا ہے وہی دوا دے گا۔ اس امت کے تمام علماء کو اکٹھا ہونا پڑے گا اور ان سب لوگوں سے لاتعلقی کا اعلان کرنا ہو گا جن کی نفرت پر مبنی تقریریں اور مواد ہمارے درمیان موجود ہے اور ایسے سارے مواد سی ڈیز اور کیسٹوں کو سرِ عام جلانا ہو گا' ورنہ اہلِ نظر مسجدوں اور امام بارگاہوں میں جبّہ و دستار اور عمامے خون سے رنگین دیکھ رہے ہیں۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

سود ایک کا' لاکھوں کے لیے مرگِ مفاجات

حرفِ راز
اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

جاپان کا تذکرہ کرتے ہوئے جب میں نے ٹویوٹا کمپنی کے بلاسودی کاروبار کی تعریف میں چند سطریں تحریر کیں تو وہ لوگ جو دنیا بھر میں پھیلے ہوئے آکٹوپس کی طرح معیشت کو جکڑے ہوئے سودی بینکاری سے مرعوب ہیں، انہیں اوّل تو یقین نہ آیا، پھر انہوں نے ٹویوٹا کمپنی کی بیلنس شیٹس انٹرنیٹ سے نکال نکال کر مجھے بھیجنا شروع کیں اور کہا دیکھو، اس میں لفظ انٹرسٹ (Interest) کے سامنے آمدنی لکھی ہوئی ہے اور یہ سود ہے۔ ٹویوٹا کمپنی کے کاروبار سے نا آشنا اور صرف بیلنس شیٹ کی بنیاد پر دعویٰ کرنے والے ان افراد کا کیا کیا جائے جنہیں یقین نہیں آتا کہ بینک سے قرضہ لیے بغیر دنیا میں کوئی کاروبار ہو ہی نہیں سکتا۔

سب سے پہلے مجھے جاپان میں ایک انتہائی محترم پاکستانی شخصیت حسین خان صاحب کے لیے تشکر کا اظہار کرنا ہے جنہوں نے کمال محنت اور جانفشانی سے اس کمپنی کے کاروبار کا وسیع مطالعہ کیا اور اردو نیٹ جاپان پر مضامین تحریر کیے۔ چالیس برس سے جاپان میں مقیم حسین خان صاحب کو جاپانی زبان پر اس قدر عبور حاصل ہے کہ آج کل وہ اپنی توانائیاں قرآنِ پاک کے جاپانی زبان میں ترجمے پر مرکوز کیے ہوئے ہیں۔ جاپانی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھتے اور خوبصورت گفتگو کرتے ہیں۔ انہوں نے پہلی بار ٹویوٹا کے غیر سودی کاروبار کا ذکر کیا تو مجھے اس لیے حیرت نہ ہوئی کہ گزشتہ چند برسوں سے میں جاپان کی حیرت انگیز معاشی ترقی کا مطالعہ کرتے ہوئے اس بات سے واقف ہوں۔ میرے لیے یہ حقیقت حیران کن تھی کہ جاپان نے 1999ء میں اس راز کو پالیا تھا کہ سود معاشی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، لہٰذا انہوں نے دنیا کے سامنے (ZIRP) یعنی Zero interest rate policy کا تصور پیش کیا اور اس پر عملدرآمد کر کے دکھایا۔ یہی تصور دنیا کے بہت سے ترقی پذیر ممالک نے 2008ء کی اس کساد بازاری میں اپنایا جب دنیا کی بڑی بڑی معیشتیں سودی بینکاری نظام کی وجہ سے تباہی کے دہانے پر جا پہنچی تھیں۔ اس وقت بڑے بڑے مگرمچھ قسم کے بینکوں نے بھی سود کی شرح صرف ایک فیصد تک محدود کر دی تھی جو دراصل سود نہیں بلکہ سروس چارجز تھے جس سے بینک کے اخراجات پورے کیے جاتے تھے۔ آج بھی امریکہ، برطانیہ اور یورپ میں یہی شرح قائم ہے، لیکن سودی نظام کی وکالت میں باؤلے ہو چکنے والے لوگ یہ بیلنس شیٹس نکال کر یہی کہیں گے کہ یہ دیکھو، سود مکمل طور پر تو ختم نہیں ہوا۔ اس بات پر کوئی غور نہیں کرتا کہ یہ سب بینک اور کاروباری ادارے مسلمان ہیں نہ اسلام سے ان کا کوئی تعلق۔ ان کے نزدیک حرام اور حلال کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ انٹرسٹ ریٹ کو 0.5 فیصد پر بھی لے آئیں تو اسے انٹرسٹ ہی لکھتے ہیں' حالانکہ یہ ان کے سروس چارجز ہوتے ہیں۔ یہی معاملہ ورلڈ بینک' ایشین بینک اور آئی ایم ایف کا ہے جو اپنے قرضوں پر ایک یا دو فیصد انٹرسٹ لیتے ہیں جو دراصل ان کے سروس چارجز ہوتے ہیں اور وہ اسے تحریر میں انٹرسٹ ریٹ ہی لکھتے ہیں۔

یہی کیفیت ٹویوٹا کمپنی کی ہے۔ بینک کے سود سے اس کی نجات کی کہانی اس بات کا ثبوت ہے کہ دنیا کا بڑے سے بڑا کاروبار بھی بینکوں سے قرضہ لیے بغیر کیا جا سکتا ہے۔ ٹویوٹا کمپنی کو اس کے بانی ''اچی رو تو یودا'' نے 1937ء میں قائم کیا اور 1950ء تک اسے اپنی محنت سے ایک بہت بڑی کمپنی بنا دیا، لیکن دوسری جنگِ عظیم کے اثرات نے اسے دیوالیہ ہونے کے قریب پہنچا دیا۔ اچی رو نے بینک آف جاپان سے رابطہ کیا تاکہ قرضہ لے کر اس کمپنی کی مالی حالت کو بہتر کیا جائے، لیکن بینک نے یہ شرط عائد کی کہ انہیں اپنے 1600 مزدوروں کو فارغ کرنا ہو گا کیونکہ بینک کو خطرہ تھا کہ اتنے مزدوروں کے ہوتے ہوئے کمپنی اتنا منافع نہیں کما سکے گی کہ سود سمیت قرضے کی قسط ادا کرے۔ مجبوری کے عالم میں اچی رو نے قرض لے لیا لیکن مزدوروں کو فارغ کرنے کی شرط سے اسے اس قدر اذیت ہوئی کہ اس نے کمپنی سے استعفیٰ دے دیا اور یہ وصیت کی کہ آئندہ کمپنی کبھی بینک سے قرضہ نہیں لے گی۔ جاپانی مزدوروں کو اپنے خاندان کی طرح سمجھتے ہیں' ان کو نکالنے کے صدمے نے اچی رو کی یہ حالت کر دی کہ وہ دو سال کے اندر انتقال کر گیا۔ اس کے بعد کمپنی نے ایک سادہ کاغذ پر کمپنی کے قواعد و ضوابط چھاپ کر قرار دیا کہ اگر کوئی شخص کمپنی میں بلاسود سرمایہ کاری کرنا چاہے تو وہ جتنے حصص خریدے گا، اسی تناسب سے اس کو کمپنی میں ملکیت حاصل ہو جائے گی۔ اس بلاسودی سرمایہ کاری کا کمال دیکھیں کہ ایک خاندان جو سو فیصد اس کمپنی کا مالک تھا، اب صرف 2 فیصد کا مالک ہے جبکہ 98 فیصد وہ لوگ مالک ہیں جو اس میں سرمایہ کاری کیے ہوئے ہیں۔ چونکہ یہ قرضہ نہیں تھا' سرمایہ کاری تھی اس لیے کمپنی کے پاس اس قدر اضافی سرمایہ آ گیا کہ اس نے ہر سال نئے اسمبلنگ پلانٹ لگانے شروع کر دیے۔ نہ قرضے کی ادائیگی اور نہ ہی سود در سود کی لعنت۔ اس وقت اس کمپنی کی کل مالیت 120 ارب ڈالر ہے جس میں 2 فیصد کے حساب سے پورے خاندان کا حصہ 2.2 ارب ڈالر بنتا ہے۔

طریق کار بھی انتہائی سادہ ہے۔ پہلے بانڈ جاری کر کے سرمایہ حاصل کیا جاتا ہے اور پھر اسے حصص کی صورت میں ملکیتی حیثیت دی جاتی ہے؛ البتہ ٹویوٹا کمپنی کے پاس جو اضافی سرمایہ ہوتا ہے وہ اسے بینکوں میں جمع کرواتی ہے جس سے اسے سود حاصل ہوتا ہے۔ اس کا کمپنی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی یہ ان کی کمپنی کی ضروریات کی پلاننگ میں شامل ہوتا ہے، یہی ٹویوٹا کی بیلنس شیٹ میں سود کی صورت میں نظر آتا ہے۔ اس کے لیے ٹویوٹا کی خالصتاً گاڑی سازی کی کمپنی تندوکو (Tandoku) کی بیلنس شیٹ دیکھی جائے تو اس میں سود یا انٹرسٹ نام کی چیز نظر نہیں آئے گی، لیکن گزشتہ دس برسوں کی بیلنس شیٹس جو ٹویوٹا کی ویب سائٹس پر ہیں ان میں کہیں یہ نہیں ملتا کہ کمپنی نے کسی بینک سے سود پر قرضہ لے کر اپنے کاروبار میں لگایا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان دس برسوں میں یہ کمپنی 60 ارب ڈالر سے 120 ارب ڈالر تک جا پہنچی ہے۔ کمپنی کے مالکان نہ اسلام کے زریں اصولوں سے آشنا ہیں اور نہ ہی وہ مسلمان ہیں کہ ان سے توقع رکھی جائے کہ وہ اتنی احتیاط کریں گے کہ اپنی اضافی رقم بینک میں رکھ کر سود نہ لیں۔ لیکن ایک اصول جس کی بنیاد پر دنیا بھر میں بینکوں کا جواز فراہم کیا جاتا ہے اور زور و شور سے کیا جاتا ہے کہ اگر بینک نہ ہوں گے تو سرمایہ کاری کیسے ہو گی، اس اصول کو اس کمپنی نے غلط ثابت کر کے دکھا دیا ہے... اور یہ ہے وہ اصل پتے کی بات۔

دنیا کی بڑی سے بڑی کمپنیاں سود در سود کے ہاتھوں دیوالیہ ہوئیں لیکن ٹویوٹا کے پاس اضافی سرمایے کا یہ عالم ہے کہ وہ دنیا کی سب سے بڑی کمپنی کے طور پر مسلم ہو چکی ہے۔ بینکوں کا سودی نظام لاکھوں لوگوں کی تھوڑی تھوڑی رقم کو اکٹھا کر کے اپنے ہاتھ میں لیتا ہے، پھر جس جگہ چاہے ان کی مرضی اور منشا کے خلاف سود پر سرمایہ کاری کرتا ہے، ڈھیروں سود کماتا ہے اور لاکھوں لوگوں کو بھی اس نامعلوم ذرائع والی سودی آمدن کا حصہ دار بناتا ہے، لیکن بینک ڈوبتا ہے تو کروڑوں لوگ بھی اس کے ساتھ ہی ڈوب جاتے ہیں۔ آج کسی سودی نظام کے حامی سے گفتگو کرو تو وہ یہی کہے گا کسی دکان' فیکٹری یا کاروبار میں رقم مت لگانا، ڈوب جائے گی لیکن دنیا کے ہر ملک میں کئی بینک ڈوبے اور اپنے ساتھ لاکھوں لوگوں کی قسمتوں اور جمع پونجیوں کو بھی غرق کر گئے، لیکن ان کا ذکر کوئی نہیں کرتا اس لیے کہ اگر اس نقصان کا ذکر کریں گے تو سودی نظام کی عمارت گر جائے گی۔ اقبال نے کہا تھا

ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا' لاکھوں کے لیے مرگِ مفاجات

allurdupdfnovels.blogspot.com

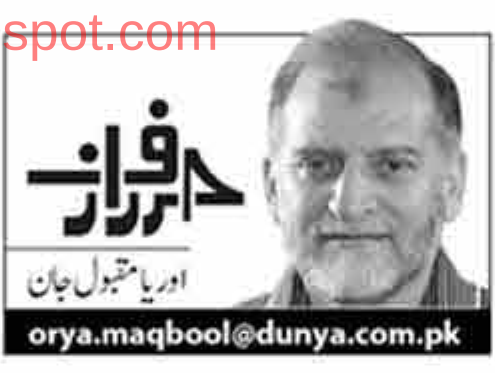

اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

تعصّبات کے پنجروں میں قید

ان لوگوں کا کوئی ماتم نہیں کرے گا۔ یہ خاک نشینوں کا خون تھا' رزق خاک ہوگیا۔ ٹرین کی متروک سواری پر اپنی غربت کی وجہ سے سفر کرنے والے پردیسی لوگ' جن کا مارنے والوں سے کوئی مسلکی اختلاف نہیں تھا۔ کوئی جبہ و دستار پہن کر ٹیلی ویژن پر ان کے حق میں شعلہ فشانی نہیں کرے گا۔ کسی خانقاہ یا مدرسے کے مفتی کو ان قاتلوں کے خلاف فتویٰ دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی جو مفلوک الحال لوگوں کو خون میں نہلاتے ہیں۔

سبی شہر اور اس کا ریلوے اسٹیشن میری خوبصورت یادوں میں سے ایک ہے۔ اس شہر نے مجھے بہت سی محبتوں سے نوازا ہے۔ دو سال اس شہر میں ڈپٹی کمشنر رہنے کے بعد جب میرا تبادلہ ہوا تو پورا شہر مجھے پیدل جلوس کی صورت میں ریلوے اسٹیشن تک چھوڑنے آیا تھا۔ وہ پلیٹ فارم جہاں میں نے ہنستے مسکراتے چہرے دیکھے تھے اور وہی ٹرین جس پر سوار ہو کر میں درۂ بولان کی جانب روانہ ہوا تھا۔ اس پر آگ کے شعلوں میں لپٹی ٹرین دیکھی تو بے اختیار اشک رواں ہوگئے۔ ٹرین کا طویل سفر عجیب ہوتا ہے۔ ایک نشست پر بائیس تئیس گھنٹے گزارنے، گھروں سے لائے ہوئے ناشتہ دانوں کو کھولنے اور مل جل کر کھانا کھانے کے تجربے کا کوئی بدل نہیں۔ تیسرے درجے کے ڈبوں میں تو محبتوں کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے یہاں چوبیس گھنٹے گزارنے والے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ لاہور سے روانگی کے بعد سبی کا ریلوے اسٹیشن آتا تو بیس گھنٹوں کی تھکن امید میں بدلنے لگتی کہ اب کوئٹہ چند گھنٹوں کی مسافت پر ہے۔ یہ سفر بھی خوبصورت ہوتا۔۔۔۔ درہ بولان کی بھول بھلیاں، لمبی لمبی سرنگیں اور کوئٹہ کی خوبصورت وادی۔ سبی ریلوے اسٹیشن سے ہی سفر ختم ہونے کا احساس ہونے لگتا، مسافر سامان درست کرنے لگتے۔ وہ لمحہ ایسا ہی تھا جب ٹرین کے مسافروں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔

اس سے پہلے خضدار کے قریب ایک آپریشن اور اس میں علیحدگی پسندوں کی موت اور پورے علاقے سے ان کا صفایا کرنے کی اطلاعات اخبارات کی زینت بنیں۔ بلوچستان کے دو علاقے ایسے ہیں جو مرکز مخالف اور علیحدگی کی تحریکیں چلنے کے وقت سب کی توجہ کا مرکز بن گئے۔۔۔۔ ایک درۂ بولان کے بالکل درمیان میں بی بی نانی اور پیر غائب کے اطراف کے پہاڑ جہاں سے ایک راستہ منگوچر کو نکلتا اور سپلنجی کے کٹے ہوئے علاقے سے ہو کر گزرتا ہے، انہی پہاڑوں سے دوسرا راستہ مچھ کے پاس سے کوئلے کی کانوں سے گزرتا ہوا مری قبائل کی سرزمین تک جا پہنچتا ہے۔ دوسرا علاقہ سبی کے ساتھ ہرنائی کی ریلوے لائن کے دونوں اطراف پھیلا ہوا ہے جہاں مری قبائل آباد ہیں۔ یہاں سے ایک راستہ کٹ منڈائی والا کو اور دوسرا سبی سے کاہان والا کی جانب نکلتا ہے۔ ان دونوں علاقوں میں حالتِ امن میں بھی فراری کیمپ موجود رہتے ہیں۔ بی بی نانی سے جانے والے راستے پر جسے رودبار کا علاقہ کہتے ہیں، مدتوں سے عبدالنبی بنگلزئی اپنی بندوق تھامے پہاڑوں پر بیٹھا ہے۔ 1977ء سے 1999ء کا عرصہ بلوچستان میں امن اور ترقی کا دور تھا۔ شاہراہیں پُرامن تھیں، اغوا، نہ ڈکیتی اور نہ ہی قتل و غارت، لوگ میلوں ایسی سڑکوں پر سفر کرتے جہاں کئی میل سفر کرنے کے بعد بھی آبادی کا نام و نشان نہ ملتا مگر کسی کے دل میں ڈر یا خوف نہ ہوتا۔ اُس پُرامن دور میں بھی ان دونوں علاقوں میں عبدالنبی بنگلزئی اور توکل کیمپ موجود تھے؛ تاہم یہ ایک علامت سی بن کر رہ گئے تھے۔ لیکن 1999ء کے بعد حالات ایسے ہوئے کہ یہ سلگتے ہوئے کیمپ الاؤ بن چکے ہیں جنہوں نے پورے بلوچستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ مکران میں کسی بھی وقت مسلح جدوجہد کی علامتیں موجود نہ تھیں کہ بالغ نظری اور تعلیم یہاں پورے بلوچستان سے زیادہ ہے۔ مکرانی اعلیٰ سرکاری عہدوں پر سب سے زیادہ فائز تھے اور آج بھی ہیں۔ شعر و شاعری، ادب و فن ان کی میراث ہے۔ یہ صلح جو ہیں، ہتھیار سے دور اور شاعری و ادب کے دلدادہ۔ اب مکران سے ملحقہ علاقے آواران میں شدت پسندی کا ایک تیسرا مرکز پیدا ہو چکا ہے۔ یہاں ڈاکٹر اللہ نذر کی قیادت میں بلوچ مسلح افراد ریاست سے جنگ میں مصروف ہیں۔ یہ اچانک نہیں ہوا۔ کتنے تجزیہ نگار ہیں جو اس کا ماخذ پاکستان سے ریاست قلات کے الحاق سے شروع کرتے ہوئے خان آف قلات کے غیر مشروط الحاق کے خلاف اس کے چھوٹے بھائی شہزادہ عبدالکریم کی بغاوت کو جانتے ہیں جو مکران کا گورنر تھا۔ اس نے وہاں کے اسلحے اور خزانے پر قبضہ کر کے تقریباً پانچ سو ساتھیوں کے ساتھ بغاوت کا اعلان کیا، لیکن اس وقت کے بلوچ رہنماؤں غوث بخش بزنجو اور گل خان نصیر وغیرہ نے اس سلسلے میں سرد مہری کا مظاہرہ کیا۔ عبدالکریم تنہا تھا لیکن افغانستان کی مدد سے اس کی طاقت میں اضافہ ہوا اور اس نے فوج کے خلاف چھاپہ مار کارروائیوں کا آغاز کر دیا۔ یہ بلوچستان بلکہ پاکستان کے معاملات میں پہلی بیرونی مداخلت تھی۔ اس کے بعد 6 اکتوبر 1958ء کو اچانک پاکستانی افواج قلات میں داخل ہوگئیں۔ یہ ملک میں ایوب خان کا مارشل لاء لگنے سے ایک دن پہلے کی بات ہے۔ خان آف قلات کو گرفتار کر لیا گیا، تمام آبائی اشیاء ضبط کر کے تین سو قبائلیوں کو بھی حراست میں لے لیا گیا۔ یہ ملک میں مارشل لاء لگانے کا ایک بہانہ تھا۔ صرف دڑھ میں تھوڑی بہت جھڑپیں ہوئیں۔ یہاں وہ مشہور واقعہ پیش ہے جو آج بھی بلوچوں کو یاد ہے۔ نواب نوروز خاں کو قرآن پر حلف دے کر پہاڑوں سے اتارا گیا لیکن اسے عمر قید سنائی گئی اور اس کے ساتھیوں کو پھانسی دے دی گئی۔ اس قصے کے ساتھ دھوکے اور قرآن سے بے وفائی کی کہانیاں بلوچوں میں زبانِ زد عام ہیں۔

بلوچستان میں اصل خرابی مقبول ترین عوامی رہنما ذوالفقار علی بھٹو کی عدم برداشت کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ بلوچستان اور سرحد میں بھٹو کی مخالف حکومتیں تھیں جو ان کے مزاج کو گوارا نہیں تھیں۔ پھر عالمی سازش کا تانا بانا بُنا گیا، لندن پلان، عراق کے سفارت خانے سے اسلحہ کی برآمدگی اور پھر بلوچستان پر فوج کشی۔ تمام بلوچ رہنما جن میں آئین پاکستان پر حلف اٹھانے والے غوث بخش بزنجو، عطاء اللہ مینگل، گل خان نصیر اور خیر بخش مری شامل تھے، سب کے سب غدار قرار پائے۔ اسی زمانے میں سبی کے اردگرد پہاڑوں اور خضدار کے نواحی علاقوں میں فراری کیمپ قائم ہوئے۔ ضیاء الحق نے عام معافی کا اعلان کیا تو پانچ سال کی مسلح جدوجہد سے اکتائے ہوئے بلوچوں نے اسے غنیمت جانا۔ اس وقت بھی اس ساری جدوجہد کو افغانستان میں پناہ ملتی اور روس اور بھارت کی جانب سے مالی اور تکنیکی مدد۔ اب اس راز کو بلوچستان میں بسنے والا ہر شخص جانتا ہے۔ یہ پاکستان میں دوسری بیرونی مداخلت تھی لیکن اس دفعہ ہم بھی اس کے قصوروار تھے۔ ہماری انا کے بت نے بلوچوں کو چکنا چور کر دیا۔ ان کے اندر جو آگ مدتوں سلگ رہی تھی وہ بھڑک اٹھی بلکہ شعلہ جوالہ بن گئی۔ اس کے بعد یہ آگ ٹھنڈی ہوگئی اور تقریباً 22 برس ٹھنڈی رہی۔ نفرتیں، تعصب، دشمنی ایسی چیزیں اس صوبے سے کہیں دور جا بسیں۔ ایسے میں پرویز مشرف آ گیا۔ ایک اور انا پرست، خود کو عقل کُل اور طاقت کا سرچشمہ سمجھنے والا۔ نواب اکبر بگٹی کی بے وجہ ہلاکت اور پھر اس سے شروع ہونے والے ردِّعمل نے دونوں جانب کی بندوقوں کو آمنے سامنے کر دیا۔ لیکن اس دفعہ صرف افغانستان اور بھارت نہیں بلکہ تقریباً ایسے سات سے زیادہ ملک ان کی پشت پر ہیں جن کا مفاد اس میں ہے کہ اس خطے میں بدامنی اور انتشار رہے۔ یہ بہت تفصیل طلب قصہ ہے جسے مسند اقتدار پر بیٹھے سب لوگ جانتے ہیں بلکہ اب تو بلوچوں کا بچہ بچہ بھی جانتا ہے کہ کون کہاں سے کیا کچھ حاصل کر رہا ہے۔ لیکن یہ چنگاری ہماری تھی جسے آگ دکھانے کا کام دوسروں نے کیا۔ اس آگ میں ہمارا گھر جل رہا ہے مگر اس کا دکھ تبصرہ نگاری تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ ہم ظالم اور متعصب ہیں کہ ہمارے معیارات الگ الگ ہیں۔ ہم مون مارکیٹ، اسلام آباد اور راولپنڈی کے دھماکوں کا برسوں ماتم کرتے ہیں لیکن بسوں سے اتار کر شناختی کارڈ دیکھ کر قتل کیے جانے والے پنجابیوں کا صرف ایک خبر میں تذکرہ کر کے خاموش ہو جاتے ہیں۔ ہم طالبان کی قتل و غارت کو دہشت گردی اور بلوچستان کی بربریت کو حقوق کی جنگ کہتے ہیں۔ یہ سب ہمارا المیہ ہے۔ اس ملک کے بسنے والے اب یہ جان گئے ہیں کہ ہر مسلک کا بندہ اپنے ہم مسلک کی حمایت کرے گا۔ ڈاکٹر، وکیل، بلوچ، پشتون، پنجابی سب اپنے اپنے تعصب کے پنجرے میں قید ہیں۔ ان پنجروں سے رہائی کے بغیر صرف تباہی ہے جو ہمارا شدت سے انتظار کر رہی ہے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

روزنامہ دنیا

ٹیکنالوجی اور کلچر

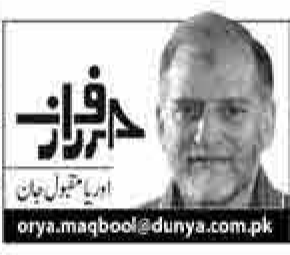

حرف راز
اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

مغرب زدہ نظامِ تعلیم کے پروردہ اور ابتدائی تعلیم سے ہی مرعوبیت کی لوریاں سن کر جوان ہونے والے افراد اپنے سیکولر استادوں کی خودساختہ منطق سے بنائے گئے تصورات میں سے ایک تصور عام طور پر پیش کرتے نظر آتے ہیں کہ جس ملک سے ٹیکنالوجی آتی ہے' اس کے ساتھ اس ملک کا کلچر بھی آتا ہے۔ جس معاشرے کی ٹیکنالوجی پر برتری ہوگی، اسی کی بالادستی قائم ہوگی۔ ان لوگوں کے نزدیک کلچر اور ثقافت دراصل گاڑیاں، ایئرکنڈیشنر، برقی سازوسامان، صوفے اور کرسیاں یا دیگر استعمال کی چیزیں ہوتی ہیں اور اسی کو وہ مکمل کلچر تصور کرلیتے ہیں۔ کلچر کی تمام تعریفوں میں ایک بات مشترک ہے کہ یہ ایک Complex whole ہے' یعنی ایک قوم یا معاشرے کی ثقافت میں اس کی زبان، رہن سہن، کھانا پینا، اخلاقیات، مذہبی رسومات، پہناوا، شادی بیاہ، موت، رقص، موسیقی، جنگ وجدال، دوستی ودشمنی غرض ہر وہ چیز شامل ہوتی ہے جو اس قوم کے لیے خاص ہوتی ہے۔ اسے آج کے ''مہذب'' معاشرے میں لائف سٹائل کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ وہی لائف سٹائل ہے' جس کے تحفظ کے لیے پوری مغربی دنیا گیارہ ستمبر کے بعد عالمِ اسلام کے خلاف متحد ہوگئی تھی۔ یہی وہ وقت تھا جب جارج بش اور ٹونی بلیئر نے اپنی اپنی تقریروں میں ایک ہی نعرہ استعمال کیا تھا کہ ''یہ لوگ ہمارا لائف سٹائل ہم سے چھیننا چاہتے ہیں۔ لائف سٹائل کے تحفظ ہی کی کوشش تھی کہ فرانس کی پارلیمنٹ کو صرف 92 حجاب پہننے والی عورتوں کے خلاف قانون سازی کرنا پڑی۔ اس لیے کوئی ملک اگر یہ کہتا ہے کہ اس کا کوئی نظریہ نہیں تو وہ غلط بیانی کررہا ہوتا ہے۔ مغربی ممالک جس چڑیا کو اپنا لائف سٹائل اور طرزِ زندگی کہتے ہیں، وہی ان کا نظریہ ہے اور وہ اس کے تحفظ کے لیے جس ملک پر چاہیں چڑھ دوڑیں، قتل وغارت کریں، پورے پورے شہر کھنڈر بنادیں' اسے جائز قرار دیتے ہیں۔

کیا ٹیکنالوجی کی برتری کسی معاشرے کے خوابوں، امنگوں، امیدوں، اخلاقیات، گھریلو اقدار اور معاشرتی رویے پر اثر انداز ہوسکتی ہے؟ یہ ہے وہ سوال جو ہر مغرب زدہ شخص ہم سے پوچھتا ہے اور پھر خود ہی اس کا ''ہاں'' میں جواب دیتا ہے کہ اگر ہم مغرب کی ٹیکنالوجی استعمال کریں گے تو ہمیں ان کا کلچر بھی لینا ہوگا۔ مملکتِ خداداد پاکستان کے بارے میں جاپان کا ایک دعویٰ ہے کہ اس ملک کا کوئی ایک گھر بھی ایسا نہیں جس میں جاپان کی بنی ہوئی کوئی چیز موجود نہ ہو' خواہ وہ ایک چھوٹی سی آڈیو کیسٹ ہی کیوں نہ ہو۔ کاریں' ٹیلی ویژن' ریفریجریٹر بلکہ بے شمار اشیاء ہیں جو جاپان سے آتی ہیں۔ اس کے بعد دوسرا بڑا ملک جس کی مصنوعات ہم دھڑا دھڑ استعمال کرتے ہیں' چین ہے۔ چین نے تو ہماری اپنی مصنوعات کی کھپت ہی اس ملک میں ختم کرکے رکھ دی ہے۔ بجلی کے سوئچوں سے لے کر جوتوں اور فرنیچر سے لے کر ٹائلوں تک' کون سی چیز ہے جو چین سے درآمد نہیں ہوتی اور ہم استعمال نہیں کرتے۔ لیکن کیا اس ملک کے کسی کونے میں چین یا جاپان کے کلچر کا کوئی محدود سا اثر بھی نظر آتا ہے؟ کیا ہم نے جاپانیوں کی طرح وعدہ خلافی پر اپنی انگلیاں کاٹنا شروع کردی ہیں؟ یا دھوکہ کا الزام ثابت ہونے پر شرمندگی سے بچنے کے لیے خودکشی شروع کی ہے؟ ہم ان کی طرح جھک کر آداب کرنے لگے ہیں؟ ہم گھروں کے اندر زمین پر سوتے ہیں یا پھر کئی بار کورنش بجالا کر چائے پیتے ہیں؟ ہم تو جاپانی کھانوں میں سے کوئی ایک کھانا بھی نہیں کھاتے جبکہ ہمارے کھانے جاپان کی بنائی ہوئی مصنوعات میں پکتے اور گرم ہوتے ہیں۔ یہی معاملہ چین کا ہے۔ کیا سوائے چینی کھانوں کے' جو خود انہوں نے دنیا بھر میں متعارف کرائے، چینی ثقافت کا کوئی اور پہلو ہمارے معاشرے میں نظر آتا ہے؟ کیا برقی مصنوعات یا دیگر نئی دریافتیں ہماری اقدار بدل دیتی ہیں؟ ہمارے شرم وحیا کے اصول تبدیل ہوجاتے ہیں؟ دنیا میں کتنے ایسے معاشرے ایسے ہیں جہاں ٹیکنالوجی سیلاب کی صورت آئی لیکن تمام معاشرتی اقدار قائم رہیں۔ جاپان ہی کو دیکھ لیجیے' جو اپنی اخلاقیات اور رہن سہن کے اعتبار سے آج بھی کئی سو سال پہلے کی معاشرتی حالت پر کھڑا ہے۔ وہاں بلٹ ٹرین چلتی ہے، اونچی اونچی عمارات بنی ہیں لیکن ان جاپانیوں کے قصے کہانیاں بدلی ہیں اور نہ ہی رہنے کے اصول۔ ان کے خواب، ان کے ہیرو، ان کے معاشرتی اصول سب کے سب آج بھی وہی ہیں۔

کسی بھی ملک کا کلچر، ٹیکنالوجی کی ترقی سے نہیں بدلتا بلکہ اس نصابِ تعلیم سے بدلتا ہے جو ہم بلا سوچے سمجھے اپنے اوپر لاگو کرلیتے ہیں۔ اس میڈیا سے بدلتا ہے جس پر ہم اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ جس طرح کی چاہیں فحاشی' عریانی اور بے حیائی اور بے شرمی دکھائیں' ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ کوئی موبائل فون یا ٹیلی ویژن فحش نہیں ہوتا بلکہ اس کے پیچھے بیٹھے انسان ہوتے ہیں جو اسے پراگندہ کرتے ہیں۔ ہم نے کئی سالوں کی محنت سے بچوں کو وہ کارٹون دکھائے، کومکس پڑھائیں، گیت اور کہانیاں سنائیں جن میں وہ کلچر موجود تھا جو کسی بھی مغربی معاشرے میں مروج تھا۔ شراب کشید کرنے کے تہوار سے لے کر فادرز ڈے اور مدرز ڈے تک سب کے سب ہماری محنت اور لگن سے ہی ہمارے لوگوں تک پہنچے۔ ان میں کسی ٹیکنالوجی نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا کہ اگر ایسا ماحول نہ ہوگا تو ٹیلی ویژن چلنے سے انکار کردے گا یا مائیکرو یو کھانا نہیں گرم کرے گا۔

دنیا میں جہاں کہیں بھی کسی دوسرے علاقے کے کلچر کو فروغ ملا اس کی صرف دو وجوہ تھیں۔ ایک یہ کہ وہاں کے حملہ آوروں نے اسے فتح کیا' وہاں مدتوں حکومت کی اور پھر فاتحین کے کلچر نے وہاں زبردستی اپنی جگہ بنائی۔ دوسرا کسی بھی معاشرے میں سے لوگوں کی دوسرے علاقوں کی طرف ہجرت نے وہاں کے رہن سہن اور طور طریقوں حتیٰ کہ مذہب کو بھی بدل دیا۔ امریکہ دریافت ہوا تو وہاں کے ریڈ انڈین کلچر کو کسی ٹیکنالوجی نے نہیں' قتل وغارت اور ظلم وستم نے تباہ کیا تھا۔ جن ملکوں کو برطانیہ، سپین، فرانس، ہالینڈ اور پرتگال نے فتح کیا' وہاں زبردستی اپنا کلچر نافذ کیا۔ اس دور میں اس کا ہتھیار نظامِ تعلیم تھا اور آج اس کے دو ہتھیار ہیں نظامِ تعلیم اور میڈیا۔ کلچر نہ فزکس پڑھانے سے بدلتا ہے اور نہ کیمسٹری سے۔ کلچر دوسرے ملکوں کے کلچر کو غالب دکھانے اور اس کو قصے کہانیوں کے ذریعے ذہنوں پر نقش کرنے سے بدلتا ہے۔ حیرت یہ ہے کہ جاپان' جس کی ترقی یافتہ تہذیب بھی ہے' ٹیکنالوجی پر مکمل کنٹرول بھی رکھتا ہے اور پوری دنیا اس سے مستفید بھی ہوتی ہے لیکن اس کا کلچر کسی دوسرے ملک میں پروان نہیں چڑھتا مگر امریکہ صرف جنگی سازوسامان ہی بھیجے تو لوگ اس کے کلچر کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

تیسری عالمی جنگ کس کے درمیان ہوگی

تین ماہ قبل عراق میں لڑنے والے عسکریت پسند گروہ انصار الاسلام نے اپنے نئے تربیتی کیمپ کی ایک ویڈیو جاری کی جس کا نام تھا "معسکر شہید عبدالرشید غازی"۔ ویڈیو کے آغاز میں مختلف کیمپوں میں جنگی مشقیں کرتے ہوئے جنگجوؤں کو دکھایا گیا ہے۔ یہ حصے اس مہارت سے ایڈٹ کئے گئے ہیں کہ کسی شخص کا چہرہ واضح نظر نہیں آتا۔ اس کے بعد لال مسجد کے عبدالرشید غازی کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے اور پھر ان کی جانب سے ایک پیغام "امت کے مردوں کے نام" پڑھ کر سنایا جاتا ہے۔ یہاں پس پردہ کمنٹری دو زبانوں میں ہو رہی ہوتی ہے، ایک عربی اور دوسری کُردش۔ تمام کے تمام عسکریت پسندوں نے کُردوں والی شلوار زیبِ تن کی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کے بعد لال مسجد کے اردگرد فوجیوں کی صف بندیاں دکھائی گئی ہیں اور پھر آپریشن کے بعد لال مسجد کے مختلف حصے نظر آتے ہیں اس کے ساتھ ہی اسامہ بن لادن کے بیان کا ایک اقتباس سکرین پر آتا ہے جس میں عبدالرشید غازی کو ایک ہیرو قرار دیا گیا ہے۔ سب سے اہم ترین حصہ آخر میں ایک جہادی ترانہ ہے جو اُردو میں ہے جس کا ترجمہ عربی اور کردش زبانوں میں سب ٹائٹل کی صورت میں دکھایا جاتا ہے۔ یوں تو انصار الاسلام جولائی 2001ء میں عراق کے کرد علاقے کے دو گروہوں جند الاسلام اور اسلامک موومنٹ آف کردستان کے ادغام سے بنی اور اس نے اپنی تنظیم کو مضبوط بھی بنایا لیکن جب عراق پر امریکی حملے سے قبل سی آئی اے اپنے (Division Special Activities) اور پینٹاگون نے دسویں سپیشل فورسز گروپ کی ٹیموں کو کردستان بھیجا اور وہاں کی قوم پرست تنظیم "پش مرجا" کو ساتھ ملا کر انصار الاسلام کے خلاف خفیہ حملے شروع کیے تو ان کے ساتھیوں کو خاصہ نقصان اٹھانا پڑا۔ جارج بش نے جب امریکی سینٹ کے سامنے عراق پر حملے کا جواز پیش کیا تو ایک الزام یہ لگایا کہ صدام حسین کو انصار الاسلام کی خبر ہے اور وہ اس کے ذریعے القاعدہ سے روابط میں ہے۔ فروری 2003ء میں امریکی وزیر خارجہ کولن پاول نے اقوام متحدہ میں تقریر کرتے ہوئے اسی تنظیم کا ذکر کیا صدام حسین کو اس کا سرپرست قرار دیا جب کہ انصار الاسلام کا سربراہ صدام حسین کو ایک قوم پرست کی حیثیت سے اپنا بدترین دشمن قرار دیتا تھا۔

اس کے بعد کی کہانی طویل بھی ہے اور دلگداز بھی۔ امریکہ کا عراق پر حملہ، لاکھوں انسانوں کا قتل عام، جمہوری نظام کا طاقت کے زور پر نفاذ، آئین، پارلیمنٹ، منتخب حکومت اور سب سے بڑھ کر امریکہ کی تربیت یافتہ ایک نئی فوج کی تخلیق۔ دنیا کو بتا دیا گیا کہ ہم نے ایک ملک میں آمریت کا خاتمہ کر کے جمہوریت نافذ کر دی ہے۔ عالمی سرحدوں کی پامالی اور ذلت کا موجودہ تاریخ میں افغانستان کے بعد یہ دوسرا بڑا واقعہ تھا۔ اس کے بعد یہ دونوں ملک ایک گزرگاہ بن گئے۔ وہ عالمی برادری جس نے اقوام متحدہ بناتے وقت ایک دوسرے کی سرحدوں کے احترام کا عہد کیا تھا، جب اس نے ہی انہیں پاؤں تلے روند ڈالا تو پھر وہ لوگ جو ان کے خلاف لڑ رہے تھے۔ ان کے لیے بھی سرحدیں بے معنی ہو کر رہ گئیں۔ شام کا معرکہ شروع ہوا تو جہاں عراق کی سرزمین سے ہوتے ہوئے ایران کے پاسداران، اور لبنان سے حزب اللہ کے دستوں نے شام کا رخ کیا تو وہ لوگ اور گروہ جو عراق میں امریکی افواج اور پھر اس کی قائم کردہ جمہوری حکومت سے لڑ رہے تھے انہوں نے بھی شام کا رخ کر لیا۔ شام جو اس وقت مسلم امہ کی دو استعماری قوتوں ایران اور سعودی عرب کی خطے پر بالادستی کی جنگ میں آگ اور خون کے دریا سے گزر رہا ہے۔ ان دونوں طاقتوں کی پشت پر عالمی بالادستی کی خواہش میں پاگل عالمی طاقتیں خونیں پنجے لہرائے کھڑی ہیں۔ ایک جانب امریکہ اور مغرب ہے تو دوسری جانب روس اور چین۔ دونوں جانب کے ممالک کسی سرحد پر روایتی فوجی جنگ نہیں لڑ رہے بلکہ شام کی سرحد کی عصمت چاروں جانب سے تار تار کر دی گئی۔ یہ اس نظام کا حال ہے جسے عالمی قومی ریاستوں کی حرمت اور اقتدار اعلیٰ سے عبارت سمجھا جاتا ہے۔ ایسے وہ لوگ جو اس ساری تقسیم اور عالمی ریاستی دہشت گردی کے زخموں سے چور تھے انہوں نے بھی زمین کے نقشے پر ڈالی ہوئی ان لکیروں کو تار تار کر کے رکھ دیا۔ اس کی تازہ ترین مثال "دولت الاسلامیہ فی العراق والشام" ہے جسے اس وقت پوری مغربی دنیا "آئی ایس آئی ایس" کے نام سے جانتی ہے اور ان کی تازہ ترین کامیابیوں سے پورا مغربی میڈیا خوفزدہ نظر آرہا ہے۔ اس لیے کہ وہ فوج جسے امریکی افواج نے تربیت دی اور جسے وہ ایلیٹ Elite فورس کہتے تھے اور جس کے بارے میں پورا مغربی میڈیا یہ تاثر دیتا رہا کہ اب عراق میں امریکی فوج کا نعم البدل میسر آگیا ہے۔ یہ ایلیٹ فوج عراق کے دوسرے بڑے شہر موصل سے ایسے بھاگی کہ اپنے ہیلی کاپٹر، ٹینک، بکتر بند گاڑیاں اور اسلحہ تک چھوڑ آئی۔ افواج کسی نظریے کی بنیاد پر قربانی دیا کرتی ہیں، خواہ وہ مادرِ وطن ہو یا مذہب، نسلی برتری کا تصور ہو یا علاقائی غلبے کی آرزو۔ مراعات سے بہترین ٹریننگ اور شاندار نوکری تو کی جاسکتی ہے لیکن مرنے کا جذبہ مفقود ہوتا ہے۔ صلاح الدین ایوبی کی قوم کُرد جسے مغربی دنیا نے چار ملکوں شام، ترکی، عراق اور ایران میں تقسیم کیا تھا۔ اس آئی ایس آئی ایس میں ان کا ایک بڑا حصہ شامل ہے۔ یہ ان مصنوعی سرحدوں کو تسلیم نہیں کر رہے۔ لیکن اس جنگ کے جیتنے اور وسیع علاقے پر قبضے کے بعد ایک خطرہ اور ہے جو پوری مسلم امہ کو اپنی لپیٹ میں لے سکتا ہے۔ اب اس جنگ میں نظریہ شامل ہو چکا ہے۔ آئی ایس آئی ایس خود کو ایک سنی تنظیم کہلاتی ہے اور اس نے شام اور عراق کے سنی علاقوں کے وسیع حصے پر قبضہ کر لیا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو القاعدہ سے علیحدہ بھی کر لیا ہے اور اس کے نظریات بہت شدت پسند ہیں۔ اب ان کے سامنے لڑائی کے لیے شیعہ اکثریت کے علاقے ہیں۔ اس جنگ میں اب ریاستیں خود سرحدوں کی حرمت کو پامال کرنا چاہتی ہیں۔ ایران سے پاسداران کا ایک قافلہ وہاں پہنچ چکا۔ دنیا کے ہر ملک میں اپنے مقدس مقامات کے تحفظ کے نام پر تیاریاں ہو رہی ہیں۔ آئی ایس آئی ایس کے ساتھ مغربی ممالک انگلینڈ، فرانس اور بقیہ یورپی ممالک کے رضاکاروں ساتھ ساتھ امریکی شہری بھری لڑ رہے ہیں۔ یہ وہ کشت و خون ہے جس کا خواب مغرب مدتوں سے دیکھ رہا ہے اور اب اسے یہ پورا ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ اس لیے کہ پوری امتِ مسلمہ میں اتحاد کی آواز بلند کرنے والا کوئی نظر نہیں آرہا۔ ہر عالم دین کی اپنی فقہ اور اپنے مسلک کے مطابق شہید اور جہنم رسید ہیں۔ ایک کے مقدس مقامات دوسرے کے لیے مسمار کرنے کے لائق ہیں دوسرے کی مقدس شخصیات پہلے کے لیے دشنام اور لعنت و ملامت کی علامت۔ ہر کوئی اپنے مسلک کے لوگوں کا تحفظ چاہتا ہے خواہ وہ کسی بھی ملک میں ہوں اور خواہ ان کو بچانے کے لیے کتنی ہی سرحدیں کیوں نہ عبور کرنا پڑیں۔ جو گروہ ریاست کے ساتھ ہے وہ ان کے لیے امن کا علمبردار اور حق پر ہے جبکہ جو گروہ حکومت کے خلاف ہے وہ ان کے لیے دہشت گرد اور باغی ہے۔ جمہوری، قومی اور سیکولر ریاستوں کا یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ کسی بھی گروہ کو دہشت گردی، اغواء برائے تاوان، بے رحمانہ معصوم لوگوں کا قتل اور بھتہ خوری کا مصدقہ لائسنس لینے کے لیے دو کڑی شرائط سے گزرنا ہوتا ہے، ایک یہ کہ وہ ریاست کے آئین کو مانتا ہو اور دوسرا اس کی پارلیمنٹ میں عددی نمائندگی موجود ہو۔ اس کے بعد آپ قوم پرست بن کے حکومت کی رٹ کا مذاق اڑائیں یا مسلک کے نام پر دوسرے مسلک کی اقلیت پر زندگی تنگ کر دیں۔ آپ حق پر بھی ہیں اور جائز بھی کیونکہ آپ نے اس عالمی ریاستی نظام کو قبول کر لیا ہے۔ جسے اس دور میں قومی ریاست کہتے ہیں۔

مسلم امہ میں اس وقت پچاس سے زیادہ قومی ریاستیں ہیں۔ ان میں سے افغانستان، عراق اور لیبیا کی سرحدوں کی بے حرمتی بڑی ریاستوں نے براہِ راست فوج کشی سے کی اور باقی کئی ریاستوں میں ایران اور سعودی عرب نے اسلحہ، سرمایہ اور افرادی قوت سے ان کی سرحدوں اور اقتدار اعلیٰ کو خاک میں ملایا۔ ان تمام شورش زدہ علاقوں میں ریاستیں دہشت گردوں کے خلاف اس لیے آپریشن کر رہی ہیں کہ ان کی حکومتی بقا کا مسئلہ ہے۔ دوسری جانب ان ریاستوں کے خلاف لڑنے والے بھی ان تمام سرحدوں کو تسلیم نہ کرتے ہوئے ہر اس ریاست سے لڑ رہے ہیں جو ان کے مسلک یا نظریے کے خلاف ہے۔ جنگ عظیم اوّل اور دوم ریاستوں کی آپس میں جنگ تھی لیکن شاید تیسری جنگ عظیم ریاستوں اور ان کے مدمقابل گروہوں کی جنگ ہو گی۔ یہ جنگ کون جیتتا ہے یہ تو وقت بتائے گا لیکن جو تصور اور نظریہ جنگ کے آغاز میں ہی ہار چکا ہے وہ سرحدوں کے تقدس کا ہے۔ سب بے معنی ہو کر رہ گئیں ہیں۔ ان کی عزت اور حرمت نہ حکومتیں کرتی ہیں اور نہ حکومت کے خلاف لڑنے والے افراد اور گروہ۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

تہمتیں دھر کر فساد پھیلانے والوں کو قائداعظم کا جواب

حرف راز
اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

قائداعظم محمد علی جناح وہ عظیم رہنما تھے‘ جنہیں اللہ نے ایسے دور میں ایک اسلامی ریاست کی بنیاد رکھنے کے لیے چُنا جب پوری دنیا میں سیکولر تصور کے تحت نسل، رنگ، زبان اور علاقے کو بنیاد بنا کر قومی ریاستیں وجود میں آ رہی تھیں۔ پوری دنیا کے انسانوں کو اسی بنیاد پر تقسیم کر کے بہت بڑے چڑیا گھر میں تبدیل کیا جا رہا تھا۔ جنگ عظیم اوّل کے بعد لیگ آف نیشنز بنی تو 1920ء میں اس نے پاسپورٹ کا ڈیزائن منظور کیا۔ 1924ء میں ویزا ریگولیشن، آئین اور پھر بارڈر سکیورٹی فورسز کے ذریعے ایک پنجرے کے انسانوں کو دوسرے پنجرے میں جانے سے روک دیا گیا۔ ایسی ریاستیں وجود میں آ رہی تھیں جن کی بنیاد خالصتاً نسلی اور علاقائی تھی۔ یہی طاقتور نظریہ برصغیر پاک و ہند پر بھی لاگو ہونے کو تھا، ایک ایسا آزاد ہندوستان جس میں کسی بھی قسم کی جمہوری حکومت اپنے جمہوری اصولوں کے مطابق اکثریت کی آمریت (Tyrany of Majority) نافذ کرتی۔ اس بدترین مستقبل کو صرف وہ لوگ محسوس کر رہے تھے جنہیں اللہ نے چشم بینا عطا کی تھی۔ برصغیر کے مسلمانوں کے لیے اور کوئی راستہ باقی نہ تھا کہ وہ متحدہ ہندوستان کی قومی ریاست کا حصہ بن جائیں یا پھر ایک نعرۂ مستانہ بلند کرتے ہوئے یہ اعلان کریں کہ بے شک ہم زبان ایک بولیں، لباس ایک جیسا پہنیں، کھانا ایک جیسا کھائیں، گیت ایک جیسے گائیں لیکن ہم علیحدہ قوم ہیں اس لیے کہ ہم کلمہ طیبہ پڑھتے ہیں۔ یوں قومی ریاستوں کے مینا بازار میں ہندوستان میں بسنے والے بنگالیوں، پنجابیوں، بلوچوں، پشتونوں اور سندھیوں نے اپنی قومیتوں کا انکار کرتے ہوئے ایک اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی۔ یہ تاریخ کا ایک معجزہ تھا جس کے لیے اللہ نے قائداعظم محمد علی جناح کو منتخب کیا۔ ایسے معجزے کے لیے جو قیادت ضروری ہوتی ہے اسے بصیرت کی آنکھ بھی عطا ہوتی ہے۔

بصیرت کی اس آنکھ کا تذکرہ اس لیے کر رہا ہوں کہ آج بعض لوگ قائداعظم کے کردار اور نظریے کو اپنے مخصوص خیالات کے تعصب سے داغدار کر رہے ہیں۔ قائداعظم کے زمانے میں بھی ایسے لوگ موجود تھے اور قائداعظم نے ان لوگوں کو اپنی زندگی میں ہی مخاطب کرتے ہوئے ایک ایسا جواب دیا تھا اور ان کے رویے کو ایسے الفاظ سے یاد کیا تھا جو اس قدر واضح ہیں کہ آنے والی کئی صدیوں میں بھی محققین قائداعظم کی اسلامی شریعت کے نفاذ سے وابستگی کو دھندلا نہیں سکتے۔ ایسے طبقات پاکستان کے قیام سے پہلے بھی ہندوستان میں موجود تھے اور آج بھی ہیں۔ ان کے لیے یہ بات انتہائی حیرت، استعجاب اور دکھ کی تھی کہ اسلام کے نام پر بھی کوئی ملک قائم ہو سکتا ہے۔ انہوں نے اپنے مروّجہ علم سے مذہب کے نام پر قومیت کا خانہ ہی کھرچ دیا تھا۔ ان میں انگریز کے سو سالہ دور غلامی کی پیداوار بیوروکریٹ، انگریزی رنگ ڈھنگ میں رچے فوجی افسران، انگریز کی عطا کردہ مراعات سے بننے والے وڈیرے، خان، چودھری اور سردار شامل تھے۔ ان کے ہمراہ وہ دانشور طبقہ بھی تھا جن کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک ملک کلمۂ طیبہ کی بنیاد پر وجود میں آئے گا اور پھر اس کے رہنما اس ملک میں شریعت کو نافذ کرنے کی کوشش کریں گے، وہ شریعت جسے یہ لوگ فرسودہ اور ناقابلِ نفاذ ثابت کرنے میں وہ اپنی توانائیاں صرف کرنے میں عمریں گزار چکے تھے۔ پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بحث چھیڑ دی کہ یہ ملک اسلام کے لیے نہیں بلکہ مسلمانوں کے لیے بنایا گیا ہے۔ یہ معاشی وجوہ پر بنا، لہٰذا اس کا قانون موجودہ ماڈرن ریاستوں کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ ایسی باتیں اس عظیم لیڈر قائداعظم تک بھی پہنچیں... وہ جو اس خطے کے مسلمان شہیدوں کے خون کا امین تھا، جسے علم تھا کہ یہاں دس لاکھ لوگوں نے کس مقصد کے لیے جان دی ہے، یہ نحیف و نزار مگر عزم و استقلال کا پیکر ان سازشی چہروں کو بے نقاب کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ایک ایسے فورم کا انتخاب کیا جہاں سب قانون دان جمع ہوں اور اس کے کہے ہوئے ایک ایک لفظ کو سمجھتے ہوں۔ قائداعظم نے ان سیکولر طبقات کی شرارتوں کا ذکر کرتے ہوئے تقریر کا آغاز کیا اور اپنا اور اس ملک کے قیام کا نظریہ پوری وضاحت سے بیان کیا۔ 25 جنوری 1948ء کو سندھ بار ایسی ایشن، کراچی میں خطاب کرتے ہوئے اس عظیم قائد نے کہا:

"Why this feeling of nervousness that the future constitution of Pakistan is going to be in conflict with the shariat Law— there are people who want to create a mischief and make the propaganda that we will scrap Shariat Law. Islamic Principles have no Parallel. Today they are as applicable in actual life as they were 1300 years ago.

میں نے اصل انگریزی عبارت اس لیے تحریر کر دی ہے تاکہ قائداعظم کے اصل الفاظ میں چھُپی اس نفرت کو ملاحظہ کیا جا سکے جو انہوں نے ایسے عناصر کے خلاف دکھائی تھی جو انہیں اس دور میں سیکولر اور اسلامی شریعت کے مخالف ثابت کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ تقریر کا ممکن حد تک ترجمہ یہ ہے:

”یہ پریشانی اور ہیجان کیوں ہے کہ پاکستان کا آئندہ آئین اسلامی شریعت سے متصادم ہوگا۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو تہمتیں دھر کے فساد پھیلانے والے ہیں اور پروپیگنڈہ کر رہے ہیں کہ ہم شریعت کے قانون کو اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں۔ اسلامی اصولوں کا کوئی نعم البدل نہیں۔ یہ آج بھی اسی طرح نافذ العمل ہیں جس طرح تیرہ سو سال پہلے تھے“۔

یہ ہے اس قائداعظم کا جواب‘ ان سب سیکولر دانشوروں کو جو آج ان کی ذات میں کیڑے نکالنے کے لیے کبھی سٹینلے والپرٹ اور کبھی ہیکٹر بولتھیو کی کتابوں کی ورق گردانی کرتے پھرتے ہیں، کبھی ان کے زمانہ طالب علمی کے خدوخال سے انہیں نئے مطالب پہناتے ہیں، کبھی ان کے لباس اور رہن سہن سے انہیں سیکولر ثابت کرتے ہیں۔ اگر سارا یورپ آج مسلمان ہو جائے تو کیا یورپ کے مسلمان دھوتی پہننے لگیں گے؟۔ آدمی مسلمان یا سیکولر نظریات سے ہوتا ہے، لباس سے نہیں۔ قائد نے اپنی آخری تقریر‘ جو سٹیٹ بینک کے افتتاح کے موقع پر کی تھی، میں سودی نظام کے خلاف جنگ کا اعلان کیا تھا اور وہ اس لشکر کا حصہ بن گئے تھے جو اللہ اور اس کے رسول کا لشکر ہے۔ اللہ نے پورے قرآن میں صرف سود کے خلاف جنگ کا اعلان کیا ہے، کیا وہ قائد جو اس جنگ میں شریک ہو، سیکولر ہو سکتا ہے؟ مجھے یہاں قائداعظم کی زندگی اور طرزِ زندگی سے مثالیں دے کر ثابت نہیں کرنا کہ وہ کیسے نظریات رکھتے تھے۔ میں ایسے لوگوں کا جواب بھی نہیں دینا چاہتا کہ اس ساری بحث کا مقصد قائداعظم کی شخصیت کو متنازع بنانا ہے۔ آج یہ سیکولر دانشور بھی ویسے ہی لوگ ہیں جن کی تحریروں، گفتگو اور طرزِ سیاست سے قائد کو زندگی میں اس قدر صدمہ پہنچا کہ نپی تلی اور محتاط گفتگو کرنے والے قائداعظم نے ایسے افراد کے لیے (Mischief) کا لفظ استعمال کیا جس کا عرف عام میں مطلب ”تہمتیں دھر کے فساد پھیلانے والے“ (ترجمہ کتابستان کی لغت سے) ہے۔ قائداعظم نے یہ نام ان کو دیا جو ان کے بارے میں یہ تاثر پھیلاتے تھے کہ وہ اس ملک میں اسلامی شریعت نافذ نہیں کرنا چاہتے۔ یہ 1948ء میں بھی موجود تھے اور آج بھی... تہمتیں دھر کر فساد پھیلانے والے!

allurdupdfnovels.blogspot.com

تجھے آباء سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی

حرف راز
اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

میوزیم کی نیم تاریک گزرگاہوں میں شیشے کی بند الماری میں رکھی ہوئی تلواروں' چادر اور دیگر نوادرات کے ساتھ لکھی ہوئی تحریر گزشتہ تین گھنٹوں سے مجھے ایک ایسی کیفیت میں مبتلا کیے ہوئے ہے جہاں سے نکلنا میرے لیے بہت مشکل ہے۔ یوں لگتا ہے میں ماضی کی بھول بھلیوں میں کھو چکا ہوں اور واپسی کا راستہ بھول چکا ہوں۔ سکاٹ لینڈ کے دارالحکومت ایڈنبرا کا یہ میوزیم اس شہر کے بیچوں بیچ واقع ایک پہاڑی کے اوپر قلعے میں موجود ہے۔ اس میوزیم میں دیکھنے کو بہت کچھ ہے۔ برطانوی افواج کے ساتھ سکاٹ لینڈ کے لوگوں کی جنگوں کے حوالے سے بھی اور وہاں کے عوام کے شاندار اور تابناک ماضی کے بارے بھی۔ ایک تنگ و تاریک قید خانہ بھی ہے جہاں مخالفین کے قیدی لا کر رکھے جاتے تھے۔ قید خانے کی دیواروں پر لکھی ہوئی ان کی بے بسی کی داستانیں ہیں اور مرغیوں کے ڈربوں کی طرح بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے عقوبت خانے بھی۔ لیکن یہ تلواریں' چادر' چند تصویریں اور دیگر سامان وہاں کیوں موجود ہے۔ اس کا سکاٹ لینڈ اور میوزیم کے ساتھ کیا تعلق بنتا ہے۔ اس سوال نے سب سے پہلے مجھے حیرت میں ڈالا۔ یہ سب سامان برصغیر پاک و ہند کے عظیم مجاہد اور شہید فتح علی ٹیپو سلطان کا ہے۔ یہ سب یہاں کیوں ہے؟ یہ اس لیے ہے کہ اس مردِ حُر کو جس فوج نے شہید کیا تھا' اس کا سربراہ اور برطانوی فوج کا جرنیل سر ڈیوڈ بیرڈ Sir David Baird کا تعلق ایڈنبرا سے تھا۔ یہ شخص 6 دسمبر 1757ء میں ایڈنبرا کے ایک تاجر خاندان میں پیدا ہوا۔ اس نے 1772ء میں فوج میں کمیشن حاصل کیا اور 1779ء میں اسے کیپٹن کی حیثیت سے ہندوستان بھیج دیا گیا۔ انہی دنوں کرنل بیلی (Baillie) کی سربراہی میں انگریز فوج ٹیپو سلطان کے والد اور میسور کے حاکم حیدر علی کے ساتھ جنگ میں مصروف تھی۔ ڈیوڈ بھی اس فوج کا حصہ بن گیا۔ اس جنگ میں انگریز کو بری طرح شکست ہوئی' اکثریت ماری گئی اور جو بچے قیدی بنا لیے گئے۔ ڈیوڈ شدید زخمی ہوا اور چار سال قید میں رہنے کے بعد رہا ہوا۔ ایڈنبرا کے لوگ اس کی ماں کی بہادری کی داستان بھی بیان کرتے ہیں کہ کیسے اس نے بیٹے کی قید کے دوران صبر کا مظاہرہ کیا۔ رہائی کے بعد انگلستان آیا۔ لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی پائی اور 1790ء میں دوبارہ ہندوستان بھیج دیا گیا۔ یہاں اس نے لارڈ کارنیوالس کے زیر سایہ ایک بریگیڈ کو کمانڈ کیا اور ٹیپو سلطان کے ساتھ جنگیں لڑیں۔ آخری جنگ میں پچاس ہزار سپاہیوں نے حصہ لیا۔ برطانوی فوج کے سپاہی چھبیس ہزار تھے جن میں چار ہزار گورے تھے اور باقی ہندوستان سے بھرتی کیے ہوئے' سولہ ہزار گھڑ سوار نظام حیدر آباد نے دیے اور باقی مرہٹہ ہندوؤں نے حصہ لیا' جبکہ ٹیپو سلطان کے ساتھ تیس ہزار سپاہی تھے۔ جب میر صادق کی غداری کی وجہ سے برطانوی فوج قلعے کے کھلے دروازوں سے اندر داخل ہوئی تو ٹیپو سلطان کے ساتھ لڑنے والے فرانسیسی سپاہیوں نے اسے خفیہ راستے سے بھاگ جانے کا مشورہ دیا جس پر اس نے اپنا تاریخی فقرہ کہا تھا: ''گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے''۔ 4 مئی 1799ء کو اسلامی دنیا کے اس لازوال فرزند نے جامِ شہادت نوش کیا۔ لارڈ ولزلے نے نبض دیکھی اور برطانوی فوج میں خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ اسی شام ٹیپو سلطان کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔ اس رات میسور میں شدید طوفان آیا۔ بارہویں رجمنٹ کا لیفٹیننٹ رچرڈ بیلے لکھتا ہے۔

"I have experienced hurricans, typhoons and gales of winds at sea, but never in whole course of my existance had I seen anything comparable to this desolating visitation".

''میں نے طوفان' جھکڑ اور آندھیوں کا شور کئی بار دیکھا مگر اپنی پوری زندگی میں کبھی میں نے ایسی تباہ کن صورت حال نہیں دیکھی''۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے ساتھیوں میں غلام حسین علی خان المعروف غلام حسینی نواب آف کرناٹک کا نام خاص طور پر تحریر کرتی ہے جس نے خفیہ طور پر انگریزوں کو مدد فراہم کی لیکن جنگ جیتنے کے بعد انگریز نے پورے میسور پر حکومت کرنا چاہی' تو غلام حسینی نے مخالفت کی اور اپنی سربراہی پر اصرار کیا' جس پر ایسٹ انڈیا کمپنی نے اسے زہر دے کر ہلاک کر دیا۔ ٹیپو سلطان کی داستان برصغیر پاک و ہند ہی نہیں مسلم تاریخ کا بھی ایک روشن باب ہے۔ وہ نسل جو آج میرے ملک میں پروان چڑھ رہی ہے' اسے اپنے ماضی سے اس قدر لاعلم کر دیا گیا ہے کہ اسے علم ہی نہیں کہ ان کے آباؤ اجداد کس جرأت و بہادری کے پیکر ہوا کرتے تھے لیکن ایڈنبرا کے میوزیم میں یہ تمام نوادرات محفوظ ہیں جو ٹیپو سلطان کے قاتل کو بطور تحفہ عطا کر دیے گئے تھے' لیکن ان نوادرات کے ساتھ ایک تحریر ہے جس کے الفاظ میرے شکستہ خوابوں اور گمنام آرزوؤں کے لیے ایک ایسا زخم ہیں جو اس میوزیم کی سیر کے دوران لگا اور شاید عمر بھر اس سے ٹیسیں اٹھتی رہیں۔ تحریر یوں ہے:

"The threat Tipu represented to British interests in India meant that news of his death was a cause of National celebration".

''ٹیپو سلطان ہندوستان میں برطانیہ کے مفادات کے لیے اتنا بڑا خطرہ ثابت ہوا تھا کہ اس کی موت کی وجہ سے برطانیہ میں قومی جشن منایا گیا''۔

یہ تحریر بتاتی ہے کہ قومیں کیسے اپنے ہیروز کو یاد رکھتی ہیں لیکن وہ قوم جو اب برطانیہ میں لکھی جانے والی نرسری کی نظموں اور انہیں کی لکھی ہوئی کتابوں کی لوریوں کو پڑھ کر جوان ہو رہی ہے' اسے کیا خبر کہ اس کا کوئی ماضی بھی تھا جس پر فخر کیا جانا چاہیے۔ دنیا میں کوئی ایک قوم بھی ایسی نہیں جس نے اپنے ماضی پر فخر نہ کیا اور اس میں غیرت' محبت' عظمت اور اعتماد کے چراغ روشن ہوئے ہوں۔ دوسروں کی عظمتوں کی کہانیاں پڑھ کر جوان ہونے والے مرعوب ذہن اور مردہ ضمیر لے کر چلتے اور پسماندگی کی دلدل میں زندگی گزارتے ہیں۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

امتِ مسلمہ کا انتشار

گزشتہ چودہ سو سال میں مسلمانوں نے اپنی تاریخ پر ان گنت کتابیں تحریر کیں، بلکہ دنیا کو تاریخ نگاری کا فن اگر کسی نے سکھایا تو وہ مسلمان ہی تھے، ابنِ خلدون کا مقدمہ آج تک تاریخ دانوں کے لیے تاریخ شناسی کی وہ مشعل ہے جس کی لو روز بہ روز تیز ہوتی جارہی ہے۔ یوں تو تاریخ' لکھنے والے کے تعصبات سے کبھی پاک نہیں ہوتی اور نہ ہی حکومتوں کے خوف سے آزاد، پھر بھی دو تین مختلف مورخین کی تحریروں سے اصل سچ تک پہنچا جا سکتا ہے۔ لیکن جیسے ہی اس وادی میں یورپ کے ان تاریخ دانوں نے قدم رکھا' جنہیں مستشرقین کہا جاتا ہے' تو انہوں نے اسلامی تاریخ کے متنازعہ ادوار کو ہی اپنی تحقیق کا موضوع بنایا اور ان گروہوں پر کتابیں تحریر کیں جو مسلم امہ میں اختلاف کا باعث بنے تھے۔ مسلمانوں کی چودہ سو سالہ تاریخ سازی میں خوارج پر معلومات انتہائی بکھری ہوئی اور مواد خاصہ محدود ہے' حالانکہ یہ وہ لوگ تھے جو حضرت علیؓ سے لے کر بنواُمیّہ کے پورے دور تک حکومتوں کے لیے مسئلہ بنے رہے۔ شیعہ اور سنی دونوں میں کوئی بھی ایسا نہیں جو ان کے لیے نرم گوشہ رکھتا ہو' پھر بھی ان کے بارے میں جامع تحقیقی کام انگریزوں کے ہاں ملتا ہے یا پھر پچاس سال قبل عمر ابوالنصر نے تاریخِ خوارج مرتب کی۔ اسے یہ کتاب مرتب کرنے کے لیے مواد صرف طبری اور مسعودی میں بکھرا ہوا ملا۔ البتہ عربی اور فارسی ادب کی کتابوں میں بھی اس گروہ کا تذکرہ ملتا ہے' لیکن گزشتہ چند سالوں سے جب امریکہ، کینیڈا اور یورپ میں مغرب زدہ مسلمان مفکرین نے اس گروہ کے بارے میں لکھنا شروع کیا اور پھر وہ اس گروہ کی علامتوں کو رسول کریم ﷺ کی احادیث سے تطبیق کے بعد موجودہ دور کے گروہوں تک لے آئے تو میرے لیے حیران ہونا ضروری تھا۔ اس لیے کہ جس بُغض وعناد کے ساتھ مغربی مؤرخین نے ہماری تاریخ لکھی اور جس طرح اس امت میں اختلافات' خصوصاً شیعہ سنی اختلاف کو ہوا دی' اس سے ان کے فتنہ انگیز ذہن کا پتہ چلتا ہے۔ رسول کریم ﷺ کی احادیث میں آنے والے زمانوں میں گروہوں کے پیدا ہونے کے بارے میں مختلف علامات ملتی ہیں اور قربِ قیامت کے دور پر تو ہر محدث نے احادیث کے ذخیرہ میں ''کتاب الفتن'' کے نام سے باب ضرور باندھا ہے۔ دجّال، حضرت عیسیٰؑ، امام مہدی، یاجوج ماجوج اور دیگر کے بارے میں کثیر احادیث ملتی ہیں۔ ہر دور میں کچھ خود ساختہ عالموں اور روحانی سفیروں نے ان احادیث کی کسی نہ کسی شخص پر تطبیق کرنے کی کوشش کی۔ کوئی مرزا قادیانی بن گیا اور کوئی یوسف کذاب۔ اسی طرح کتنے تھے' جنہوں نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا۔ اسی طرح خوارج اور روافض کے بارے میں ہر دور میں کسی نہ کسی گروہ کو خارجی یا رافضی کہا گیا اور رسول اللہ ﷺ کی حدیثوں سے استنباط کیا گیا۔ اس کا مقصد امت میں فتنہ اور فساد پھیلانے کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ جو احادیث آنے والے دنوں کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمائی ہیں' میں ان کی صحت اور رجال پر بحث نہیں کرنا چاہتا کہ اس پر پہلے ہی خاصی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ حدیث کے عالموں نے ''موضوعات'' یعنی گھڑی ہوئی حدیثوں کے بارے میں دفتر کے دفتر لکھے۔ یہ احادیث مختلف گروہوں نے اپنے حق میں اور دوسروں کے خلاف گھڑیں اور پھیلا دیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی کسی گروہ کو بحیثیت مجموعی کافر، ملحد اور واجب القتل قرار دینا ہو تو ایسی حدیثوں میں سے علامتیں ڈھونڈ کر ان پر منطبق کی جاتی ہیں۔ آج کل اس امت کو تقسیم کرنے والے اور قتل و غارت کو ہوا دینے والے خوارج اور روافض کے نام پر پہلے حدیث کا سہارا لیتے ہیں اور پھر تاریخ شناس بن کر حکمتِ عملی واضح کرتے ہیں۔ خوارج ان دنوں مغرب کا محبوب موضوع ہے۔ خوارج کا سب سے پہلے اطلاق افغانستان میں ملا عمر کے گروہ پر کیا گیا تھا۔ روافض کا موضوع ان دنوں مغرب نے خفیہ طور پر ان مسلمان گروہوں پر چھوڑ دیا ہے جو اس اختلاف کو ہوا دے کر اُمت کو تقسیم کرتے ہیں۔ صرف خوارج کی تاریخ کا مطالعہ کر لیں تو فتنے اور سازش کا پتہ چل جائے گا۔ عمر ابوالنصر نے خوارج کے بارے میں سب سے مستند تحقیق کی ہے۔ وہ اس گروہ کا خلاصہ یوں بیان کرتا ہے: ''خوارج جمہوریت کے علمبردار تھے لیکن ان کی انتہا پسندی نے انہیں کامیاب نہیں ہونے دیا۔ ان کا نظریۂ سیاست خلیفہ کے انتخاب اور معزولی میں اس نظریے سے ملتا جلتا تھا جو انقلابِ فرانس اور انقلابِ انگلستان کا محرّک بنا۔ یوں یہ کہا جائے کہ اہلِ مغرب نے انقلاب کا سبق خوارج سے سیکھا تو کچھ غلط نہ ہوگا''۔ جمہوریت پسندی کا یہی نظریہ تھا کہ خوارج اسلام میں مہاجرین، انصار اور اہل بیت رسول کریم ﷺ کو بھی ایک آدمی ایک ووٹ کے نظریے پر پرکھتے تھے۔ ان کا نظریہ بھی موجودہ دور میں ریاست کی طاقت کے اندھے استعمال کے حق میں اور صلح جوئی اور مذاکرات کے خلاف تھا۔ ان کا جنم جنگ صفین سے ہوا جب حضرت علیؓ نے واضح جیت کے باوجود امت مسلمہ کے اتحاد کے لئے تحکیم اور مذاکرات قبول کر لیے۔ ایسے میں وہ جو حضرت علیؓ کے ساتھی تھے یہ کہہ کر علیحدہ ہو گئے کہ اگر آپ حق پر ہیں تو پھر مذاکرات کے کیا معنی۔ یہ تھا خوارج کا آغاز۔ مذاکرات سے انکار۔ ریاست کی طاقت کا استعمال۔ اس کے بعد کی تاریخ بہت خونچکاں ہے۔ یہ لوگ بنوتمیم سے تھے اور پھر ان کے ساتھ فارس کے گروہ بھی آ ملے۔ انہوں نے نہروان کے مقام پر حضرت علیؓ سے جنگ کی، شکست کھائی، بکھر گئے اور پھر انہوں نے حضرت علیؓ کو شہید کیا، اس کے بعد امیر معاویہؓ سے نخیلہ میں جنگ کی، شکست کھائی، اس کے بعد یہ حجاج بن یوسف کے زمانے تک ہر کسی سے لڑتے رہے۔ ان کا نظریہ قائم رہا اور آج کل ان کے ایک فرقے اباضیہ کی حکومت مسقط اور عمان میں قائم ہے۔ اسی طرح روافض کا لفظ پہلی دفعہ حضرت زید بن علی نے اس وقت استعمال کیا جب وہ بنی امیہ کے خلاف خروج کے لیے کوفہ کے لوگوں کو اکٹھا کر رہے تھے۔ یہ حضرت امام علی زین العابدینؒ کے بیٹے تھے۔ ان کے خروج کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ نے کہا تھا کہ یہ رسول کریم ﷺ کی بدر میں آمد سے مشابہ ہے' لیکن کوفہ کے لوگوں نے ان سے سوال کیا کہ آپ کا حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے بارے میں کیا خیال ہے تو انہوں نے کہا: ''میں نے اپنے گھر میں ان کے بارے میں ہمیشہ اچھی بات سنی''۔ اس پر چالیس ہزار کوفی انہیں تنہا چھوڑ گئے۔ یہاں زید بن علی نے رسول کریم ﷺ کی وہ حدیث سنائی جس میں روافض کی علامتیں ہیں اور یہ لفظ استعمال کیا۔ اگلے روز زید بن علی خروج کے لیے نکلے تو ان کے ساتھ تین سو تیرہ افراد تھے، اتنے ہی جتنے رسول کریم ﷺ کے ساتھ بدر میں تھے۔ اس دور سے لے کر آج تک اس امت میں جہاں کہیں بھی نفرت پھیلائی ہو' ان دونوں الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ افغانستان میں جب ہزارہ قبیلے کے خلاف ریاستی طاقت کا استعمال کرنا مقصود تھا تو ایسے ہی ان کے خلاف روافض کے فتوے جاری ہوئے اور اسی طرح احادیث کی تطبیق کی گئی۔ اسی طرح جب صفوی حکمرانوں نے ایران میں صوفیائے کرام کا بے دریغ قتل کیا تو انہیں دشمنانِ اہل بیت اور گمراہ سمجھ کر کیا اور اس کے لیے جواز اس دور کے علماء نے فراہم کیے۔

آج کے دور میں اس امت کو اسی بنیاد پر ایک منصوبہ بندی سے تقسیم کر کے لڑایا جا رہا ہے۔ جو امت اختلاف تو رکھتی تھی لیکن قتل و غارت کے چند واقعات کے سوا' چودہ سو سال امن و محبت کے تھے۔ ایک دوسرے کا احترام اور سب اپنے اپنے عقائد تک محدود تھے۔ آج یہ ایک دوسرے کے گلے کاٹ رہی ہے اور قتل و غارت کا جواز احادیث رسول ﷺ سے نکالا جاتا ہے۔ واجب القتل کے فتوے بھی اس تقدس کے ساتھ دیے جا رہے ہیں اور پھر تاریخ سے تطبیق دی جاتی ہے۔ حکمرانوں کے خلاف جنگ کرنی ہو تو پھر ظالم بادشاہ کے خلاف جہاد کی حدیثیں پیش کی جاتی ہیں۔ بادشاہ یا حکمران کا ساتھ دینا ہو تو سارے مخالف خارجی، بدعقیدہ اور باغی بنا دیے جاتے ہیں۔ تاریخ سے مثالیں ڈھونڈی جاتی ہیں۔ شام میں، مصر میں، عراق میں خارجی ہیں اور ان کے مقابلے میں بشارالاسد، حسنی مبارک اور دوسرے ٹھیک قرار دیے جاتے ہیں اور ان کے ظلم کو جائز اور ان کی حکومت کو صالح اسلامی ریاست کہا جاتا ہے۔ اگر یہی تصور مان لیا جائے تو ریاست بنوامیہ اور بنی عباس کے خلاف اٹھنے والے تمام گروہ کون تھے، کیا تھے۔ یہ وہ ساری بحثیں ہیں جو آج اس امت کے ہر دروازے پر دستک دے رہی ہیں، ان کے علمبردار دونوں جانب کے علماء ہیں۔ ایسے علماء جن کی آنکھوں میں انتقام کے شعلے ہیں اور نفرت کی چنگاریاں۔ جہاں اقتدار ان کے مسلک کا حامی ہو تو سارے باغی، شدت پسند واجب القتل اور ریاست کو انہیں کچلنے کا اختیار ہے۔ اور جہاں اقتدار ان کے مسلک کے خلاف ہو تو سارے لڑنے والے برحق۔ یہی تو اس دور کا المیہ ہے۔ امت کا وبال ہے۔ ہر ریاست کے اپنے فتوے باز ہیں اور ہر ریاست کی مخالفت میں بھی فتویٰ بازوں کی کمی نہیں۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

دنیا

امتِ مسلمہ کا مشترک نصابِ تعلیم

حرفِ راز
اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

یہ پورا خطہ' جسے آج یورپ کہا جاتا ہے' کیا اس کی کوئی مشترک تاریخ رہی ہے؟ کیا اس میں شامل ممالک کی اقدار' روایات' نظامِ حکومت و سیاست اور اخلاقیات ایک جیسی تھیں؟ حقیقت یہ ہے کہ ایک علاقے کا ہیرو دوسرے کا دشمن اور دوسرے کا فاتح پہلے علاقے کے لیے قابلِ نفرت ہوتا تھا۔ ادب' فن' آرٹ اور ثقافت میں ہر علاقے نے اپنے اپنے عظیم لوگوں کو جنم دیا۔ فرانس کا ایک ادیب ایسی زبان میں ادب تخلیق کرتا تھا جو باقی یورپ کے لیے اجنبی تھی اور روم کا مصور ایسے شاہانہ کروفر والے ماحول کو کینوس پر لے کر آتا یورپ کے دور دراز شمالی علاقے میں جس کا تصور بھی ممکن نہ ہوتا۔ صدیوں ٹکڑوں میں بٹے اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے یورپ کو آج ایک تہذیب کیوں کہا جاتا ہے؟ آج جدید مغربی تہذیب ایک حقیقت کیسے بن گئی ہے؟ روس کے سائبیریا سے لے کر سسلی کے جزائر تک اور آئرلینڈ کی سرزمین سے آرمینیا کی وادیوں تک اس تہذیب میں کیا چیز مشترک تھی' جس کی وجہ سے یہ ایک اکائی کا روپ دھار گئے؟ صرف یورپ کی آپس میں جنگوں کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو دنیا میں کسی بھی دوسرے علاقے میں ہونے والی خونریزی بھول جاتی ہے۔ میں قدیم تاریخ میں نہیں جانا چاہتا' صرف چند صدیاں پہلے کی جنگوں کا حال پڑھ کر یوں لگتا ہے کہ یورپ کو سوائے جنگ کرنے اور قتل و غارت کے اور کوئی کام ہی نہ تھا۔ انگلینڈ اور فرانس کے درمیان 1337ء سے 1453ء تک' 116 سال جنگ جاری رہی جس کے بعد سو سالہ جنگ کا محاورہ ایجاد ہوا۔ میلان' وینس اور فلورنس کے درمیان 1402ء سے 1454ء تک 52 سال جنگ چلتی رہی۔ ڈنمارک اور سویڈن کے درمیان 1506ء سے 1513ء تک' سپین اور ہالینڈ کے درمیان 1567ء سے 1593ء تک' انگلینڈ اور ہالینڈ کے درمیان 1652ء سے 1674ء تک جنگ ہوتی رہی' غرض کوئی سال ایسا نہیں ہے کہ یورپ کے کسی نہ کسی خطے میں جنگ نہ چل رہی ہو یا پھر اندرونی طور پر ملکوں میں قتل و غارت نہ ہو رہی ہو۔ دنیا کی تاریخ کی آخری خوفناک اور ہیبت ناک عالمی جنگیں بھی یورپ کی سرزمین سے شروع ہوئیں اور پھر انہوں نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جنگِ عظیم اول اور جنگِ عظیم دوم میں جتنے افراد مارے گئے پوری انسانی تاریخ میں مارے جانے والے افراد کی کل تعداد سے بھی زیادہ ہوں گے۔

اتنی جنگوں' قتل و غارت اور نسل و زبان کے اختلاف کے باوجود وہ کون سی ایسی سماجی لڑی تھی جس نے یورپ کو ایک تہذیب کی شکل دے دی۔ یہ تہذیب خود بخود آسمان سے نہیں ٹپکی، اسے مدتوں کی محنت اور کوشش سے تخلیق کیا گیا۔ پورے براعظم یورپ کے ادب' آرٹ' موسیقی یا طرزِ زندگی کو اٹھا کر دیکھ لیں' آپ کو صرف ایک چیز مشترک ملے گی لیکن اسے نہ کوئی سیکولر مورخ ماننے کو تیار ہوتا ہے اور نہ ہی ماڈرن دانشور۔ وہ مشترک چیز عیسائی تہذیب و معاشرت ہے۔ چیخوف سے موپساں اور شیکسپیئر سے ہارڈی تک کی کہانیاں دیکھ لیں، آپ کو ان میں ایک عیسائی گھر کا ماحول' عیسائی عبادات و تہوار اور عیسائی روحانی کردار یعنی سینٹ جلوہ گر نظر آئیں گے۔ کرسمس' ایسٹر' سانتا کلاز' گڈ فرائی ڈے: ان سب سے لگی بندھی رسومات ان کہانیوں میں نظر آئیں گی۔ پیدا ہوتے ہی بچے کا بپتسمہ' چرچ کی گھنٹیوں میں شادی کی تقریب اور کالے ملبوس اور نقاب میں روتی ہوئی عورتوں کے درمیان قبرستان میں تابوت کا قبر میں اتارنا، پادری' راہبائیں اور ان سے منسلک تمام افراد ان ناولوں' افسانوں' نظموں اور دیگر اصنافِ سخن میں پائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی روسی ناول انگریزی میں اور انگریزی ناول فرانسیسی میں ترجمہ ہوتا ہے تو پڑھنے والے کو اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔ سارے ادب کا تہذیبی ماحول آج بھی عیسائی تہذیب اور تہواروں سے عبارت ہے۔ یہی حال ان کی تاریخی آرٹ گیلریوں میں موجود تصویروں کا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ، حضرت مریم، سینٹ پیٹر' یہاں تک کہ بائبل کے مطابق تخلیقِ آدم و حوا تک کو تصاویر کی زینت بنایا جا چکا ہے۔ موسیقی اور شاعری میں بھی اسی طرح کا ماحول ملتا ہے۔ عیسائیت وہ واحد مشترکہ قدر ہے جس کے تہذیبی ورثے نے ہزاروں جنگوں اور قتل و غارت کے باوجود یورپ کو ایک یورپی ماحول میں ڈھلنے میں مدد دی۔ لیکن کیا یہ خود بخود ہو گیا؟ ہرگز نہیں، قطعاً نہیں! اس کے لیے تین صدیاں صرف ہوئیں' حکومتوں' اہلِ دانش و علم اور تعلیمی ماہرین کو سخت محنت کرنا پڑی۔ صلیبی جنگوں کے بعد جب یورپ کو علم ہوا کہ مسلمانوں کے علاقے تہذیب کا سرچشمہ ہیں تو انہوں نے ترجمے کی تحریک شروع کی۔ یورپ کا کوئی قصبہ ایسا نہ تھا جہاں عربی زبان پڑھائی نہ جاتی ہو۔ یہ زبان صرف اس لیے پڑھائی جاتی تھی کہ عربی میں موجود علم تک رسائی حاصل ہو، لیکن ذریعہ تعلیم ہمیشہ ان کی مقامی زبان ہوتی۔ پورے یورپ میں سائنس' فلسفہ' طب' جغرافیہ اور دیگر علوم ترجمہ ہوئے لیکن ان کو براہِ راست لوگوں تک نہیں پہنچنے دیا گیا بلکہ مصنفین نے اپنے نام سے کتابیں تحریر کیں اور انہیں سکولوں' یونیورسٹیوں اور کالجوں میں پڑھایا گیا۔ اس دوران مسلمان مصنفین کا نام بددیانتی سے بدل کر یورپی بنایا گیا، جیسے بوعلی سینا کو Ave sina بنا دیا گیا تاکہ بچوں کو احساس تک نہ ہو کہ یہ لوگ مسلمان یا غیر یورپی تھے۔ سب سے بڑا اہتمام یہ کیا گیا کہ بچوں تک ایسی کوئی کہانی نہ پہنچنے دی جائے جس میں یورپ سے باہر کا ماحول موجود ہو۔ مسلمانوں کی تہذیب' ثقافت' اخلاقیات اور اقدار کی ایک جھلک تک گزشتہ سات صدیوں سے یورپ کے کسی ملک کے نصاب میں نہیں ملتی۔ یورپ کے ہر خطے میں جنم لینے والوں کو مشترکہ ہیرو قرار دیا گیا۔ سکندرِ اعظم جیسے ظالم شخص کو عظیم بادشاہ' شیکسپیئر کو یورپ کا سرمایہ' لیونارڈو ونچی کو پورے خطے کا مصور اور مائیکل اینجلو کو عظیم مجسمہ ساز تسلیم کیا گیا۔ موپساں' گوئٹے' دانتے' والٹیئر' روسو' ٹالسٹائی' دوستوفسکی.... اس سے قطع نظر کہ ان میں سے کوئی کون سی زبان بولتا اور کس زبان میں لکھتا، اس کے کام کو پورے یورپ کے لیے مشترک سرمایہ اور میراث قرار دے دیا گیا: وہ یورپ جس نے صدیوں ایک دوسرے کا خون بہایا۔ اس دوران دنیا بھر میں لکھے جانے والے ادب کو نہ نصاب کی زینت بنایا گیا اور نہ ہی عام آدمی کی دسترس تک پہنچنے دیا گیا۔ عربی اور فارسی میں لکھا گیا ادب اور کہانیاں آج بھی یورپی سکول کے بچوں کے لیے اجنبی ہیں، اس لیے کہ ان کہانیوں میں تہوار بھی الگ ہیں اور ماحول بھی' اخلاقیات بھی مختلف ہے اور معاشرت بھی۔ پورے یورپ میں کسی سکول کے بچے کو شاید ہی علم ہو کہ عید' جمعہ' رمضان کے روزے اور حج کیا ہوتا ہے جبکہ پوری دنیا کے نصاب میں بچوں کو کرسمس ٹری، ایسٹر' سانتا کلاز اور اس سے منسلک تمام رسومات کا علم بزور پڑھایا گیا۔ پورے یورپ میں کہیں بوعلی سینا' ابن الہیثم' الخوارزمی' رومی یا کسی بھی ادیب کا مجسمہ نظر نہیں آتا، حتیٰ کہ اکبر کو وہ اکبرِ اعظم کہتے ہیں لیکن اس کی تصویر اور ذکر کہیں نہیں ملتا۔ انہوں نے اپنے نصاب کو یورپ سے باہر کی ہر شخصیت اور تصور سے پاک رکھا ہے۔ یوں ایک جدید مغربی تہذیب وجود میں آئی جسے کتنا ہی سیکولر کہا جائے اپنے جوہر میں عیسائی ماحول' اقدار اور ثقافت میں ڈوبی تہذیب ہے اور یہی ان کا لائف سٹائل ہے جس کا وہ تحفظ چاہتے ہیں۔

اگر یہ ان کا لائف سٹائل ہے تو پھر میرا لائف سٹائل کیا ہے؟ مجھے کس لائف سٹائل کا تحفظ کرنا ہے؟ ان کے ہاں زبانوں کا فرق بھی یورپ کو علیحدہ قوموں میں تقسیم نہیں کرتا لیکن ہم اگر کسی دوسرے ملک کے مسلمان ادیب کی بات کریں تو اسے عربی اور فارسی ادیب کہہ کر مسترد کر دیا جاتا ہے۔ اس طوفانِ مغرب میں صرف ایک ہی راستہ ہے کہ مراکش سے لے کر برونائی تک تمام مسلمان ادیب' شاعر' فلسفی اور فنونِ لطیفہ کے ماہرین کا علم سکولوں کے نصاب میں شامل کیا جائے۔ ان کی کہانیوں میں ہماری اقدار ہیں' ہمارے تہوار ہیں' ہماری اخلاقیات ہے اور ہماری شخصیات کا ذکر ہے۔ پوری امت کے مشترک ہیروز' مشترک ادیب' شاعر اور مشترک قابلِ قدر شخصیات ہیں۔ جب تک سکندرِ اعظم کی بجائے عمرؓ ابن خطاب اور نپولین کی بجائے صلاح الدین ایوبی ہمارے نصاب کی زینت نہیں بنتے ہم بکھرے رہیں گے اور ہم پر دنیا حکومت کرتی رہے گی' ہمارے شہر برباد کرتی رہے گی۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

امتِ مسلمہ کا مجرم

اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

طاقتور لوگ' برادریاں' خاندان اور قبیلے اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا انتقام ضرور لیتے ہیں، اپنے مجرم کو ڈھونڈ نکالتے ہیں اور اسے قانون کے کٹہرے میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ یہی حال قوموں کا ہے۔ طاقتور قومیں اپنے مجرموں کا سات سمندر پار تک پیچھا کرتی ہیں، انہیں ڈھونڈ نکالتی ہیں اور کیفر کردار تک پہنچاتی ہیں۔ اس تگ و دو میں اس بات کا خیال تک نہیں رکھا جاتا کہ ہمارا مجرم کسی دوسری قوم کا ہیرو بھی ہو سکتا ہے۔ قوموں کے غیرت مند افراد بھی اپنے آباؤ اجداد پر ہونے والے ظلم کا بدلہ لینے دور دراز کا سفر کرتے ہیں۔ جس شخص نے جلیانوالہ باغ میں نہتے عوام پر گولی چلائی تھی وہ برصغیر پاک و ہند میں اپنی حکمرانی کے دن پورے کرنے کے بعد برطانیہ سدھار چکا تھا' لیکن انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے سکھ وہاں بھی جا پہنچے تھے۔ ایمل کانسی امریکہ میں سی آئی اے کے دو افراد کو قتل کرنے کے بعد پاکستان لوٹ آیا تھا لیکن اس کی تلاش میں امریکی ٹیمیں کئی سال اس ملک کا کونا کونا چھانتی رہیں اور بالآخر حکمرانوں کی ملی بھگت اور ملت فروشی کی وجہ سے اسے ان طاقتوروں کے حوالے کر دیا گیا' جنہوں نے اسے سزائے موت دے دی۔ ایمل کانسی امریکہ کا مجرم تھا' لیکن جس صبح اسے زہریلا ٹیکہ لگا کر موت کی نیند سلایا گیا' پورے پاکستان میں موت کا سا سناٹا تھا۔ کوئٹہ کی تاریخ نے کبھی اس سے بڑا جنازہ نہیں دیکھا۔ امریکہ کا یہ دشمن' حکمرانوں کی عالمی مجبوری تھی لیکن وہ عام آدمی اور عام پاکستانی کا ہیرو تھا۔ ایسے ہیرو دنیا کے ہر ملک میں پائے جاتے ہیں اور ایسے مجرم بھی دنیا کے ہر خطے میں موجود ہیں۔ اسامہ بن لادن کی شہادت ابھی کل کی بات ہے، وہ شخص' جس نے زندگی بھر کبھی امریکہ کی سرزمین پر قدم نہ رکھا' امریکہ کا سب سے بڑا دشمن تھا اور امریکہ اسے پندرہ سال تک دوسرے ملکوں کے صحراؤں' میدانوں اور پہاڑوں میں ڈھونڈتا رہا اور بالآخر اس کی موت سے اپنے انتقام کی آگ ٹھنڈی کر لی، اپنے مجرم کو کیفر کردار تک پہنچا دیا۔

کیا پرویز مشرف صرف جمہوریت اور آئین کا مجرم ہے؟ یہ الگ بات ہے کہ اس وقت یہ تصور اور اس کے پیچھے عالمی رائے عامہ طاقتور ہے۔ یہ رائے عامہ بھی کارپوریٹ سرمائے اور اس کے میڈیا نے تراشی ہے۔ جمہوریت اور جمہوری اداروں کی بقا اور اسے ایک عالمی سچائی اسی سرمائے نے بنایا۔ اسے ایک سچائی بنانے کے لیے لاکھوں انسانوں کا خون کیا گیا۔ بڑا آسان نسخہ ہے... پہلے کسی بھی ملک میں حکمران شخص کو میڈیا کے ذریعے آمر یا ڈکٹیٹر ثابت کرو' اسے بدنام کرو اور پھر کہو کہ ہم اس ملک کے عوام کو ایک جمہوری مستقبل دینے کے لیے اس پر حملہ کرنے جا رہے ہیں۔ عراق' افغانستان' لیبیا پر حملہ کرو۔ لاکھوں لوگوں کو قتل کرو' پھر وہیں بیٹھ کر ایک آئین تحریر کرو' اپنے سامنے انتخابات کراؤ' اپنے منظور نظر افراد کی حکومت قائم کرو اور دنیا کے سامنے یہ نعرہ بلند کرو کہ ہم نے اس قوم کو آمریت سے نجات دلا کر جمہوریت کی راہ پر گامزن کر دیا ہے۔ پوری دنیا کو دھمکاؤ کہ اگر ہمارے بنائے ہوئے سسٹم کے مطابق زندگی نہیں گزارو گے تو تمہیں قبرستان بنا دیں گے۔ یہ ہے وہ عالمی جمہوری نظام جس کا مجرم پرویز مشرف آج کٹہرے میں ہے۔ اس لیے اس کارپوریٹ سرمائے پر پلنے والا میڈیا اسے ایک مجرم کے طور پر پیش کرتا ہے اور کوئی اس پر اختلاف نہیں کرتا۔

لیکن میرا دکھ اس امتِ مرحوم کا دکھ ہے۔ یہ امت جس کے بارے میں میرے آقا سید الانبیاء ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ جسدِ واحد ہے، اگر اس کے ایک عضو کو تکلیف ہو گی تو پورا جسم درد محسوس کرے گا (مفہوم حدیث)۔ آج اس کی یہ پہچان گم ہو چکی ہے۔ اگر یہ امت زندہ ہوتی تو مشرف جمہوریت کے نہیں امتِ مسلمہ کے ملزم کی حیثیت سے کٹہرے میں کھڑا ہوتا۔ اس پر یہ فردِ جرم عائد ہوتی کہ تم نے ایک کلمہ گو مسلمان ہوتے ہوئے کیسے اپنے زیرِ انتظام تین ہوائی اڈوں سے امریکی جہازوں کو اڑنے کی اجازت دی کہ وہ پڑوس میں مسلمانوں کی ہنستی بستی آبادیوں پر بم برسائیں اور مسلمانوں کا قتلِ عام کریں۔ اس پر یہ فردِ جرم عائد ہوتی کہ تمہیں سید الانبیاء ﷺ کا وہ فرمان یاد نہیں تھا کہ قیامت کے دن اللہ کا غضب اس شخص کے لیے بے پناہ ہو گا جو کسی آزاد مسلمان کو قید کرے اور آگے بیچ دے۔ تم نے چار سو سے زیادہ مسلمانوں کو پیسے لے کر آگے بیچا اور پھر اس پر اتراتے بھی رہے۔ اس کی فردِ جرم میں اسلام کے اس بنیادی اصول اور رسول اللہ ﷺ کی ہدایات کی خلاف ورزی بھی شامل ہوتی کہ سفارت کار تمہاری پناہ میں ہوتے ہیں لیکن تم نے ایک مسلمان سفارت کار ملا عبدالسلام ضعیف کو کس تحقیر اور ذلت کے ساتھ غیر مسلموں کے حوالے کر دیا۔

اس مملکتِ خداداد پاکستان میں اور یہاں بسنے والی امت مسلمہ کے اخلاق و اقدار کو بگاڑنے' ان کے اندر فحش کو عام کرنے' ان کے مدرسوں اور مسجدوں پر ٹینکوں سے حملہ کرنے اور ان کی عورتوں اور بچوں کو بموں کی آتش میں بھوننے کے الزامات اس سے سوا ہیں، لیکن کوئی ان پر آواز بلند نہیں کرتا۔ کوئی ان جرائم کی تفصیل سامنے نہیں لاتا۔ یہ جرم تو وہ ہیں جن کا اقرار خود مشرف نے کیا اور جن کے شواہد امریکہ کی سینیٹ کے سامنے پیش کردہ رپورٹوں میں بھی موجود ہیں۔ یہ مقدمہ ایک دن چلے یا دس سال، اس کا فردِ جرم میرے لیے دلچسپی سے خالی ہے۔ یہ بالکل ایسے ہے جیسے کوئی فرد کسی گھرانے میں آ کر فائرنگ کرے' سب گھر والوں کو قتل کر دے لیکن اس پر اس قتل و غارت کا مقدمہ نہ چلایا جائے، ہاں البتہ اس بات پر اسے مجرم ٹھہرایا جائے کہ اس نے ڈرائنگ روم میں لگی 1973ء کی فیملی پورٹریٹ کو دیوار سے اتار کر زمین پر پٹخا اور اس کی توہین کی۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

دنیا

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی!

حرف راز
اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

سید الانبیاء، سرکارِ دو عالم حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت بیان کرتے یا آپ کی آمد کا ذکر اپنی تقریروں میں فرماتے ہوئے ہمارے اکثر مصنفین اور مقررین ایک فقرہ عموماً بولتے اور لکھتے ہیں: ''آپؐ کی آمد سے پہلے دنیا جہالت کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ڈوبی ہوئی تھی''۔ سیرت کا مطالعہ کریں اور اس دور کے معاشروں کا جائزہ لیں تو آپ کو حیرت ہوگی کہ یہ جہالت کیا تھی؟ یہ تو علم اور ٹیکنالوجی کا وہ بامِ عروج تھا جس نے انسان کو اس کے غرور میں مبتلا کر رکھا تھا اور وہ اپنی اسی ترقی کو زندگی کی آخری منزل سمجھے ہوئے تھا۔ سیرت کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ سوال اکثر ذہن سے ٹکراتا ہے کہ اگر دنیا اس قدر تاریک تھی' جہالت کا اندھیرا اتنا زیادہ تھا تو پھر ایک چھوٹے سے چراغ سے اس تاریکی کا سینہ چیرا جا سکتا تھا، لیکن اللہ نے انسانی تاریخ کے سب سے بڑے چراغِ ہدایت کو سراج منیر کا لقب عطا کر کے بھیجا۔ یہی وہ دعویٰ ہے جس کے بعد اگر اس دور کی تاریخ پر روشنی ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس وقت کی دنیا میں انسان نے علم اور ترقی کے ایسے ایسے چراغ روشن کر لیے تھے کہ انہی کی روشنی میں گم ہو کر اس کی آنکھیں چندھائی ہوئی اور نورِ بصیرت سے محروم ہو چکی تھیں، ہدایت کی روشنی سے دور، اپنے ہی علم کے غرور سے اندھی ہو رہی تھیں۔ جو معاشرے اس دور میں بامِ عروج پر تھے ان میں چین' مصر' روم اور ایران تہذیبی ترقی اور سائنسی دریافت کے میدانوں میں کمال حاصل کر چکے تھے۔ وہ تمام فلسفیانہ بحثیں' جو آج تک جاری و ساری ہیں' لوگ ان کا آغاز اور ان پر تفصیلی علمی کام بعثت نبوی سے بہت پہلے کر کے دنیا کو حیران کن مغالطوں میں چھوڑ چکے تھے۔ یونان اور بابل کی تہذیبوں کو دیکھیے، ایک طرف موجودہ دور کی جمہوریت سے لے کر فرائڈ کی تعینات اور مارکس کی اشتراکیت، سب کے ماخذ یونان سے برآمد ہوتے ہیں تو دوسری جانب حمورابی کے قوانین اور انسانی حقوق کی بنیادیں بھی لوگ وہیں سے کھود کر نکالتے ہیں۔ فرعونوں کی سرزمین مصر میں اہرام کی تعمیر ٹیکنالوجی کی ترقی کے راز کھولتی ہے۔ دنیا آج تک حیران ہے کہ کیسے اتنے بڑے بڑے پتھروں کو اس طرح تراشا گیا تھا جیسے نرم صابن کو دھاگے کے ساتھ کاٹا جاتا ہے، نہ پھاوڑے کا نشان اور نہ ہی کدال اور چھینی کی کوئی علامت۔ آخر انہیں ہموار کرنے کے لیے کون سا کیمیائی مادہ استعمال ہوا؟ اس کے بعد ان میں در آنے والی روشنی سے جس طرح تقویم کے مسئلے حل کیے گئے، آئندہ آنے والے ہزاروں سالوں میں سورج' چاند اور ستاروں کی آمد و رفت کا حساب متعین کیا گیا، وہ سب حیران کن ہے۔ ایران کی حکومت مزدکیت کے ایک سیکولر تصور کی بھول بھلیوں میں جدید ترین تہذیبی خدوخال بنا رہی تھی۔ خاندان سے آزادی' جنسی تلذذ اور اجتماعیت' غرض وہ سب کچھ اس فلسفہ زندگی میں موجود تھا جو آج یورپ کے کسی بھی تہذیب یافتہ شہر میں ہم جنس پرستوں کے حقوق اور جنسی آزادی کے علمبرداروں کے کلب میں نظر آتا ہے۔ چین دور تھا لیکن تہذیب کا گہوارہ تھا۔ موجودہ بیوروکریسی کا نظام چین کے نظام مینڈرنز کی نقل ہے۔ مقابلے کے امتحان سے لے کر اکیڈیمی کی ٹریننگ اور پھر آخری مقابلے کے امتحان کے بعد شاہ کے محل میں نوکری، یہ سب کا سب آج کی بیوروکریسی کی بنیادیں ہیں۔ یہ تو تھا انتظامی' سائنسی اور علمی ترقی کا عالم، دنیا کے ہر خطے میں نشانیوں کے طور پر موجود بڑی بڑی عالی شان عمارتیں اس ترقی اور علمی معراج کی گواہ ہیں۔

یہ وہ مقام تھا جب اس علم کو آخری سچائی سمجھ کر انسان اپنے آپ کو خدا کا ہم پلہ تصور کرنے لگتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس دنیا کے تمام خزانے اس کی مٹھی میں ہیں۔ وہ سمندروں کا سینہ چیر سکتا ہے' دریاؤں کا رخ موڑ سکتا ہے، ہواؤں کو مطیع بنا سکتا ہے اور زمین کے سینے پر بلند و بالا اور پُرشکوہ عمارتوں سے اپنے خدا ہونے کا اعلان کر سکتا ہے۔ یہاں اس کے علم کی کل بساط اسے یہ کہنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ وہی حق ہے جو میں نے دیکھا' چھوا' سنا' سونگھا اور محسوس کیا۔ اپنی اس محدود دنیا کو وہ حرفِ آخر سمجھتا ہے۔ یہی المیہ دنیا کی ہر تہذیب کا ہوتا ہے اور یہی المیہ موجودہ دور کی سائنسی ترقی کا ہے جسے ہم سائنسی حقیقت کہہ کر سچ ثابت کرتے ہیں؛ حالانکہ ایک صدی تک راج کرنے والی سائنسی حقیقت اگلی صدی میں جہالت اور جھوٹ بن جاتی ہے۔

یہ تھا وہ علم کی روشنی میں چندھائی ہوئی آنکھوں کا دور جس نے کائنات کے لوگوں کو ایک ایسے جہل کا شکار کر دیا تھا جس میں وہ اس تصور سے ناآشنا ہوتے جا رہے تھے کہ اس کائنات کو تخلیق کرنے والا ایک خدائے قدوس ہے۔ دنیا کے ہر خطے میں ذاتی اور معاشرتی رنگا رنگی کے لیے مذاہب تخلیق بھی کیے گئے اور پرانے مذاہب میں تبدیلیاں بھی کی گئیں۔ دنیا کے ہر خطے میں رنگین مزاج دیوی دیوتاؤں کی دنیا آباد تھی جس کا تعلق زندگی کے میلوں ٹھیلوں سے تھا۔ اللہ' اس کا تصور اور اس کائنات پر اس کی بادشاہت تو کسی کے خواب و خیال سے بھی نکل گئی تھی۔ زمین بھی انسان کی اور اس پر بادشاہ بھی انسان' اس دور میں ایک ایسے خطے میں اللہ نے میرے آقاؐ کو مبعوث کیا جو ان چکا چوند تہذیبوں اور علمی مباحث سے دور تھا۔ عرب کی سرزمین سے نکلنے والا یہ نورِ ہدایت نہ فلسفے کے مباحث تک محدود تھا اور نہ بادشاہتوں کے اسلوب حکمرانی تک' اس روشنی کو تو یہ ثابت کرنا تھا کہ اللہ کی تعلیمات سے خوبصورت معاشرے کیسے جنم لیتے ہیں اور دلوں سے پھوٹتی ہوئی روشنی معاشروں میں تبدیلی کیسے لاتی ہے۔ سید الانبیاءؐ کی بعثت سے پہلے اگر کوئی شخص عرب چھوڑ کر دور دراز ملک چلا جاتا اور صرف تئیس سال بعد واپس آتا تو حیران رہ جاتا۔ اسے یقین نہ آتا کہ کیا یہ وہی عرب ہے؟ یہ تبدیلی سڑکوں' عمارتوں اور ذرائع آمد و رفت کی تبدیلی نہیں بلکہ دلوں کی تبدیلی تھی۔ یہ ایسی تبدیلی تھی جس کی خوشبو نے ایک عالم کو معطر کر دیا... ایک نورِ ہدایت' سراج منیر جس کی روشنی اس قدر تابناک تھی کہ انسانوں کے جلائے ہوئے چراغ اس کے سامنے ماند پڑ گئے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

یہ تو میرے اللہ کا فضل ہے

ایک طوفان برپا ہے۔ گالیوں کا ایک جم غفیر ہے کہ خطوط، ای میلز اور سوشل میڈیا پر میرے مہربانوں کے عظیم تحفے کے طور پر مجھے مل رہا ہے۔ مجھے اس معصوم بچی سلینہ کریم پر بھی ترس آ رہا ہے جس نے پاکستان کے سب سے متنازع اور قابل نفرت چیف جسٹس منیر کا جھوٹ پکڑا کہ کیسے اس نے قائداعظم کے رائٹرز کو دیے گئے انٹرویو میں اپنی طرف سے سیکولر جمہوریت کے مفہوم والے فقرے ڈالے اور اسے ایک سرکاری رپورٹ "منیر انکوائری رپورٹ 1954ء" میں شامل کیا۔ یہ پاکستان کی واحد سرکاری رپورٹ ہے جو تین زبانوں اُردو، انگریزی اور بنگالی میں شائع اور ہزاروں کی تعداد میں تقسیم کی گئی تا کہ سرکاری طور پر قائداعظم کے بارے میں جھوٹ بول کر عام کیا جائے۔ خطا تو میری تھی کہ میں نے سلینہ کریم کی اس تحقیقی کاوش... Secular Jinnah کا ذکر کالم میں کر دیا اور سوشل میڈیا پر بیٹھے حقوقِ نسواں کے مشعل بردار اس بچی پر مغلظات بکنے لگے۔ گیارہ اگست والی تقریر کی بات بھی کمال کی ہے، ایسے لگتا ہے کہ جیسے میں نے اُن کی دُکھتی رگ کو چھیڑ دیا ہو۔ دلیل کے طور پر گزشتہ دو دہائیوں سے سرکاری طور پر اسمبلی کی روداد میں چھپنے والا متن اور ہندو اخبار کی خبر مختلف ویب سائٹس پر ایک دفعہ پھر گھوم گئی۔ دعویٰ یہ ہے کہ اسے سرکاری طور پر شائع کیا گیا تھا۔ معاملہ تو ہے ہی سرکاری دستاویز پر اعتماد کا۔ جب تک اس کی دوسرے ذرائع سے تصدیق نہ ہو، میں اسے مکمل سچ کے طور پر تسلیم نہیں کر سکتا۔ میں سرکاری دستاویز پر یقین بھی کر لوں لیکن اس حیرت کو کہاں لے جاؤں کہ 12 اگست 1947ء کے اخبارات میں اس تقریر کے بہت سارے مندرجات تو موجود ہیں لیکن وجہ تنازع وہ فقرے نظر نہیں آتے جن پر سیکولرازم کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ جس ہندو اخبار کی خبر نیٹ پر گردش کر رہی ہے اس کا پورا صفحہ موجود نہیں، بس خبر کا ایک تراشہ ہے۔ اس سے تو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ یہ ہندو اخبار کا تراشہ ہے بھی کہ نہیں۔ ہندو اخبار کی ویب سائٹ پر جاؤ تو وہاں 1990ء سے پہلے کے اخبارات کے آرکائیوز موجود نہیں۔ آل انڈیا ریڈیو اور ریڈیو پاکستان کے پاس قائداعظم کی تقاریر کا تمام ریکارڈ موجود ہے اور انعام اللہ خواجہ نے اپنی کتاب The Creation of Pakistan میں اس کی ساری تفصیل دی ہے، لیکن ریڈیو کے ریکارڈ میں 11 اگست 1947ء کی تقریر ہی موجود نہیں ہے۔

اب آیئے اس اسمبلی کی روداد کی طرف جو پنجاب اسمبلی کی لائبریری میں موجود ہے اور جس کے بارے میں دعویٰ کیا گیا کہ یہ قائداعظم کی زندگی میں چھپ گئی تھی۔ اس کتاب کو دیکھ کر میرے شکوک حیرت میں بدل گئے۔ کتاب ہے Constituent Assembly of Pakistan Debates... یہ 10 اگست سے 14 اگست تک کی کارروائی کی رپورٹ ہے، لیکن آپ حیران ہوں گے کہ اس کارروائی کو شائع کرنے کے لیے باقاعدہ قائداعظم کی وفات کا انتظار کیا گیا۔ اس کی تاریخ اشاعت 9 اکتوبر 1948ء ہے یعنی ان کے انتقال سے ایک ماہ بعد کی۔ اس دوران گورنمنٹ پرنٹنگ پریس نے ہزاروں دستاویزات شائع کیں جن کا ریکارڈ تفصیل سے پنجاب آرکائیوز میں موجود ہے لیکن اسمبلی کی کارروائی چھاپنا ان کو بالکل یاد نہ آیا۔ سب سے زیادہ مضحکہ خیز بات اس کتاب پر پنجاب اسمبلی کی لائبریری کی مہر ہے۔ یہ مہر آپ ان کاغذات پر بھی دیکھ سکتے ہیں جو میرے مہربانوں نے نیٹ پر شائع کیے ہیں۔ پوری کتاب میں چار مہریں ہیں اور وہ بیچ میں سے خالی ہیں، لیکن پہلے صفحے کی مہر کے اندر ایک اور تاریخ والی مہر ہے جس پر تاریخ 13 جولائی 1948 درج ہے۔ لائبریری کی باقی کتابوں پر تاریخ ہاتھ سے لکھی گئی ہے، اس پر مہر ہے۔ کیا کمال کی جادوگری ہے کہ کتاب 9 اکتوبر 1948ء کو چھپتی ہے اور تین ماہ قبل ہی عالم ارواح سے پنجاب اسمبلی کی لائبریری میں پہنچ جاتی ہے۔ یہ کسی ایسے مہربان کا کرشمہ ہے جو اس رپورٹ کو مزید مصدقہ بنانا چاہتا تھا اور اس نے بیچ میں تاریخ والی مہر ثبت کر دی، لیکن تاریخ اشاعت پڑھنا گوارا نہ کیا کیونکہ تاریخ اشاعت آخری صفحے میں بہت باریک چھپی ہوئی ہے۔ اس تقریر کا ریڈیو ریکارڈ کسی کے "باکمال" ہاتھوں نے تلف کر دیا تھا اس لیے آخری سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اخبارات میں ویسا کیوں رپورٹ نہیں ہوا جیسا سرکاری تقریر میں ہے۔ اس کو سچ ثابت کرنے کے لیے 22 جون 1981ء میں ویو پوائنٹ میں حامد جلال نے ایک مضمون لکھا کہ اصل میں اس تقریر کو بیوروکریسی نے پریس میں جانے سے روکا تھا، لیکن ڈان کے ایڈیٹر الطاف حسین نے دھمکی دی کہ ہم اس کی شکایت قائداعظم سے کر دیں گے اور پھر یہ جنگ الطاف حسین نے جیت لی اور تقریر ڈان میں چھپ گئی۔

یہ ایک اور بڑا لطیفہ ہے۔ ڈان کا پہلا شمارہ کراچی میں پندرہ اگست 1947ء کو شائع ہوا، دلی کا دفتر توڑ پھوڑ کی وجہ سے بند ہو چکا تھا یعنی ڈان اخبار کی پیدائش سے تین دن پہلے ہی تقریر شائع ہو گئی۔ حیرت یہ ہے کہ اس پورے واقعے کو ضمیر نیازی جیسے "عظیم" سپوت نے ایک مصدقہ واقعہ سمجھ کر اپنی کتاب The Press in Chains میں صحافت کے لیے جدوجہد کرنے والوں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے درج کیا ہے۔ معاملہ صرف اس تقریر پر نہیں رکتا، ریڈیو پاکستان کے تقاریر کے خزانے میں قائداعظم کی 25 جنوری 1948ء کی وہ تقریر موجود ہے جو انہوں نے سندھ بار ایسوسی ایشن میں کی اور جس میں انہوں نے پہلی دفعہ آئینِ پاکستان کے خدوخال بتائے۔ ان کے یہ الفاظ اس تقریر میں گونجتے ہیں... "Islamic Principles have no parallel, today these are as applicable in actual life as they were 1300 year ago"... یعنی "اسلام کے اصولوں کا کوئی نعم البدل نہیں، وہ آج بھی اسی طرح ہماری اصل زندگی میں نافذ العمل ہو سکتے ہیں جیسے 1300 سال پہلے ہوتے تھے"۔ اس پوری تقریر میں قائداعظم ان سیکولر قوتوں کے بارے میں یہ بھی کہتے ہیں کہ کچھ لوگ یہ شرارت اور پراپیگنڈا کر رہے ہیں کہ ہم شرعی قوانین نافذ نہیں کریں گے۔ قائداعظم نے شریعہ لاء (Shria Law) کا لفظ استعمال کیا۔ یہ تقریر 26 جنوری 1948ء کے ڈان اخبار میں چھپی لیکن جس سرکاری دستاویز کا حوالہ دیا جاتا ہے اور جسے مستند کہا جاتا ہے، اس کی بددیانتی کا عالم یہ ہے کہ حکومت پاکستان نے 1948ء کے آخر میں ایک کتاب The Speeches of Quaid-e-Azam as Governor General گورنمنٹ پرنٹنگ پریس سے شائع کی۔ اس کتاب میں 25 جنوری 1948ء کی تقریر غائب کر دی گئی۔ یہ تھا بددیانتی کا عالم جو ان سرکاری دستاویز کے ساتھ اس طبقے نے روا رکھا، جو اس وقت تمام اداروں میں براجمان تھا۔ اس قدر بددیانتی کے عالم میں سرکاری دستاویز کو مستند کیسے مان لیں؟

یہ طبقہ کون تھا جو آج بھی ہے؟ یہ طبقہ انگریز کی تیار کردہ وہ بیوروکریسی ہے جو لارڈ کارنوالس نے خالصتاً سیکولر اور مغربی اقدار کی بنیاد پر استوار کی تھی اور جس کو اکیڈمی کی ٹریننگ سے لے کر نوکری کے کلچر تک انگریزوں کی طرح چلنا، پھرنا، اٹھنا، بیٹھنا، ہنسنا، رونا اور خواب تک دیکھنا سکھایا گیا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اس ملک کی تقدیر سے بلا شرکتِ غیرے 1958ء تک کھلواڑ کیا اور پھر اپنے جیسی انگریز کی تیار کردہ فوج کو بھی ساتھ ملایا۔ انہی کی مغرب زدہ آغوش سے غلام محمد، سکندر مرزا اور محمد علی بوگرہ جیسے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے اس ملک کی قسمت کے ساتھ وہ کھیل کھیلا جس کی سزا آج پوری قوم بھگت رہی ہے۔ یہ لوگ کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ قائداعظم کے منہ سے نکلنے والے 'شریعہ لاء' کے لفظ زبانِ زدِ عام ہو جائیں۔ یہ وہی ڈپٹی کمشنر اور سیکرٹری یا ایس پی تھے جو 14 اگست 1947ء سے پہلے انہی عوام پر ڈنڈے برساتے تھے اور انہیں قید کرتے تھے جو پاکستان کا مطالبہ کرتے تھے اور اب وہ اس پاکستان کے ہر ادارے کے مالک و مختار بن گئے تھے۔ انہوں نے اس صفائی سے اپنے مطلب کے فقرے ہر اس سرکاری دستاویز میں ڈالنے کی کوشش کی جس تک ان کی پہنچ تھی۔ جو لوگ یہ منصوبہ بندی کر سکتے ہوں کہ علامہ محمد اسد کے ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک ری کنسٹرکشن کو کیسے نذرِ آتش کرنا ہے اور اس کے ریکارڈ کو آرکائیوز تک نہیں پہنچنے دینا، جو قائداعظم کے رائٹر کو انٹرویو میں ایک جھوٹا فقرہ ڈال کر پاکستان کی تاریخ کی ایک بہت بڑی سرکاری دستاویز شائع کریں اور اس جھوٹ کو سرکاری حیثیت دے دیں، جو ریڈیو پاکستان سے اصل ریکارڈنگ تک ضائع کر دیں تاکہ تقریر میں جو فقرے ڈالنے ہیں، اپنی مرضی سے ڈال سکیں، ایسے لوگوں کی موجودگی میں کوئی سرکاری دستاویز مستند کیسے ہو سکتی ہے جب تک اس کی دیگر ذرائع سے تصدیق نہ ہو؟ اس تقریر کا جوڑ جسٹس منیر کے ساتھ بہت گہرا ہے۔ پاکستان میں 11 ستمبر کی تقریر پر سب سے پہلے بحث کا آغاز منیر رپورٹ میں کیا گیا اور پھر اس تصور کو بحث کا موضوع بنا دیا گیا۔ یہ جنگ ازل سے ہے۔ قائداعظم تو ابھی کل کی بات ہے، سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے ذخیرے میں محدثین نے باقاعدہ "موضوع" یعنی گھڑی ہوئی احادیث کا باب باندھا ہے۔ ملا علی قاری کی کتاب موضوعاتِ کبیر ان گھڑی ہوئی احادیث کا مجموعہ ہے۔ یہ سب احادیث کا دامن صاف کرنے کے لیے کیا گیا۔ کاش کوئی پاکستان کی تاریخ کا دامن بھی آلائشوں سے پاک کر دے۔ باقی رہی طعن و تشنیع اور مغلظات تو میرے اللہ نے اپنے بندوں کی ایک پہچان بتائی ہے کہ "وہ نہیں ڈرتے ملامت سے اور ملامت کرنے والوں سے۔ یہ تو ان پر اللہ کا فضل ہے جو دیتا ہے جسے چاہے"۔ (المائدہ: 54) اس راستے میں ملامت، طعن و تشنیع اور گالیاں تو اللہ کا فضل ہیں۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

ذات الٰہی اور قرآن کا تصورِ عذاب

حرفِ راز
اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

انسانی ذہن کا کمال یہ ہے کہ وہ اس وسیع و عریض کائنات میں اسی بات کو سچ مانتا ہے جو اس کے فہم و ادراک کے دائرے میں آتی ہے۔ موجودہ سیکولرازم کی بنیاد دو اصولوں پر ہے۔ پہلا سائنسی سچائی (Scientific Truth) اور دوسرا یہ کہ ہر واقعہ اپنے پس منظر میں کوئی نہ کوئی محرک رکھتا ہے جسے علت و معلول (Cause and Effect) کا اصول کہا جاتا ہے۔ جہاں تک سائنسی سچائی اور حقیقت کا تعلق ہے تو اس کا عالم یہ ہے کہ ایک صدی تک نصاب میں پڑھائے جانے والے سائنسی اصول، کلیے اور قانون اگلی صدی میں سفید جھوٹ کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں، لیکن ماہرین سائنس انہیں سچائی کے طور پر حصولِ علم میں سرگرداں لوگوں کو پڑھاتے رہتے ہیں۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ ہر واقعہ کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ سمندر سے بخارات اڑتے ہیں، بادل بنتے ہیں اور بارش برستی ہے۔ بیج بویا جاتا ہے، پانی دیا جاتا ہے تو فصل اگتی ہے۔ پہاڑوں میں موجود معدنیات پانی کو گرم یا زہریلا کرتی ہیں، زمین کے اندر لاوا نرم سطح سے ابلتا ہے، مختلف براعظموں کی پلیٹیں مستقل حرکت میں ہیں اور ان کی حرکت سے زلزلہ آتا ہے۔ جراثیم اور وائرس سے مختلف بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ جہاں کہیں معاملہ سمجھ سے بالاتر ہو جائے اسے ایک لاینحل سوال (Mystry) کہہ کر دعویٰ کیا جاتا ہے کہ انسان کی جستجو جاری ہے اور ایک دن وہ اس راز کو بھی پا لے گا۔ یہ ہے وہ بنیاد اور تصور جس کی متعین حدود کے اندر یہ لوگ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات کو کھینچ کر لاتے ہیں۔ جبکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا دعویٰ ہے کہ وہ خالقِ اسباب ہے۔ وہ "باری" ہے یعنی ایک ایسا مصور یا تخلیق کار جس کے پاس اسباب نہ ہوں، تو بھی وہ خلق کرتا ہے۔

دنیا کا ہر خالق اسباب کا محتاج ہے لیکن اللہ اسباب خود تخلیق کرتا ہے۔ اللہ کی کائنات کے رازوں کو جاننا اللہ کے نیک بندوں کی صفات میں سے ہے، لیکن اس کائنات کے رازوں کو جاننے کا مقصد معرفتِ الٰہی کے لیے ہونا چاہیے۔ اللہ فرماتا ہے: "جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹے ہوئے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق پر غور کرتے ہیں اور پھر پکار اٹھتے ہیں، اے پروردگار تو نے یہ سب کچھ باطل پیدا نہیں کیا (آل عمران:191)۔ یہ ہے کائنات کے رازوں کو جاننے کا مقصد کہ جوں جوں اس کی نعمتوں کا ادراک کرو، اللہ کی بڑائی آپ پر واضح ہو۔ لیکن موجودہ تمام تر سیکولر علم کی بنیاد یہ ہے کہ جوں جوں علم میں اضافہ ہوتا ہے، اس پر انسان کی بڑائی کا خمار چڑھتا چلا جاتا ہے اور وہ پکار اٹھتا ہے: "انسان عظیم ہے یا خدا"۔ اسی طرح انسان نے زندگی گزارنے کے جو اصول وضع کیے ہیں اور جو ادارے بنائے ہیں وہ اللہ کو بھی ان اصولوں کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ مثلاً وہ عادل رب کو چیف جسٹس کی کرسی پر بٹھاتا ہے اور اس کو وہی اختیارات دینا چاہتا ہے جو چیف جسٹس کو آئین کے تحت حاصل ہیں؛ حالانکہ اللہ تو گناہوں کو نیکیوں میں بدلنے، گناہوں کو چھپانے، تمام گناہوں کو معاف کرنے والا ہے۔ ایسا تو کسی آئین کے مطابق ممکن ہی نہیں۔ اس کے ہاں تو ایک سچی توبہ انسان کو صاف شفاف کر دیتی ہے۔ اسی لیے یہ لوگ جب اللہ کے تصورِ عذاب کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو اسے ایک چیف جسٹس کی کرسی پر لا بٹھاتے ہیں اور پھر یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ایسا عذاب نازل کرے جس میں بے قصور بچ جائیں اور قصوروار سزا پائیں۔ یہ قرآن اور اللہ کے بتائے ہوئے اصولوں سے بالکل الٹ تصور ہے۔ اللہ نے یہ دنیا فیصلوں کے لیے نہیں بلکہ امتحان کے لیے بسائی ہے اور فیصلے کے لیے روزِ قیامت مقرر ہے۔ جزا اور سزا کے سب فیصلے وہیں ہوں گے جہاں کوئی گروہ، خاندان، سیاسی پارٹی، مذہبی جماعت، مسلکی گروہ اکٹھا پیش نہیں ہوگا۔ "اور ان میں ہر شخص قیامت کے دن اللہ کے حضور پیش ہوگا فرداً فرداً"۔ (مریم:95) پھر وہ اس دنیا میں قوموں پر عذاب کیوں نازل کرتا ہے؟ اس عذاب کا فلسفہ اللہ خود قرآنِ پاک میں بیان فرماتا ہے: "اور ہم انہیں لازماً مزہ چکھائیں گے چھوٹے عذاب کا بڑے عذاب سے قبل، شاید کہ یہ رجوع کر لیں"۔ (السجدہ:21) یہاں اللہ کسی فرد پر علیحدہ عذاب نازل نہیں کرتا بلکہ پورے گروہ یا قوم میں سے کسی کو استثنیٰ نہیں ہوتا۔ وہ فرماتا ہے: "اور ڈرو اس وبال سے جو تم میں سے صرف ظالموں کو ہی لاحق نہیں ہوگا"۔ (الانفال:25) یہ بھی اسی کا اختیار ہے کہ وہ کبھی کبھی نیک لوگوں کو اپنے عذاب سے خاص طور پر محفوظ رکھتا ہے اور اس میں بھی صرف ایسے لوگوں کو اللہ بچاتا ہے جو لوگوں کو برائی سے روکتے رہتے تھے۔ "ہم نے بچا لیا ان لوگوں کو جو برائی سے روکتے تھے"۔ (الاعراف:165) اس آیت کے آغاز میں اللہ ان لوگوں کا بھی ذکر کرتا ہے جو لوگوں کو کہتے تھے: "تم ان لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنہیں اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا سخت عذاب دینے والا ہے"۔ (آلِ عمران:164) یعنی وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ خاموش بیٹھو، اللہ خود ان کو دیکھ لے گا۔ اللہ نے ان خاموش رہنے والوں کو بھی عذاب میں مبتلا کر دیا۔

برائی سے روکنے والوں کا استثنیٰ بھی اللہ کا اپنا فیصلہ ہے، وہ چاہے تو بچائے اور چاہے تو ہلاک کر دے اس لیے کہ موت صرف ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف منتقلی کا نام ہے اور روزِ قیامت عذاب کے دوران ہلاک ہونے والے فرداً فرداً پیش ہوں گے۔ جس کے اعمال اچھے ہوں گے وہ جنت میں جائے گا اور جس کے اعمال بُرے ہوں گے وہ جہنم کا مزا چکھے گا۔ یہ ہے وہ فلسفہ جس کے تحت اللہ لوگوں کو جھنجھوڑنے اور اپنی جانب لوٹ آنے کے لیے عذاب نازل کرتا ہے۔ اس کے نزدیک چھوٹی سے چھوٹی پریشانی سے لے کر بڑی سے بڑی مصیبت اس کی جانب سے نازل ہوتی ہے تاکہ انسان اسے یاد کرے اور آخرت میں سرخرو ہو۔ وہ تو کسی ظالم بادشاہ کو بھی اپنا عذاب ہی کہتا ہے اور پھر قوموں کو یاد دلاتا ہے کہ میں نے اس ظالم سے تمہیں نجات دلائی "جب ہم نے تم کو فرعون کے لوگوں سے نجات دی جو تمہیں بڑا عذاب دیتے تھے، تمہارے بیٹوں کو ذبح کر ڈالتے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتے، یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر بڑی بلا (امتحان) تھی"۔ (البقرہ49) لیکن علت و معلول اور سائنسی سچائی کو حرفِ آخر سمجھنے والے انہیں دنیا کے عوامل سمجھتے ہیں۔ اسی لیے جب کہا جاتا ہے کہ عذاب میں اللہ کی طرف رجوع کرو، اس سے اجتماعی استغفار کرو تو اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ لیکن میرا اللہ تو حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کی مثال دے کر شدید خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ قومیں اس سے اجتماعی توبہ کریں۔ یونسؑ کی قوم اجتماعی طور پر اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو گئی تھی اور اللہ نے عذاب ٹال دیا تھا۔ اللہ فرماتا ہے: "بھلا کوئی بستی ایسی کیوں نہ ہوئی کہ ایسے وقت ایمان لے آتی کہ اس کا ایمان اسے فائدہ پہنچا سکتا۔ البتہ صرف یونسؑ کی قوم کے لوگ ایسے تھے۔ جب وہ ایمان لائے تو ہم نے دنیوی زندگی میں رسوائی کا عذاب ان سے اٹھا لیا اور ان کو ایک مدت زندگی کا لطف اٹھانے دیا"۔ (یونس98) یہ ہے قوموں اور نبیوں سے اللہ کی شدید خواہش۔ اللہ کی اسی خواہش پر سید الانبیاء ﷺ اور ان کے ساتھیوں نے عمل کیا۔ اگر کچھ عرصہ بارش نہ برستی تو پوری اُمت شہروں سے باہر نکل آتی اور بارش کے لیے رو رو کر نمازِ استسقاء ادا کرتی۔ نمازِ استسقاء کیا ہے؟ اجتماعی استغفار ہی تو ہے۔ آپس میں لڑائی شروع ہوتی تو سورہ الحجرات کی 9ویں اور 10ویں آیات کے مطابق اللہ کے حکم کو سامنے رکھتے ہوئے مسلمانوں کے دو گروہوں میں صلح کی کوشش کی جاتی، خواہ اس میں سیدنا امام حسنؓ کو خلافت سے دستبردار کیوں نہ ہونا پڑتا، اس لیے کہ وہ سمجھتے تھے کہ اللہ گروہوں میں تقسیم ہونے کو بھی اپنا عذاب بتاتا ہے۔ "کہو وہ اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ کوئی عذاب تم پر اوپر سے بھیجے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے نکال دے یا تمہیں مختلف ٹولیوں میں بانٹ کر ایک دوسرے سے لڑا کر ایک دوسرے کی طاقت کا مزا چکھائے"۔ (الانعام:65) اسی لیے انہوں نے اللہ کے احکامات کی جانب رجوع کیا۔ سیدہ عائشہؓ کا عمر بھر کا پچھتاوا اور حضرت علیؓ کا قرآن کو حکم مان کر صلح پر آمادہ ہونا۔ ہاں جب امت نے یہ روش ترک کی تو خون میں نہاتی رہی۔ اجتماعی استغفار کی اللہ کی شدید خواہش سے انکار کی اور کیا وجہ ہو سکتی ہے، سوائے اس کے کہ ہمیں ہمارا اکڑا ہوا سر اور تنی ہوئی گردن لوگوں کے سامنے ہمیں اللہ کے حضور جھکنے نہیں دیتی۔ لوگ کیا کہیں گے؟ کس قدر احمق ہے، غیر سائنسی، جاہل، بھلا قتل و غارت بھی اللہ کے حکم سے رکتے ہیں، بھلا امن و امان بھی اللہ قائم کرتا ہے، بھلا معاشی ترقی بھی اللہ کے حکم سے ہوتی ہے؟ بے وقوف، جاہل، کس لائن میں جا کر کھڑا ہو گیا ہے؟ تم نے تو پڑھ لکھ کر غارت کر دیا ہے، لیکن میرے اللہ نے اپنے پیارے رسول ﷺ کے ذریعے "سورۃ القریش" میں جب قریش کو کعبے کے رب کی عبادت کے لیے پکارا تو دو بلند بانگ دعوے کیے: ہم نے تمہیں بھوک میں کھانا کھلایا اور خوف میں امن دیا، لیکن ان لوگوں کے نزدیک یہ کتنی غیر سائنسی بات ہے!

allurdupdfnovels.blogspot.com

زین علی، مرگ بر امریکہ اور ایران

حرف راز
اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

تہران کی مرکزی شاہراہ ولی عصر پر مسجد بلال کے ساتھ ایران کے مرکزی ریڈیو اور ٹیلی ویژن چینل کی عمارات ہیں' جنہیں 'صداوسیما' کہا جاتا ہے۔ عیسوی سال 2007ء میں جب مَیں ای سی او (یہ دس ممالک کی علاقائی تنظیم ہے جس میں ترکی، ایران، پاکستان، افغانستان اور روس سے آزاد ہونے والی چھ مسلم ریاستیں شامل ہیں) کے کلچرل انسٹی ٹیوٹ کا ایگزیکٹو ڈائریکٹر تھا' تو تہران کے اسی مرکز صداوسیما میں حالات حاضرہ کے پروگراموں میں ایک مستقل تجزیہ نگار کی حیثیت سے مدعو ہوتا رہا۔ اسی ٹیلی ویژن چینل سے میں نے علامہ اقبال کی شاعری پر ایک مستقل سیریز بھی ریکارڈ کروائی۔ یوں تو میرے پاس ایک سفارت کار کی حیثیت سے پاکستان کا سرخ پاسپورٹ تھا لیکن چونکہ میں پاکستانی سفارت خانے کے بجائے ایک علاقائی تنظیم سے منسلک تھا' اس لیے اس تنظیم کے سربراہ ایران کے سابق وزیر تعلیم ڈاکٹر رجبی نے مجھے ان تمام سفارتی پابندیوں سے آزاد کرکے لکھنے اور ٹیلی ویژن پروگراموں میں شرکت کی مکمل آزادی دے رکھی تھی۔

یہ آزادی محض رسمی نہ تھی بلکہ جب لال مسجد اور حفصہ مدرسے کے خلاف آپریشن کے موقع پر ایران کے انگریزی چینل پریس ٹی وی پر میری گفتگو سے سیخ پا ہو کر مشرف حکومت نے فوری طور پر مجھے ایران سے واپس بلا کر عبرت کا نشان بنانے کے لیے انکوائری کا آغاز کیا تو ڈاکٹر رجبی سفارتی آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے دو ماہ تک میرے حق میں لڑتا رہا۔ اس دوران جب تہران میں پاکستان کا سفیر مشرف حکومت کے احکام کی تعمیل کرتے ہوئے میری ایران بدری پر کمربستہ تھا، مجھے ایک سرکاری دورے پر تاجکستان جانا تھا۔ میرے اس دورے کو ڈاکٹر رجبی نے منسوخ کرنے سے انکار کر دیا۔ بات بڑھ سکتی تھی، مگر میں پاکستانی تھا اور مجھے یہ جنگ پاکستان میں ہی لڑنا تھی اس لیے میں نے پاکستان واپسی اختیار کرلی۔

بعد کی کہانی طویل ہے لیکن ایران کے اس عرصہ ملازمت میں جس شخص سے میرا تعلق بہت مستحکم ہوا وہ زین علی تھا، تہران ٹی وی کی اردو نشریات کا ڈائریکٹر۔ اس کے والد ایران سے کراچی آکر مدتوں ایک ہوٹل چلاتے رہے تھے، اس لیے اسے اردو اور فارسی دونوں زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ اقبال شناسی کا ماہر اور سب سے اہم بات یہ کہ مسلکی تعصب اسے چھو کر بھی نہیں گزرا تھا۔ گزشتہ دنوں جب میں نے ایران امریکہ معاہدے سے دلبرداشتہ ہو کر اپنا کالم ''مرگ بر امریکہ، مرگ بر اسرائیل اور مرگ بر ضدِ ولایتِ فقیہ'' تحریر کیا تو زین علی نے مجھے ڈھونڈنا شروع کیا۔ گزشتہ دنوں میرے کالم کے مندرجات پر اس کا طویل فون آیا اور ایک محبِ وطن ایرانی کی طرح اس نے لمبی دفاعی گفتگو کی۔ اس کی گفتگو اگر لوگوں تک نہ پہنچے تو یہ میری طرف سے بہت بڑی خیانت ہوگی، اس لیے بھی کہ اس میں زین علی کا امت مسلمہ کے لیے درد بھی شامل ہے اور ایران سے محبت بھی۔ وہ میرے ملک کے لوگوں سے مختلف ہے۔ میرے ملک میں اگر کوئی کسی مسلک کے ماننے والوں کے کسی رویے کے بارے میں کچھ تحریر کردے تو فوراً اسے یزید پکارنا شروع ہو جاتے ہیں۔ باقی مغلظات اس کے علاوہ ہیں۔ یہ رویہ کسی ایک مسلک کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔

اس کالم کے جس حصے پر زین علی کو سب سے زیادہ اعتراض تھا' وہ تھا جس میں' میں نے لکھا تھا کہ ایران کا انقلاب جو آیت اللہ خمینی کی قیادت میں آیا وہ پوری ملت اسلامیہ کے لیے ایک امید کی کرن تھا لیکن اس میں آہستہ آہستہ مسلکی رنگ جھلکنے لگا۔ زین علی نے کہا کہ ایران آج بھی ایسے ممالک میں جارحیت کے خلاف آواز بلند کرتا ہے جہاں سنی اکثریت ہے، مثلاً فلسطین اور مصر کے بارے میں ایران کی پالیسیاں واضح ہیں۔ حسنی مبارک کے خلاف اور اسرائیل کی مخالفت میں ایران کا کردار پوری دنیا کے سامنے عیاں ہے؛ حالانکہ دونوں سنی اکثریت والے علاقے ہیں۔ زین علی نے کہا کہ ایرانی معاشرے میں دوسرے معاشروں کی طرح خرابیاں بھی ہوں گی لیکن یہاں ممکنہ حد تک شرعی قوانین کا نفاذ کر دیا گیا ہے۔ میں ان دونوں معاملات میں زین علی سے مکمل اتفاق کرتا ہوں اور میں نے اس موضوع پر بار بار لکھا بھی ہے۔ لیکن جب میں نے افغانستان اور شام کے حوالے سے بات شروع کی تو زین علی اس کی پشت پر امریکہ اور سعودی عرب کے اثرات کے بارے میں گفتگو کرنے لگا۔ اس کی یہ دلیل بھی مضبوط ہے کہ ایران نے افغانستان میں شمالی اتحاد کا ساتھ دیا اور اس میں تو ازبک اور تاجک بھی شامل تھے جو سنی ہیں اور اس کے نزدیک ایران نے طالبان کی اس لیے مخالفت کی تھی کہ وہ اپنے سوا باقی تمام مسالک کے لوگوں کو کافر سمجھتے ہیں۔ یہ وہ تاثر ہے جو میں نے بھی پورے ایران میں دیکھا ہے؛ حالانکہ افغانستان میں طالبان حکومت کے زمانے میں کسی قسم کا ایسا بیان یا فتویٰ جاری نہیں ہوا تھا۔ زین علی کی دوسری دلیل یہ تھی کہ امریکہ طالبان کی پشت پر تھا اس لیے ہم اس کے مخالف تھے۔ یہ دلیل بھی عالمی سیاست کے حساب سے وزن رکھتی ہے لیکن جب امریکہ شمالی اتحاد کے ساتھ تھا تو ایران کو طالبان کا ساتھ دینا چاہیے تھا جبکہ ایران شمالی اتحاد کے ساتھ ہی رہا، اس شمالی اتحاد کے ساتھ جس کی پشت پر امریکہ آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ گفتگو کے دوران ایران عراق جنگ کا تذکرہ چل نکلا اور اس کا موقف تھا کہ یہ جنگ مختلف عرب ریاستوں نے ایران کے اسلامی انقلاب کے اثرات کو خراب کرنے کے لیے شروع کروائی تھی اور امریکی اس کی پوری نگرانی کے ساتھ مدد بھی کر رہے تھے۔ یہ بات ایک تاریخی حقیقت ہے اور اس میں جن دس لاکھ مسلمانوں کا ناحق خون بہا وہ یقیناً ان حکمرانوں کی گردن پر ہے جنہوں نے اپنی بادشاہتیں بچانے کے لیے عرب وعجم اور پھر شیعہ سنی تنازعے کو ہوا دی۔ ایران امریکہ معاہدے کے بارے میں اس کا کہنا تھا کہ یہ دراصل ایران کی فتح ہے کہ اس نے مغرب سے اپنے پُرامن ایٹمی پروگرام کا حق منوالیا ہے۔ یقیناً یہ ایک سفارتی فتح ہے، لیکن ایران میں مجھ جیسے لاکھوں ایسے لوگ بھی بستے ہیں جو آیت اللہ خمینی کے شیطانِ بزرگ کے تصور کو حقیقت جانتے ہیں اور وہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ اس دنیا میں فسادات کی جڑ امریکہ اور اس کی پالیسیاں ہیں۔ اس پر زین علی کا جواب یقیناً ایک خوش فہم اور رجائیت پسند ایرانی کا تھا کہ ایران آج بھی امریکہ کے نزدیک برائی ہی کا مرکز ہے۔ ایران کی اسرائیل مخالف پالیسی نہیں بدلی، ایران کو ابھی محبت کی نظر سے نہیں دیکھا جا رہا۔ میں بھی ایک رجائی شخص ہوں اور امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ میری دعا ہے کہ ایرانی اپنے تینوں نعروں... مرگ بر امریکہ، مرگ بر اسرائیل اور مرگ بر ضدِ ولایت فقیہ پر قائم رہیں اور جو خواب انہوں نے چونتیس سال قبل دیکھے تھے وہ نہ ٹوٹیں۔

ایران امریکہ معاہدے اور پابندیاں نرم ہونے کے بعد میرا خوف اور میرے ذہن کا خطرہ زین علی سے مختلف ہے۔ وہ ایک ایرانی ہے اور وہ فردوسی کے اس قول کے مصداق کہ ''اگر ایران نہیں تو پھر کچھ نہیں'' ایک محبِ وطن ایرانی ہے اور میں جس مملکت خداداد پاکستان میں رہتا اور اس سے محبت کرتا ہوں اس کا خدشہ کسی اور طرف سے ہے۔ اس معاہدے کا سب سے زیادہ فائدہ بھارت کو ہوگا جو ایران سے تیل خریدنے والا سب سے بڑا ملک ہے اور 2007ء سے اب تک بھارت اور ایران کی تجارت میں بیش بہا اضافہ ہوا ہے۔ 2012ء میں ایران نے بھارت سے 15,968 ملین ڈالر کی تجارت کی اور اس میں ایران کی برآمدات 13556 ملین ڈالر تھیں جن میں بڑا حصہ تیل کا تھا، اس مقصد کے لیے بھارت اور ایران کی ایک مشترکہ جہاز راں کمپنی ہے جس کی مالیت 250 ملین ڈالر ہے۔ اسی طرح چنائی پٹرولیم کارپوریشن اور مدراس فرٹیلائزر دونوں ملکوں کی مشترکہ کمپنیاں ہیں۔ بھارت کا ایران میں پندرہ ارب ڈالر سے ایک بزنس گروپ کام کر رہا ہے جس کا نام ایثار گروپ ہے، اسی گروپ نے تہران میں ایثار پارس سٹیل مل قائم کی ہے جبکہ 2002ء میں بھارت اور ایران کے درمیان تیل اور گیس کی تلاش کے لیے OVL نامی کمپنی کام کر رہی ہے جس میں بھارت کا حصہ 36 ملین ڈالر ہے۔ یہاں میں ان موجودہ سیاسی نوعیت کی ترقیاتی سرگرمیوں کا ذکر نہیں کرنا چاہتا جن میں چاہ بہار سے افغانستان تک سڑک اور چاہ بہار کی بندرگاہوں میں سرمایہ کاری شامل ہے۔ ایرانی معاشرے میں بھارتی فلموں کے اثر کا یہ عالم ہے کہ ہر فلم فارسی میں ڈب ہو کر سینماؤں میں لگتی ہے؛ چنانچہ بھارت کی اداکارائیں اور اداکار وہاں اجنبی نہیں۔ مجھے ایران سے خوش فہم اور پُرامید ہونا چاہیے کہ وہ ایک مسلمان ملک ہے لیکن میں، میرا ملک اور میرے ملک کے عوام بھارت کو جانتے ہیں اور ہم آئے روز اس سے نئے زخم کھاتے آرہے ہیں۔ عالمی سیاست اور علاقائی بالادستی وہ ایسی بلا ہے جس نے اس دنیا میں صرف خون کی ہولی کھیلی ہے، قومی ریاستیں اس کھیل کے چہرے ہیں۔ اقبال ہمارا اور ایران کا مشترکہ ہیرو ہے۔ جو بتانِ رنگ و بو کو توڑنے اور نیل کے ساحل سے کاشغر تک امتِ مسلمہ کی یکجائی کا نعرہ بلند کرتا ہے۔ کاش اس نعرے کی گونج ایران کے تہران اور سعودی عرب کے مکہ و مدینہ سے ایک ساتھ بلند ہو۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

ذلت ورسوائی کی چادر

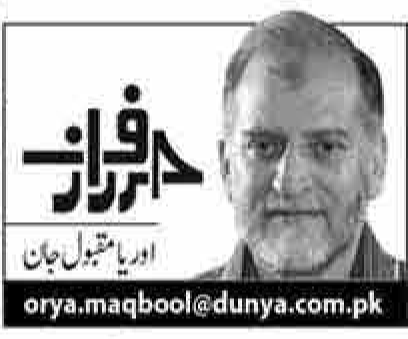

دسمبر 1971ء کی سولہ تاریخ کو ڈھاکہ کی سرزمین پر پاکستان کی فوج ہاری تھی لیکن آج ٹھیک بیالیس برس بعد دسمبر ہی میں پاکستان ہار گیا ہے۔ پاکستان کی فوج چند لاکھ افراد پر مشتمل وہ سرفروش ہیں جو اس ملک کی سرحدوں کا دفاع کرتے ہیں جبکہ پاکستان ان اٹھارہ کروڑ عوام کا نام ہے جن کی زندگی اور موت اس سرزمین سے وابستہ ہے۔ بیالیس برسوں میں اس ملک پر کیا کچھ نہیں بیتا، لیکن اس سے وفاداری اور محبت میں خون کے چراغ روشن کرنے والوں میں کبھی کمی نہیں آئی۔ ہم کس قدر بدقسمت اور بدنصیب عہد کے باسی ہیں کہ جہاں جنرل یحییٰ اور جنرل نیازی قومی پرچم میں دفن ہوئے اور ان کے شانہ بشانہ لڑنے والے عبدالقادر ملا کی شہادت پر اس مملکت خداداد پاکستان کا پرچم ایک منٹ کے لیے بھی سرنگوں نہیں ہوا۔ دنیا میں موجود دوسو کے قریب ممالک میں سے کسی نے بھی اپنے وفاداروں کے ساتھ یہ سلوک نہیں کیا ہوگا۔ میرا دکھ اور بھی شدید ہے کہ اسی سال یعنی 2013ء میں برطانیہ نے ہندوستان کے ان بارہ لاکھ وفاداروں کو عزت و توقیر دینے کا فیصلہ کیا جو برطانوی فوج کے ساتھ فرانس اور بلجیم کے محاذوں پر لڑے تھے اور ان میں سے 74 ہزار اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ یہ تقریباً ایک صدی قبل کا قصہ ہے لیکن جیسے ہی برطانوی حکومت نے یہ فیصلہ کیا' بیرونس سعیدہ وارثی' جو برطانیہ کی وزیر ہے' بلجیم میں خداداد خان کی قبر پر گئیں اور اسے خراج عقیدت پیش کیا۔ خدائے داد خان پہلا ہندوستانی تھا جسے وکٹوریہ کراس ملا تھا۔ وہ فرانس کے نیوچیپل(Neuve Chapelle) کی یادگار پر گئیں جہاں چار ہزار سات سو بیالیس ہندوستانی سپاہی مارے گئے تھے۔ برطانیہ کا گروٹ بیک(Grote Beek) قبرستان' جس میں گوجر خان کے ہندوستانی وفاداروں کی قبریں ہیں، آج بھی اہم دنوں میں پھولوں سے لدا جاتا ہے۔ برطانوی حکومت نے وہ تمام خطوط اکٹھے کرکے عجائب گھروں میں رکھنے کا اہتمام بھی کیا ہے جو ان وفاداروں نے محاذ جنگ سے اپنے رشتے داروں کو لکھے تھے۔

امریکہ جب برطانیہ سے آزادی کی جنگ لڑ رہا تھا تو امریکی سرزمین پر بہت سے ایسے تھے جو برطانوی افواج کا ساتھ دیتے تھے، ان سب کو جارج سوئم کی اہلیہ ملکہ شارلٹ کے نام سے جاری کردہ ایوارڈ دیے گئے اور ان کی تصاویر برطانیہ کے قومی فوجی عجائب گھر میں موجود ہیں۔ امریکہ ایک عالمی طاقت ہے اور دوسری جنگ عظیم کے بعد تو برطانیہ اس کا مرہون منت ہوکر رہ گیا تھا لیکن آج تک کسی نے ان وفاداروں کا نام اپنی تاریخ سے کھرچ کر نہیں پھینکا۔ ویت نام سے زیادہ بدنام زمانہ جنگ کون سی ہوگی، ایک ایسی جنگ جس میں امریکہ نے انسانیت کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی تھیں۔ لاکھوں ویت نامیوں کا قتل عام کیا گیا۔ پورے امریکہ میں اس کے خلاف شدید نفرت کی لہر تھی۔ اس جنگ میں شرکت سے انکار کرکے عالمی باکسر محمد علی امریکی تاریخ کا ہیرو بن کر ابھرا، لیکن آج بھی امریکہ کے دارالحکومت واشنگٹن میں ان کی کانگریس کی عمارت کے سامنے پارک میں سیاہ رنگ کی ایک دیوار پر ان 59 ہزار فوجیوں کے نام درج ہیں جو اس جنگ میں مارے گئے۔ بات صرف فوجیوں تک نہیں رکتی، امریکہ نے ہر اس شخص کو بھی نوازا جس نے اپنی مادر وطن ویت نام سے غداری کرکے امریکی فوج کا ساتھ دیا تھا، لیکن یہ سب تو باہر سے آئے ہوئے لوگ تھے، قابض حکمران تھے، ان کے ملک کا کوئی ٹکڑا کسی نے فوج کے ذریعے ان سے علیحدہ نہیں کیا تھا، اس کے باوجود وہ اپنے ساتھ مرمٹنے والوں کو یاد رکھتے ہیں۔

لیکن میرا المیہ یہ ہے کہ میرے ملک کا بددیانت مورخ جب بنگلہ دیش کی کہانی سناتا ہے تو وہ اس مملکت خداداد پاکستان سے اس قدر نفرت کرتا ہے کہ اسے کلکتہ سے مشرقی پاکستان کی طرف مارچ کرتے ہوئے بھارتی ٹینک نظر آتے ہیں نہ بھارتی فوج۔ یہ مورخ بہت کمال کا ہے' اسے مکتی باہنی دہشت گرد تنظیم نہیں بلکہ تحریک آزادی کی فوج لگتی ہے لیکن سوات اور وزیرستان میں سب کے سب دہشت گرد نظر آتے ہیں اور فوج محب وطن لیکن اسے یہی فوج مشرقی پاکستان میں ظالم اور حقوق کی غاصب محسوس ہوتی ہے؛ حالانکہ ان دونوں سانحات کے وقت اس ملک کی باگ ڈور فوج کے ہاتھ میں تھی' جنرل یحییٰ اور جنرل مشرف۔ کسی ملک کی ریاستی قوت اس وقت تک ختم نہیں کی جاسکتی جب تک کوئی بیرونی طاقت اس عمل میں شریک نہ ہو۔ امریکہ کی جنگ آزادی ناکام ہوجاتی اگر فرانس اپنی فوجیں امریکی باغیوں کے ساتھ برطانیہ سے لڑنے کے لیے نہ بھیجتا۔ نیویارک کا مجسمہ آزادی آج بھی فرانس کی بیرونی مدد کی گواہی کے طور پر امریکی ساحلوں پر نصب ہے، لیکن اس بدقسمت ملک کا دانشور، میڈیا اینکر، کالم نگار، مورخ اور تبصرہ نگار صرف ان لوگوں کو گالی دیتا ہے جو اس ڈوبتے ہوئے ملک کی سرحدوں کے تحفظ کی جنگ لڑ رہے تھے۔ یہ کیسا مورخ تھا جو اس جہاز کے سپاہیوں کی تعریف کرتا ہے جو ڈوبنے لگا تھا تو اس پر سوار فوجی عرشے پر کھڑے ہوکر فوجی بینڈ کی دھن میں موت کا انتظار کرتے رہے لیکن تیراکی جاننے والے بھی ساتھیوں کو چھوڑ کر نہیں گئے تھے۔ یہ مورخ ژاں پال سارتر کو اپنے ہی ملک کے خلاف الجزائر میں جاکر جنگ آزادی کی حمایت پر خراج تحسین پیش کرتا ہے۔ بولیویا کا چی گویرا کیوبا میں لڑے تو اسے ہیرو بناتا ہے۔ فرانس کی اشرافیہ کا نمائندہ ویت نام میں امریکیوں کے خلاف لڑنے والا انسانی حقوق کا علمبردار ہے۔ یہ کیسا تضاد ہے کہ مکتی باہنی کا ساتھ دینے والا ہندوستان کا سپاہی بھارت کا ہیرو ہے لیکن کشمیر، افغانستان، فلسطین اور چیچنیا جاکر لڑنے والا مسلمان دہشت گرد اور قاتل ہے۔ اسی مورخ کے نزدیک بلوچستان میں 1974ء میں بلوچوں کے شانہ بشانہ پاکستانی فوج کے خلاف لڑنے والے پنجابی دانشور آج اس ملک میں علم و دانش کے نمائندے ہیں بلکہ ایک تو نگران وزیراعلیٰ بھی رہ چکا ہے، لیکن اس مورخ کے نزدیک بنگلہ دیش میں لڑنے والا، پاکستان کے تحفظ کے لیے زندگی کی آخری سانس تک ہتھیار نہ ڈالنے والا عبدالقادر ملا غدار بھی ہے اور دہشت گرد بھی۔ پاکستان کی فوج کو سولہ دسمبر 1971ء کو شکست ہوئی تھی لیکن پاکستان کو آج شکست ہوئی ہے۔ عبدالقادر ملا کو کسی شہر میں 21 توپوں کی سلامی نہیں دی جائے گی، اس کی شہادت پر فوجی بینڈ ماتمی دھن نہیں بجائیں گے، اس کی تصویر کسی آرمی میوزیم میں نہیں لگائی جائے گی، اس کی یاد میں کوئی ڈاک ٹکٹ جاری نہیں ہوگا، اس کے نام پر کسی سڑک کا نام نہیں رکھا جائے گا۔ شاہ ایران جب ایران سے بھاگا تو اسے صرف مصر کے انوارالسادات نے پناہ دی۔ ایران نے انوارالسادات کے قاتل کے نام پر تہران کی مرکزی سڑک کا نام رکھا، اس کے باوجود ہم یہ گلہ کرتے ہیں کہ کوئی ہم پر بھروسا نہیں کرتا۔ قومیں شکست کے باوجود زندہ رہ جاتی ہیں لیکن ذلت و بے وفائی کی چادر اوڑھ کر زندہ رہنا چاہیں تو یہ چادر ان کا کفن بن جاتی ہے۔